

READING SECTION

دانش و تفریح کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

# پچی کہانیاں

April  
2016

# پاک سوسائٹی

READING SECTION

Online Library for Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library for Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM



# پہلی کتابیں

E-mail: pearlpublications@hotmail.com

بانہی سہام مرزا



میجر مارکیٹنگ

021-35893121

فیجر سرکولیشن

0333-2269932

مدیر اعلیٰ منزہ سہام  
کاشی جوہان / ادنیال شمشی

انکم ٹیکس ایڈوائزر  
منزہ ایڈیٹنگ (ایڈووکیٹس)

رکن آل پاکستان منڈی گھرانہ  
رکن کونسل آل پاکستان منڈی گھرانہ

MEMBER  
APNS  
CPNE

رابطے کے لیے

021-35893122

021-35893123

خط و کتابت کا پتہ: II-C-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کراچی  
ڈیفنس فیز 7، ڈیفنس بلاسٹنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے \* جلد: 33 - شمارہ: 04 اپریل: 2016

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

پہلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دوشیزہ اور پہلی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق سٹی وٹل بچن ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی وی بٹائل نہ ڈراما، ڈرامائی شکل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ چوں کا حق رکھتا ہے۔

Section



احوال

08

کاشفی جوهان

تاریخین کے خطوط اور حال  
احوال کا دل چسپ سلسلہ

گرم کے فیصلے

41

عبد الغفار صاحب

اُن روئینوں کی داستان جس نے  
شوہر کی خوشنودی کے لیے ہر ظلم سہا

اندھیرے دریچے

82

وسائے عبدالعہد

اُس عورت کا قصہ بلاخبر جس  
گدگداتی آہنی کوکھیل بنا کر زون کھلا

پھر صبح ہوگی

116

محمد سلیم افتر

لچھڑ لکھاری کی طرف سے کشمیری  
پسند و نظر پر ایک یادگار داستان

دو کوڑی کی عورت

134

عقلمہ حق

خاص نمبر کے لیے ایک بہت خاص داستان  
حال بہت خاص مصنف کی جانب سے

ہم شکل

142

ایم لہر راحت

جی کہانیاں میں پہلی بار برصغیر  
کے نامور قلم کار کا سنسنی خیز سلسلہ

تبدیلی

07

منزہ نسیم

منزہ نسیم کی کہانیاں  
تبدیلی

لا لائف بوائے

35

اسماء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو  
اپنے اندر کا خیال کے لڑ پناں رکھتی ہیں

تم مل گئے ہو

63

محمد یوسف لغاری

قسمت کی تابناکیوں سے جڑی  
ایک بہت خاص داستان

پتھر میر انصیب

96

ناٹلہ طارق

اُس عورت کی دردناک داستان کا قصہ  
جسے ہر بار قدرت نے زیر کر دیا تھا

چندرا سے عبدالرحمن تک

124

نخستینہ مسیحیت

اُس نوجوان کا قصہ 'عجب جسے قدرت  
گمراہی سے حق کی جانب لے آئی تھی

ایک تصویر ایک کہانی

141

دانیال سنٹوسی

آکھ کے کمرے میں محفوظ ہو جانے والے  
ان مناظر کو آپ لڑاوش نہیں کر سکتے



162 **باہل**

مصداق خان

ان مردوں کے لیے آئینہ تحریر جو بیٹی کو زحمت تصور کرتے ہیں

156 **پکا پھل**

نازت جبین صباہ

اُس مرد کا قصہ جسے عزت جو بیٹیوں کو مستقبل کی پونجی سمجھتا تھا

168 **بھارت میں بلیک لسٹ**

محمود شام

نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے سزائے بھارت

165 **اپنا خون**

شعبان کھوسہ

اس شخص کا قصہ جسے اپنے خون پر عمر و سرنہ تھا

192 **بادبان**

عبدالمنعم

ایک حاصل مطالعہ ناول جو زندگی کے ایک نئے جذبے کا سفر کرائے گا

182 **حسرتِ ناتمام**

ممتاز احمد

اپنی روزمرہ کی زندگی ایک حسرتِ ناتمام بن کر رہ گئی تھی

226 **زہرِ عشق**

کاشف جہان

خفت اور رکون میں لہو جھادینے والے مناظر سے بھر پور نیا سلسلہ

204 **گردش**

جاوید اللہ

ایک ایسی ڈیکٹی کی روایات جو آپ کو کبھی نہ بھولے گی

254 **ہاسٹڈ پارک**

ڈی ظان

زندگی کے رنگوں سے آجاو وہ گوشہ جسے قارئین خود ترتیب دیتے ہیں

244 **مسئلہ یہ ہے**

ادارہ

آپ کا سائل کا حل، سچی کہانیاں کا لادرواں سلسلہ

34 **بیوٹی گائیڈ**

عزیز اسماعیل

حسن کی بے ہدایتی سے جزی و ہباتیں جو یقیناً آپ کی ضرورت ہیں

257 **تیرنیم کش**

قارین

قارئین کی سخن نہیں کو آزمانا ایک دلچسپ سلسلہ



www.paksociety.com ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



میں کس جگہ

# سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے دیکھتے محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بیٹھتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انھیں قبول کرنے والے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے۔ "سچی کہانیاں" میں آپ بتائیں، جگ بتائیں اور انٹرنیٹ پر سزا کی کہانیاں، ناقابل یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلوں کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین رڈیو کے درمیان دلچسپ نوک جھڑک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا۔ اپنی نوعیت کا واحد چرچہ

ماہنامہ سچی کہانیاں۔ پرنٹ پبلی کیشنز: II-C-88۔ فرسٹ فلور، خیابانِ جامی کراچی۔ ڈیفنس

ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی۔ فون نمبرز: 021-35893121-35893122

ای میل: [pearlpublications@hotmail.com](mailto:pearlpublications@hotmail.com)

READING  
Section

## تبدیلی

خان صاحب نے تبدیلی کا نعرہ لگایا اور لوگ جوق در جوق ان کے ساتھ چل پڑے..... کیونکہ ہر شخص تبدیلی چاہتا تھا، ہر پاکستانی ملک میں جاری فرسودہ نظام میں تبدیلی دیکھنے کا خواہاں تھا..... یوں خان صاحب کا قافلہ بڑھتا چلا گیا..... دور دراز علاقوں سے لوگ خان صاحب کی ایک آواز پر لبیک کہتے آگے بڑھنے لگے..... دوسری سیاسی جماعتوں کے لیے بھی تبدیلی کا یہ نعرہ خطرے کی گھنٹی ثابت ہوا..... خان صاحب ویسے بھی ہر دلچیز شخصیت کے مالک ہیں پھر تبدیلی کے نعرے نے ان کا سیاسی قد بہت اونچا کر دیا..... مگر جلد ہی لوگوں کو ان ناچنے والے ہلڑ بازی کرتے جلسوں میں جا کر اندازہ ہو گیا کہ جس تبدیلی کے خواہش مند خان صاحب یا ان کی پارٹی ہے وہ درست نہیں۔ اکثریت کا یہ ماننا ہے کہ سیاست میں سنجیدگی ضروری ہے۔ سیاست دان کا بھی سنجیدہ اور بردبار ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ سیاست اور سیاست دان ہی دنیا کے سامنے پاکستان کا مثبت چہرہ لانے کے ذمہ دار ہیں۔ لہذا کھیل تماشے سیاست میں ناقابل قبول ٹھہرے۔ تبدیلی ضرور آنی چاہیے مگر مثبت تبدیلی۔ منظور خان صاحب کی پارٹی کا تھا مگر تبدیلی آگئی ان لیگ میں..... وہ لوگ جو خان صاحب کی نظر سے سیاست سے نالان تھے ان لیگ میں آنے والی تبدیلی پر انگشت بدندان رہ گئے۔ تبدیلی بھی ایسی جس نے دور جہالت کے تمام بُت توڑ ڈالے۔ وہ بُت جو لوگوں نے اپنے ذہنوں میں بھی بنا رکھے تھے وہ بھی پاش پاش ہو گئے۔ سربراہ وقت نے اپنے جانشین کے طور پر اپنے بیٹے کو نہیں بلکہ بیٹی کو منتخب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مریم نواز وزیراعظم پاکستان کی جانشین ثابت ہوں گی۔ اس کو کہتے ہیں تبدیلی جو صرف نعرے کی حد تک محدود نہ ہوں بلکہ عملی طور پر بھی ثابت ہوں۔ میں بطور پاکستانی عورت نواز شریف صاحب کی اس نوازش کا خیر مقدم کرتی ہوں۔

ہم مائیں ہم بہنیں ہم بیٹیاں منزہ سہام  
قوموں کی عزت ہم سے ہے



# احوال

قارئین کے درمیان رابطہ آپ کے خطوط اور ان کے جواب

پیارے ساتھیو! کبھی کبھی بہت دل چاہتا ہے کہ ہم سب ملیں۔ اکٹھے ہوں۔ محفلیں سجائیں۔ کیسے ہیں آپ! کبھی کبھی بہت دل چاہتا ہے کہ ہم سب ملیں۔ اکٹھے ہوں۔ محفلیں سجائیں۔ رِس بھری باتیں کریں۔ ساون جیسی امیدوں کی ناؤ کو زات کے سمندر میں اتار دیں اور بس آپ ہوں اور ہم ہوں۔ کہنے کو بہت کچھ ہے مگر..... صرف کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ لفظ لفظ جمع کر کے احوال کی ابتداء کر رہا ہوں مگر..... یہ لفظ سمٹتے ہی نہیں۔ ہر لفظ تھوڑی تھوڑی دیر بعد تالی کی صورت ورق سے آزاد ہو کر اڑنے لگتا ہے۔ بہار کی جستجو میں اپنے الفاظ اڑنے دیتا ہوں۔ کاش کہ میں کھنڈروں کی اس زمین پر محبت کی آبادیاں آباد کر سکوں۔ میری خواہش ہے کہ سب انسان آپس میں انسان بن کر رہیں۔ جب ہم انسان بن کر رہیں گے تب ہی تو امن کا قیام بھی ممکن ہوگا۔ اور ساتھیو! جب امن کا قیام ممکن ہوگا تب ہی تو ہم اکٹھا ہوں گے۔ محفلیں سجائیں گے۔ رِس بھری باتیں کریں گے اور ہماری امیدوں کے ساون محبت کرنے والوں کی مقدس پہیلیاں بھگو دیں گے۔ میں نے تو اپنے دل کی باتیں کر دی ہیں۔ کیا آپ لوگ بھی میری اس امید کے لئے یقین نہیں لگائے..... آئیے ساتھیو! محبت کی ٹولے سے ہاتھ روشن کرتے، تیلیوں کے رنگوں کو آنکھوں میں بسائے احوال کی ابتداء کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں سب سے پہلے ہمارے احوال کے مہمان کون ہیں۔

کراچی سے موینہ بٹول رضا ہماری سب سے پہلی مہمان ہیں۔ لکھتی ہیں۔ کچھ مصروفیات زندگی نے رابطہ کرنے میں سستی دکھائی اور تقریباً دو ماہ سے حاضر محفل نہ ہو سکی مگر مطالعہ ضرور جاری ہے۔ کاشی تمہاری محبت خود سے بول رہی ہے۔ کہانیوں کا معیار اور بہتر ہو رہا ہے۔ احوالی محفل بھی اچھی جا رہی ہے تمام دوستوں کو سلام محبت۔ اس مرتبہ بھی تبصرے جاندار ہیں۔ جنوری فروری کے دونوں شمارے بہت اچھے لگے اور دل سے تمہارے لیے دعا نکلی۔ اس مرتبہ ایڈیٹرس صاحب کی ایک خبر اور بازی لے گئی کیونکہ یہ آج کل ہمارے معاشرے کی زندہ حقیقت ہے۔ کاش..... ام یکتوب صاحب کی آئیں کے ساپ نے کوئی تاثر نہ چھوڑا نہ ہی نعمان اسحاق صاحب کی باربان نے متاثر کیا۔ باقی کاوشیں اچھی

رہیں اور جناب آپ کی کاوش زہر عشق بھی۔ محویت قائم کر دیتی ہے۔ اچھے جارہے ہو کاشی۔ گر  
بڑا مانو تو۔ عرض ہے کہ اذیت بوائے والا سلسلہ اب کچھ پور کرنے لگا ہے۔

☆: اچھی بہن! سلامت رہیے۔ آپ کی تجاویز پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ باقی دیگر  
تجاویز کے لیے عرض یہ ہے کہ کچھ پروفیشنل چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ سو.....

انتہا: گاؤں سیداں کمال۔ راولپنڈی سے یہ پہلی آمد ہے۔ طالبہ واؤڈ کی۔ لکھتی ہیں۔ میرا نام  
طالبہ واؤڈ ہے میں گاؤں سیداں کمال میں رہتی ہوں۔ مجھے کہانیاں پہلے بہت اچھی لگتی تھیں میں  
پڑھتی تھی۔ لیکن پھر جو کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ یہ کہانی میں نے پہلی بار آپ کے ڈائجسٹ میں  
لکھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو میری کہانی پسند آئے گی اور ضرور شائع ہوگی۔ میں نم کلاس کی  
اسٹوڈنٹ ہوں۔ اب میرے امتحان ہونے والے ہیں۔

☆: اچھی گڑیا! خوش آمدید! کہانی پڑھ کر رائے دیں گے۔ احوال میں ضرور شرکت کرو۔ یہ  
رابطوں کی کہکشاں ہے۔

انتہا: کراچی سے سیم سحر نے ہمیں یاد کیا ہے۔ لکھتی ہیں۔ اب عرض یہ کرنا ہے اگر کوئی آپ  
کو کہانی بھیجتا ہے اور اگر وہ قابل اشاعت ہے تو آپ شائع کر دیں اور اگر نہیں ہے تو پھر فون  
کرے پر بتادیں کہ نہیں چھپ سکتی تاکہ انتظار کی اذیت ختم ہو جائے۔ میری کوشش ہوتی ہے  
کہ مختلف موضوع پر لکھوں لیکن آپ لوگ حوصلہ افزائی ہی نہیں کرتے۔ عورت کو صرف یہ مسئلہ  
نہیں ہے کہ اس کو ماموں یا چچا کے بیٹے نے پسند نہیں کیا۔ عورت کو بے شمار مسائل ہیں اور ہمیں  
ان کو اجاگر کرنا چاہیے اور یہ کام آپ لوگ بہتر کر سکتے ہیں۔ خیر مزید کہانیاں بھیج رہی ہوں  
امید کرتی ہوں آپ کو پسند آئیں گی۔

☆: اچھی بہن! ہم نے سچی کہانیاں کے علاوہ دوشیزہ میں بھی آپ کو شائع کیا۔ اگر ہم حوصلہ  
افزائی نہ کرتے تو پھر یہ نئے رائٹرز کی کیس کیوں نظر آ رہی ہوتی۔ احوال سے دوری آنکھ اوجھل پہاڑ  
اوجھل والی مثال ہو جاتی ہے۔ ہمیشہ فون پر آپ کو سراہا ہے حوصلہ افزائی کی ہے مگر آپ کا گلہ.....  
جلد کہانیاں اشاعت کے مراحل طے کریں گی۔

انتہا: ڈیرہ غازی خان سے ہماری بہت اچھی بہن ارم خان عرض گزار ہیں۔ آپ کا بے حد شکریہ  
کہ میری کہانی کو ایوارڈ یافتہ کہانیوں میں شامل کیا مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ میری کہانی یہ مقام  
حاصل کر سکتی ہے۔ بھیا جی بے حد شکریہ۔ اب آئی ہوں شمارے کی طرف۔ رسالہ ملتے ہی اپنے من  
پسند سلسلے احوال کی طرف دوڑ لگائی ہر ماہ کی طرح اس بار بھی کچھ نئے لوگوں کو احوال میں شامل پایا۔  
خوش آمدید۔ اب ذکر ہو جائے ان پیارے پیارے بہن بھائیوں کا جنہوں نے مجھے یاد رکھا۔ منزل  
خان آپ کے مشورے پر ہم عمل نہ کریں کیسے ہو سکتا ہے۔ عظمیٰ شکور بہنوں کو ٹھیکس نہیں کہتے۔ سو نیا  
خان، اچھی بھابی صائمہ مجید، بھائی سید ملازم حسین شیرازی، مجید احمد جانی، راشد لطیف، ڈاکٹر خادم



حسین کھیڑا۔ اچھے بہن بھائی میرے تبصرے کو پسند کرنے کے لیے اور مجھے یاد رکھنے کے لیے بے حد شکر یہ۔ جس طرح مجھے آپ سب یاد رکھتے ہیں اسی طرح دعاؤں میں بھی رکھا کریں۔ ایم یعقوب بھائی میں ٹھیک ہوں اور ہر ماہ سچی کہانیاں میں حاضر ہوتی ہوں۔ آپ کیسے ہیں۔ اللہ پاک آپ کو اچھی صحت نوازے آمین۔ کہانیوں میں یہ دوستی ہے ڈراپ سین، ناسوز، قاطرہ گل، قسمت کے کھیل نرالے ہیں، کوئی خوشیاں لاوئے، روایات کی دلدل، آپ اپنے دام میں، قاتل، تلاش، بلند بخت، ذرا سی غلطی، ایک چھوٹی سی نیکی، ازالہ، وہ کون تھی، پڑھی زبردست۔ بھیا جی بے حد شکر یہ آپ نے میری دوسری کہانی کو بھی سچی کہانیاں میں جگہ دی ایک بار پھر بے حد شکر یہ۔ حبیب الرحمن بھائی معذرت کیوں؟ بھائی بہنوں سے معذرت کر کے بہنوں کو شرمندہ نہیں کرتے۔ اللہ پاک آپ کو بہت جلد رہائی دے گا انشاء اللہ۔ وہ بڑا ہی رحم کرنے والا ہے اس کے بندے کے مانگنے میں دیر ہے اس کے عطا کرنے میں نہیں۔ پراسرار کہانیوں میں سترہواں مسافر، مجھے معاف کرو، روم نمبر 607، بھوک، عرش کون تھی، ہانڈی، سرخ لیموں، تمہارے ساتھ ساتھ دوسری دنیا کا عشق، اچھی کہانیاں تھی جن کے نام نہیں لکھ سکی ان تمام سے معذرت۔ اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔

☆ پیاری ارم! مارچ کے شمارے میں اپنی کہانی دیکھ کر یقیناً تم خوش ہو گئی ہو گی۔ تبصرے کا شکر یہ۔ بیٹا تم سب کی محبت پر بچے کو چار چاند لگاتی ہیں۔ خوش رہو، خوشیاں باٹتی رہو۔

لکھا: کراچی سے یہ آمد ہے ہماری بہت پیاری بہن سیمیں غزالہ نیماں کی۔ لکھتی ہیں۔ میری کہانی 'کنیز' شائع کرنے اور ایوارڈ کے لیے منتخب کرنے کا بہت شکر یہ۔ پچھلے دو مہینوں سے بہت مصروفیت رہی۔ خاندان میں شادیاں۔ نئے مہمانوں کی آمد اور جرمنی سے آئے ہوئے بیٹے بہو کی مہمان داری سے اتنا وقت نہیں ملا کہ سنجیدگی سے 'سچی کہانیاں' کا مطالعہ کر سکتی۔ بس جلدی جلدی میں پڑھ لیا۔ اب سب تقریبات ختم ہوئی اور مہمانوں کے جانے کے بعد فروری کا شمارہ تفصیل سے پڑھنے کے بعد آپ کو خط لکھنے بیٹھی ہوں۔ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت، بیماروں کے لیے دعائے شفا اور جن کو خوشی نصیب ہوئی ان کو مبارک باد کے بعد سب سے پہلے منزہ سہام مرزا کا 'اسمارٹ فون' پڑھا واقعی سچ کہا منزہ نے۔ اس کے بعد اسماء اعوان صاحبہ لائف بوائے شیمپو سے رشتوں ناتوں کی دھول صاف کرتی نظر آتی ہیں۔ جیسے لائف بوائے شیمپو سے بال دھل کر صاف ستھرے سلکی اور شائین نظر آتے ہیں اسی طرح آپس میں جڑے رشتے بھی صاف شفاف اور پر خلوص کر کے دکھا رہی ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ محمد سلیم اختر کی یہ دوستی ہے بہت اچھی لگی۔ اقبال بانو صاحبہ کا ڈراپ سین بہترین کہانی تھی۔ رئیسہ خالد صاحبہ کی 'ایک چھوٹی سی نیکی' نے بھی بڑا متاثر کیا۔ اسی طرح ممتاز احمد صاحب کا 'ازالہ' بھی بہت اچھا لگا۔ ثنا کنول کی 'ذرا سی غلطی' نے بھی متاثر کیا۔ باقی سب کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔ 'سچی کہانیاں' میں اچھی ہی کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہم شکل اور زہر عشق پر ہم جیسے طفل مکتب

## سانحہ ارتحال

ہمارے بہت عزیز لکھاری اور شاعر ساتھی عبدالعزیز جی آ کی والدہ گزشتہ ماہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ادارہ دکھ کی ان گھڑیوں میں عبدالعزیز جی آ کے ساتھ ہے۔ اور مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

تبصرہ کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ تو خود اپنی مثال آپ ہیں۔ آخر وہ ایم اے راحت اور کاشی چوہان جیسے بڑے ادیبوں کے قلم کی کاوش ہے۔

☆: پیاری بہن! کہانیاں جلد شائع ہوں گی۔ مہمان داری سے بڑی ذمہ داری اور کیا ہوگی بھلا۔ ایوارڈ آپ کا حق تھا۔

✉: ہماری ساتھی لکھاری کرن شبیر کراچی سے ایک عرصے بعد احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ سلام سر! امید کرتی ہوں مزاج بخیر ہوں گے۔ بہت عرصے بعد احوال میں احوالی بن کے آئی ہوں۔ خوش آمدید نہیں کہیں گے۔ لیکن ایک قاری کی حیثیت سے ہمیشہ ساتھ ہوں۔ سرورق ہمیشہ کی طرح لاجواب تھا۔ احوال سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے اسماء اعموان کے لیے لائف بوائل ایوارڈ تو جتا ہے۔ سلیم اختر صاحب کا تحفہ حاسم واقعی اس شمارے کا شاہ کار تھی۔ 'ناسور' ڈراپ سین عمدہ رہیں۔ 'فاطمہ گل' میرے کشمیر کی ننھی شہزادی پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ شمیمہ فیاض فرسودہ معاشرے کی روایات کی عکاسی کرتی نظر آئیں۔ ایم یعقوب، ضرغام محمود اچھے انداز میں آئے، ایم اے راحت سر کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ جس کہانی کو پڑھ کے ایک پل دل کی دھڑکن رک ہی گئی وہ ننھی ایڈیسن اور یس کی ایک خبر اور ارم ناز، فوزیہ، حنا بشری ہمیشہ کی طرح خوب سے خوب تر رہے۔ بھارت میں بلیک لسٹ، محمود شام زبردست، مقصود احمد بلوچ، شانی خانان، نوشاہ صدیقی، ثناء کنول، ربیعہ خالد، الماس فاطمہ تمام لوگوں کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ زبیر عتیق پہلی قسط سے جو سحر میں جکڑا اس کی گرفت اب تک مضبوط ہے۔ جاوید راہی بیک وقت خوف و تجسس سے بھری کہانی لے کر حاضر ہوئے۔ نعمان اسحاق 'بادبان' کے ساتھ تشریف لائے اس پر تبصرہ ادھار۔ باباجی خلق خدا کے جیسے کام آرہے ہیں اس کا اجر انھیں دعاؤں میں ملے گا۔ خدا ہمیشہ انھیں تندرست رکھے آمین۔ ہم جیسے بہت سے نوآموز لکھاریوں کے لیے سچی کہانیاں ایک بہترین پلیٹ فارم ہے۔

☆: پیاری کرن! گڑیا ویکم بیک ٹو۔ اب تم آگئی ہو تو بس اب آمد مستقل بناؤ اور انشاء اللہ کہانیاں بھی جلد اشاعت پذیر ہوں گی۔

✉: جہاں سے ملے وہاں سے پہلی پہلی آمد ہے ام حاسم بونا ماہ کی۔ کہتے ہیں۔ جناب میں تقریباً عرصہ 10 سال سے میں اپنے قلم کو حرکت دے رہا ہوں۔ ماہنامہ "سچی کہانیاں" کا تعارف، تعریفی انداز میں بہت سارے دوستوں سے ہو چکا تھا۔ بہت سارے



دوستوں نے اس میں لکھنے کی رائے سے بھی نوازا تھا۔ خاص کر جناب محترم رفعت محمود صاحب نے سچی کہانیاں میں لکھنے کا بھرپور انداز میں کہا ہے۔ ایک شام میں دن بھر کی مصروفیات کے بعد جہانیاں منڈی سے ماہ جنوری کا پرچہ خریدا جیسے ہی مطالعہ کے لیے ورق گردانی کی تو بہت سارے چہروں کو اپنی جان پہچان والے پایا۔ کاشی چوہان صاحب اس بار ایک لیٹر کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ امید ہے میری اس کوشش کو رومی کی ٹوکری کی نظر کر کے حوصلہ شکنی نہیں کر دے گی۔ زندگی نے وفا کی تو بہت جلد ایک کاوش لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔

☆: پیارے بھائی بونا عاصم! خوش آمدید۔ آپ کا تعارف تو ہو گیا۔ اب ذرا دیکھیں آپ کی تحریر میں کتنا دم ہے۔ انتظار رہے گا۔

✉: سرگودھا سے ہمارے بہت ممتاز لکھاری ممتاز احمد شامل احوال ہیں۔ لکھتے ہیں۔

مارچ کا شمارہ پراسرار نمبر موصول ہوا اس بار ناسٹل بہت ہی دلنشین اور جاذب نظر تھا۔ ادارہ میں منظرہ بہانے ”الفاظ کھو گئے“ کے عنوان سے مرحومہ فاطمہ ثریا بیجا کو خراج عقیدت کے ساتھ اُن سے وابستہ اپنی بے پناہ محبتوں کا ذکر کیا۔ احوال میں کاشی بھائی نے بھی اُن کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ ماشاء اللہ سچی کہانیاں دن بدن خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یار کاشی ایک بات تو بتائیں پراسرار نمبر پڑھ کر مجھے تو اب یہ محسوس ہونے لگا ہے کہیں آپ میں کسی جن کی روح تو نہیں آگئی؟ اتنا کام اور پھر دن بدن احوال میں دوستوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ پاک آپ کو نظر بد سے ہمیشہ بچائے۔ آمین۔ احوال سب دوستوں، بہن بھائیوں کے خوب صورت خطوط اور تبصروں سے جگمگا رہا تھا۔ سب سے پہلے میں تہ دل سے انتہائی ممنون و مشکور ہوں۔ اُن تمام بھائیوں اور بہنوں کا جنھوں نے میرے خطوط اور کہانی کو اپنی پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ کنول عمران خان شادی کی سال گرہ مبارک ہو۔ زرینہ جو، سنبھل بہن، نازیہ بتول رضا بہت بہت شکریہ خیر مبارک۔ بہت ہی بیاری بہن ام ادل احوال میں آپ کا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ محترم حبیب الرحمن، محترم ملازم حسین شیرازی صاحب آپ سب کی دعاؤں میں شامل ہیں۔ ہماری قابل صدا احترام بہن محترمہ پروفیسر صفیہ سلطانہ ایک عرصے کے بعد تشریف لائیں۔ آپ کا خوب صورت اشعار سے مزین خط احوال کی زینت بنا آپ کی آمد بہت اچھی لگی۔ عمارہ ناز کو احوال میں خوش آمدید آپ کا بے حد شکریہ جو آپ میری کہانیاں سب سے پہلے اور شوق سے پڑھتی ہیں۔ لائف بوائے کمرشل کہانی حسب معمول زبردست رہی۔ محترم سلیم اختر کی کہانی ”ستر ہواں مسافر“ کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ حنا بشری کی ”مجھے معاف کر دو“ پراسرار بہن واپسی حاس اور لا جواب کہانی تھی۔ روم نمبر 60، م سداہ چہرہ، بھول، عری لون سی، ہانڈی، سرخ لیموں، دوسری دنیا کا آخری عشق، بہترین کہانیاں تھیں۔ علی حسنین تابش

## مبارک یاد

ہمارے دیرینہ رفیق ہرول عزیز سدا بہار لکھاری محمد سلیم اختر صاحب کی چھوٹی بیٹی جویریہ سلیم کی شادی خانہ آبادی گزشتہ ماہ 18 مارچ کو انجام پائی۔ ادارہ اس پر مسرت موقع پر سلیم اختر اور ان کے اہل خانہ کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

”سنپولے“ نازیہ بتول رضا ”تمہارے ساتھ ساتھ“ فرح انیس کی ”آٹھ کہانیاں اک کردار“ نزہت ناز کی ”اک پل میں سب کچھ“ تحسین جوینجو کی ”مہانتاناگ“ اچھی کہانیاں تھیں۔ کیسا یہ راز، ہماری ادھوری کہانی، سب کچھ تیرا ہے، وہ بڑھیا کون تھی؟ نجات، بیٹا دے یا..... مایا، پھل پیری، حلوہ کھاؤں گی، پراسراریت سے بھری عمدہ کہانیاں تھیں۔ بادبان ابھی نہیں پڑھ سکا۔ جاوید راہی کی ”مینی باجی“ ایک عبرت انگیز کہانی تھی۔ ہائیڈ پارک میں خضر حیات، مسز گہت غفار، ریاض حسین بسم، فرح انیس اور صائمہ بشیر کے انتخاب بہت بہترین اور لا جواب تھے۔ محمد قاسم خان بلوچ، علی حسنین تابش اور روبینہ ناز روبی کی شاعری بہت شاندار تھی دل میں اتر گئی۔ شائلہ اختر اور حنا لطیف کے لطیفے مزے کے تھے۔ آخر میں سب دوستوں کو خلوص بھرا سلام اب اجازت چاہوں گا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو.....

☆ اچھے بھیا! تبصرے کا، اتنے مزیدار تبصرے کا شکر یہ..... امید ہے آپ ان نقطوں کی زبان سمجھ گئے ہوں گے۔ اگلی بار معافی نہیں ملے گی۔

کمالیہ سے یہ آمد ہے ہماری نئی شاعرہ بہن، عمارہ ناز کی لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے میں آپ کی بہت مشکور ہوں کہ آپ نے نہ صرف میری غزل اور خط کو سچی کہانیاں کے قیمتی صفحات پر جگہ دی بلکہ خوش آمدید اور ویلکم کیا تو اب انشاء اللہ میں بھی اپنا فرض اور وعدہ نبھاؤں گی اور ہر ماہ حاضری لگواتی رہا کروں گی۔ ماہ مارچ کا پراسرار نمبر چار تاریخ کو خریدی۔ سچی بات یہ ہے کہ پراسرار جنوں بھوتوں اور جاادو ٹونے کی کہانیاں پڑھ کر بہت ڈر لگتا ہے تو آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر پڑھنا شروع کیا ہے۔ ابھی تک چند ایک کہانیاں ہی پڑھ پائی ہوں۔ سب سے پہلے ممتاز احمد صاحب کی لکھی ہوئی کہانی حسد کی آگ پڑھی جو کہ بہت ہی سبق اور نصیحت آموز تھی۔ نازیہ بتول رضا صاحبہ کی لکھی ہوئی کہانی تمہارے ساتھ ساتھ پڑھی۔ بہت خوب بڑی شاندار کہانی لکھی انھوں نے۔ انکل محمد سلیم اختر کی لکھی کہانی ستر ہواں مسافر بہت لا جواب، بہترین کہانی تھی۔ علی حسنین تابش صاحب کی لکھی کہانی سنپولے بہت اچھی کاوش تھی۔ پسند آئی۔ فرح انیس کی لکھی کہانی آٹھ کہانیاں اک کردار۔ نزہت ناز کی لکھی کہانی ایک پل میں سب کچھ اور ارم خان کی کہانی سب کچھ تیرا ہے بہت شاندار کہانیاں تھیں۔ تحسین جوینجو کی مہانتاناگ بھی اچھی کہانی تھی۔ بس ابھی تک اتنا ہی پڑھ پائی ہوں۔ ہائیڈ پارک میں محمد قاسم خان بلوچ، علی حسنین تابش کی غزلیں بہت زبردست تھیں۔ پسند آئیں۔ روبینہ ناز روبی کی نظم حوا کی بیٹی بہت عمدہ کلام تھا دل میں اتر گیا۔ محمد قاسم خان بلوچ صاحب



آپ کو میری غزل پسند آئی آپ کی شکر گزار ہوں۔ آخر میں سب احوالیوں کی خدمت میں درجہ بدرجہ سلام اور آداب۔

☆: عمارہ! بیٹا آپ نے اپنا وعدہ نبھایا ہم بھی اپنا وعدہ نبھائیں گے۔ تبصرہ مختصر مگر اچھا تھا۔ آپ کی شاعری بہتر ہے۔ امید ہے کل کا بڑا نام ہماری بہن کا ہی ہوگا۔

☆: یہ احوال میں لکھی جا رہی ہے ہمارے بہت محترم شاعر خالد یوسفی صاحب کی۔ عرض کرتے ہیں۔ عزیزم کاشی چوہان جیتے رہو۔ میرا تعلق سرگودھا شہر سے ہے میں بنیادی طور پر شاعر ہوں اور شاعری سے بہت لگاؤ ہے اور اسی حوالے سے اللہ پاک نے مجھے بہت عزت دی ہے۔ ممتاز احمد کی معرفت ماہنامہ سچی کہانیاں متعارف ہوا اور جب ممتاز صاحب نے بتایا کہ کاشی چوہان بہت نامور شاعر ہیں اور ان کا مجموعہ کا نام ”اور تم“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے تو آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور بے اختیار آپ کو خط لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ فوراً کاغذ قلم سنبھالا اور چند سطریں آپ کی نظر کر رہا ہوں۔ بلاشبہ سچی کہانیاں کو ایک معیاری ڈائجسٹ پایا اور ہر لحاظ سے یہ ایک بہترین معلوماتی جریدہ ہے، جس میں خوب صورت کہانیوں کے ساتھ اچھی شاعری بھی ہے۔ اپنی ایک غزل خط کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ وقتاً فوقتاً حاضری ہوتی رہے گی۔ اب اجازت چاہوں گا۔

☆: محترم بھیا! آپ کی آمد سے دل کو جو خوشی ملی اس کا احوال ان صفحات پر بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بس اپنی شفقت اسی طرح برقرار رکھیے گا۔

☆: لاہور سے یہ نامہ سے ہماری بہت پیاری لکھاری بہن حنا بشری کا۔ لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے اتنا زبردست رسالہ شائع کرنے پر مبارکباد۔ سرورق شاندار تھا۔ تبصرے سب کے شاندار تھے۔ احوال کی رونق یونہی بڑھتی رہے۔ آمین۔ کہانیوں پر تبصرہ کرنے سے پہلے چھوٹی سی بات کروں گی۔ کاشی بھیا یہ آپ کا دیا ہوا حوصلہ ہے کہ بھائی ملازم حسین اور بھائی حبیب الرحمن ان حالات میں بھی لکھ رہے۔ چنانچہ تبصرہ کرتے ہیں۔ اللہ ان دونوں کے حال پر اپنا رحم فرمائے اور ان پر اپنا فضل فرمائے۔ باقی بھیا آپ کو آپ کی نیک نیتی کا اجر اللہ پاک ضرور عطا فرمائے گا۔ بھائی حبیب الرحمن کا خط پڑھ کر احساس ہو رہا تھا کہ کاشی بھیا کی محبت اور خلوص نے انہیں نئی زندگی دی ہے۔ اب ثارے پر تبصرہ ہو جائے ستر ہواں مسافر بہترین تحریر تھی۔ بھوک، روم نمبر 607، گم شدہ چہرہ، عرشی کون تھی؟، سرخ لیموں، تمہارے ساتھ ساتھ، دوسری دنیا کا آخری عشق، آٹھ کہانیاں اک کردار پر اسرار نمبر کی رونق بڑھا رہی تھیں۔ نزہت ناز کی تحریر اک پل میں سب کچھ۔ مہمان ناگ، آدم خور زبردست تھیں۔ ارسہ سحر چوہان کی تحریر کیسا یہ راز ہے؟ کشاف اقبال کی ہماری ادھوری کہانی سچی اپنی کوششیں تھیں۔ مختصر تحریروں پر بھی بہت محنت لی ہے۔ بہت خوب تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ بادبان بھی خوب صورت تحریر ہے۔ زہر عشق کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ویلڈن کاشی بھیا۔ جاوید راہی صاحب کی منی باجی اور ممتاز احمد صاحب کی حسد کی

## خواتین کی محبوب قلم کار

### رفعت سراج کا تازہ ترین ناول "دام دل"

رفعت سراج کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں جو قارئین کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی ہیں۔

"دام دل" ایک ایسا جادو کی کہانی، جسے دو بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں ہر لمحہ سانس، سر کے قطرے اور تشویشوں کا نشانہ بننا پڑا ہے۔

### تازہ ترین قسط سے کچھ لائیں

اے ہاں اپنے ان تحفوں کو اوپر ہی رکھا کرو۔ وہ تو شکل ہی دوسری ہوتی ہے جو چاند سا پوتا کھیلنے کو دیتی ہے۔ مشکل سے پچاس ہزار کا جہیز لائی ہوں گی۔ پانچ لاکھ کے خرچے ڈال دیئے ہم پر۔" فردوس کی بڑبڑاہٹ زہری کی کڑواہٹ کے برابر تھی۔

"ارے پانچ لاکھ کہاں! جب تک یہ شادی کی عمر کو پہنچیں گی۔ ایک کی شادی پندرہ لاکھ میں پڑے گی۔" حامد حسین نے لقمہ دیا۔

"پ..... پ..... پندرہ لاکھ....." فردوس نے دھپ سے سینے پر ہاتھ مارا اور صوفے پر گر گئے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ یوں گویا کوئی ان پر بندوق تانے کھڑا ہوا اور کہہ رہا ہو۔ نکالو پندرہ لاکھ۔

"ارے کہاں سے لائے گا ہمارا بچہ تیس لاکھ؟" وہ گویا پچھاڑیں کھانے لگیں۔

"آسرا رکھو، دو تین اور ہو گئیں تو کروڑ کا بندوبست کرنا ہوگا۔" حامد حسین نے زینہ چڑھتی ایمین کی پشت پر تاک کر نیا تیر چھوڑا۔ ایمین کو پاؤں اٹھانا دو بھر ہو گیا۔

جی تو چاہا پلٹ کر کہہ دے کہ جس نے انہیں ماں بکے پیٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں رزق دیا۔ آگے بھی وہی ذمہ دار ہے۔ جسے رب العالمین کہتے ہیں۔ جو ہماری تقدیر لکھتا ہے۔ جس کے لکھے کو نہ کوئی مٹا سکتا ہے نہ تبدیل کر سکتا ہے۔ مگر جی کی جی میں رہی۔ کچھ کہنے کا مطلب تھا کم از کم پندرہ دن کی جنگ تو چھڑ گئی۔ وہ شوہر کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کو بھی ترس جائے گی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

آج کے جدید دور میں بھی ایسے کردار ہر دوسرے گھر میں موجود ہیں۔ رفعت سراج عام بات کو خاص بنانا جانتی ہیں۔

دام دل ہر ماہ دو شہزادہ ڈائجسٹ میں مسلسل شائع ہو رہا ہے۔

Section



آگ بھی بے مثال تھیں۔ دونوں ہمیشہ اچھے لکھتے ہیں۔ بلکہ ہم آپ دونوں سے سیکھتے بھی ہیں۔ آخر میں ایک بات کہ سدرہ انور علی کا خوب صورت تبصرہ موجود تھا مگر پراسرار نمبر کے لیے ان کی کہانی کیوں غائب تھی؟ اجازت سے پہلے تمام احوالیوں کے لیے بہت سی دعائیں۔ سب کو سلام اور بہت پیار۔

☆: بہت اچھی حنا! تبصرہ بہت شاندار رہا۔ بالکل تمہاری کہانیوں کی طرح۔ بس بیٹا ہمیں ہر ماہ یاد کر لیا کرو۔ احوال میں سب احوالی ایک دوسرے کے خوشی اور غم کے شریک ہوا کرتے ہیں۔

✽: بڈالی سے ہمارے قاری ساتھی نعیم اللہ بڑے دنوں بعد احوال میں حاضر ہو رہے ہیں۔

لکھتے ہیں۔ چند ماہ بعد احوال میں شرکت کر رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ مارچ کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ سرورق تو پراسرار کے عین مطابق بہترین لگا۔ پھر اشتہارات پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے منزہ سہام کے ادارہ پر پہنچے۔ ”الفاظ کھو گئے“ بہت خوب لکھا۔ اس کے بعد کہانیوں کی باری آئی تمام لکھاریوں نے خوب لکھا۔ ستر ہواں مسافر محمد سلیم اختر۔ مجھے معاف کر دو حنا بشری۔ روم نمبر 607، نفیسہ سعید۔ گم شدہ چہرہ شانی خاں۔ بھوک رضوانہ پرنس۔ عرشی کون تھی؟ نازیہ ملک۔ ہانڈی شائستہ انور۔ ٹاپ کی کہانیاں تھیں۔ ان کی تعریف کے لیے الفاظ کم ہیں بہت خوب زبردست۔ ایک تصویر ایک کہانی، دانیال نسیمی۔ بہترین سلسلہ ہے۔ کاشی چوہان کا ناول زہر عشق اور ایم اے راحت کا ناول ہم شکل بہترین جارہے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی کہانیاں پڑھی نہیں ہیں۔ امید ہے بہتر نہیں بہترین ہوں گی۔ کیونکہ بہترین کہانیاں سچی کہانیاں میں ہی ہوتی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ماہ نامہ سچی کہانیاں کو دن دو گنی رات چوٹی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆: پیارے نعیم! ہماری بھی اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس طرح تم نے اس بار خوب صورت تبصرہ لکھا تمہیں بہت اچھا لکھنا بھی آ جائے۔ خوش رہو۔ امید کے ساتھ۔

نکحہ: احوال میں یہ شرکت ہے ہماری آپا منزنوید ہاشمی کی گراچی سے۔ لکھتی ہیں۔ میرے

دوستوں اور ساتھیوں کیسے ہیں آپ لوگ۔ منزہ سہام نے اسمارٹ فون پر بہت خوب صورت لکھا۔

کاشی چوہان کے احوال میں قدم رکھا تو ایسا محسوس کرتی ہوں کہ کہیں سے گھوم پھر لو گھرائے گھر کا جو

مزہ ہوتا ہی سکون اپنوں کی محبت وہ کاشی چوہان کے احوال میں نظر آتی ہے یہ سب آپ کی محبت کا

ثبوت ہے۔ میں سچی کہانیاں بھی پڑھتی ہوں اور وہ شیرہ بھی۔ مگر احوال میں ماشاء اللہ تعداد بڑھتی

جارہی ہے۔ سنبھل کیسی ہو، سدرہ انور علی آپ سب کو خوب صورت خطابات سے نوازتی ہو میری گزیا

میں بھی آپ کو ایک خطاب دینا چاہتی ہوں۔ ہماری (لاڈلی گزیا) جو ہم سب کی چہیتی ہے۔ ذہین

محبت کرنے والی لاڈلی گزیا پسند آیا اپنا خطاب۔ اسماء اعوان لائف بوائے کو کامیاب بنانی جارہی

ہیں۔ شانی خاں کے والد کے لیے دعا گو ہوں۔ خدا ان کو صحت عطا فرمائے۔ ہم سکینہ صدف کے غم

میں ہم برابر شریک ہیں۔ سب دوستوں کا شکر یہ جنہوں نے ہمیں مبارکباد پیش کی۔ یعقوب احمدانی

اب طبیعت کیسی ہے؟ سو نیا اور سردہ آپ نے یاد کیا۔ ہم حاضر۔ مجید احمد جانی بھائی اب طبیعت کیسی ہے۔ محمد سلیم اختر اپنی دوستی بہت خوب صورتی سے تحریر کر رہے ہیں۔ اقبال بانو ڈراپ سین میں اپنا گھر بچانے کی ترکیب بتا رہی ہیں۔ ناسور میں نسرین غرور اور ٹھمنڈ کو نیچا دکھا رہی ہیں۔ فاطمہ گل جو بہادر جینی کی کہانی ہے پسند آئی۔ نازیہ بتول سوتن کو کیلی بنا رہی ہیں اور زندگی آسان کر رہی ہیں۔ منعم اصغر نے اپنی چاچی کی محبت اور تم کو بہت خوب صورتی سے تحریر کیا۔ شمینہ فیاض نے نئے نئے کی رسم پر کہانی پیش کی۔ محمد قاسم خان بدیع عاتے ڈراتے ہوئے نظر آئے۔ نرغام محمود نے ایک مجبور و شیزہ کی کہانی بہت خوب صورتی سے پیش کی۔ ایم یعقوب دوست نمدار شمن سے ہوشیار کراتے نظر آئے۔ ایم اے راحت کی ہم شکل، کاشی چوہان زہر عشق ڈائجسٹ کا دل ہے دل نہ ہو تو جسم میں کچھ نہیں رہتا۔ ایڈیٹس معاشرے کی سچائی پیش کر رہے ہیں۔ ارم ناز معاشرے کی اقدار کو بھسم کرتی تحریر لائیں۔ فوزیہ احسان رانا آپ کی تحریر پسند آئی، ہذا حرام احسان فراموش کی کہانی "خدا بشری" نے بیٹیوں پر غرور، بیٹی پر افسوس کو بہت خوب صورتی سے پیش کیا۔ مقصود احمد بلوچ لالچ نے بھائی کی جان لے لی۔ تحریر پیش کی، شانی خاں اچھی تحریر تھی۔ نوشاہہ، ثنا کنول، رئیسہ خالد، المناس فاطمہ کی حکایتیں پسند آئیں۔ نعمان اسحاق پہلا حصہ چھا گیا۔ ممتاز احمد پلیٹ فارم پر ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت کہانی لارہے ہیں۔ بانیڈ پارک میں کنول جی، امیس البرجن چھا گئے، تیرنیم کش میں ایم افضل، اشفاق شاہین، رہ مینہ شاہین پسند آئے۔ اب اجازت پراسرار نمبر میرے ہاتھ میں ہے۔ مزے لے لے کر تھوڑا ڈر ڈر کر انجوائے کر کے املی کی طرح پڑھوں گی۔ اجازت۔

☆: پیاری آپا! مزید ارکھنا میٹھا تبصرہ دل لے گیا۔ خوش رہیے۔ آپ کی محبتوں کے مان ہمیں ہمیں کرتے ہیں۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسے محبت کرنے والے ہمارے اپنے ہیں۔

☆: اسلام آباد سے ہماری نٹ کھٹ عظیم شکور صاحبہ کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتی ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کیسے ہیں آپ! خود تو آپ مسکرا رہے ہیں اور ہماری موت کا سامان کیسے ہیں۔ اور نہیں تو کیا۔ پراسرار کہانیاں پڑھ کر کسی روز ہم بھی پراسرار کہانی بن جائیں گے۔ مارچ کا شمارہ خوفناک کھوپڑیوں، جنات پر یاں لیے حاضر ہوا۔ اُف! کانپتے ہاتھوں سے جیسے ہی کھولتے ہیں تو روح جیسے فنا ہو رہی ہے۔ چلیں جی کہانی خوفناک ہے مان لیتے ہیں۔ اس پر طرہ کہ خوفناک تصویریں۔ یا اللہ آنکھیں بند کر کے پڑھیں کیا۔ فاطمہ ثریا بھیا کی موت واقعی ایک بہت بڑا صدمہ تھی۔ منزہ سہام کی اُن سے محبت اُن کے لفظوں سے جھلک رہی تھی۔ آگے بڑھتے ہیں تو احوالیوں کی محفل جی ہے۔ ہر کوئی سچی کہانیاں سے محبت میں سبت لے جانے کو ہے۔ واہ!! جی خوش ہو گیا۔ اُف!! آ گیا وہ مرحلہ..... ہاں جی..... خوف ناک کہانیاں اور میں اکیلی جان۔ بہت سا حوصلہ صحیح کرے پڑھنا جو سرور لیا تو اسلام آبادی، ملی ہی سردی میں ہی پیسے لی سی ی بوندیں پیشانی کو جگمگاتے لگیں۔ محمد سلیم اختر صاحب پنڈی ایبٹ آباد کا سفر بھی اتنا طویل نہ لگا جو آج محسوس ہوا۔



ستر ہواں مسافر..... موت کے سائے میں لکھی گئی یہ کہانی لمحہ بہ لمحہ اپنی طرف متوجہ کرتی رہی اور اینڈ موت پر کیا گیا۔ ہمیں تو لگا کہ جیسے وہ قبرستان ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ حنا بشری مجھے معاف کر دو۔ قسم سے آپ ہمیں واقعی معاف کر دیں۔ نہ ڈرایا کریں اتنی خوفناک کہانی لکھ کر۔ اُس بے چاری کو ڈاکٹر بنا کر مار ڈالا..... کس قدر دکھی کہانی تھی۔ ابھی پچھلی کہانی کا دکھ آنکھوں سے بہ رہا تھا کہ گمشدہ چہرہ ہوش اڑانے کو آ گیا۔ شانی خانان کے قلم سے تحریر کردہ یہ روح فرسا قصہ روح و ہلا دینے کو کافی تھا۔ میرے ہی جیسی تھی بے چاری، پرانی یادوں سے محبت کرنے والی مگر بدلے میں عمر بھر کی اذیتیں ملیں۔ نادیدہ ملک کمال جی..... آپ کی اسٹوری نمبر لے گئی۔ مطلب ایک روح کے ساتھ رہتی رہیں۔ یا اللہ! کہاں جائیں ہم۔ ڈر سے کیسے چھپیں ہم، مارے دے رہا ہے یہ خوف۔ شائستہ انور ”ہانڈی“ لیے تشریف لائیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ جن بہت زبردست قسم کے عاشق ہوتے ہیں۔ مطلب قبر میں ہی ساتھ اتر گئے۔ اللہ اکبر۔ علی حسین تابش کی تحریر کردہ کہانی سنبولے بھی توجہ کا مرکز رہی۔ مطلب لوگوں کے دلوں میں اس قدر حسد اور نفرت پائی جاتی ہے کہ وہ انسانی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔ حد سے حد..... بس جی مزید ہمت نہیں تھی کہانیاں پڑھنے کی۔ سو ہائیڈ پارک چلے ہم۔ دو تین لمبے سائس لینے کے بعد طبیعت میں کچھ بہتری آئی تو نظروں کے سامنے رنگ رنگ کی تحریریں موجود تھیں۔ ارے..... یہاں میں بھی..... ادوہ ٹھیکس ایڈیٹر صاحب! آپ بہت اچھے سے ہو۔ چند غم زدہ شعر پڑھے اور اپنی نرسرت زندگی میں مصروف ہو گئے ہم۔ لیس جی!! اب ملیں گے گرمیوں میں۔ اپنا ڈھیر سارا خیال رکھیے گا۔ دعائیں بہت ساری۔

☆: ارے عظمیٰ جی! آپ کے ہاں پورا سال سادوں رہا اور ہم کراچی والوں نے تو فروری میں بھی ٹو کے مزے لے لیے۔ ہمارے ہاں موسم گرما ہی مستقل ٹھہر گیا ہے۔ جانے سورج راجہ کو ہم سے اتنا پیار کیوں ہے۔ تبصرہ زبردست رہا! آپ کا۔

☞: بورڈی شریف، خیر پور ناٹھن شاہ سے ہماری پیاری لکھاری بہن تحسین جو نیچو عرض کرتی ہیں۔ اب کی بار اپنے محبوب پر سچے کاشدیت سے انتظار رہا کہ میری بھی تحریر اس کا حصہ بننے جا رہی تھی۔ اس عنایت پر بے حد ممنون ہوں۔ کاشی بھیا! یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی تو ہوتی ہیں جو جینے کا خوصلہ بڑھاتی ہیں۔ ادارہ ’الفاظ کھو گئے‘ ادب کی دنیا کا معتبر نام فاطمہ ثریا بجیا اب ہم میں نہیں بہت دکھ ہوا۔ اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائی۔ آمین۔ سید ملازم حسین صاحب کے احوال نامے نے محفل کی رونق میں اضافہ کیا۔ بہت خوب۔ حبیب الرحمن صاحب، عمارہ ناز جی محفل احوال کا حصہ بننے پر خوش آمدید۔ سدرہ انور علی میری شہزادی تمہاری دعا سے میں اب الحمد للہ بالکل ٹھیک ہوں۔ بس تم اپنا خیال رکھا کرو جانی۔ اللہ پاک تمہیں سلامت رکھے۔ اچھی صحت کے ساتھ۔ آمین۔ منعم اصغر، سدرہ انور علی، سونیا خان اور صائمہ مجید بھائی تبصرہ پسند کرنے پر بے حد مشکور ہوں۔ مور شاہد حسین بھائی اور اشفاق شاہین بھائی کہاں ہیں آپ؟ حاضری لگوائیے۔ کاشی بھیا

میں جس جگہ  
سچی کہانیاں

کے چرچے نہیں

آپ سہمی کہانیاں کے خریدارین کو ملک کو

نہ مبادلہ پیچھے

اندروں ملک = 890 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

155 امریکی ڈالرز	ایران	155 امریکی ڈالرز	کویت
155 امریکی ڈالرز	سری لنکا	155 امریکی ڈالرز	سعودی عرب
155 امریکی ڈالرز	جاپان	155 امریکی ڈالرز	یو اے ای
155 امریکی ڈالرز	لیبیا	155 امریکی ڈالرز	مصر
155 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	155 امریکی ڈالرز	یونان
155 امریکی ڈالرز	جرمنی	155 امریکی ڈالرز	فرانس
155 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	155 امریکی ڈالرز	برطانیہ
155 امریکی ڈالرز	پولینڈ	155 امریکی ڈالرز	ناروے
165 امریکی ڈالرز	کینیڈا	165 امریکی ڈالرز	امریکہ
165 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	165 امریکی ڈالرز	افریقہ

زودستی لایہ

آج ہی رابطہ کیجیے 88-C II - فرسٹ فلور - خیابان جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز - 7، کراچی

فون نمبر 35893122 - 021-35893121

READING  
Section



آپ کو 4 اپریل، یکم مئی سال گرہ بہت بہت مبارک ہو۔ کہانیوں میں سرخ لیموں، یوسف لغاری بھائی، وہ بڑھیا کون تھی، حجاب فاطمہ آپی، خند کی آگ، ممتاز احمد بھائی، بھوک، رضوانہ پرنس آنٹی، دوسری دنیا کا عشق، منعم اصغر بھائی، کیسا یہ راز ہے، ارسہ سحر چوہان، اور آدم خور ملک صفدر اعوان صاحب کی بہترین کہانیاں رہیں۔ اب اجازت خدا حافظ۔

☆: اچھی تحسین! خدا تمہیں خوش رکھے۔ لو قینچی کب ادھار رکھتی ہے۔ بس ہمیشہ اس طرح شامل احوال رہو۔

✉: کراچی سے ہماری بہت پیاری آنٹی نفیہ فضل لکھتی ہیں۔ آپ سب کی بے انتہا کاوشوں سے وقت سے پہلے بہترین ڈائجسٹ ہمیں مل جاتا ہے۔ جزاک اللہ۔ من موہنی ہی گڑیا منزہ کو عقیدت بھر اسلام۔ آپ نے اس پرچے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف ستر ہواں مسافر بھائی محمد سلیم اختر ایک بہترین لکھاری ہیں۔ زبردست کہانی ہے مگر یہ سمجھ نہ آیا کہ جب شیدا دیگن میں اکیلا تھا روحوں کے ساتھ تو یہ اسٹوری کیسے پتا چلی؟ دوسری کہانی مجھے معاف کر دو، حنا بشری تم نے تو دل دکھی کر دیا۔ نفیہ سعید روم نمبر 607، یہ شاید ہماری نئی ساتھی ہیں دلچسپ تحریر ہے، گم شدہ چہرہ شانی خانان، عرشی کون تھی، نادیدہ ملک، ہانڈی، شانستہ انور، سرخ لیموں، محمد یوسف لغاری، ہینو لیے، علی حسنین تابش زبردست تحریریں ہیں۔ آج کل یہی سب ہو رہا ہے۔ تمہارے ساتھ ساتھ نازیہ بتول رضایہ سب ممکن ہے دوسری دنیا کا آخری عشق منعم اصغر یہ سب ممکنات ہیں مجھے بھی ایسی بہت سی اسٹوریز معلوم ہیں۔ ایک پل میں سب کچھ نرہت نازیہ سچ ہے۔ مہانتا ناگ تحسین جو بنجوز زبردست کہانی لائی ہیں۔ آدم خور صفدر عباس اعوان کہانی پڑھنے سے متلی ہو رہی تھی۔ رک رک کر پوری کر ہی لی۔ ہماری ادھوری کہانی کشاف اقبال تم نے تو دل ہی دکھا دیا یہ حقیقت سے بھرپور کہانی رلا گئی مجھے۔ نجات ارمان فاطمہ الباس بیٹا دے یا نایا، سیماء عروج صدیقی، پھل چیری، بشیر احمد بھٹی، ہائیڈ پارک، شیر نیم کش، الفاظ کھو گئے منزہ نہام کی طرف سے فاطمہ ثریا بیجا کو بہترین خراج تحسین اور ایم اے راحت صاحب کی ہم شکل بہترین ناول جو کہ اختتام پذیر ہے دلچسپ ہے اور کاشی بیٹا زہر عشق بہت دلچسپ ہو گیا ہے۔ ارے ہاں سفر نامہ مجھے ہمیشہ پسند رہا ہے اور یہ بادبان زبردست ہے۔ مگر نعمان اسحاق جب مزہ آنے لگتا ہے کہانی میں تو قسط ختم ہو جاتی ہے۔ باقی سب کہانیاں بھی اچھی ہیں مجموعی طور پر اسرار نمبر بہت شاندار ہے۔

☆: اچھی آنٹی! تبصرہ زبردست رہا۔ حج کی رواداد انشاء اللہ اس بار خصوصی طور پر شائع کریں گے۔

لکھا: احوال میں یہ حاصر ہے ہماری آفت لی پڑیا۔ سدرہ انور بلوچ کی جھنک صدر سے۔ عرض کرتی ہیں۔ مارچ کا پر اسرار نمبر ملانا مثل ٹھیک لگا۔ ادارہ یہ منزہ سہام آنٹی کا الفاظ کھو گئے بوجھل

دل کے ساتھ پڑھا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ فاطمہ ثریا بیجا کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے  
 آئین۔ احوال میں آبی زرینہ جو نجو، ملکہ احوال تحسین جو نجو، سید ملازم حسین، صفدر عباس اعوان،  
 منزل خان، صفیہ سلطانہ مغل، مسز نوید ہاشمی، صائمہ مجید، مجید احمد جانی کے خطوط پسند آئے۔ اس کے  
 علاوہ باقی سب نے بھی اچھا لکھا۔ لائف بوائے میں اسماء اعوان نے بہت خوب لکھا۔ انکل محمد سلیم  
 اختر کی سترہواں مسافر حنا بشری کی مجھے معاف کر دو روم نمبر 607، گم شدہ چہرہ شانی خاں رضوانہ  
 پرنس کی تحریر بھوک نادیا ملک 'عرشی کون تھی؟' ہانڈی شائستہ انور محمد یوسف لغاری کی 'سرخ لیموں'  
 علی حسنین تابش کی سنبولے لئیے نازیہ بتول رضا کی ساتھ ساتھ منعم اصغر، دوسری دنیا کا آخری عشق، فرح  
 انیس، آٹھ کہانیاں اک کردار، نزہت ناز، اک پل میں سب کچھ، ملک صفدر عباس اعوان کی آدم  
 خور، ارسہ سحر چوہان یہ کیسا راز ہے؟ ارم خان کی سب کچھ تیرا ہے، سیدہ حجاب فاطمہ، وہ بڑھیا کون  
 تھی؟ الماس فاطمہ ارمان، نجات، سیماء عروج، پیٹا دے یا مایا، بشیر احمد بھٹی کی پچھلی چیری، انکل  
 جاوید راہی کی منی باجی، یہ تمام تحریریں بہت ہی دلچسپ و سبق آموز لگیں۔ ملکہ احوال تحسین جو نجو کی  
 مہمان ناگ، بہت خوب صورت تحریر لگی۔ ویلڈن ملکہ۔ زہر عشق قسط 13 بہت پسند آئی۔ ہائیڈ  
 پارک اور تیرنیم کش میں سبھی کے انتخابات پسند آئے۔ اب اجازت! سانسون کا سلسل اسی طرح  
 قائم رہا تو پھر ہوگی ملاقات تب تک اپنا بہت سارے والا خیال رکھیے گا۔ اللہ تعالیٰ۔

☆: پیاری گڑیا! تمہارے خط آتا ہے تو جانے کیوں اطمینان سا ہو جاتا ہے کہ ہم سے محبت  
 کرنے والے ہمارے بہت آس پاس ہیں۔ جیو گڑیا تبصرہ شاندار رہا۔

✉: چک نمبر 58 شانی، سرگودھا سے ہمارے پیارے بھائی، فیصل ندیم بھی عرض کرتے ہیں۔  
 مارچ 2016ء کا پراسرار نمبر، پیرے سامنے بے تاثر میں لڑکی کی نشانی آکھیں دیکھتے ہی ان میں گم  
 ہو گیا۔ مگر جب لڑکی کے ہاتھ کی طرف دیکھا تو آف ہم تو ڈر ہی گئے یہ بھوت بھی نہ بس۔ اگلے صفحے  
 پر جام شیریں پیتے ہوئے۔ ایریل سے کپڑے دھوئے۔ اور پھر منزہ سہام صاحبہ کے ادارے الفاظ  
 کھو گئے پڑھ کر جی بوجھل ہو گیا۔ احوال میں نئے آنے والے دوستوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ جن  
 میں قاسم بلوچ، عثمان بلوچ، عمارہ ناز ثوبہ ٹیک سنگھ سے احتشام احسان اور ساجدہ لطف اللہ، امید ہے  
 کہ ہر ماہ احوال میں آپ سے ملاقات ہوا کرے گی۔ غزالہ نزہت ناظم ویکلم بیک۔ ممتاز احمد، مسز  
 نوید ہاشمی، راشد لطیف، سونیا خان، باجی صائمہ مجید اور مجید احمد جانی کے تبصرے شاندار تھے۔ کنزہ  
 ملک ملتان سے احوال میں شامل ہونے پر خوش آمدید اور تبصرہ بہت شاندار تھا اور اب کچھ تبصرہ  
 کہانیوں پر ہو جائے۔ سترہواں مسافر، سلیم اختر کی پراسراریت سے بھرپور کہانی ہے۔ حنا بشری کی  
 مجھے معاف کر دو، کہانی عبرتناک ہے۔ رضوانہ پرنس کی 'بھوک حیران کن کہانی ہے۔ نادیا ملک  
 'عرشی کون تھی' عرش کا دو سال موت کے بعد واپس دنیا میں آنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایم اے راحت کا  
 'ہم شکل' بہترین سلسلے کی کڑی ہے۔ سیدہ حجاب فاطمہ وہ بڑھیا کون تھی؟ قابل تعریف ہے۔ ممتاز



احمد کی 'حسد کی آگ' بہترین کہانی ہے۔ کاشی بھیا۔ آج کل مصروفیت تو بے انتہا ہے کیوں کہ مارچ کے آخر میں یونیورسٹی کا امتحان ہے تو اس کی تیاری میں مصروف ہوں۔ امتحان کی تیاری کی وجہ سے صرف اتنا ہی شمارہ پڑھ سکا۔ اب اجازت۔

☆ پیارے سے فیصل بھیا! امتحان کی کامیابی کی پیشگی مبارکباد قبول کرو۔ ہم نے تمہیں دعا دی ہے۔ اللہ ضروری ہماری سنے گا۔ بس تھوڑی سی فراغت نکال کر پرچے پر ضرور تبصرہ لکھنا۔

☞ شاہد سلیم، حسن ابدال سے احوال کا حصہ بن رہے ہیں۔ طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ آپ کی محفل میں شریک ہونے کی سعادت کر رہا ہوں۔ میرا تلی کا آپریشن ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ سے رابطہ قائم نہ رکھ سکا۔ معذرت۔ ماہ مارچ 2016ء کا شمارہ اپنی تمام تر عنایتوں کے ساتھ موصول ہوا ہے جسے پڑھ کر بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ ماشاء اللہ سبھی احباب کی تحریریں بیسٹ تھیں۔ کہانیاں تمام دوستوں کی بہت پسند آئیں۔ سلسلے وار کہانیاں بھی بہترین جا رہی ہیں۔ اب انشاء اللہ ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ حاضری دوں گا۔

☆ پیارے شاہد! تمہاری بیماری بیماری کا سن کر دلی رنج ہوا۔ خدا تمہیں جلد شفا سے کامل عطا فرمائے۔ انشاء اللہ کہانیاں پڑھ کر جلد رائے دیں گے۔ ارے ہاں..... یہ تو بتاؤ تم ہمیشہ خط کے ساتھ NIC کی کاپی اور تصویر کیوں بھیجتے ہو۔ بھیا یہ ہمارا احوال سے کوئی تھانا تو نہیں.....

☞ یہ آمد ہے شمسہ قمر کی کراچی سے۔ عرض گزار ہیں۔ دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد محفل میں حاضر ہوں۔ یہ دوری مجھے کھل تو رہی تھی۔ لیکن کچھ مصروفیت ایسی تھی کہ کلم اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ چلیں دیر آید درست آید۔ پہلے تو سرورق کے بارے میں کہنا چاہوں گی کہ پراسرار نمبر کی مناسبت سے Beauty And Beast والی بات ہے۔ حسینہ بہت زبردست لگ رہی ہے۔ مزہ بہام صاحبہ بجا طور پر بجیا کی وفات پر ملول ہیں وہ ایک عہد تھیں جو تمام ہوا۔ لائف بوائے کی کہانی اچھی تھی ویسے سچی کہانیاں ایک گلدستے کی مانند ہے جس میں ہر لکھاری تقریباً اچھا لگتا ہے اور پھولوں کی طرح ان کی تحریریں بھی مہکتی ہیں۔ حنا بشری کی معاف کر دو اچھی تحریر تھیں۔ کاشی صاحب کے احوال کی باتیں تو حسب معمول اچھی ہوتی ہیں اور اچھی لگتی ہیں۔ بہت اپنائیت اور خلوص کے ساتھ سب کو جواب دیتے ہیں اور مانو ان سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ محمد سلیم اختر صاحب کی ستر ہواں مسافر بھی منفرد لگی۔ شائستہ انور کی ہانڈی، منی باجی، بادبان، حسد کی آگ، پچھل پیری، سب ہی اچھی لگیں۔ محمود شام صاحب کا تو ایک نام ہے ان کی تعریف میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ کاشی صاحب کی زہر عشق کا کیا کہنا اس کے علاوہ ایم اے راحت صاحب کا ناول بھی بہت عمدہ ہے۔ ہائیڈ پارک، تیرنیم کش سب ہی بہترین تھیں۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ غرض دوون میں ڈائجسٹ ختم کر لیا۔ اچھا اب سب سے اجازت چاہتی ہوں۔ دوبارہ موقع ملا تو حاضر خدمت ہو جاؤں گی۔ اللہ نگہبان۔

## ایک بہت خاص آپ بیتی

لاہور کی جیل میں سزائے موت کی سزا کاٹنے والے اُس قیدی کی زندگی کے شب روز جو اسے ایک معصوم انسان سے مجرم بننے پر مجبور کر گئے۔ اُس قیدی کی داستانِ عبرت جس میں آپ بھی ہیں۔ سنسکیاں بھی ہیں محبت اور نفرت کے رنگ بھی۔ بہت جلد رانا حبیب الرحمن کے قلم سے ایک آتش فشاںی سچی کہانیاں کے صفحات پر ملاحظہ کیجیے۔

☆ شمسہ جی! آپ کا تبصرہ شاندار رہا۔ موقع ملنے کی بات ہے تو ہم ہر ماہ آپ کی آمد کے منتظر رہیں گے تو پھر اگلے ماہ تبصرہ آ رہا ہے ناں آپ کا؟

☐ یہ احوال میں پہلی بار آمد ہے عرفان حسین آصف کی ملتان سے لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی میں کافی عرصہ سے ماہ نامہ سچی کہانیاں کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ماہ نامہ سچی کہانیاں میں تمام راسخ بھائی اور بہنیں بہت محنت سے لکھتے ہیں۔ اللہ پاک ان کو اور سخن دے۔ آمین۔ شماره ہمارے ہاتھ میں ہے اور اس کی اسٹوریاں بھی بہت اچھی ہیں۔ جن میں ہمیں یہ دوستی ہے تا سوز ڈراپ سین، قسمت کے کھیل، روایات کی دلدل، کوئی خوشیاں لا دے میرا سا جن، آستین کے سانپ اور میرے اے اسٹوریز بہت پسند آئیں۔ ویسے تو تمام نئے پرانے راسخ حضرات بہت محنت سے لکھتے ہیں۔ مگر جو جادو کاشی بھائی اور ایم اے راحت کے ہاتھ میں سے شاید ہی کسی کے ہاتھ میں ہو۔ ہمارے پورے کالج میں یہ دونوں ناول، زہر عشق اور ہم شکل بہت مقبول ہیں۔ کچھ ایسے طلبہ طالبات بھی ہیں جو صرف ان دونوں ناولوں کے لیے ڈائجسٹ خریدتے ہیں۔ سچی کہانیاں اور آپ کے ہم شکل اور زہر عشق کے کچھ دیوانوں کا نام لکھ رہا ہوں۔ ابرار حسین، ازم ناز، شائستہ، وقاص خان اور مائرہ ہیں۔ کاشی بھائی میں پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ اس میں کچھ غلطیاں بھی ہوں گی تو پلیز اسے نظر انداز نہ کرنا میں ان غلطیوں پر آئندہ قابو پانے کی کوشش کروں گا۔ اور امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے اور میری حوصلہ افزائی کریں گے۔

☆ پیارے آصف! خوش آمدید۔ تو تمہارا تبصرہ ہوا شائع۔ اب کہانی کے بارے میں پڑھ کر ہی کچھ رائے دے سکتے ہیں۔ فی الحال تھوڑا سا انتظار۔ تمہارے کالج فرینڈز کے لیٹرز کہاں ہیں؟؟ اگلے ماہ ان سب کے تبصرے ہمارے پاس ہوں۔

☐ یہ احوال میں حاضری دے رہے ہیں ملک علی رضا۔ شار کالونی، فیصل آباد سے۔ لکھتے ہیں۔ ماہنامہ سچی کہانیاں مارچ کا شماره ملا۔ میرے لیے خوشی کا باعث ہے کہ مجھے بہت سے دوستوں نے یاد کیا۔ سچی کہانیاں کی کہانیاں، غزلیں، خطوط پر لطف اور بے مثال تھے۔ فوزیہ احسان رانا، رانا حبیب الرحمن لاہور، مجید احمد جانی، کاشی چوہان صاحب آپ نے بڑی محبت سے تمام



دوستوں کو اکٹھا کیا ہے۔ دوستوں کو ایک جگہ ملایا ہے۔ سچی کہانیاں رسالہ اب تو میرا محبوب میگزین بن گیا ہے۔ جب تک میری زندگی ہے میں ضرور پڑھتا رہوں گا۔ ارے..... جو احباب مجھے ہر وقت یاد رکھتے ہیں خاص کر آفتاب رسول، عظمت اٹلی، فرحان یوسف چاکینہ، افضل آزاد اور بہت ہی اچھے دوست حکیم جاوید نسیم اور خالد فاروق سداخوش اور آباور ہیں۔

☆: پیارے ثلی رضا! تم بھی ہر ماہ ہم کو یاد رکھا کرو۔ اور احوال میں حاضری یقینی بناؤ۔ تبصرے کا شکریہ۔

☆: فیصل آباد سے محمد شعیب لکھتے ہیں۔ اس خط کے ہمراہ میں کہانیاں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے یہ تحریریں سچی کہانیاں میں اپنی جگہ ضرور بنائیں گے۔

☆: پیارے بھائی! خوش آمدید! ارے یہ کیا؟؟ اپنی بات کی اور بس..... کچھ پرچے کے بارے میں بھی تبصرہ کرتے تو۔ اچھا لگتا۔ اب یہ جلد بازی نہیں چلے گی۔

☆: کراچی سے فرح انیس تحریر کرتی ہیں۔ احوال میں سب ہی احوالیوں کے احوال اچھے لگے۔ تمام احوالیوں کو میری جانب سے سلام اور سب کی خیریت مطلوب ہے۔ نزابت اقبال اللہ

آپ کو کامیابی دے بھائی۔ آمین۔ میرا B-A کا رزلٹ آ گیا۔ فرسٹ ڈویژن آئی ہے۔ اب ماسٹرز کی تیاری ہے آپ سب سے التجا ہے میری کامیابی کی دعا کیجئے گا۔ ٹائٹل پر لڑکی اچھی لگی پر ساتھ چھوٹی سی عجیب و غریب مخلوق دیکھ کر ڈر لگا۔ منزہ سہام کا الفاظ کھو گئے پڑھ کر یہی لبوں سے نکلا۔

اللہ بجا کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ حنا بشری کی تحریر اچھی لگی۔ برائی کا انجام برائی ہوتا ہے۔ نضیرہ سعید کی تحریر بہت پیارا پیغام لے کر آئی۔ اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ شانی

خامان کی تحریر میں ماہم کے عجیب و غریب شوق نے اسے اتنے بڑے نقصان سے دوچار کر ڈالا۔ رضوانہ پرنس کی تحریر میں نیلہ کی بے بسی اور موت اور آخر میں رمشا، علیہ کے انجام پر خوف آیا۔

علی حسنین تابش کی تحریر بھی اچھی لگی۔ حسد کی آگ بہت بڑی ہوتی ہے۔ انسان کو جلا کر خاکستر کر ڈالتی ہے۔ نازیہ بتول کی تحریر میں رضا صاحب کو داوینے کو دل چاہا ان کی ہمت پر۔ نسیم اصغر،

نادیہ ملک، تحسین جونجو، الماس فاطمہ کی تحریریں اچھی لگیں۔ ممتاز احمد کی تحریر زبردست لگی۔ کشاف اقبال کی تحریر پسند آئی۔ زہر عشق ماشاء اللہ زبردست جارہی ہے ہر قسط کا بے صبری سے انتظار ہوتا ہے۔

کچھ تحریریں ابھی پڑھی نہیں۔ کاشی بھیا آپ کا بہت شکریہ آپ نے میری تحریر لگائی۔ آپ جیسے بھائی ہم بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ انشاء اللہ۔

☆: اچھی فرح! تبصرہ زبردست رہا۔ اپنا بہت خیال رکھنا اور ہاں احوال میں اسی طرح حاضری یقینی ہونی چاہیے۔

☆: محمد قاسم خان بلوچ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ چک نمبر 184 گ ب سے احوال میں شامل ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ پہلے کی طرح اس بار بھی آپ نے ایک نہایت عمدہ پرچہ اچھے ٹائٹل کی

سینئر صحافی شاعر اور ملکوں ملکوں گھومے تجزیہ کار

محمود شام کی زیادت

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

کراچی

# اطراف

جولائی 2014ء سے باقاعدگی سے شائع ہونے والا

بین الاقوامی معیار کا پہلا قومی میگزین

☆ ہمارا عزم یونیورسٹیوں، دینی مدارس، تحقیقی اداروں، تربیت گاہوں سے پھوٹنے والی روشنی عوام تک پہنچانا  
☆ دنیا بھر میں پاکستان اور عالم اسلام پر شائع ہونے والی تازہ ترین کتابوں کی تلخیص  
☆ پاکستان کے سیاستدانوں، تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں کے بارے میں عالمی تحقیقاتی اداروں کی  
بے لاگ رپورٹیں، آسان اردو میں  
☆ ملک میں سرگرم ایک لاکھ سے زیادہ این جی اوڑ کی سرگرمیوں سے سجا عوام نامہ

☆ مصوری ☆ سفارت کاری ☆ کتابیں ☆ کہاب و مہر ☆ نثر و تجربہ ☆ شاعری  
☆ پاکستان کے اشعار ☆ سوچنی ☆ اور ہمارے بچے ☆ نثر و مباحث ☆ اردو ادب سے انتخاب  
☆ لائبریریوں، یونیورسٹیوں، دینی مدارس کو خصوصی رعایت  
☆ نیوز ایجنٹس کو معقول کمیشن

جو کچھ آپ کے اطراف میں ہے..... ماہ نامہ اطراف میں ہے

Ph: 0092 21 32274661  
Mob: 0300-8210636

پوسٹ نمبر 508 لینڈ مارک بلازا، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی  
Email: mahmoodshaam@gmail.com Web Site: www.alraafmagazine.com

نہیں منتہی  
کے لیے تلاش

READING  
Section



اپریل 2016ء

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

کوین  
برائے  
احوال

نام: .....

مکمل پتا: .....



اپریل 2016ء

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا رہتیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شامل اشاعت کر لیں۔

کوین  
برائے  
اشاعت  
کہانی

عنوان کہانی: .....

تعداد صفحات: .....

نام: .....

مکمل پتا: .....

فون ریل نمبر: .....



اپریل 2016ء

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا کرتی ہوں۔ میری رائے میں

کوین  
برائے  
پسندیدہ  
کہانی

اول، عنوان: .....

مصنف: .....

دوم، عنوان: .....

مصنف: .....

سوم، عنوان: .....

مصنف: .....

نام: .....

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



صورت میں پیش کیا۔ سب سے پہلے تو میں احوال کی بھیڑ میں پہنچا جہاں بڑی رونقیں سچی ہوتی ہیں۔ ہر ماہ کے شمارے میں کئی چہرے نئے نظر آئے۔ دلچسپ باتوں کے ساتھ نئے لوگوں کو احوال میں دیکھ کر اب یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ماہنامہ سچی کہانیاں دن دو گنی رات چو گنی ترقی کر رہا ہے۔ احوال میں نئے ساتھیوں کو محبت بھرا سلام۔ عمارہ ناز پہلی بار کمالیہ سے تشریف لے آئیں۔ ویلکم عمارہ جی۔ تمہیں جو نیچو آپ نے میری کہانی پسند کی شکر یہ۔ بہن جی آپ کا۔ سرگودھا کے اچھے لکھاری ممتاز احمد جی آپ نے اچھے لفظوں میں میری ٹوٹی پھوٹی تحریر کو پسند کیا۔ میں کیسے آپ کا شکر یہ ادا کرو۔ اللہ آپ کو ڈھیروں خوشیاں دے۔ آمین۔ آپ سب کا تہہ دل شکر یہ۔ تبصرے تمام لوگوں کے بہت پسند آئے تحریروں کی طرف آئیں تو اس بار پراسرار پرچہ بہت شاندار تھا کہانیوں کے حوالے سے۔ سب سے پہلے تو محمد سلیم اختر کی کہانی ستر ہواں مسافر پڑھی۔ بہت خوب سلیم اختر۔ محمد اسامہ کی چھوٹی سی تحریر حلوہ کھاؤں گی۔ بہت پسند آئی ارم خان کی سب کچھ تیرا ہے۔ زبردست تحریر رہی۔ جاوید رانی کی۔ منی بانجی۔ سیدہ حجاب فاطمہ کی کہانی۔ حسد کی آگ۔ ممتاز احمد کی تحریر ہر لحاظ سے اچھی رہی۔ ممتاز احمد بہت اچھا لکھتے ہیں۔ باقی تحریریں ابھی زیر غور ہیں۔ آئندہ شمارے میں ان پر بھی بات ہوگی۔ ہائیڈ پارک میں انمول موتی، خوب صورت باتیں، قدرت کے رنگ غزلیں، اقوال زریں، حوا کی بیٹی یہ سب پسند آئیں۔ تیرنیم کش میں شعبان کھوسہ اور ارباز حسین کے شعر اچھے لگے۔ اب باتیں بہت ہو گئیں۔ انشاء اللہ آئندہ شمارے میں ڈھیروں باتوں کے ساتھ پھر حاضری دوں گا۔ آخر میں پیارے کاشی اور دوسرے سب سچی کہانیاں کے ساتھیوں کو خلوص بھرا سلام اور دعا کہ اللہ پاک ہم سب کو اپنی رحمت رکھے۔ آمین۔

☆: اچھے قاسم! تبصرہ بہتر لگا اور سب سے اچھا تمہارا عجز ہمیں ابیر کرتا ہے۔ خوش رہو۔

☞: کرن ناز تحصیل سمندری ضلع فیصل آباد سے پہلی بار احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔

پہلی بار احوال میں شامل ہو رہی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ مجھے بھی دوسرے نئے لوگوں کی طرح احوال میں شامل کیا جائے گا۔ سچی کہانیاں دو سال سے پڑھ رہی ہوں اور اس رسالے سے میں بہت محبت کرتی ہوں کیونکہ اس میں جو تحریریں شائع ہوتی ہیں وہ بہت اچھی اور جاندار تحریریں ہوتی ہیں۔ پڑھتے ہوئے بہت مزہ آتا ہے۔ اس بار مارچ کا پراسرار نمبر چار تاریخ کو ای جان کے ہاتھوں سے موصول ہوا۔ کیونکہ ای جان ہی ہر ماہ سچی کہانیاں بازار سے لا کر دیتی ہیں۔ ای جان کے لیے دل سے شکریں۔ پراسرار کہانیاں پڑھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ ہر کہانی میں پراسرار سی باتیں پڑھتے ہوئے اک عجیب سی کیفیت دل پہ طاری رہتی کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس بار کچھ کہانیاں تھیں پھر زیادہ ہی پسند آئیں۔ سر ہواں مسافر، آئندہ پیرہ، دوسری دنیا کا شق، کیسا یہ راز ہے، سب کچھ تیرا ہے، آدم خور، تمہارے ساتھ ساتھ، بھوک، سپولے، حلوہ کھاؤں گی اور حسد کی آگ یہ

سب کہانیاں نمبر ون تھیں۔ اس شمارے کی باقی کہانیاں ابھی پڑھ رہی ہوں۔ کیونکہ نام بہت کم ہوتا ہے میرے پاس پھر بھی سچی کہانیاں شوق اور ذوق سے پڑھتی ہوں۔ ایسے خوبصورت ڈائجسٹ سے دور رہنا اب میرے لیے بہت مشکل سا ہو گیا ہے۔ کاشی بھیا آپ سے گزارش ہے کہ میرے خط کو ضرور شائع کیا جائے تاکہ میں اگلی بار بھی ایک اچھے تبصرے کے ساتھ حاضر ہو سکوں۔ ہائیڈ پارک میں رمشا عارف کا لطیفہ اور حنا لطیف کا بے بسی، مرسلہ پڑھ کر خوب ہنسی آئی۔ غزلوں میں ڈاکٹر دانش علی غزل، محمد قاسم خان بلوچ کی غزل بہت پسند آئیں۔

☆: کرن! خوش آمدید! بیٹا تبصرہ تو آپ کا شامل احوال ہوا اب آپ نے ہر ماہ ہمیں احوال میں موجود ملتا ہے۔

✉: یہ تبصرہ ہمیں موصول ہوا ہے ایم افضل آزاد سا بیواں کا۔ لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں اس بار 5 تاریخ کو لاہور سے ملا۔ اس بار ٹائٹل تو بہت خطرناک لگا حسب عادت پہلے منزہ سہام کا الفاظ کھو گئے۔ پڑھا جہاں پر ان کے الفاظ فاطمہ ثریا کو ڈھونڈ رہے تھے۔ احوال میں کچھ نئے کچھ پرانے ساتھی موجود تھے۔ پراسرار اسٹوریوں میں کاشی چوہان کی اسٹوری بہت خطرناک ہو گئی ہے۔ منی باجی، جاوید راہی، نجات، الماس فاطمہ ارمان، اک پل میں سب کچھ، نزہت ناز، آدم خور، ملک صفدر عباس، سب کچھ تیرا ہے، ارم خان، عرشی کون بھی، نادیا ملک، ہم شکل، ایم اے راحت، حسد کی آگ، ممتاز احمد، بھارت میں بلیک لسٹ، معاف کرو، حنا بشری، سنیو لیے، علی حسنین تابش، ہانڈی، شائستہ انور، وہ بڑھیا کون بھی، سیدہ حجاب فاطمہ کی اسٹوریوں بہت پسند آئیں۔ ہائیڈ پارک میں عظمیٰ شکور، اسامہ بلال اعوان، محمد جواد، عامر بشیر، شائستہ اختر، روپینہ ناز رونی، حنا لطیف نے بہت اچھا لکھا۔ تیرنیم کش میں نعیم اکبر، جیلہ کنول، عامر جاوید، ایم سعید انور، شعبان کھوسہ، شازیہ رضوی، اشعر عتیق، فرح عالم، ایم اوکیل عامر کے شعر بہت اعلیٰ تھے۔ اب اجازت۔

☆: پیارے افضل! نام تمہارا آزاد ہے اور کسی دوسرے کو کیوں ہتھکڑی پہنا کر احوال میں ساتھ جوڑ رہے ہو۔ امید ہے کچھ گئے ہو گے۔ خوش رہو۔ تبصرہ بہتر تھا۔ اپنے دوست سے کہنا دو لفظ الگ صفحے پر لکھ دیا کرے۔

✉: بہاول نگر سے محمد ابو ہریرہ بلوچ عرض کرتے ہیں۔ مارچ کا پراسرار نمبر 5 مارچ کو ملا۔ ٹائٹل دل کش تھا۔ احوال کی محفل میں نئے آنے والے قارئین کو ویلکم۔ عمارہ ناز، احتشام احسان، خضر حیات، محمد ندیم عباس میواتی، عثمان بلوچ، منزل خان، شاہد رفیق، راشد لطیف، ملازم حسین، ممتاز احمد دیگر دوستوں نے زبردست تبصرے لکھے۔ ویلڈن یوں ہی احوال کی محفل کو سجانے رکھنا۔ کہانیوں کی طرف سے معاف کرو حنا بشری، ہانڈی، منی باجی، سرخ میمون دوسری دنیا کا سن منعم اصغر، "عرشی کون بھی" سنیو لیے، علی حسنین تابش۔ زہر عشق سبھی اچھی تھیں سب کا زور قلم اور زیادہ



ہو۔ باقی مختصر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔

☆: اچھے ہریرہ! کہانی پڑھ کر ہی رائے دے سکیں گے۔ فی الفور کچھ کہنا عیس ہے۔ خدا تمہیں تمہارے امتحانات میں کامیاب کرے۔

✉: ایم وارث بیگ ضلع ٹوبہ چک نمبر 190 گ ب وال سے پہلی بار شامل احوال ہو رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ پیارے پیارے بھیا کاشی چوہان جی نیک دعاؤں کے ساتھ پہلی بار آپ کی خدمت اور آپ کی میٹھی اور نرمالی بزم سچی کہانیاں میں شرکت کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ مجھے ضرور اس بزم میں خوش آمدید کہیں گے۔ کاشی بھائی مارچ کا پراسرار نمبر بہت کامیاب تھا۔ احوال میں لوگوں کی چٹ پٹی باتیں اور لوگوں میں پیار و محبت دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ میں سچی کہانیاں اب باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں پہلے پہل تو میں سچی کہانیاں اپنے پیارے دوست اور بھائی محمد قاسم خان بلوچ سے لے کر پڑھتا تھا۔ میں ایک اسٹوڈنٹ ہوں اور یہ سچی کہانیاں رسالہ قاسم بھائی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے مجھے سے منگواتے ہیں۔ کیونکہ میں روز ٹوبہ میں اپنے کالج جاتا ہوں اور اب میں ایک پرچہ اپنے لیے بھی اضافی لیتا ہوں۔ اب یہ رسالہ میرے دل میں سما گیا ہے۔ امید ہے اس رسالے سے میری محبت ہمیشہ قائم رہے گی۔ کہانیوں میں جناب محمد سلیم اختر صاحب کی ستر ہواں مسافر بہت پسند آئی۔ اس کے بعد ایک اچھے لکھاری ممتاز احمد جی کی کہانی حسد کی آگ بھی دل کو بھاگنی۔ جاوید راہی کی کہانی منی باہی بھی دلچسپ تحریر تھی۔ کشاف اقبال اور ارم خان کی کہانیاں اچھی لگیں۔ باقی تمام تحریریں وقت ملنے پر ضرور پڑھوں گا۔ ہائیڈ پارک تو ہمیشہ ہی زبردست ہوتا ہے۔ خاص طور پر چٹ پٹے لطیفے اور اچھی باتیں۔ شازبیہ رضوی کا شعر بہت بہت اچھا تھا۔ سچ میں انسان کو ماں کی میٹھی گود میں سکون آجاتا ہے۔ اب میں پیارے کاشی آپ سے اجازت لوں گا نیک دعاؤں کے ساتھ۔ اگلی بار پھر شامل احوال ضرور ہوں گا آپ کے جوصلے دینے پہ۔

☆: پیارے وارث! خوش آمدید! تمہارا اتنا بھرپور تبصرہ سچ میں مزہ دے گیا۔ خوش رہو۔ اب تمہارے اگلے ماہ کے تبصرے کا تو ہمیں ابھی سے انتظار ہونے لگا ہے۔

✉: سیدہ حجاب فاطمہ، کراچی سے لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ آپ نے مجھے دوبارہ سچی کہانیاں میں جگہ دی اور کاشی بھائی میری کہانی کو سچی کہانیاں میں شامل کیا۔ کاشی بھیا آج میں جو بھی ہوں اپنی ماں کی دعاؤں اور سچی کہانیاں کی مرہون منت ہوں۔ اب ذرا بات ہو جائے اس دلربا کی جس نے ہمارے من آنکن میں محبتوں کے جھولے ڈال رکھے ہیں۔ یکم مارچ بڑی بے چینی سے ہا کر کا انتظار کر رہے تھے۔ جو آواز سنی تو دوڑے مگر یہ کیا وہ تو یہ کہہ کر اپنی راہ ہو لیے کہ شمارہ ابھی نہیں آیا۔ منہ لٹکائے ساس کے پاس آئے تو انھوں نے عندیہ دیا کہ تمہاری کوئی کتاب آئی ہے۔ امید تو امید ہوتی ہے تا اسی کے سہارے قیاس کیا شاید جو کہانی سچی تھی

وہ لگ گئی ہو اور جب بیڈ پر پڑی اعزازی کا پی پر نگاہ پڑی تو دل بلیوں اچھل کود کرنے لگا۔ شماره صفحہ اول سے صفحہ آخر تک آپ کی محنت اور لگن کی دلیل ہے۔ منزہ جی کے ساتھ ساتھ ہمارے بھی الفاظ کہیں کھو گئے ہیں کہ بچیا ایک خزانہ تھیں۔ اسماء اعوان کی لائف بوائے بہت اچھی جا رہی ہے ہر ماہ ایک اچھوتا خیال لایا کرتی ہیں۔ ستر ہواں مسافر، معاف کر دو، نومبر 607، گم شدہ چہرہ، بھوک، عرشی کون تھی، ہانڈی بہترین تحریریں رہیں۔ ایک تصویر ایک کہانی اچھا سلسلہ ہے وانیال نے اس بار بھی چھوٹے خیال سے بڑا کردار بنا ڈالا۔ علی حسنین تابش کی سنبولے اور محمد یوسف لغاری بھائی کی سرخ لیموں بھی بیٹھ رہیں۔ باقی پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے مگر یہی کہوں گی کہ جب پڑھوں گی تو آگے بھی مزیدار ہی ہوگا۔ اب اجازت کہ ویسے ہی میں لیٹ ہو چکی ہوں اور ایسا نہ ہو کہ احوال میں حاضری سے رہ ہی جاؤں۔

☆: اچھی بہن! بس آپ غیر حاضر ہوتے ہوتے رہ گئی ہیں۔ امید ہے آئندہ اس طرح کا مزید تبصرہ آپ ہمارے لیے ہر ماہ بہت جلد اور وقت پر عنایت فرمایا کریں گی۔

✉: قندیلہ ظنم خان بھی تحصیل ماموں کا نجن چک نمبر 509 گ ب سے پہلی بار احوال میں شرکت کر رہی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ اس بار میں اپنے خوب صورت شہر ماموں کا نجن تحصیل کی مارکیٹ میں کچھ کتابیں خریدنے گئی تو بک اسٹال میں میری نظر سچی کہانیاں پر پڑی تو خیال آیا کہ آج اپنے ساتھ یہ رسالہ بھی لے جانی ہوں۔ ویسے تو میں ایک اور رسالے کی بھی فین ہوں لیکن جب میں نے اس رسالے کو پڑھا تو یقین کریں دل کو یہ ڈائجسٹ بھا گیا۔ میں اس کی اپنی طرف سے جتنی بھی تھریفیں کروں کم ہیں۔ بہر حال جو دل کو اچھا لگ رہا ہے اس خوب صورت ڈائجسٹ کے لیے وہ لکھ رہی ہوں۔ اس رسالے کو پڑھنے کے بعد میں نے سوچا کہ میں بھی اس میں خط لکھوں اور اس بزم کی رکن بنوں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے پورا رسالہ تین دن میں پڑھ لیا۔ خوف ناک اور پر اسرار کہانیاں پڑھتے ہوئے بہت مزا آیا۔ ہر رائٹر نے اپنی کہانی لکھنے پر بہت محنت کی۔ الفاظ کھو گئے منزہ سہانج کا لکھا ہوا پسند آیا۔ کہانیاں تو سب کی اچھی تھیں مگر ستر ہواں مسافر، سب کچھ تیرا ہے وہ بڑھیا کون تھی، اک بل میں سب کچھ، روم نمبر 607، حسد کی آگ یہ کہانیاں کچھ زیادہ اچھی لگیں۔ شاعری بھی بہت جاندار تھی۔ تبصروں میں سب کے خطوط اچھے لگے۔ اگلی بار سچی کہانیاں میں امید ہے اپنا تبصرہ بھی پڑھنے کو ملے گا اگر کاشی بھانے میرا یہ خط شامل کر لیا تو۔ اس بار تو میں مختصر سا خط لکھ رہی ہوں لیکن اگلے ماہ تفصیل سے تبصرہ لکھوں گی۔ تاکہ ہم بھی اپنے دل کی باتیں لوگوں تک پہنچا سکیں۔ اور میں اپنی تمام دوستوں کو یہی کہوں گی کہ سچی کہانیاں پڑھو یہ ایک اچھا ڈائجسٹ ہے۔

☆: پیاری سی قندیلہ! خوش آمدید! تمہارا جتنا پیارا نام، اتنا ہی پیارا تبصرہ بھی تھا۔ احوال میں تمہاری آمد کا شدت سے انتظار ہے گا۔



☞ پھولوں کی نگری ہتوکی سے محمد ندیم عباس میواتی اپنے تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ لکھتے ہیں۔ یوں تو ہمارا شہر ہتوکی نرسریوں، پھولوں کی نسبت پورے ملک میں شہرت رکھتا ہے۔ لیکن موسم بہار میں تو جنت کا ٹکڑا ہی لگتا ہے۔ آج میں احوال گلشن کے آنگن میں بسنے والے قارئین کی خدمت میں انھی پھولوں کو لے کر حاضر ہوں سب سے پہلے محترم ایڈیٹر بھائی کاشی چوہان تازہ گلابوں کا گلہ دستہ قبول کریں۔ نئے مہمانوں کو دل کش مسکراہٹ سے خوش آمدید۔ پھر پیاری سسٹر منزل خان، نازیہ بتول، بڑی آبا، مسز نوید ہاشمی، ام عادل، کنزہ ملک، آپنی صائمہ مجید اینڈ بابا مجید احمد، ملازم حسین، شاہد رفیق، ابو ہریرہ بلوچ، عثمان بلوچ، منعم اصغر، یاسر، ندیم ڈھکو، راشد لطیف، خضر حیات، خادم حسین، علی حسین تابش، سب نے بہت بھرپور تبصرے لکھے۔ میری طرف سے سلام اینڈ گلابوں کے گلہ دستے قبول فرمائیں۔ ڈیئر سسٹر سدرہ انور علی آپ کو بھی گلہ دستہ، تبصرہ شاندار۔ آپ اسٹوری بھی لکھا کریں۔ ڈیئر سسٹر سیدہ حجاب فاطمہ وہ بڑھیا خوشبو کی دیوانی تھی۔ لو گلابوں کی خوشبو والا گلہ دستہ اب ذرا بچ کر رہنا۔ (ہا ہا ہا)۔ معاف کرو، حنا بشری، بھوک، عرش کون تھی، ہانڈی، سرخ لیموں، سپولے، علی حسین تابش، تمہارے ساتھ ساتھ نازیہ بتول، دوسری دنیا کا عشق، منعم اصغر، آٹھ کہانیاں، فرح انیس، ہماری اذھوری کہانی، سنی باجی، محترم جاوید راہی، حسد کی آگ، ممتاز احمد، زہر عشق، محترم بھائی کاشی چوہان اور ڈیئر ارم خان سب کچھ تیرا ہے بہت اچھی تھیں۔ سب کے لیے گلابوں کے گلہ دستے حاضر خدمت۔ ایکسٹرا جو لینا چاہے وہ ہتوکی آجائے۔ ڈیئر نیم کش اور ہائیڈ پارک مسلسل زبردست رہا۔ یوں پورا شمارہ بیسٹ تھا۔ ویلڈن کاشی بھائی۔ زندگی نے وفا کی اور ایگزیم سے فرصت ملی تو اگلے ماہ حاضری ہوگی۔ تب تک فی امان اللہ۔

☆: ندیم شہزادے! ہمیشہ گلاب کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ پھول لیتے ہوئے اب ہمیں بھی محتاط رہنا ہوگا۔ تبصرہ زبردست رہا۔

☞ مجید احمد جانی! سلطان شریف سے عرض کرتے ہیں۔

ماشاء اللہ! ماشل دیدہ زیب ہے۔ اوار یہ ”الفاظ کھو گئے“ رلا دینے والا تھا۔۔۔ محی الدین نواب، فاطمہ ثریا بجیا اور کاشف زبیر کا یوں اچانک چلے جانا غم زدہ کر گیا۔۔۔ ماہ فروری بڑا بھاری گزرا ہے۔ ادب کی نامور شخصیات داغ مفارقت دے گئیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جو رحمت میں جگہ عنایت فرمائے آمین۔ احوال میں قدم جھے تو کاشی بھیا ہم سے مخاطب تھے۔ عرض کروں گا کہ اپنی کہانی ”وہ مرا طیب خاص“ کا ذکر پہلے کر چکا ہوں اور اب دس ماہ گزر گئے لیکن یہ معاملہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں حیران ہوں کہ میرے خصوصی دوست کیا چاہتے ہیں۔۔۔ یہ کہانی میری ذات پر ہی ہے اور اب بس ہی زندگی ہی رہا ہوں۔۔۔ میں بیس کروڑ عوام تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا تھا، اپنا پیغام دینا چاہتا تھا جو مایوس ہو جاتے ہیں ان کو کہنا چاہتا تھا کہ مایوسی گناہ ہے۔۔۔ مایوسی کرنے کی بجائے اللہ کی ذات پر کامل یقین رکھیں اور اگر ہم میں سے کوئی بھی کسی بھی بیماری میں مبتلا ہے تو اس

کا علاج سنت بنوی سمجھ کر کرائے۔ اس لئے یہ غلطی سرزد ہوئی۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ میرا کوئی مقصد نہیں تھا۔۔۔۔۔ سستی شہرت۔ نہ دل آزاری۔۔۔۔۔ احوال میں تمام کے تبصرے جامع اور جاندار تھے۔۔۔۔۔ سب سے سپر ہٹ خط پیارے ممتاز احمد سرگودھا کا لگا۔۔۔۔۔ کاشی بھائی آپ کی لقمہ اس دفعہ پھر غائب ہے۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔؟ کہانیوں میں سب سے پہلے ممتاز احمد حسد کی آگ پڑھی۔ واقعی حسد کی آگ انسان کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ سرخ لیموں شان دار تحریر تھی۔ مہانتانگ بہت خوب کہانی تھی وہ بڑھیا کون تھی؟ مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ زہر عشق پر اسراریت کا جادو چڑھا رہی ہے۔ اس کے علاوہ باقی تحریریں زیر مطالعہ ہیں۔ تبصرے سے معذرت پر اسرار نمبر ون نمبر ون ہی رہا۔ خوش رہیں اور خوشیاں بائیں۔

☆: پیاری مجید! تم نے وضاحت دی اچھا لگا۔ مگر..... زندہ رہیں وہ لوگ جو مرنے نہیں دیتے۔

☒: تانیہ راجپوت لاہور سے پہلی بار ہم سے مخاطب ہیں۔ پیارے کاشی بھیا کیسے ہیں۔۔۔۔۔؟ اوہ

سووی سب کو سلام کرنا تو بھول گئی۔ تو لیجئے سب کو سلام کرتے ہیں۔ سب لوگ کیسے ہیں؟ میں تو ایک دم فٹ فاقٹ۔ سردرق بہت بہت بہت اچھا اور خوفناک تھا۔ ڈیڑ سدرہ! کیسی ہو؟ آپ کا لیٹر زبردست ہوتا ہے۔ باقی سب بھی اچھا لکھتے ہیں۔ سوچا آج خاموشی کا در پھلانگ کر محفل کی گپ شب میں حصہ لیا جائے۔ ٹھیک ہے تاکاشی بھیا؟ کہانیاں ایک دم فٹ تھیں۔ ”آپی حجاب“ کی اور ”آپی تحسین جو تجو“ کی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ علی حسنین تائبس، سلیم انکل، کی بھی اچھی تھیں۔ میرے خیال سے میری آمد سب کو پسند آئی ہوگی۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ کاشو بھیا آپ کا ناول؟ واہ واہ واہ دل چاہتا ہے آپ کے ہاتھ چوم لوں۔ سلمان ابراہیم کا کردار مجھے بہت پسند آیا۔ اد کے اب کاشو بھیا جانے دیں۔ اللہ حافظ۔

☆: ارے گڑیا! تم نے تو مجھے نانانانی کی یاد دلادی! وہ مجھے کاشو ہی کہا کرتے تھے۔ اوہ تمہیں

خوش آمدید کہنا تو ہم بھی بھول گئے۔ دیکھو احوال۔

☒: یہ آمد ہے جبکہ آباد سے آپی پر دفسر صفیہ سلطانہ مغل کی۔ لکھتی ہیں۔ حسب معمول پرچہ

وقت پہل گیا تھا دلچسپ اتنا تھا، کہ جی چاہ رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ مزے لے کر پڑھوں۔ بعد ازاں خیال آیا کہ خط بھی لکھتا ہے۔ آج جب پڑھ لیا تو تم نے فون پہ کہا آپی، آپ بہت لیٹ ہو گئی ہیں۔ سو میں اس برقی سہولت کے توسط سے خط لکھ رہی ہوں بچیا کے انتقال کا بہت دکھ ہوا۔ یہ صدیوں کا صدمہ ہے۔ اللہ انیس غریق رحمت کرے۔ آمین کاشو۔ (یہ تمہارا نیا نام ہے) تم نے شاعری کا صفحہ پھر غائب کر دیا۔ کیوں معصوم شاعروں کی دعائیں لیتے ہو۔ کہانیاں سب بہت بہت ہی اچھی تھیں۔ کسی ایک کی تعریف کی اور ایک کی بھی نہ کی تو یقین کرو کہ نا انصافی ہوگی۔ زہر عشق کی کیا بات کریں تمہارے م میں حر ہے۔۔۔۔۔ سن اسل لطف جب آئے گا جب یہ کہانی نسل میں ہمیں ملے گی ہوتا کہ ایک ہی نشست میں زوق کی تسکین ہو۔ میری کئی غزلیں تمہارے پاس ہیں، آگے سمجھ جاؤ۔ اد کے بیٹا اب اجازت دو۔ مشنی کیپوزنگ پہ اتنی مہارت نہیں ہے کہ ایک بہت طویل خط لکھ سکوں۔ اس لیے



شعر و شاعری سے گریز بھی کیا ہے اور ڈاکٹر نے پرہیز بھی بتایا ہے۔ سو خدا حافظ۔

☆: پیاری آپی! آپ بھلے سے دو لفظ لکھ دیں لیکن شامل احوال ضرور ہوا کریں۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

☞ شیخوپورہ سے احتشام شامی لکھتے ہیں۔ مارچ کا شمارہ لاہور سے خریدا۔ سردرق حسب معمول خوبصورت تھا پر سرانمبر کے لحاظ سے۔ کہانیوں کی فہرست پر نظر ڈالی اور احوال میں پہنچے جہاں احتشام اور منعم ساتھ ساتھ بیٹھے نظر آئے۔ ہاں جی ہم دوست ہی استے اچھے ہیں۔ پر سرانمبر کی سات خاص کہانیوں میں نمبر ایک پر رضوانہ پرنس کی ”بھوک“ رہی، نیلما کی موت پر افسوس ہوا دوسرے نمبر پر ”گم شدہ چہرہ“ رہی۔ شانی خانان نے خوبصورتی سے کہانی بنی۔ ایسے بہت سے اچھی باتیں کرنے والے افراد ہمیں آس پاس نظر آجاتے ہیں اور ان کی بھکی بھکی باتیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ نقیبہ سعید کی روم نمبر 607 تیسرے نمبر پر آئی۔ ہمارے قرآن پاک کے کلام میں وہ خاصیت ہے جو شیطانی بلاؤں کو بھگا سکے۔ عرش کون تھی۔۔۔؟ کاشی بھائی آپ کو معلوم ہے۔۔۔؟ سنیو لے، علی حسنین تابلش نے بھی خوب لکھی۔ ”ہماری ادھوری کہانی“ کشاف اقبال نام کی طرح کہانی بھی ادھوری ادھوری لگی۔ وہ بڑھیا کون تھی، پینا دے یا مایا، جلوہ کنالوں کی بھی بہترین تھیں۔ ”بادبان“ نعمان اسحاق بہت ذبردست لکھ رہے ہو۔ ”حسد کی آگ“ ایک بہترین سبق آموز تحریر تھی۔ ممتاز احمد صاحب نے بہت بہتر لکھا۔ خیر اور شر کی جنگ میں جیت ہمیشہ خیر کی ہوتی ہے۔ اللہ نسرین جیسی کم عقل عورتوں کو ہدایت نصیب فرمائے۔

☆: بھائی احتشام! تبصرے کا شکریہ۔ کہانی پڑھنی ہے بہتر ہے۔ مگر ہمیں تو مزید بہتر چاہیے۔

☞ غلام مرتضیٰ قلی۔ فاروق کالونی چشتیاں سے پہلی بار مختصر نائے کے ساتھ موجود ہیں۔ تمام مدیران، اسٹاف اور قارئین کو سلام۔ شمارہ ”سچی کہانیاں“ ایک مکمل فیملی ڈائجسٹ ہے۔ اس کو اسی وجہ سے بے حد پذیرائی حاصل ہے۔ اسکول لائف سے آج ٹیچنگ لائف میں بھی ”سچی کہانیاں“ کا قاری ہوں۔ پر سرانمبر کے لیے بے حد منتظر رہتا ہوں۔ ماہ مارچ کا پر سرانمبر بہت پسند آیا۔ اللہ اس ڈائجسٹ کو اور تمام

## طویل کہانی نمبر 2

پیارے ساتھیو! طویل کہانی نمبر کا اعلان ہوتے ہی آپ کی بے شمار کہانیاں ہمیں موصول ہوئیں۔ ایک پرچے میں تمام منتخب کہانیاں سونا ممکن نہ تھا۔ اس لیے اگلے ماہ یعنی ماہ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 ہوگا۔ امید ہے طویل کہانی نمبر آپ کی توقعات پر پورا اترے گا۔ اور اگلے ماہ کے پرچے کا آپ کو بے چینی سے انتظار ہوگا۔

نوٹ فرمائیں۔ ماہ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 ہوگا۔

ایجنٹ اور ہا کر حضرات نوٹ فرمائیں۔ سچی کہانیاں ماہ مئی کا شمارہ طویل کہانی نمبر 2 ہوگا۔

اسٹاف کو ہمیشہ خوشیوں سے نوازے۔ (آمین)

☆: ارے بھائی قبلی! خوش آمدید۔ اتنا پرانا تعلق اور لکھیں تو صرف دو سطر ہیں۔ امید ہے اگلے ماہ تمہارا تفصیلی تبصرہ ہمارے پاس ہوگا۔

☞: چشتیاں سے ہمارے ساتھی علی حسین تابش برقی نامے کے ساتھ شامل احوال ہے۔ لکھتے ہیں۔ پراسرار نمبر مارچ کی 4 تاریخ کو ملا۔ سرورق پسند آیا۔ ادارہ تو آنکھیں نم کر دینے والا تھا۔ احوال زبردست رہا۔ اپنی کہانی شائع ہونے پر دلی خوشی ہوئی۔ سلیم اختر صاحب، سید حجاب فاطمہ، یوسف لغاری، ممتاز احمد صاحب کے ساتھ ساتھ محترمہ تحسین جونجو اور باقی سب رائٹرز کی کہانیاں پسند آئیں۔ کاشی بھائی آپ کا ناول زبردست جا رہا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ اب اجازت۔

☆: پیارے تابش! تبصرے کا شکریہ۔ بھیجی اب تم سے ہمیں کوئی یادگاری کہانی چاہیے۔ امید ہے میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔ خوب محنت کرو۔

لیجیے ساتھیو! اس ماہ تک کی ہماری آپ کی ملاقات پہنچی اپنے اختتام تک۔ پہلا طویل کہانی نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ پڑھیے اور اپنی رائے سے نوازے کہ ہماری سخن کارزی آپ کی امیدوں پر کس حد تک پوری اتری۔ کہ ہم نے تو کر دیا ہے بنداک کوزے کو دریا میں پھر سے..... اجازت سے پہلے ایک تازہ ترین نظم آپ کی بصارتوں کی نذر۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اگلے ماہ انشاء اللہ انہی صفحات پر ملاقات ہوگی۔

شہر، جنگل..... اور.....

چاند جنگل سے جب گزرتا ہے  
کیا شفاف سے وہ دکھتا ہے  
آتے آتے شہر کی طرف  
میلا سے کیوں وہ دکھتا ہے  
شہر میں میرے سمندر بھی ہے  
اس سمندر میں کتنی ڈوبی ہیں  
میری حسرت کی سپیاں یارو!  
جن سے پوچھل ہے سمندر بھی مرا  
چاند میرے! تو اب اداس نہ ہو  
سننے ہیں امن ہو گیا ہے یہاں  
سر نہیں کٹ رہے ہیں اب پھر سے  
لوگ بس آتیش سے نکلے ہیں  
آپ کا اپنا  
تو بھی شفاف ہو جا چاند مر۔  
اس شہر کو سمجھ کے جنگل اب کاشی چوہان



# بیوی گائیڈ

”دوسرا اور طرز زندگی“

دنیا میں زیادہ تر یعنی 70 فیصد لوگ صحت مند ہوتے ہی نہیں ہیں۔ زیادہ تر لوگ اپنی صحت کا خیال رکھتے ہی نہیں انہیں پروا ہی نہیں ہوتی کہ وہ کیا اور کتنا کھا رہے ہیں۔ کتنی ورزش کر رہے ہیں اور کبھی رہے ہیں یا نہیں۔

صحت صرف یہ ہی نہیں ہے کہ آپ بیمار نہیں ہوتے تو آپ صحت مند انسان ہیں اگر آپ!

مہرین اسماعیل

☆۔۔۔۔۔ اجتالی ٹیبلٹ

☆۔۔۔۔۔ جیسائی ٹیبلٹ

☆..... بیوی بطور پرفیکٹ ہیں تو آپ صحت مند انسان ہیں ہر انسان کی خواہش ہوتی

ہے کہ وہ اسمارٹ اور دلکش و نظر آئے صحت مند و تندرست رہے صحت مند ہونے کے لیے ہمیں خود اپنے آپ کو بدلنا ہوگا خود سے عہد کرنا ہوگا کہ مجھے صحت مند

ہونا ہے۔ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی بدلنی ہوگی کیونکہ ہماری طرز زندگی ہماری

صحت پر اثر انداز ہوتی ہے جب تک ہم خود نہیں سوچیں گے جب تک کچھ

نہیں ہو سکتا چاہے ہم کتنی ہی ورزش کیوں نہ کر لیں۔ صحت مند و

تندرست رہنے کے لیے اور خوبصورت و دلکش نظر آنے کے لیے

ضروری ہے کہ ہم اپنے جسم کے ہارمونز کو ٹھیک کریں ہمارے

جسم میں چھوٹے چھوٹے ہارمونز ہوتے ہیں جو اثر انداز

ہوتے ہیں ہماری صحت پر۔ اگر ہمیں صحت مند ہونا ہے

تو ہمیں اپنے جسم کے ہارمونز کو ٹھیک کرنا ہوگا

ہمارے جسم کے ہارمونز پر اثر انداز ہوتا ہے

ہمارے آس پاس کا ماحول جیسے ا☆.....

لائٹ☆..... نیند☆..... بیوی

دباؤ☆..... غذا

☆..... ورزش

Fair & Lovely

30 سال

سے قابل

اعتماد و نام

Fair & Lovely

SKIN HEALTH ALLIANCE



SAFE TO USE

READING Section

Fair & Lovely

30 سال

سے قابل  
اعتماد نام

Fair & Lovely



ہماری صحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان باتوں کا خاص خیال رکھیں ہارمونز کو اچھا کرنے کے لیے ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں غیر ضروری عادتوں کو ختم کرنا ہوگا اگر کوئی انسان دبلا پتلا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ صحت مند ہے ورزش صرف دبلا پتلا ہونے کے لیے نہیں ہوتی بلکہ صحت مند ہونے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اپنی روزمرہ زندگی میں ہلکی پھلکی ورزش کریں۔ ہماری زندگی میں اگر ہم ورزش کو شامل کریں تو اس سے ہم چست و توانا رہیں گے اور کئی بیماریوں سے محفوظ رہیں گے اپنی زندگی کے روزمرہ کام کرنے میں کافی آسانی پیدا ہو جائے گی ہم جو بھی کھائیں گے۔ ہلکا محسوس کریں گے ہمیں اپنا آپ اچھا لگے گا رات کی نیند کا ہونا بہت ضروری ہے موٹاپے کا نیند سے گہرا تعلق ہوتا ہے اس لیے رات کی نیند لیں۔

اکثر خواتین و حضرات اپنی روزمرہ زندگی کے کام کاج میں اسٹریس مصروف ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ذہنی دباؤ کا شکار ہونے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ کئی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے اپنے ذہنی دباؤ کو اپنے اختیار میں لائیں اپنے رہن سہن کو بدلیں اپنی زندگی میں ورزش کا معمول بنانے سے ہم مختلف قسم کی بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں کیونکہ غذا کی کمی یا زیادتی یا اس میں تبدیلی آپ کی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں اگر آپ چست و توانا ہیں اور اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمیں کیا چیز اور کتنی مقدار میں کھانی ہیں آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم جو چیز کھائے اس کے حصے بنالیں۔ موٹاپا ایک بیماری ہے جو ہماری زندگی ہماری صحت کے لیے اچھی نہیں ہے اس لیے یہ بات ضروری ہے کہ آپ ایک ایسی طرز زندگی متعارف کروائیں۔ جس میں آپ ہر وقت اپنے آپ کو چست و توانا محسوس کریں اچھی طرز زندگی آپ کو صحت مند اور خوبصورت بنانے میں مدد دیتی ہے۔

جس کی وجہ سے آپ اپنی عمر سے کئی گناہ کم دکھائی دیتے ہیں اور ایک باوقار شخصیت بن جاتے ہیں۔

READING Section



# لالکے بوائے ..... چمتا کرو کھائے

نساء اعوان

حقیقت سے جڑی وہ کہانیاں، جو اپنے اندر بہت

سارے دکھ سمجھ اور کامیابی کے راز چھپا رکھتی ہیں

.....

ہر چیز کا سہ ہوتا ہے۔ خوشی اور غمی کا بھی سو یہ میرے لیے خوشی کا سہ تھا۔ مجھے سز مہتا ایک ایٹک ہی لگ رہی تھیں، ایسا شاہکار جس کے لیے لوگ ٹیلن ڈالرز کی بولی لگا دس۔ دیکھیے ذہنی روکس طرف بھٹک گئی۔ ان کا ٹمکین چہرہ میری آنکھوں میں جیسے جم سا گیا تھا۔ شاید وہ بھی میری دلچسپی بھانپ گئی تھیں۔ وہ خود ہی میری طرف آگئیں۔ اور میری طرف دوستانہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔

”ہیلو! آئی ایم سز مہتا، پاروتی مہتا! آپ شاید مجھ میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔“  
 ”گڈ ایوننگ! آئی ایم روینہ امان! میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہی تھی۔“  
 ”واٹ ڈیو یو مین؟“ انہوں نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے اپنی طرف اشارہ کیا۔  
 ”مجھ میں مجھ ہی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ویری ٹائس۔ کانی دلچسپ ہیں آپ۔“

زندگی میں بہت ساری چیزیں انسان خود خود شامل کر لیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ ہوتا ہے۔ مجھے ہر ایٹک چیز اپنی جانب اٹریکٹ کرتی ہے۔ کیا کروں؟ سمجھ ہی نہیں آتا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ خوبصورتی خود بھی سب سے بڑا میکینٹ ہوتا ہے۔ بہت دور نہ جائیں، ابھی لاسٹ ویک اینڈ کی ہی تو بات ہے۔ سز صدیقی کے ہاں پارٹی میں کچھ سہمان سرحد پار سے بھی آئے ہوئے تھے۔

میرے لیے صرف سز مہتا ہی کی ذات قابل رشک تھی۔ مجھے ان میں ایک عجیب سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے سیاہ گھنے بال اور ان کی کمر پر ناگن کی طرح تل کھاتے محسوس ہوتے تھے اور وہ آہنی رنگ کی ساڑھی پر کیا بچ رہے تھے۔ سز صدیقی کی پارٹی میں آنے سے پہلے میں جس قدر دل خراب کیے ہوئے تھی، سز مہتا کو دیکھ کر میں نہال ہو گئی۔

”مجھے ہر.....“ یکدم میں کہتے کہتے رک گئی کہ مجھے ہر ایسے چیز پسند ہے۔ مبادا وہ برا ہی نہ مان جائیں۔

عورت عمر کے آخری حصے میں بھی خود کو بوڑھا اور ادھیڑ عمر کہنے کی اجازت کبھی کسی کو نہیں دے سکتی۔ عورت کی عمر ہمیشہ 16 سے شروع ہوتی ہے اور 25 پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے۔ ظاہر ہے میں خود عورت ہوں لہذا میں کس طرح اس تجزیے کے منافی بات کر سکتی ہوں۔

”میں سمجھی نہیں۔“ وہ تھوڑا سنجیدہ ہوئیں۔

”آپ کھل کر بات کریں۔“

”مجھے ہر حسین چہرہ اپنی جانب کشش کرتا محسوس ہوتا ہے۔ آپ میں ایک بہت خاص انٹرکشن ہی فنل ہوئی تھی مجھے..... اور مجھے یہ امید نہیں یقین ہے کہ آپ میں کچھ تو اسپیشل ہے۔“

آخر میں نے دل کی بات لبوں سے آزاد کر دی اور اب میں مسز مہتا کا رد عمل دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ میری بات کا کہیں برا تو نہیں مان گئی ہیں۔

”سنا تھا پاکستانی بہت گہری نگاہ رکھتے ہیں مگر آج یہ یقین بھی ہو گیا۔“ وہ مسکراتی چلی گئیں۔

”اس کا مطلب ہے جو بات میں نے محسوس کی وہ سچ ہے۔“ میں نے فوراً کہا تھا۔

”جی بالکل! اور ہاں میں چاروں اور یہاں کراچی میں موجود ہیں۔ مجھے امید ہے ہم پھر سے ایک بار ضرور ایک دوسرے سے ملیں گے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک کارڈ میری جانب بڑھایا۔

کارڈ کی بیک پر ایک فون نمبر جو یقیناً ان کے موجودہ استعمال میں تھا، درج تھا۔ میں نے ان کو گلے لگا لیا اور پھر ہم دونوں ہی اُس تقریب کا حصہ بن گئیں۔

میں نے گھر آتے ہی مسز مہتا کو فون کیا اس طرح ان کے پاس میرا رابطہ نمبر بھی منتقل ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

’کراچی سے بہت اہم ترین امور کے سلسلے میں کس بندے کو بھیجا جاسکتا ہے۔ جو ان ڈاکومنٹس کو فائل کر کے لے آئے۔‘

روبینہ بہت پریشان تھیں۔ اماں مرزا کی سہیلی نے بہت اہم ڈیل کی تھی اور وہ اس وقت چونکہ خود لندن میں تھے۔ ڈیل پر اطرزیقے سے سائن کرانے کی ذمہ داری روبینہ پر آن پڑی تھی۔ مگر وہ کچھ دنوں سے نیگیٹو کاشکار تھیں۔

اب کیا کیا جائے۔ وہ پریشان ہو گئیں۔ ان کے ذہن میں اچانک ہی صبح کی کال آگئی۔ ان کا چھوٹا بیٹا آج ہی ایگزامز سے فارغ ہو کر اپنی اسپورٹس پریکٹس کے لیے چند روزہ دن کے لیے لاہور جا رہا تھا۔

تھا تو لاہابی ہی لیکن دو بیٹوں کے بیرون ملک شفٹ ہو جانے کے باعث بڑا ذمہ دار ثابت ہو گیا تھا۔

اب یہ ذمہ داری اگر وہ ٹھیک سے نبھالیتا تو اُسے رائٹ چوائس کا ٹیک دیا جاسکتا تھا۔ روبینہ نے فوراً ہی اُسے کال ملائی اور پھر شام تک وہ لاہور جانے کے لیے راضی ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

”مما میں آپ کو ہاسپٹل لے چلتا ہوں۔“ بازل نے محبت سے کہا۔

”نومائی سوٹو! آئی ایم فائن ڈارلنگ!“

”ڈیئر اچ پوچھو تو اگر میری طبیعت خراب نہ ہوتی تو میں کبھی اپنے سوٹو کو یہ بودر (تکلیف) بند دیتی۔“

”مما کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ..... یہ تو



میں گم تھی کہ موبائل پر پیپ ہونے لگی۔  
 ”ہیلو! کیسی ہیں آپ مسز امان!“ فون پر  
 مسز مہتا تھیں۔

”بس کچھ میگزین کی شکایت ہے۔“  
 ”اوہ! اب تو مجھے آپ کے پاس آنا ہی  
 پڑے گا۔ آئی وڈ لائیک ٹومیٹ وڈ لویا!“

”آپ کس جگہ پر قیام پذیر ہیں مسز مہتا؟“  
 میرے اس سوال پر انہوں نے مجھے اپنی  
 ریڈیٹس کے بارے میں مطلع کیا۔

”میں ابھی ڈرائیور بھیج دیتی ہوں۔ یقین  
 کریں اگر کچھ بہتر فیمل کرتی تو خود لینے آتی  
 مگر.....“

”انس او کے! انس ناٹ آ میٹرز۔“ یہ کہہ کر  
 فون بند ہوا اور میں نے فوراً ہی ڈرائیور کو ایڈریس  
 سمجھا کر مسز مہتا کی طرف روانہ کر دیا۔

☆.....☆.....☆

”سونائس آف یو مسز امان! واٹ  
 آپیلین!“

مسز مہتا مسلسل ہمارے آشیانے کو سراہ رہی  
 تھیں۔ میرے لیے اب یہ باتیں قطعاً معنی نہیں  
 رکھتی تھیں۔ گھر ایک خواب ہوتا ہے اور اگر خدا  
 آپ کے خواب کو خوابوں جیسا ہی گھر دے تو پھر  
 جنت کا نظارہ اس دنیا ہی میں ہو جاتا ہے۔

”اب بتائیں کہ آپ کو میگزین کی شکایت  
 کب سے ہے؟“ مسز مہتا ڈاکٹر بن گئیں۔  
 ”پہلے بتائیں کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔“

”ہوم ڈاکٹر کہہ سکتے ہیں۔“  
 ”اد کے..... بس مجھے دوسرے بیٹے کی  
 پیدائش کے بعد سے یعنی بیس برس سے پراہلم  
 ہے۔“

”اسٹریس کیوں لیتی ہیں ہر بات کا۔“

اپنا کام ہے۔ انس آپارٹ آف بزنس..... میں  
 بھلا کس طرح اس بات کو بودر (تکلیف) سمجھ سکتا  
 ہوں۔“

”لو یو مائی سن! میرا بیٹا تو سچ سچ بہت ذمہ دار  
 ثابت ہو گیا ہے۔“

”مما آپ کی ہمیشہ ایک بات مجھے یاد رہتی  
 ہے کہ تم تینوں اپنے فادر کار اسٹ ہنڈ ہو۔ کبھی میں  
 یہ نہ دیکھوں کہ تم تینوں میں کوئی کلینش ہو اور  
 تمہارے فادر ڈسٹرب ہوں۔“

مما ہمیشہ سے میں نے دونوں بڑے بھائیوں  
 کو پاپا کے بزنس میں ہاتھ بٹاتے دیکھا ہے۔ اب  
 اگر یہ ٹھوڑا سا کام میرے ذمہ آپ نے لگا دیا ہے  
 تو کیا میں اس سے منہ موڑ لوں۔ نیور ممما۔ آئی لو  
 مائی پیئرس۔ آئی لو یو۔“

میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ یہ تربیت کا اثر  
 ہوتا ہے جو ہمیں انعام کی صورت ملتا ہے۔

”مما آپ ایزی فیمل کر رہی ہیں نا۔“  
 بازل نے اپنے بازو میرے گرد حائل  
 کر دیے۔

”اد کے جانو! اب تو لگتا ہے سب ٹھنک  
 ہے۔“

مجھے پھر سے میگزین محسوس ہو رہا تھا مگر میں  
 بازل کو اس وقت ڈسٹرب کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

”مما آپ ہمیشہ مجھے اپنے دیے گئے حکم پر  
 اد بیڈنٹ پائیں گی۔ لیکن ایک وعدہ کریں کہ آپ  
 ڈاکٹر کے پاس لازمی جائیں گی۔“

”اد کے جانو! میں چلی جاؤں گی۔ ڈونٹ  
 دری۔“

بیٹے کی محبت سے سرشار میں اپنی طبیعت میں  
 بہت بہتری پارہی تھی۔ اولاد کا سکھ تو آپ ہی ایک  
 فرحت بخش احساس ہوتا ہے۔ میں اسی سرشاری

انہوں نے جیسے میرے اندر جھانکا تھا۔  
 ”میں..... میں تو کسی بات کا اسٹریس نہیں  
 لیتی ہوں۔“ میں گڑبڑائی۔

”ایک بات ہم دونوں ملکوں کے عوام میں  
 بہت عام ہے۔ ہماری عورتیں برداشت کے  
 سمندر اپنے اندر رکھتی ہیں۔ ہرز یادتی اور ظلم سہہ  
 کر بھی..... سب کچھ OK ہے کانفرہ لگاتی ہیں۔“  
 ”ارے ارے مسز مہتا ایسی کوئی بات نہیں۔“

میں کچھ دیر بعد مسز مہتا کے آگے الہمز کے  
 ڈھیر لگا کر ہاتھ لینے چل پڑی تھی۔

ہم اپورٹڈ چیزیں استعمال کرنے والوں کا  
 الہیہ یہ ہے کہ ہمیں دیگر تمام چیزوں کے رنگ  
 خوشبو ذائقے استعمال سب بھول جاتے ہیں۔ بس  
 ہمارا ایمان مہنگی سے مہنگی چیز پر ہی ہوتا ہے۔ ہمیں  
 جتنی مہنگی چیز ملتی ہے ہم اس کی کوالٹی کو ہی نمبروں  
 سمجھ کر مطمئن ہوتے ہیں۔

آپ خیال نہ کریں۔ آئی ایم فائن۔“  
 ”گڈ!“ وہ استہزائیہ مسکرائی تھیں۔

میں نے جب بال شیپو کیے تو ذہن میں یہی  
 تھا کہ یہ بہت مہنگا شیپو ہے۔ اور پھر جب میں  
 شاور لے کر آئی تو کچھ دیر کے لیے بال ڈرائی  
 کر کے ایزی چیئر پر بیٹھ گئی۔ میری آنکھ لگ گئی۔  
 کچھ دیر بعد جب اچانک میں ہڑبڑا کر اٹھی تو.....  
 یہ تو چمنکار ہو گیا تھا۔ میں بہت پراسکون تھی۔

”آپ بالوں کے لیے کیا استعمال کرتی  
 ہیں۔ مطلب بالوں کو بھی غذا کی ضرورت ہوتی  
 ہے اور بال جاندار ترین شے ہیں۔ یہ تو آپ  
 جانتی ہیں۔“

میں نے غائب تھا۔

”اوہ! مسز مہتا!“ میں اچانک انہیں یاد کرتی  
 کمرے میں آئی۔ وہ وہیں موجود میری یادوں  
 سے محفوظ ہو رہی تھیں۔

”جی بالکل! کچھ خاص نہیں۔ بس شروع سے  
 ہی اپورٹڈ آئل شیپو اور کنڈیشنرز یوز کرتی رہی  
 ہوں۔ اس عمر میں آکر کیا قلابے ملاؤں۔“

”ہیلو! چارمنگ لیڈی..... آر یو فائن ناؤ!“  
 وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

میں مسکرائی، اچانک سے آنکھیں بوجھل  
 ہونے لگی تھیں۔ وہ میری کیفیت بھانپ گئیں۔

”میں بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں خود  
 کو۔“

”آئی تھنک یو فیل میگرین ناؤ!“  
 ”بس کچھ..... میں نے ہاتھ پر انگلیوں  
 سے مساج کرتے ہوئے کہا۔

”میں چاہتی ہوں آپ اسی طرح ہلکا پھلکا  
 اور ایزی فیل کریں ہمیشہ۔“

”آئی ہیو آسولوشن!“ انہوں نے اپنے بیگ  
 سے ایک بوتل نکالی۔ اُس بوتل سے کور ہٹا ہوا تھا  
 یعنی بالکل واٹ بوتل تھی۔

”انشاء اللہ! خدا نے چاہا تو!“  
 ”آپ کا خدا تو چاہتا ہے مگر آپ لوگ نہیں  
 چاہتے۔“

”یہ کیا ہے؟“ میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔  
 ”یہ آپ کے لیے ایک علاج ہے۔ آپ  
 جائیں اور نیم گرم پانی سے شاور لیں۔ سر کو اس  
 شیپو سے دھو کر آئیں۔ تب تک میں آپ کے  
 فیملی الہم دیکھتی ہوں۔ یقیناً جس طرح تصویروں  
 سے آپ کے کمرے کی Walls بھی ہیں تو آپ

”کیا مطلب؟“



”مطلب یہ ہے کہ خدا نے عقل تو سب کو دی ہے نا۔ تو پھر اُس عقل کا فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے ہم۔“

”پلیز کھل کر بتائیں۔“ میں جزبہ ہوئی۔

”ہمارے پاس دماغی مسئلے کا سب سے آسان حل موجود ہے۔ دیکھیں سزا مان۔ میں بہت پریکٹیکل و دمن ہوں۔“

میں آج سے دس سال پہلے بہت سارے ہیڈز پراہلز اور ہاس میجرین کا شکار تھی۔ سچ پوچھیں تو کوئی ویڈیو ڈاکٹر نہ چھوڑا تھا۔

مگر نتیجہ ٹھن (زیرد) اور پھر اچانک سے میں نے ایک دن ایک چٹکاری شیپو کا ایجوگ کیا۔ (استعمال کیا) وہ شیپو استعمال کر کے ہفتے دو ہفتے میں سچ سچ چٹکار ہو گیا۔

اور پھر..... آپ نے مجھ میں ایک بہت خاص کشش محسوس کی تھی اور اب یہ چٹکار آپ بھی دیکھیں گی۔“

”پلیز سز مہتا! کیوں مجھے اس چٹکاری شیپو کے نام سے اب تک بے خبر رکھے ہوئے ہیں۔“

اب بتا بھی دیں۔“ یہ کہہ کر میں ان کے مزید نزدیک ہو گئی۔ ”ویٹ آ منٹ۔“

سز مہتا نے اپنے بیگ سے شیپو سے ہٹایا گیار پیر نظروں کے آگے کر دیا۔ ریپر دیکھ کر مارے حیرت کے میری آنکھیں اُبلنے کو تیار تھیں۔

”یہ!! اوہ مائی گاڈ! سز مہتا! لائف بوائے شیپو!“ مارے حیرت کے میں گولگ تھی۔

”جی ہاں..... یہ نہ ہے وہ چٹکار..... لائف بوائے شیپو! اور پھر ہم لوگ ہیں نا عقل کے کچے جو کبھی اپنی ذہم ترین پراڈکٹس پر بھی توجہ نہیں

دیتے۔ لائف بوائے شیپو میں ملک پروٹین شامل ہے۔ بادام کے تیل کی خاصیت لیے اس میں اہم عرقیات ہمارے بالوں کو ہی نہیں بلکہ ہمارے دماغ کو بھی شانتی دیتے ہیں اور کئی بیماریاں ہمارے پاس نہیں آتی ہیں۔“

اب بھلا بتائیں۔ لائف بوائے شیپو بنانے والوں کو پتا ہے کہ ہم اس منفرد اور سستے شیپو سے کتنی مہنگی بیماریوں سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ اگر پتا چل جائے انہیں تو یہ شیپو ڈالرز میں فروخت ہو۔“ سز مہتا اپنی بات کر کے خاموش ہو گئی تو مجھے لگا مجھے کچھ بولنا چاہیے۔

”لائف بوائے شیپو کو تو میں زمانے سے دیکھ رہی ہوں سز مہتا۔ یقیناً آپ بھی دیکھ رہی ہوں گی۔“

اس کی قیمت تو شروع سے بہت کم ہے لائف بوائے شیپو یقیناً لوگوں کے لیے ایک تحفہ ہے جو ہمیں معلوم ہی نہیں ہے۔ لائف بوائے شیپو کی قیمت اتنی ہی ہے جتنی کہ ایک عام پاکستانی افورڈ کر لے۔ کیوں! کیا میں نے غلط کہا۔“

”بالکل ٹھیک! تو پھر آج سے میں اور آپ بھی ہو گئیں لائف بوائے شیپو کی اسیر۔“

”بالکل..... کیوں نہیں۔ ہم دونوں بھی آج سے اسی چٹکاری ہیں شاہکار۔“ سز مہتا جا چکی تھیں۔ اور میں آج کی رات سکون سے سوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

بازل کا فون آیا تو میں اٹھی تھی۔ ”مما! کیسی ہیں آپ؟“ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سوٹو تم بتاؤ بیٹا آرام سے پہنچ گئے تھے نا۔“ ”یس ممما! بس آپ کی طرف سے فکر تھی۔“

READING  
Section

”ارے جانوائیک اٹ ایڑی۔ میری فکر تو  
سز مہتانے چٹکیوں میں ختم کر دی تھی۔“ اور پھر  
میں نے بازل کو جب ساری کل والی بات بتائی تو  
وہ بھی حیران ہو گیا۔

مگر اس میں حیرانی کی بات نہ تھی بلکہ ہماری  
کم نہیں ہمیں بعض اوقات صحیح فیصلوں سے دور  
کرویتی ہے۔ ہمیشہ اپنی ذات کے لیے اپنی ہی  
ویسی چیز کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جیسے ہمارا لائف  
بوائے شیمپو ہمارے بالوں کے مسائل کا سچ سچ  
خاتمہ کرتا ہے مگر..... ہم کتنے کم فہم ہیں نا۔

☆.....☆.....☆

آج اس واقعے کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔  
میں ایک پرسکون زندگی گزار رہی ہوں۔ لائف  
بوائے شیمپو نے میری لائف میں بالوں کی اہمیت  
واضح کر دی ہے اور آج میں بھی اپنے بالوں پر جتنا  
فخر کروں کم ہے لیکن یہ سب ممکن تو صرف لائف  
بوائے شیمپو ہی سے ہوا نا۔ سز مہتا کی طرف سے  
ایک میل آئی ہوئی ہے۔ میں بار بار اسے پڑھ  
رہی ہوں۔

تم نے سوچا تو ہوگا..... دیکھا نہیں

خشک صحرا یہ جب برس جائے

ایک چھلکا ہوا بھرا ساون

ویر تک ریت سنسناتی ہے

ایک موہوم امید ہے

شاید اب کے کہیں کوئی کوئل

جنم لیتی ہوئی نظر آئے

بانجھ صحرا کی گود بھر جائے

”سز مہتا! پتا نہیں کیوں میں اب تک پھر  
پاکستان نہ آسکی لیکن ایک چیز ہمیشہ تڑپاتی ہے۔“  
پاکستان میں واقعی محبت اور محبت دینے  
والے لوگ موجود ہیں۔ یہ نظم بہت پسند آئی۔

آپ کی امید جس طرح لائف بوائے شیمپو بنا  
اسی لائف بھر کے لیے میری اور آپ کی دوستی  
بھی مثالی بن گئی۔ کاش کوئی ایسا چٹکار ہو جائے کہ  
دلوں کی ساری بدگمانیاں بھی دھل جائیں۔ کاش  
انسان انسان سے پیار کرنے سرحدیں پھول  
برسائیں اور ہر طرف بہا رہی بہا رہی۔

اور ہاں سز مہتا! اب یہ میری اپنی Poetry  
آپ کے لیے، امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

زندگی نام ہے

ملنے کا بچھڑ جانے کا

زندگی تو کبھی رکتی ہی نہیں

چلتی رہتی ہے، چلتی رہتی ہے

ہم فقط سال گنتے رہتے ہیں

اور محبت کو لے کر اس دل میں

پھر مدد سال گنتے رہتے ہیں

اس برس جب ہوں محبت کا

میں کروں گی تمہارے نام وہ دن

اور ایک اور دعا مانگوں گی

زندگی سہل ہو سہی کی یہاں

ہم ہوں سرحد کے آریا ہوں پیار

بس محبت سے ہم ہمیشہ ملیں

آشا جیون کی بس محبت ہو

زندگی نام ہے محبت کا

سز مہتا

☆.....☆.....☆

لائف بوائے شیمپو..... تم نے سز مہتا کی  
صورت مجھے ایک ایسا گفٹ دیا ہے کہ میں لائف  
بھر تمہارا احسان مانتی رہوں گی..... سولو ٹیو.....  
میری بھی سز مہتا کی امید بھری آس والی دعا  
کاش رنگ لے آئے۔

☆☆.....☆☆

READING

40

Section





یہ بڑے کرم کے ہیں نصیحتے!



عہد انفقار عابد

اُس دوشیزہ کی داستانِ الم، جس نے شوہر کی خوشنودی کے لیے ہر ظلم سہا  
پہلی طویل کہانی کی صورت ایک یادگار کتھا

ہوئے تھے۔ جبکہ پابندی کی جانب ابا حضور کی بیگم شائستہ  
خاتون پیشی چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔  
”جی ابا حضور حکم!“ ہارون میاں نے ادب سے  
جواب دیا۔

”ہارون بیٹے۔“ مسہری پر نیم دراز ابا حضور نے  
اپنی دائیں طرف رکھی کرسی پر بیٹھے اپنے بڑے  
صاحبزادے کو مخاطب کیا۔ مسہری کے بائیں طرف کرسی  
پر ابا حضور کے چھوٹے صاحبزادے رشید میاں بیٹھے

Downloaded From  
Paksociety.com

REALING  
Section

”ہارون میاں ہمارا پوتا امجد اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کر کے عنقریب انگلینڈ سے آنے ہی والا ہے۔“ ابا حضور اتنا کہہ کر حقہ گڑ گڑانے لگے۔ دونوں صاحبزادے ابا حضور کو ایک تک دیکھتے ہوئے اُن کے مزید بولنے کے منتظر تھے۔ شائستہ خاتون بھی چھالیہ کانتے ہوئے رُک کر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی تھیں۔

”بیٹے ہارون میں چاہتا ہوں تمہارے بیٹے امجد کے انگلینڈ سے آتے ہی تم اس کی شادی اپنے چھوٹے بھائی رشید میاں کی بیٹی جنت النساء سے کر دو۔“ دونوں بھائی کن اکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے مگر خاموش بیٹھے رہے تھے۔

”آپ دونوں بھائی خاموش بیٹھے ہیں۔ کیا میں نے غلط فیصلہ کیا ہے؟“ ابا حضور نے ایک بار پھر حقہ گڑ گڑا کر دونوں بیٹوں سے سوال کیا۔

”ہرگز نہیں ابا حضور! آپ بزرگوں کے فیصلے تو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ میری خاموشی کی وجہ سے دراصل کچھ اور ہے۔“ ہارون میاں نے بہت ادب سے جواب دیا۔

”مثلاً کیا وجہ ہے۔ بیان کریں۔“

”ابا حضور آپ تو جانتے ہیں کہ میرے صاحبزادے بچپن سے انگلینڈ کے ماحول میں اپنے پھوپھا پھوپھی کے پاس رہ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ وہاں ماحول میں اپنی بڑھی میری پیاری بیٹی کو قبول نہ کریں۔“

”ہوں!“ ابا حضور کچھ دیر تک حقے کی نئے منہ میں لیے سوچتے رہے پھر انہوں نے اپنی بیگم کو مخاطب کیا۔

”آپ کی کیا رائے ہے؟“

”میرے خیال میں تو ہارون میاں ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔“ شائستہ بیگم نے بیٹے کی حمایت میں جواب دیا۔

”دیکھو میرے بچو! ابا حضور نے دو تین لمبے لمبے کس لینے کے بعد سوچتی ہوئی نظروں سے دونوں بیٹوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

”ہر انسان کا ایک مرکز ہوا کرتا ہے کوئی بھی انسان اپنے مرکز سے ہٹ کر خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ چلا جائے۔ اسے ایک نہ ایک دن اپنے مرکز پر واپس آنا ہی پڑتا ہے۔“

آپ لوگ جانتے ہیں کہ وہ مرکز کیا کہلاتا ہے؟“ دونوں بیٹوں نے نئی میں گردنیں دائیں بائیں ہلائیں۔

”اس مرکز کو مذہب یا دھرم کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ میرا پوتا امجد الحمد للہ ایک مسلمان گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ یہ درست ہے کہ امجد انگلینڈ کے ماحول میں پل کر جوان ہوا ہے۔ تاہم پیدائش کے بعد اُس کے کانوں میں دی جانے والی اذاتوں نے میرے پوتے کو مرکز اسلام سے وابستہ کر دیا ہے۔“

”خدا نہ کرے بیٹا کہ آپ کا اندیشہ ٹھیک نکلے۔ لیکن خدا نخواستہ ایسا ہوا بھی تو وہ اپنے مرکز سے زیادہ دنوں تک دور نہیں رہے گا۔“ بات کو اختتام تک پہنچانے کے بعد ابا حضور حقہ گڑ گڑانے لگے تھے۔

”اے، میں تو کہتی ہوں امجد کو انگلینڈ بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“ شائستہ خاتون نے پان کی گھوری منہ میں رکھتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ال کدیڈ نہیں ای حضور انگلینڈ۔“ رشید میاں نے تصحیح کی اور سب شائستہ خاتون کے غلط تلفظ پر مسکرائے لگے۔

”ارے بیٹا یہ توڑ ماری فرنگی بولی بھی عجیب ہے۔ بولوں کچھ ہوں منہ سے نکلتا کچھ ہے۔“

”ہیں آپ کا یہ بھولپن ہی تو پسند ہے جو انگریزی الفاظ کی حماقت گڑ کے ہم سب کو مسکرانے پر مجبور کرتا ہے۔“ ابا حضور نے ہنستے ہوئے بیگم کو مخاطب کیا۔

تب اس فیصلے کی روشنی میں کہ امجد میاں کے انگلینڈ سے آنے کے بعد ان کی شادی جنت النساء سے کر دی جائے گی۔ یہ نشست برخاست ہو گئی تھی۔ دروازے کی آڑ میں چھپی ہوئی جنت نے ساری کارروائی سنی اور امجد سے شادی کا فیصلہ سن کر شرم سے گلابی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

جنت کو زمینی مخلوق میں شمار کرنا گویا اس کے حسن کی توہین تھی۔ وہ تو ایک حور تھی جو غلطی سے بھٹک کر دنیا میں آ گئی تھی۔ جنت کے چہرے پر برستا ہوا نور اور حیا سے جھکی ہوئی گھنیری پلکیں لوگوں کو بے اختیار بار بار اُس کا پر نور چہرہ دیکھنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔

جنت اپنے نام کی طرح اسم با مسکی تھی۔ پانچوں



وقت نماز کی پابند اور درود شریف کا ورد اُس کے معمول کا حصہ تھا۔ جنت نے اپنے کمرے میں ایک چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی تھی۔ اس میں انبیاء علیہ السلام اور بزرگان دین اور احادیث مبارکہ پر مشتمل کتب کا ذخیرہ موجود تھا۔ جنت بہت پابندی سے اور بخور ان کتب اور احادیث مبارکہ کا مطالعہ کرتی رہتی تھی۔ یہی جنت کا شوق تھا اور یہی اس کی چھوٹی سی دنیا تھی جس میں اُسے سکون اور اطمینان کی ہر دولت میسر تھی۔

کا حلیہ بگاڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ امجد بھی کبھی کبھار انگریزوں کے لہجے میں بولی جانے والی اردو میں دادی جان کو مخاطب کر کے چھیڑا کرتا تھا۔

آج بھی دونوں دادی پوتے صوفے پر ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہارون میاں اخبار پڑھ رہے تھے اور رشید میاں کوئی سے مشغول فرما رہے تھے۔ اچانک دادی جان نے پان لگاتے ہوئے امجد کو مخاطب کیا۔

”بیٹا امجد!“

”جی دادی جان اینڈ گریٹڈ مام۔“

”ارے بیٹا مجھے صرف دادی جان ہی کہا کر۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی تیرے دادا جان نے تیری شادی اپنی پوتی جنت سے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”ہائیں جنت مینز جیرا ڈائز۔“ امجد نے مسکراتے ہوئے دادی جان کو چھیڑا۔

احادیث مبارکہ کا بار بار مطالعہ کرتے رہنے سے جنت کو ستر سے زیادہ احادیث حرف بہ حرف زبانی یاد ہو چکی تھیں۔ جنت کا یہ شوق صرف مطالعے کی حد تک نہیں تھا۔ وہ فرمان نبوی ﷺ اور بزرگان دین کی ہدایتوں پر سختی سے عمل بھی کرتی تھی۔

گھر والوں نے جنت کو جب بھی دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کو پیارے آقا ﷺ پر درود پاک پڑھتے ہوئے ہی پایا۔ پھر جسے اپنے بزرگوں کی خدمت اور نبی پاک ﷺ پر درود شریف بھیجنے کے علاوہ کسی دوسری شے سے ذرا بھی رغبت نہ ہو اس کے چہرے پر برسنے والے نور کو کیوں کرافقاظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

جنت سب سے زیادہ اپنے دادا اور دادی کی آنکھوں کا تارا تھی۔ اس کے دادا یا اور رشید میاں جب بھی ماہر جاتے جنت سے اُس کی پسند کی شے لانے کا ضرور پوچھتے تھے اور جنت کی پسند ہمیشہ کوئی دینی کتاب ہوتی تھی۔

☆.....☆.....☆

امجد میاں اپنی اعلیٰ تعلیم کی سند کے ہمراہ انگلینڈ میں پچیس سال کی عمر پوری کر کے اپنے وطن لوٹ آئے۔ ایک پائل سی پورے گھر میں نظر آنے لگی۔ دادا دادی نے بلائیں لیں۔ ماں باپ نے لپٹا کر پیار کیا اور چچا چچی (ہونے والے ساس سسر) نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو ماہ پلک جھپکتے گزر گئے۔ امجد پینک ولایت میں رہا تھا۔ تاہم اس کے پھوپھا پھوپھی نے اسے اپنے مذہب کی تعلیمات سے بڑی حد تک روشناس کرایا تھا۔ یہی وجہ تھی جو یہاں آ کر امجد اپنے بزرگوں کی عزت میں کوئی کمی نہیں آنے دیتا تھا۔ تاہم امجد کا ٹارگٹ ہمیشہ اس کی پیاری دادی جان ہی بنتی تھیں۔ جو انگریزی

”او میاں جیرا ڈائز..... اب میری بھی سنو۔“ ہارون میاں نے تیز نظروں سے امجد کو گھورتے ہوئے مخاطب کیا۔

”جی ابو حکم۔“ امجد فوراً ہی مؤدب ہو گیا۔

”تم نے سن لیا یہ فیصلہ تمہارے دادا جان کا ہے جو تمہارے باپ کے بھی باپ ہیں۔“

”لیکن ابو.....“ امجد نے احتجاج کرنا چاہا تھا۔

”فیصلے میں بحث کی گنجائش نہیں ہے۔“

”اد کے ابو، پیارے دادا جان کا فیصلہ سراسر آنکھوں پر۔“ امجد نے مسکرا کر جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”جیتے رہو میرے چاند اب ادھر آ کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔“ دادا جان نے امجد کو مخاطب کیا۔ دادا جان نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ ورنہ وہ خاموشی سے سب کو سنتے رہے تھے۔ امجد آگے بڑھ کر ان کے سینے سے لگ گیا۔

”اب جاؤ اسی خوشی میں مارکیٹ سے مٹھائی خرید لاؤ۔“ دادا جان نے امجد کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کی پیشانی چومی اور جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے ہدایت کی۔

”بیٹا امجد لگے ہاتھوں میرا بھی ایک کام کر دینا۔“

دادی جان نے امجد سے کہا۔

”ارے پیاری دادی جان حکم کریں میں تو کام تمام

”مس پیراڈائز۔“ امجد نے جنت کو چھیڑا۔ اور جنت کی نظروں کے ساتھ ہی گردن بھی شرم سے جھک گئی۔

”اللہ! آپ یہاں کیوں آگئے۔ ہمیں حیا آرہی ہے۔“

”مس پیراڈائز میں دودھ اور شہد کی نہروں کو پینے نہیں آپ کو مٹھائی کھلانے آیا ہوں۔ امجد مسکرایا۔  
”آپ کھلائیں گے مٹھائی۔“ جنت بوکھلا گئی۔  
”آف کورس! جنت کے ملنے پر خوشی سے بانٹی جا رہی ہے۔“

”آپ پلیٹ رکھ دیں ہم کھالیں گے اور اب خدا کے لیے چلے جائیں، کسی نے دیکھ لیا تو؟“  
”کوئی دیکھے نہ دیکھے مگر دادی جان نے مجھے مٹھائی دے کر آپ کو جی بھر کے دیکھنے کے لیے بھیجا ہے۔“  
”آپ نہیں مانیں گے۔“ کہتے ہوئے جنت نے شرم سے آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا۔ اور امجد نے گلاب جامن جنت کے منہ میں ٹھونس کر پلیٹ میز پر رکھ دی تھی۔

☆.....☆.....☆

چھ ماہ کے قلیل عرصے میں امجد اور جنت شادی کے مقدس بندھن میں بندھ گئے۔ امجد کو ایک بڑی کمپنی میں سیلز منیجر کی نوکری مل گئی۔ اور دن بھر خوشی اور سکون اطمینان سے گزرنے لگے۔  
”کیا خیال ہے جنت آج چھٹی کا دن ہے۔ کیوں نہ کہیں سیر و تفریح ہو جائے۔“ امجد نے جنت کو شکر اتے ہوئے مخاطب کیا۔

”سیر و تفریح۔“ جنت نے چونک کر دھرایا۔ اور کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

”ہاں بھی کراچی میں کئی پبلک پوائنٹ ہیں۔ جہاں کہوگی چلے چلیں گے۔“

”سرتاج مجھے چلنے میں تو اعتراض نہیں مگر میں برقعے میں جاؤں گی دوسرے مجھے کسی ایسی پبلک پلیس پر نہ لے جائیے گا جہاں مردوں کی بھیڑ بھاڑ ہو۔“  
”ٹھیک ہے پھر ہم لائنگ ڈرائیو پر چلیں گے۔“  
امجد نے جواب دیا۔

کردوں گا۔“ امجد دادی جان کو محبت سے لپٹاتے ہوئے بولا۔

”امجد۔“ ہارون میاں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پینے کو سرزنش کرنی چاہی۔

”ارے چل رے، میرے پوتے کو آنکھیں نہ دکھا۔ یہ تو میرا چہیتا ہے میری آنکھوں کا نور۔“

”اور ماتھے کا شور (درد)۔“ دادا جان نے لقمہ دیا اور ہال تہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔

”ہاں تو پیٹا امجد میں کہہ رہی تھی۔ جب مٹھائی لے کر لوٹو تو ایک پنگا لے لینا۔“

”ہائیں پنگا لے لوں، مگر کس خوشی میں۔“ امجد نے دادی کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”اول ہوں بیٹا، کیسے سمجھاؤں اچھا پنگا مت لے نا مگر پھر گھسیٹا مول ضرور لے لینا۔“

”دادی جان لگتا ہے آج آپ میری بڑی پسلی تڑوا کر ہی چھوڑیں گی۔ کبھی پنگا لے لوں بھی کسی کا پتہ گھسیٹ لوں۔“

”ادھر آؤ بیٹا میں سمجھاتا ہوں۔“ دادا جان نے مسکراتے ہوئے امجد کو بلا لیا۔ ہال میں موجود ہر ایک کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں گئی۔

”بیٹا میڈیکل اسٹور سے پنگا کی جگہ پین گے لے لینا۔ دراصل یہ آئٹم ہوتا ہے جو درد کی جگہ پر ملنے سے درد سے آرام دیتا ہے۔ اور دوپترے سے پیرا میٹا مول ٹیبلٹ کے خرید لینا۔ تمہاری دادی جان ان ہی چیزوں کے لیے کہہ رہی ہیں۔“ پھر دادا جان اپنی بیگم کی سادگی پر مسکرانے لگے۔

”واہ..... میری دادی جان کاش آپ انگلیڈ میں ہوتیں۔ ہر طرف صف ماتم بھی ہوئی نظر آتی۔“ امجد نے فرط محبت سے دادی جان کو لپٹا کر ان کی پیشانی چومی اور مطلوبہ اشیاء خریدنے کی غرض سے مارکیٹ روانہ ہو گیا۔

ایک گھنٹے میں امجد سب چیزیں خرید لیا تھا۔ دادی جان نے پلیٹوں میں مٹھائی سجا کر سب کو دی۔ جنت شرم کی وجہ سے یہاں موجود نہیں تھی چنانچہ دادی جان نے ایک پلیٹ امجد کو دیتے ہوئے ہدایت کی کہ جا کر اوپر جنت کو دے دو۔

READING

44 Section



”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“ کہہ کر جنت تیزی سے تیار ہونے لگی پھر برقعہ اوڑھ کر اپنے تایا ابو کے پاس پہنچ گئی۔

بارون میاں اور ان کی بیگم اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے کسی مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ جنت کو دیکھتے ہی دونوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

”او..... ہو..... بھیجی آج تو ہماری بہو بہت ہی پیاری لگ رہی ہے۔ کیا کہیں جانے کا پروگرام ہے؟“

بارون میاں نے جنت کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں تایا ابو..... آج یہ تفریح کرانے لے جا رہے ہیں۔“ جنت نے شرم سے نگاہیں جھکائے جواب دیا۔

”میں آپ لوگوں سے اجازت لینے آئی ہوں۔“

”شکر ہے اس بیوقوف کو خیال تو آیا۔ ویسے جنت

بہٹی امجد آپ کا شوہر ہے، وہ جہاں لے جانا چاہے آپ چلی جایا کریں۔ ہماری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ہے تایا ابو اجازت کی ضرورت بالکل ہے۔ کیونکہ اجازت کے ساتھ ساتھ ہمیں وہ دعائیں بھی ملتی ہیں جو

بزرگ اپنے بچوں کو رخصت کرتے وقت اپنے دل کی گہرائیوں سے دیتے ہیں۔“ جنت نے بڑھ کر بارون

میاں کے گلے سے لگ کر جواب دیا۔

”میری بہٹی۔“ بارون کا دل بھر آیا۔ اور وہ رومال سے آنکھیں خشک کرنے لگے۔

”جاؤ بیٹی امجد انتظار کر رہا ہوگا۔“ تائی امی نے جنت کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اور جنت دونوں کو ادب سے سلام کر کے باہر نکل کر کار میں بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

بال آخرو دو سال گزر گئے۔ ان دو برسوں میں ہلکے پھلکے گھریلو حادثات ہوتے رہے تھے۔ امجد نے اپنی محنت سے کمپنی کو کافی منافع بخش مقام پر لاکھڑا کیا تھا۔

کمپنی کے مالک عثمان یزدانی امجد کے کام سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔ وہ خود تو کبھی کبھار کمپنی کا چکر لگاتے

تھے۔ البتہ سارا کاروبار ان کی بے انتہا تک چڑھی اور

ضد بیٹی مشہورہ یزدانی نے بحیثیت شیپنگ ڈائریکٹر

کے سنبھالا ہوا تھا۔

مشہورہ خود بھی امجد کی کام سے لگن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور گاہ بگاہے امجد کے کام کی تعریف بھی کرتی

رہتی تھی۔ ان دو برسوں میں دونوں غیر محسوس انداز میں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ اور بات آخر

کارشادی کے بندھن میں بندھ جانے تک آپہنچی۔

مشہورہ ایک ماتحت کو شوہر کی حیثیت سے قبول کرنے پر تیار نہیں تھی مگر اپنے باپ سے مجبور تھی جو امجد

جیسے مخنتی در کر کو اپنا داماد بنانے پر مصر تھا، یہ پہلا حادثہ تھا۔

دوسرا حادثہ وہ تھا جب امجد جنت کو سیر کرانے لے کر گیا تھا۔ امجد کے بار بار کہنے پر جنت نے برقعے کا نقاب تو

اُلٹ لیا تھا مگر برقعے سے باہر آنا گوارا نہ کیا۔ وہ جنت کے ساتھ گھومتے ہوئے ایک عجیب سی خفت محسوس کر رہا

تھا۔

دراصل اس میں امجد کا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ جس

دیس میں رہ کر واپس آیا تھا۔ وہاں کے ماحول کا کچھ اور ہی رنگ ڈھنگ تھا۔ گوکہ کراچی میں بھی کسی کسی مقام پر

انگلینڈ کے ماحول کی جھلک موجود تھی۔ لوگ اپنی بیویوں کو لیے اور جوان لڑکے لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالنے

تفریح کا مزہ لے رہے تھے۔

کئی خوش فکروں نے مسکراتی نظروں سے امجد اور

برقعے میں چھپی ہوئی جنت کو دیکھا اور امجد شدید ترین سنگی محسوس کرنے لگا۔ وہ اس لمحے کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا جب اس نے جنت سے تفریح کے لیے چلنے کی

خواہش ظاہر کی تھی۔

تیسرا حادثہ مندرجہ بالا دو حادثوں کے مقابلے میں

کچھ زیادہ ہی سنگین صورت اختیار کر چکا تھا۔ جس کا اثر سب گھر والے بھی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ گھر

کے سونے آنگن میں ابھی تک کسی ننھے سے وجود کے آثار نہیں تھے۔ امجد کی جھنجھلاہٹ میں روز بروز اضافہ

ہورہا تھا۔ گھر کے ماحول پر چھایا ہوا سکوت صریحاً کسی طوفان کے رونما ہونے کی نشاندہی کر رہا تھا..... اور

پھر..... گھر میں بھونچال آ ہی گیا۔

”داوی جان میں اب دوسری شادی کر رہا ہوں۔“

امجد نے یہ بات اس وقت کہی جب ہال میں سب ہی

موجود تھے۔ ”تایا ابو جب اللہ تعالیٰ نے ہی مرد کو چار شادیوں

کی اجازت دی ہے تو جنت اس کے حکم کے آگے کیا کہہ سکتی ہے۔“

”مگر بیٹا یہ اجازت بھی کچھ شرائط کی روشنی میں دی گئی ہے۔“ دادا جان نے مداخلت کی۔

”ہاں دادا جان آپ کی یہ پوتی اور تایا ابو آپ کی بہو آپ کے صاحبزادے کے ساتھ سوسائٹی میں مود نہیں کر سکتی۔ نہ ہی ان کو اولاد کی خوشی دے سکی ایسی صورت میں میرے سر تاج کو دوسری شادی کرنے کا مکمل اختیار ہے۔“

”میری بیٹی کیا آپ اس کڑے امتحان سے دل گرفتگی کا شکار نہیں ہوں گی؟“ ہارون میاں نے سوال کیا۔

”تایا ابو میں اپنے شوہر کی خوشی میں خوش ہوں۔ میں بھلا دل گرفتہ کیوں ہوں گی۔ میرے دل کے سکون کے لیے میرے اللہ اور پیارے محبوب ملنے کی محبت ہی کافی ہے۔“ جنت کا فیصلہ سن کر ماحول گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔

کہنے کو اب رہا بھی کیا تھا۔ امجد کے سر پر شادی کا بھوت سوار تھا چنانچہ ایک ہفتے کے اندر امجد مشہورہ کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔ صرف جنت تھی جس نے سہاگ بیج اپنے ہاتھوں سے سجائی تھی۔ یاد دادا جان جنہوں نے کمال جرأت سے اپنے آنسوؤں کو روک کر چھوٹی دلہن اور امجد کے سر پر ہاتھ رکھ کر خوشگوار زندگی گزارنے کی دعائیں دی تھیں۔ پھر ایک طرف سے امجد نے اور دوسری طرف سے خود جنت نے مسکراتے ہوئے دلہن کو بازوؤں سے تھام کر جملہ عروسی میں پہنچایا تھا۔ دودھ اور مٹھائی کا انتظام جنت پہلے ہی کر آئی تھی۔ امجد نے اطمینان سے دروازہ بند کیا اور مسکراتا ہوا مشہورہ کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

”امجد یہ تمہارا گھر ہے یا قبرستان؟“ نئی نویلی دلہن نے اپنی سسرال کو قبرستان سے تشبیہ دے کر پہلا تحفہ امجد کو پیش کیا۔

”چھوڑو ڈار لنگ یہ سب بیک ورڈ لوگ ہیں۔“  
”ٹھیک ہے! تاہم بیک ورڈ اپنے چہروں پر

”دوسری شادی مگر کیوں؟“ ہارون نے چونک کر امجد کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”کوئی ایک وجہ ہو تو بتاؤں۔“ امجد ننگا ہیں نیچی کیے بڑبڑایا۔

”وجہ ایک ہو یا دس، آپ ایک ایک کر کے سب بتائیں۔“ اس مرتبہ دادا جان بولے تھے۔

”دادا جان میں نے کوشش کی تھی کہ جنت کو لے کر باہر نکلوں۔ ان کو اپنے آفس میں کام کرنے والے اپنے دوستوں اور ان کی بیگمات سے طواؤں، مگر یہ محترمہ برقعہ اتارنے پر تیار ہی نہیں ہیں اور نہ کسی گیٹ ٹو گیٹ میں ساتھ جانے پر آمادہ ہوتی ہیں۔ سارے دوست مجھ پر پھبتیاں کتے ہیں میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ دور بیویوں کو گھر میں بند رکھنے کا نہیں ہے دادا جان۔“

”بیٹک چٹا امجد ہماری پاکیزہ تہذیب تھک ہار کر جاوڑا ڈھے سوچتی ہے۔ اب تو ہم اپنی شناخت کو کھنکھن کر نقصان پہنچی اس مغربی تہذیب میں سانس لے رہے ہیں۔ جو جدید تہذیب و تمدن کے نام سے جانی جا رہی ہے۔ یہ آزادی کا دور ہے۔ اس غلیظ دور میں ہم اپنی بیویوں کو گھر کی عزت بنا کر رکھنا پسند نہیں کرتے۔“

”دوسری وجہ بھی ہے دادا جان۔ ہر ماں باپ کو اولاد کی آرزو ہوتی ہے۔ لیکن دو سال کی مدت گزرنے کے باوجود جنت مجھے اس تمنا سے محروم رکھے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے میرے دوسری شادی کرنے کی۔“

”اور ایسا ہو نہیں سکتا۔“ ہارون میاں نے غصے کے عالم میں تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔ معاً جنت پھرتی سے آگے بڑھی اس نے اپنے سسر تایا ابو کو بمشکل تمام واپس بٹھایا اور ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”تایا ابو اس میں غصہ ہونے والی کیا بات ہے۔ خدا کی مصلحت ہے میں ان کو اولاد کی خوشی نہیں دے سکتی۔ مگر دوسری شادی کی اجازت پوری ہوش مندی سے دے رہی ہوں۔“ جنت نے انتہائی محبت سے ہارون میاں کو سمجھایا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں جنت بیٹی؟“



مسکراہٹ سجا کر دلہن کا استقبال تو کرتے ہیں۔ مجھے تو یہ سب روٹی بسورتی زخمہ لاشیں دکھائی دے رہے تھے۔“  
”مشہورہ ڈارنگ کیا ایسی باتیں اس خوشیوں بھری رات میں کرنی ضروری ہیں؟“

”آف کورس! امجد تمہارے گھر والوں کا رویہ..... نو..... امجد یہ سراسر میری تذلیل ہے۔ انسٹلٹ ہے۔“ مشہورہ نے پھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔  
”اوہ گاڈ!“ امجد دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بولا۔ اور غصے کے عالم میں منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ پھر بھلا مشہورہ کیوں پیچھے رہتی وہ نیجنگ ڈائریکٹر ہونے کے زعم میں اپنے ماتحت شوہر کے آگے جھکنے پر تیار نہیں تھی۔ چنانچہ وہ تکلیف لے کر صوفے پر دراز ہو گئی تھی۔

فجر کی اذان سنتے ہی جنت بیدار ہو گئی۔ اُس نے بستر چھوڑ کر وضو کیا اور نماز سے فارغ ہو کر قرآن شریف کی تلاوت کرنے لگی۔ جنت کے پرنور چہرے پر اس وقت بھی غم کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اپنے پیارے شوہر اور اہل خانہ کی خوشیوں کے لیے اُس کے ہاتھ خدا کے بزرگ برتر کی بارگاہ میں اٹھ گئے۔

”اے اللہ..... یہ عاجز بندی جسے تُو نے صبر و رضا کی دولت سے نوازا ہے۔ تیری جلیل قدر بارگاہ میں اپنے ہاتھ پھیلائے اپنے پیاروں کی خوشیاں لوٹانے کی التجا کر رہی ہے۔ میں تو تیری رضا میں خوش ہوں۔ مجھ ناتواں کو یہ اختیار نہیں کہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر تجھ سے مانگوں۔ میری عبادت اگر جنت کی طلب کے لیے ہے تو جنت کو مجھ سے ہزاروں میل دور کر دینا۔ اور اگر دوزخ کے خوف سے ہے تو پھر مجھے دوزخ میں ڈال دینا۔ اے غفور رحیم تیرے غضب پر تیری رحمت چھائی ہوگی ہے۔ میں تجھے تیری رحمت کا واسطہ دیتی ہوں کہ مشہورہ کو اولاد کی نعمت سے نواز دے۔ تو تو جانتا ہے تیرے اور پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مجھے اپنے شوہر دادا دادی تاپا تائی اور ابوای سے کتنی محبت ہے اور یہ سب بھی مجھے دیکھ کر ہی جی رہے ہیں۔ پروردگار میرے سر تاج کو بیٹے کی دولت عطا کر دے تاکہ ننھے وجود کی آمد سے میرے پیاروں کے لبوں کی مسکراہٹیں واپس لوٹ آئیں جو مجھے زخم زخم دیکھ کر نہ جانے کن اندھیروں میں کھو گئی ہیں۔“

وال کلاک نے صبح کے سات بیٹنے کا اعلان کیا۔ جنت گھبرا کر اٹھی اُس نے بچن میں جا کر چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ جنت کو اپنے شوہر کے معمولات کا علم تھا۔ امجد کو بیڈنی پینے کی عادت تھی۔

جنت نے چائے تیار کر کے جلدی جلدی دو کپوں میں انڈیلی اور ٹرے اٹھا کر امجد کے کمرے کے دروازے پر جو پہلے جنت اور امجد کا مشترکہ کمرہ تھا پہنچ گئی۔ جنت نے دروازے کو ٹوک کیا۔ جواب نہ دارڈ اُس نے دوبارہ ٹوک کرتے ہوئے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا ایک اشارے میں کھل گیا۔

”اسلام علیکم ا“ جنت نے دونوں میاں بیوی کو سلام کیا۔ وہ بیدار ہو چکے تھے اور امجد انگڑائیاں لے رہا تھا۔ ”کیا تم اتنی ہی جاہل ہو کہ گڈ مارنگ نہیں کہہ سکتیں؟“ مشہورہ نے نخوت بھرے لہجے میں جنت کو مخاطب کیا۔

”میں نے تو رحمت و سلامتی بھیجی ہے آپ دونوں پر۔“ جنت نے براہ راست مسکرا کر مشہورہ کو جواب دیا۔ ”اپنی جیب میں رکھو یہ رحمت و سلامتی۔“ مشہورہ نے کہتے ہوئے اب امجد کو مخاطب کیا۔

”یہ کیا عجوبہ پال رکھا ہے امجد تم نے؟“ جواب میں امجد خاموش رہا تھا۔ مشہورہ خاموشی سے چائے پیتی رہی۔ پھر کپ خالی کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے اُس نے دوبارہ جنت کو مخاطب کیا۔

”میں ٹھیک نو بجے ناشتا کرتی ہوں۔“  
”سر تاج آپ بھی اسی وقت ناشتا کر بیٹے؟“ جنت نے امجد سے پوچھا۔

”یہ ناشتا آفس میں کر لیں گے۔“ مشہورہ نے جنت کو جواب دیتے ہوئے افسرانہ شان سے امجد کو گھورا۔

”امجد میں آج آرام کروں گی۔ اٹھو اور آفس جانے کی تیاری کر دو۔“ دلہن نے اپنے ماتحت شوہر کو حکم دیا اور امجد کسی معمول کی مانند اٹھ کر آفس جانے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

”اب تم بھی یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ آخر کب

تک کھڑی اپنے شوہر کی پوجا کر دے گی۔“ مشہودہ نے بلند آواز میں جنت کو حکم سنایا۔ اور جنت برتن سمیٹ کر خاموشی سے باہر نکل آئی تھی۔

دروازہ کھلا ہونے کی بنا پر ساری باتیں نیچے صاف سنی جا رہی تھیں۔ ہال میں بیٹھے ہوئے افراد خانہ اب جنت کی بربادی اور اپنے آشیانے کے تنگے بکھرتے دیکھنے کے سوا کچھ بھی کیا سکتے تھے۔

بال آخر جنت کی مانگی ہوئی دعائیں رب العزت کی بارگاہ میں قبول ہوئیں اور ایک گول مٹول سے ننھے وجود نے اس گھر میں جنم لیا۔ آشیانے کے تنگے کچھ عرصے کے لیے نفرتوں کی تیز دھوپ اور سرد گرم جلوں کے تند و تیز جھٹکڑوں سے منتشر ہونے سے ڈک گئے اور گھر میں ایک مرتبہ پھر سے اندھیروں میں کھوئی ہوئی مسکراہٹیں لوٹ آئیں۔ امجد کے نام کے مطابق داد اور دادی نے نیچے کا نام امجد تجویز کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

گھر کے پرسکون ماحول کی جھیل میں نفرتوں کا جو پتھر مشہودہ نے چالاکی سے پھینکا تھا۔ اس سے بننے والے دائروں نے رفتہ رفتہ پھیل کر اپنا حجم اتنا بڑھا لیا کہ دس سال کے عرصے میں مکینوں کا اپنی ہی چھت کے نیچے سانس لینا بھی دوپہر ہو گیا۔

چنانچہ اس گھٹن زدہ ماحول سے دل برداشتہ ہو کر سب نے نہیں دور جانے کا فیصلہ کر کے رخت سفر باندھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ گھر میں اب صرف امجد جنت مشہودہ اور امجد میاں رہ گئے تھے۔ مشہودہ کے تو مقدر ہی کھلی گئے۔ اُس کے ہر دن عید اور ہر رات شب برأت ہو گئی تھی۔ مشہودہ کا اصل یار گٹ جنت تھی جسے وہ اپنے شوہر سے چھٹکارا دلانا چاہتی تھی۔

اب گھر میں روزانہ مشہودہ اور امجد کے مشترکہ دوستوں کی آمد و رفت رہنے لگی۔ ہر شب ہی ہلا گلہ اپنے عروج پر ہونے لگا۔ یہ شور شرابہ بھی کبھار اتنا زیادہ بڑھ جاتا تھا کہ جنت کو نماز پڑھنی مشکل ہو جاتی تھی۔ مگر آج تو انتہا ہو گئی تھی۔ ہال میں بیا ہونے والے شور سے گھبرا کر امجد میاں نے رونا شروع کر دیا۔ مگر نہ تو ماں کو اُن کے رونے کی پروا تھی اور نہ باپ کو۔ نتیجتاً امجد نے غصے میں

آ کر ایک کرار اچھڑا امجد میاں کو رسید کر دیا۔ دو سال کی ننھی سی جان تھپڑ کی زبردست چوٹ کھا کر میز پر سے نیچے فرش پر گر پڑی۔

”ماما..... ماما.....“ امجد میاں روتے ہوئے جنت کو پکارنے لگے۔ پیار محبت کا بھوکا بچہ جنت ہی کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ اور ہر دم اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ نہ جانے امجد کے روتے ہوئے بار بار ماما کہنے میں وہ کون سا درد چھپا ہوا تھا جسے محسوس کر کے جنت برداشت نہ کر سکی۔ وہ تیزی سے نیچے اتری اور آ کر امجد کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر وہ مشہودہ سے مخاطب ہوئی۔

”چھوٹی بیگم تمہیں اس مہصوم برتنس نہیں آیا؟“

”اوہ..... شٹ آپ میں نے سنی بار کہا ہے کہ مجھے سزا امجد کہا کرو۔“

”میں مشہودہ کے بجائے چھوٹی بیگم ہی کہوں گی..... وہ نہیں جو تم چاہتی ہو۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“ مشہودہ آپے سے باہر ہو گئی۔

”چینو مت اتم اگر ایم ڈی ہو تو اپنے آفس میں۔ یہاں تمہاری حیثیت چھوٹی بہو کی ہے اس لیے اپنی حد میں رہو۔“ جنت نے بھی اسی انداز میں جواب دیا تھا۔

”امجد میں اب اور برداشت نہیں کر سکتی۔ یا تو اسے گھر سے نکالو یا تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔“

مشہودہ نے امجد کو مخاطب کیا۔ اور امجد جنت کو بازو سے پکڑ کر اُس کے کمرے میں لے گیا۔ امجد میاں جنت کی گود میں تھے۔

”جنت میرے اور مشہودہ کے دوستوں کے سامنے میری اتنی بے عزتی، اب میں تمہیں اور برداشت نہیں کر سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس گھر کو چھوڑ دو۔“

”مگر میں کہاں جاؤں گی سرتاج۔“

”یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ مگر اتنا سن لو اگر صبح مجھے تمہاری صورت نظر آئی تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے آزاد کر دوں گا۔“ امجد نے سرخ انگارہ آنکھوں سے جنت کو گھورتے ہوئے حکم سنایا۔

”خدا کے لیے ایسا نہ کہیں۔ میں خود ہی اس گھر کو چھوڑ دوں گی۔“ جنت نے لرزتے ہوئے جواب دیا تھا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”اچھا زینت، جب میرے پیارے آجائیں تو ان سب سے میرا سلام عرض کر دینا۔“ جنت نے حسرت بھری نظروں سے پورے گھر کو دیکھا۔ اپنے اس کمرے کو دیکھا جہاں وہ کبھی دلہن بنی بیچ پر بیٹھی تھی۔

”کتنا عجیب اتفاق ہے زینت، پہلے کمرے سے بے دخل ہوئی اور آج اس گھر سے بے گھر کر دی گئی۔“ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسجد کو کندھے سے لگائے خاموشی سے باہر آگئی۔

”آئیے بڑی بی بی جی، آپ جہاں جانا چاہیں میں چھوڑ آتا ہوں۔“ مشہودہ کے ڈرائیور نے کمال ہوشیاری سے اپنے چہرے پر ہمدردی کے آثار پیدا کرتے ہوئے جنت کو مخاطب کیا۔

”مجھے یہاں سے دور کسی چوراہے پر چھوڑ دینا پھر میں کہیں نہ کہیں چلی جاؤں گی۔ جنت نے کار میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا اور کار ایک جھکے سے آگے بڑھ گئی کار آدھے گھنٹے تک تیزی سے سیاہ سڑک پر دوڑتی رہی۔ کئی چوراہے آئے اور نکل گئے مگر کار کے بغیر برابر آگے بڑھتی رہی جنت آنکھیں بند کیے اپنی پریشان ہو چوں میں کم بیٹھی رہی تھی۔

پکانک کار کی رفتار کم ہوئی اور پھر وہ رُک گئی۔ جنت نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور ہول گئی۔ وہاں نہ کوئی چوراہا تھا اور نہ کسی قسم کی چہل پہل۔ ہر سو ویرانی اور بھیا تک سناٹے کا راج تھا۔

”اتر بی بی۔“ ڈرائیور بدلتے ہوئے تیوروں سے بولا۔

جنت نے ایک نظر ڈرائیور کو دیکھا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر خاموشی سے نیچے اتر گئی۔ جنت نے اسجد کو سڑک کے کنارے کھڑا کرنا چاہا مگر اسجد لہرا کر سڑک پر گر پڑا۔ اس اثناء میں ڈرائیور نے جنت کا بیگ اس کی طرف پھینکا اور گاڑی کا رخ تبدیل کر کے واپس گھر کی سمت روانہ ہو گیا تھا۔

”کیا ہو گیا بیٹا؟“ جنت نے اسجد میاں کو زمین سے اٹھاتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

”ماما..... ابو مالا..... ابو مالا.....“ اسجد نے روتے ہوئے جواب دیا۔

”اور جاتے جاتے اپنے کندھے سے لگے اس ناکارہ لوٹھڑے کو بھی لے جانا جو زندگی کو انجوائے کرنے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔“ دروازے میں کھڑی مشہودہ نے اپنی کوکھ سے جنم لینے والے معصوم بچے کو لوٹھڑا کہہ کر جنت کیس سماعت من کر دی تھی۔ اتنا کہنے کے بعد مشہودہ تیزی سے نیچے اتری اور اپنے ڈرائیور کو جلدی جلدی کچھ ہدایات دینے کے بعد واپس دوستوں کی محفل میں آگئی تھی۔

”سرتاج آپ کی اجازت ہے اسجد میاں کو میں لے جاؤں؟“

”اُس کی ماں کی اجازت کی روشنی میں میری اجازت ضروری نہیں۔ البتہ اپنے لیے تم میرا حکم سن ہی چکی ہو۔“ اسجد بھی یہ کہہ کر دوستوں میں پہنچ کر پہلے گلے میں شریک ہو گیا۔ دروازے کی آڑ میں چھپی ہوئی نوکرانی زینت تیزی سے نکل کر جنت کے سامنے آگئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”بڑی بہو۔ آپ اس سبھی ہی جان کو لے کر کہاں جائیں گی؟“

”گھبراؤ مت زینت! شوہر کے حکم پر گھر سے نکل رہی ہوں۔ میرے لیے میرا اللہ ہی کافی ہے۔ اور وہی مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچائے گا۔“

”ماما۔“ اسجد میاں نے جنت کے کندھے سے اپنا سراٹھایا۔

”جی ماما کی جان۔“ جنت نے اسجد کی پیشانی چوم کر پوچھا۔

”ماما..... ابو مالا (ابو نے مارا)۔“ اسجد نے اپنا ہاتھ گال پر رکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا ابو مالا..... ماما نے پیار کیا۔“ کہتے ہوئے جنت نے اسجد کو اپنی آغوش میں بچھ لیا۔

”زینت بیگ میں میرے اور اسجد کے کپڑے اور چپلیں رکھ دو۔“

”مجھے تو بتادیں آپ کہاں جائیں گی؟“

”میری منزل نامعلوم ہے زینت۔ جس کی عظمتوں کے سہارے نکل رہی ہوں وہی میری دستگیری بھی کرے گا۔“ زینت نے بیگ تیار کر کے جنت کو دے دیا تھا۔

READING  
Section



”ویری سیڈ! آئیے میں آپ کو شہر چھوڑ دوں گی۔“  
عورت نے جنت کو افسوس سے دیکھتے ہوئے پیشکش کی۔  
”مگر بیگم صاحبہ!“ جنت کچھ کہنا چاہتا تھا۔  
”انکار مت کیجئے شہر یہاں سے میں کلومیٹر دور ہے  
آپ صبح تک بھی نہیں پہنچ پائیں گی۔“

جنت کے لیے کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ  
وہ دوسری طرف سے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ بیٹھ پر  
بیٹھ گئی۔ تب کار دوبارہ اپنی منزل کی سمت رواں ہو گئی۔  
”بچہ بھوکا ہوگا۔ یہ لفافہ لیں، اس میں چکن پیس،  
کیک پیس، اور چپس موجود ہیں بچے کو کھلائیں اور خود بھی  
شروع ہو جائیں۔“ عورت نے لفافہ ڈیش بورڈ سے اٹھا  
کر جنت کو دتے ہوئے کہا۔

”شکر یہ بیگم صاحبہ۔“ جنت نے لفافے میں سے  
ایک ملائم کیک پیس نکالا اور تھوڑا سا کھڑا توڑ کر اسجد کے  
منہ میں رکھا۔ اسجد نے کیک پیس کھانے کی کوشش کی  
تاہم منہ میں تکلیف کے باعث کھا نہیں سکا اور رونے  
لگا۔

”نہیں مانا نہیں، ابو مالا۔“ اور بچے کی تکلیف پر  
جنت کا دل خون ہو کر رہ گیا۔

”شاید بچے کے منہ میں تکلیف ہے، فلاسک میں  
دودھ بھی ہے وہی پلاوین۔“ اور اسجد نے جیسے تیسے دودھ  
پی لیا تھا۔

”بچے کو یہ تکلیف کب اور کیسے ہوئی تھی؟“ عورت  
نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

”ابھی ڈھائی تین گھنٹے قبل میرے شوہر نے غصے  
میں آ کر بہت زور دار تھپڑ مارا تھا۔ اور یہ میز سے نیچے  
فرش پر جا گرے تھے۔“ جنت نے تفصیل بتائی۔

”کیا..... اور آپ اب بتلا رہی ہیں۔“ عورت نے  
گاڑی پھرتی سے سڑک سے اتار کر ایک طرف روکی اور  
پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا بیگ اٹھا کر اس میں سے  
اسٹیتھو اسکوپ نکال کر اسجد کو چیک کرنے لگی۔ عورت  
نے اسجد کے مغزنی حصے کی سمت والا ہاتھ اٹھا کر ہوا میں  
چھوڑ دیا۔ اسجد کا ہاتھ ہوا میں رُکے بغیر تیزی سے واپس  
گر گیا تھا۔

”اوہ مائی گاڑا!“ عورت کے منہ سے تشویش کے

جنت سمجھ گئی کہ اسجد کا تھپڑ اسجد کے کسی ایسے حصے پر  
پڑا تھا۔ جس کی تکلیف ابھی تک ننھے اسجد کو محسوس ہو رہی  
تھی۔ وہ اسجد کو گود میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیگ  
کندھے سے لٹکایا اور پلٹ کر اسی سمت روانہ ہو گئی جدھر  
ڈرائیور گاڑی لے کر گیا تھا۔ دریں اثناء اسجد نے سر  
اٹھایا۔

”ماما..... بب بُو۔“ اسجد نے دودھ مانگا اور جنت  
تڑپ کر رہ گئی۔ وہ اپنی پریشانی میں بھول ہی گئی تھی کہ  
زینت سے فیڈر میں دودھ بھر والی تھی۔ جنت نے آسمان  
کی طرف نگاہ اٹھائی اور خدا سے التجا کی۔

”میرے مالک میری منزل اور ننھے بچے کی بھوک  
تیری رحمت کی منتظر ہے۔“

اس کے ساتھ ہی دور کسی کار کی ہیڈ لائٹس سے  
چھوٹنے والی تیز روشنی جنت کی پشت پر پڑنے لگی۔ کار تیز  
رفتاری سے چلتی ہوئی آئی اور زن کی آواز کے ساتھ  
جنت کے قریب سے گزر گئی۔ جنت حسرت سے کار کو  
جاتے دیکھتی رہی۔

کار روڈ صاف سوگزدور نکل چکی تھی۔ یکا یک کار کی  
عقبی سرخ روشنی میں مزید تیزی پیدا ہوئی۔ کار کے مائر  
چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رکنے کے بعد دوبارہ  
جنت کی طرف واپس آنے لگی۔

”اے اللہ تیرے بھروسے پر نکلی ہوں۔ میری  
عزت ناموس کی حفاظت فرما۔“ کار تیزی سے روپوش  
ہوتی ہوئی جنت کے سامنے پہنچ کر رُک گئی تھی۔

”کون ہیں آپ اور کہاں جا رہی ہیں؟“ کار کی  
کھڑکی میں سے ایک عورت نے سر باہر نکال کر جنت کا  
بنغور جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔ جنت کو یہ دیکھ کر  
اطمینان ہوا تھا کہ کار میں عورت اکیلی ہی تھی۔

”بیگم صاحبہ نام میرا جنت النساء ہے۔ فی الحال  
اپنی منزل سے لاعلم ہوں۔“

”مگر آپ اس ہولناک ویرانے میں ایک بچے کو  
لیے کہاں سے آرہی ہیں؟“

”کیا کہہ سکتی ہوں۔ شوہر کا حکم تھا اور اُن کے حکم کی  
بجا آوری مجھ پر فرض تھی۔ مجھے یہاں اُن کی دوسری بیگم کا  
ڈرائیور زبردستی چھوڑ گیا ہے۔“

عالم میں نکلا۔ اُس نے پھرتی سے بیگ میں ہاتھ ڈال کر سرخ نکالی پھر دو اکی شیشیوں میں سے ایک شیشی منتخب کی اور سرخ میں دو ابھری اور احمد کے جسم میں منتقل کر دی۔ اُس کے ساتھ ہی عورت نے دو گولیاں پیس کر دودھ کے ہمراہ احمد کو کھلا دیں۔ جنت احمد کو گود میں لٹائے ہوئے ساری کارروائی خاموشی سے دیکھتی رہی تھی۔

”کیا بچے کو کوئی خطرہ لاحق تھا؟“ جنت نے عورت سے پوچھ ہی لیا۔

”ہاں جنت! بچے کا یہ حصہ آہستہ آہستہ پیرالائز ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔“

”شکر ہے میرے پاس ایمر جنسی میں استعمال ہونے والی میڈیسن ہمیشہ موجود رہی ہیں انشاء اللہ بچہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تو گویا آپ ڈاکٹر ہیں۔“ جنت نے تشکر بھری نظروں سے عورت کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں جنت۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ آج ایل ایم سی چاسٹور میں ہونے والے سیمینار میں شرکت کرنے گئی تھی۔ میں یہ ایمر جنسی بیگ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ نہ جانے کب اس کی ضرورت پیش آجائے۔“

”جیسے آج میرے بیٹے کو ضرورت پڑ گئی۔ البتہ میں حیران ہوں کہ میرے صرف ایک مرتبہ بتلانے پر ہی آپ کو میرا نام یاد ہو گیا۔“ جنت نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ نام تو اتنا عظیم نام ہے۔ جسے پانا ہر مسلمان کی ولی آرزو ہوتی ہے۔ پھر مجھے یہ نام کیوں نہ پیارا لگے۔ شوہر کی اتنی فرمانبرداری صرف جنت ہی ہو سکتی ہے۔“ ڈاکٹر صاحبہ نے جنت کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

”شکریہ۔“ جنت نے ممنون لہجے میں شکر یہ ادا کیا۔ ”ابھی بہت راستہ باقی ہے ایسا کرتے ہیں پہلے میں اپنے متعلق آپ کو بتلا دوں پھر آپ اپنی اپنی تفصیل سے مجھے سنانا۔ سناؤ گی نا؟“

”بالکل سناؤں گی۔“ جنت انکار نہیں کر سکی تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اپنا تعارف کروانا شروع کیا۔

”میرا نام زیبا جہانگیر ہے۔ مگر میرے شوہر جو کہ

وکیل ہیں مجھے پیار سے زیب کہتے ہیں میں بچے کے لحاظ سے ایک لیڈی ڈاکٹر ہوں۔ میرے شوہر جہانگیر پانچ ٹاپ کلاس کمپنیوں کے انکوائٹے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ ہر کمپنی پچاس ہزار روپے ماہانہ انہیں ادا کرتی ہے۔ اور بھی اب رہی شکل و صورت تو میں نہیں بتلاؤں گی (ہنستے ہوئے) اگر جنت آپ نے انڈین فلمیں دیکھی ہیں تو خود ہی پہچان لیں گی۔ اور اب آپ کی باری ہے۔“

”ویسے آج کی رات آپ میری مہمان رہیں گی۔“ زیب نے اتنا کہہ کر کار میں لگا ہوا ٹیپ آن کر دیا اور جنت کو اشارہ کیا۔

”زیب باجی، پہلے تو میں شکر گزار ہوں اپنے پروردگار کی ہڑک پر چلتے ہوئے بچے نے دودھ مانگا، مگر مجھ بے سہارا کے پاس اس کی بھوک مٹانے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے رب سے التجا کی۔ اور اس کی رحمت کے انداز کو دیکھیں اس نے فوراً ہی آپ کو وسیلہ بنا کر بھیج دیا۔ بچے کی بھوک مٹی، اس کو بروقت طبی امداد بھی ملی اور ہم بجزورماں بیٹے کو آج کی رات سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی اس پاک ذات نے مہیا کر دیا۔ میری ٹوٹی پھوٹی عبادت اور اس کے اتنے احسان پھر جنت نے اپنی پوری تفصیل ٹیپ میں لگے کیسٹ میں ریکارڈ کر دی تھی۔“

چنانچہ جیسے ہی جنت کی آپ بتی اختتام کو پہنچی گاڑی پوٹن چلانے میں داخل ہو کر ایک خوبصورت کونوی میں پہنچ کر رُک گئی۔

”آہا۔۔۔ آپ آگئیں بیگم۔ بہت دیر لگا دی۔“ وکیل صاحب پر نظر پڑتے ہی جنت کو حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ امریش پوری جنت کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ مسکرانے لگی تھی۔

”ہاں ڈیئر واصل راستے میں ایک ایمر جنسی ہو گئی تھی۔“ زیب نے جنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ کہتے ہوئے وکیل صاحب نے کار کے اندر بیٹھی جنت پر نگاہ ڈالی۔

”سبحان اللہ! بھی بیگم اس بھنگی ہوئی حور کو کہاں سے پکڑ لائیں۔“ اور جنت وکیل صاحب کی آواز سن کر



مسکرانے لگی۔ صورت شکل قد و قامت اور اب آواز بھی بالکل وہی۔

”یہ کیسٹ لیں۔ اس میں ان کی پوری تفصیل موجود ہے، اور اب جلدی سے اندر چلیں، بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔“

”اوہ..... اچھا اچھا..... آئیے بیٹی آپ بھی آجائیں۔“ وکیل صاحب نے جس غلوص اور محبت سے جنت کو بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اسے محسوس کر کے جنت کا دل بھر آیا وہ خاموشی سے گاڑی سے باہر نکل سوائے ہوئے اسجد کو اٹھا کر کندھے سے لگایا اور بیگ لے کر وکیل صاحب کے پیچھے چلتی ہوئی کوٹھی کے ہال میں آگئی۔

کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ پھر ڈاکٹریز آئے سے سوئے ہوئے اسجد کو چیک کرنے لگی۔ کچھ دیر کے معائنے کے بعد زیب نے مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے جنت کو دیکھا۔

”خدا کا شکر ہے بچے اب خطرے سے باہر نکل چکا ہے۔“ زیب نے کہتے ہوئے جنت کو اشارہ کیا کہ وہ اسجد کو گود میں اٹھالے۔ اور خود اس کا بیگ لیے کوٹھی سے نکل کر سرونٹ کو ارڈر پر آ کر رک گئی۔ زیب نے دروازہ کھول کر کمرے کی لائٹ آن کی۔ روشنی ہوتے ہی جنت نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ ویل ڈیکورڈ تھا۔ زیب نے دیوار میں بیوست اسے ہی آن کر کے جنت کو مخاطب کیا۔

”جنت یہاں اطمینان سے سو کر رات گزاروں۔ انشاء اللہ صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔ وکیل صاحب کیسٹ پر تمہاری چٹا سن ہی لیں گے پھر جیسا تم چاہو گی اس کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔“ پھر زیب جنت کو شب بخیر کہتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔

☆☆☆

دوسرے دن جنت نے اسجد میاں کو صاف کپڑے پہنائے پھر خود بھی تیار ہو کر اسجد کو گود میں لیے کوٹھی میں پہنچ گئی۔ ڈائمنگ نیبل پر دونوں میاں بیوی جنت کا انتظار کر رہے تھے۔

”آؤ بیٹی آؤ۔“ وکیل صاحب نے جنت کو دیکھتے

ہی کہا۔

”اسلام علیکم!“ جنت نے ادب سے دونوں کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، جیتی رہو۔ آؤ ادھر میرے قریب بیٹھو۔“ دونوں میاں بیوی نے سلام کا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ تاہم اپنے قریب بیٹھنے کے لیے وکیل صاحب نے کہا تھا۔ جنت وکیل صاحب کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر ناشتے کے بعد چائے کے دوران وکیل صاحب نے جنت کو مخاطب کیا۔

”ہاں تو بیٹی اب بتلائیں آپ کیا چاہتی ہیں؟“

”اگر یہاں کوئی ایسا ادارہ موجود ہو جہاں بے سہارا.....!“

”نہ..... نہ..... اپنے آپ کو بے سہارا مت سمجھو۔ آپ کا سہارا تو وہ عظیم ذات ہے جس کا نام لے کر آپ گھر سے نکلی تھیں۔“ وکیل صاحب نے تیزی سے بات کاٹ کر کہا۔

”پھر فرمائیں وہیں کہاں جاؤں؟“

”بیٹی میں آپ کے بیک گراؤنڈ سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہوں۔ اب آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خدا سے ہر نماز میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتا تھا۔ بیٹی آپ کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری بخشش کے سماں پیدا ہو گئے ہیں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ میں ایک گنہگار بندی اور آپ کی بخشش کا سامان؟“

”ہاں بیٹی، آپ ماشاء اللہ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کا کافی علم رکھتی ہیں میں دراصل اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ جس میں پیارے نبی ﷺ نے فرمایا تھا۔ ”جس شخص کو خدا نے دو بیٹیاں عطا کیں اور اس شخص نے ان کی بہتر پرورش کی، علم کی دولت سے دونوں کو آراستہ کر کے اپنے گھر کا کر دیا یعنی ان کی شادیاں کر دیں۔ وہ شخص میرے ساتھ اس طرح جنت میں جائے گا۔ اتنا فرما کر آپ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں کو باہم ملا کر صحابہ کرام کو دکھائیں۔“

جنت کو اس حدیث مبارکہ کا علم تھا لہذا اس نے ان دونوں بچیوں کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تھیں۔

READING

52 Section

واپس آنا پڑا تھا۔ اُن کو اپنے دفاتروں سے مزید چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ البتہ ابا حضور اور امی مزید ایک ماہ کے لیے لاہور تک گئے تھے۔ دونوں بھائیوں نے عجب ہو کا عالم گھر پر مسلط پایا تھا۔

”زینت یہ خاموشی کیوں چھائی ہوئی ہے۔ جنت بیٹی اور اسجد میاں کہاں ہیں؟“ ہارون میاں نے زینت سے سوال کیا۔

”نکال دیا، انہیں اسجد میاں نے اپنی بیگم کے کہنے پر اسجد میاں سمیت گھر سے نکال دیا۔“ زینت نے روتے ہوئے جواب دیا۔

”اسجد.....“ ہارون میاں غصے سے کانپتے ہوئے دھاڑے۔ اور اسجد مشہورہ کے ساتھ فوراً اُن کے سامنے حاضر ہو گیا۔

”جنت کہاں ہے اسجد میں پوچھ رہا ہوں جنت کہاں ہے؟“ وہ اسجد کو مارنے کی غرض سے آگے بڑھے مگر رشید میاں تیزی سے درمیان میں آگئے۔

”اس باگن کے کہنے پر تم نے جنت بیٹی کو گھر سے نکالا ہے نا۔ اب تم بھی یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ اور خبردار جنت کے بغیر اس گھر میں داخل ہونے کی قسطی نہ کر بیٹھنا، ورنہ.....!“

”بھائی جان ذرا سوچے اسجد میاں کہاں جائیں گے۔“ رشید میاں نے بڑے بھائی کو سمجھایا۔

”ہٹ جاؤ رشید..... اس نابکار نے اپنے خاندان کی نیک نامی پر جو کالگ ملی ہے اسے سات سمندروں کا پانی بھی نہیں دھوسکتا۔ تم کہتے ہو یہ کہاں جائے گا۔ سسرالی کتا بن کر اپنی سسرال میں جا کر رہے گا۔ مگر میری جنت بیٹی وہ معصوم تو اس دنیا کی بھیڑ میں نہ جانے کہاں اور کن حالوں میں پھنک رہی ہوگی۔“ ہارون میاں غم سے نڈھال ہو کر کرسی پر گر پڑے۔

مشہورہ نے اسجد کا بازو پکڑا اور اُسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ چالاک عورت جانتی تھی۔ اگر اُس نے ہارون کو جواب دینے کی کوشش کی تو وہ اُسے دھنک کر رکھ دیں گے۔

شام تک دونوں میاں بیوی گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

”بیٹیاں اسکول جا چکی ہیں۔ دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی۔“ زیب نے جنت کی متلاشی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر جواب دیا۔

”بیٹی آپ کو اگر ہم گنہگاروں کی مدد کرنی منظور ہو تو ہم آپ کو اس خدمت کے عوض پندرہ ہزار روپے ماہانہ جیب خرچ کھانا، کپڑا اور ہر وہ شے جو آپ پسند کریں گی دیں گے۔“

”جیب خرچ.....“ جنت نے چونک کر دہرایا تھا۔

”ہاں بیٹی، تنخواہ ملازموں کو دی جاتی ہے۔ جبکہ میرے بیٹی کہنے سے آپ اس گھر کی فردین چکی ہیں۔“ یہ سن کر جنت کا دل بھر آیا وہ آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے بولی۔

”مجھے یہ خدمت منظور ہے۔“

”جنتی رہو جنت بیٹی، دیکھ لیں اللہ سبحانہ تعالیٰ کے اپنے چاہنے والوں پر احسانات، اور انعامات اُس نے آپ کو جھٹکنے سے بچا کر اپنی منزل پر پہنچا ہی دیا۔“

”ہاں بھائی جان آپ درست فرما رہے ہیں۔ اسے ہاں بھائی جان آپ کی کوٹھی یا لکل مسجد کی دیوار سے لگ کر بنی ہے۔ میں نے آج صبح نماز سے فارغ ہو کر ہر طرف کا جائزہ لیتے ہوئے یہ چیز نوٹ کی ہے۔“

”جنت بیٹی یہ پلاٹ میں نے میٹکے داموں خریدا تھا۔ اور اس گھر کو بناتے وقت میں نے خاص طور پر یہ خیال رکھا تھا کہ میرے گھر کی دیوار مسجد کی دیوار سے لگی رہے۔ پانچ وقت اذان اور درود سلام کی پرسوز صدائیں سنائی دیتی رہیں اور مسجد کے پرنور و پاکیزہ سائے میرے گھر کو اپنی آغوش میں لیے رہیں۔ چچا غالب نے کیا خوب فرمایا تھا۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے  
یہ بندہ کینہہ مسایہ خدا ہے  
”بیٹی انسان کو دنیا کمانے کے ساتھ ہی آخرت کی فکر بھی کرنی چاہیے۔“

اسجد میاں اب چار برس کے ہو گئے تھے اور اپنی منہ بولی بہنوں کے ساتھ اسکول جانے لگے تھے۔

☆.....☆.....☆  
ہارون اور رشید میاں کو پندرہ دن بعد لاہور سے



دو تہذیبوں کا اصل چہرہ کھل کر امجد کے سامنے آچکا تھا۔  
چھ ماہ تک تو پاس موجود پیسوں سے امجد جیسے تیسے  
گزارہ کرتا رہا تھا۔ پھر ہاتھ کی کلانی میں موجود قیمتی گھڑی  
بیچی اور اس کے بعد چین بھی بک گیا تھا۔ اس دوران  
امجد برابر نوکری کی تلاش میں بھی لگا ہوا کوشش جاری  
رکھے ہوئے تھا۔ مگر اس کے ناکامی کے اور کچھ ہاتھ نہیں  
آ رہا تھا۔

یہ حالات صریحاً اس چیز کی طرف اشارہ کر رہے  
تھے کہ قدرت امجد سے انتقام لینے پر اتر آئی تھی۔ امجد  
نے جو سزا اپنی معصوم بیوی جنت کو گھر سے نکال کر اسے  
دی تھی اب وہ خود اسی اذیت سے گزر رہا تھا۔

امجد کل رات سے بھوکا تھا اب تو بیچنے کے لیے اس  
کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ بھوک تھی کہ برابر پیٹ میں  
کچھ لگا رہی تھی۔ امجد دھیرے دھیرے چلتا ہوا ایک  
بہت بڑے ہوٹل کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔

”اتنا بڑا ہوٹل ہے شاید ایک دقت کا کھانا مل ہی  
جائے۔“ امجد نے خود کلائی کی۔ وہ ہشاش بشاش مردوں  
اور عورتوں کو ہوٹل میں آتے جاتے دیکھتا رہا۔ گوکہ غیرت  
گوارہ نہیں کر رہی تھی۔ مگر غیرت سے پیٹ کی آگ تو  
نہیں بجھ سکتی تھی۔

بال آخر غیرت اور بھوک کی جنگ میں فتح بھوک ہی  
کو حاصل ہوئی اور امجد کے لڑکھڑاتے قدم ہوٹل منیجر کے  
آفس کی سمت اٹھنے لگے تھے۔

ایک سال گزر گیا۔ بچوں کے امتحانات ختم ہو چکے  
تھے۔ زلزلہ کارڈ وکیل صاحب کے ہاتھوں میں تھے۔  
وہ خوشی سے سرشار تینوں بچوں کو مبارکباد دے رہے تھے  
جنہوں نے اسے دن گریڈ حاصل کیے تھے۔

”شاباش میرے بچو اسی طرح دل لگا کر تعلیم حاصل  
کرتے رہو۔ اور کبھی بھی ایسا موقع مت آنے دینا کہ  
میری طرح مار کھاؤ۔“

”ہیں خالو جانی آپ نے مار بھی کھائی ہے؟“ امجد  
میاں نے سوال کیا زیب اور جنت بھی قریب ہی بیٹھی  
تھی۔

”ہاں امجد میاں صرف ایک مرتبہ مار کھائی تھی۔“

ایک سال کے اندر امجد کی حیثیت واقعی سسرالی  
کتے کے جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ کام کی زیادتی نے امجد کو تھکا  
مارا تھا۔ اُسے شدت سے آرام کی ضرورت محسوس ہو رہی  
تھی۔ اور آج تو سر میں سخت درد کی بنا پر امجد کو آنکھیں  
کھولنے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ امجد نے مجبوراً پاس  
بیٹھی ہوئی مشہورہ کو سردبانے کے لیے کہا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا، میں تمہاری پاس ہوں امجد  
نوکرانی نہیں۔ شرم نہیں آتی مجھے سردبانے کا کہتے  
ہوئے۔“

”مشہورہ ہر وقت ایم ڈی کا چوغہ پہنے رہنا ٹھیک  
نہیں، ورنہ۔“

”ورنہ کیا مجھے مارو گے۔ طلاق دو گے؟“ مشہورہ  
سچ پاتوتے ہوئے گرجی تھی۔

”ہاں ہاں! میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔“ امجد سر  
میں ہونے والی دھمک سے بیتاب ہو کر جوابا بیچتا۔

”تو دے دو طلاق۔۔۔ ویسے بھی ایک ایم ڈی کا  
شوہر تم جیسے سچ ماتحت کو نہیں ہونا چاہیے۔“ مشہورہ نے  
امجد کو جڑایا۔

”اگر مجھ سے اتنی ہی بے زار ہو تو میں تمہیں آزاد  
کیے دیتا ہوں۔“

”مشہورہ یزدانی ولد عثمان یزدانی میں پورے ہوش  
دو اس میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق  
دیتا ہوں۔“ مشہورہ امجد کو مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہی تھی۔

”امجد اب تم یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتے۔ جلد  
از جلد یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔ خبردار تن کے کپڑوں  
کے علاوہ اس گھر کی کوئی شے لے جانے کی ضرورت نہیں  
ہے۔“

امجد غصے کی حالت میں اٹھا اور پیر پختا ہوا گھوٹی سے  
نکل کر سڑک پر آ گیا۔ برے وقت کو آتے دیر نہیں لگتی۔

اسے رہ رہ کر اپنی معصوم بیوی جنت یاد آ رہی تھی۔ جو اس  
کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی۔ ذرا سے بخار یا بلکے  
سے سرد رہ جانے پر وہ ساری ساری رات جاگ کر امجد  
کا سرد بانے اور اسے دلا سہ دیتے ہوئے گزار دیتی تھی۔

مغرب کی بلدادہ مشہورہ اور مشرق کی پٹی ہوئی جنت میں

وکیل صاحب جواب دے کر نظریں جھکاتے ہوئے سوچوں میں گم ہو گئے۔ کچھ دیر بعد دوبولے۔

”اس وقت میں چوغھی کلاس میں پڑھتا تھا۔ عمر یہی کوئی دس گیارہ سال کی رہی ہوگی۔ ایک دن میں اسکول صرف پانچ منٹ لیٹ پہنچا جس کی سزا کے طور پر استاد محترم نے میرے گال پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے نصیحت کی کہ جہانگیر میاں وقت کی قدر کرنا سیکھیں۔“ خیر چھٹی کے بعد میں گھر پہنچا تو غصے کے مارے برا حال تھا۔ میرے ابو اخبار پڑھ رہے تھے اور ای قریب بی بیٹھی ہوئی کپڑوں پر مبن ٹانگ رہی تھیں۔

”جہانگیر بیٹے ادھر آئیے۔“ ابو نے اخبار ایک طرف رکھ کر مجھے بلایا اور میں خاموشی سے اُن کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے بیٹا منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟“  
”دیکھیے نا ابو آج کلاس ٹیچر نے میرے گال پر تھپڑ مارا ہے۔“

”اوہ، یہ تو انہوں نے بہت برا کیا کہ دوسرا گال چھوڑ دیا۔“ اتنا کہتے ہی ابو نے بھی ایک کرار تھپڑ میرے دوسرے گال پر رسید کر دیا۔ تو بچوں میں نے اپنی ای کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھا وہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں اور کبھی ابو کے ہاتھ سے پٹنے نہیں دیتی تھیں مگر ای نے اس روز مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے ابو سے کہا۔

”لگا میں دو تھپڑ میری طرف سے، آج ان کی اتنی مجال ہوگئی کہ اپنے استاد محترم کی شکایت گھر پر آ کر کر رہے ہیں۔“

”جہانگیر میاں میں سب کچھ براشت کر سکتا ہوں۔ لیکن جو استاد تعلیم کے پڑ لگا کر آپ کو آسمان کی بلندیوں پر اڑنا سکھا رہے ہیں۔ اُن کی شکایت میں آئندہ آپ کے منہ سے نہیں سنوں۔“ ابو نے سختی سے مجھے تنبیہ کی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ ابو اسکول میں جا کر ضرور استاد محترم سے باز پرس کریں گے۔ مگر ابو اور ای کے رویے نے مجھے سمجھا دیا کہ استاد کی عزت اور تعلیم کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اور ہاں میں یہ بھی بتلاتا چلوں کہ روز صبح بیدار ہو کر کلمہ شریف پڑھنے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑا

ہو جاتا ہوں اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھ کر گالوں پر ہتھیلیاں پھیرتا ہوں اور پھر ان ہتھیلیوں کو عقیدت و احترام سے چوم لیتا ہوں۔ بچو! میں آج جس مقام پر کھڑا ہوں صرف اُن دو تھپڑوں کی بدولت جو استاد محترم اور میرے والد نے میرے گالوں پر مارے تھے۔ میری قابلیت کو اعلیٰ عدالتیں بھی تسلیم کرتی ہیں۔ پہلے مجھے ان تھپڑوں پر غصہ آیا تھا مگر اب دن و دنوں محترم ہستیوں کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔“ اتنا کہہ کر وکیل صاحب خاموش ہو گئے تھے۔

”ابو پرسوں ہماری کلاس فیلو شہناز کو کلاس مس نے اُس کی شیطانی پر صرف ڈانٹا تھا۔ اور کل شہناز کی ای اور بڑی بہن نے کلاس میں آ کر مس کو اتنا ذلیل کیا کہ وہ روتی ہوئی استغاثی دے کر چلی گئیں۔“

”ہاں بھی امریکہ میں قانون ہے اگر ماں باپ بچے کو ڈانٹیں تو سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ دراصل ہمارا معاشرہ ایک ایسی سواری پر سوار ہے جو برف پر پھسلتی ہوئی اس کھائی کی طرف جا رہی ہے جس میں مغربی تہذیب کا تعفن بھرا ہوا ہے۔ اور ہم ہیں کہ اُن کی تقلید میں مرے جا رہے ہیں۔ آپ کی مس کو ذلیل کرنا اور اُن کو نوکری چھوڑ جانے پر مجبور کرنا۔ یہ..... یہ صرف جھوٹی اٹا ہے۔ دکھاوا ہے کہ دیکھو ہم کتنے پانی میں ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہونا چاہیے کہ وہ استاد کو بھی نہیں نکال رہے ہیں۔ بچے کے دل سے استاد کے احترام اور تعلیم کی اہمیت کو نکال رہے ہیں۔“

”کیا خیال ہے بچو! آپ سب کے پاس ہونے کی خوشی میں کیوں نہ آج باہر لٹچ کیا جائے؟“ وکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے بچوں کو مخاطب کیا۔

”ابو زندہ باد..... ابو زندہ باد۔“ تینوں بچوں نے خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے تالیاں بجائیں تھیں۔

چنانچہ وکیل صاحب کے اشارے پر سب اہل خانہ تیار یوں میں مصروف ہو گئے۔

☆☆☆

”بھئی زیب آج کس بوتل میں چلا جائے؟“  
وکیل صاحب نے پیسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی اپنی بیگم سے دریافت کیا۔

READING  
Section



”سچ کی دعوت آپ کی جانب سے ہے تو چو اس بھی آپ کی ہی ہونی چاہیے۔“

”ہوں۔“ وکیل صاحب نے ہنکارا بھرا۔ ”تو پھر ہوئیں ڈی فرانس کیسار ہے گا؟“

”مجھے تو بہت پسند ہے۔ پڑ سکون ماحول، کشادہ اور سچ کیمین، اور لذیذ کھانے۔“ زیب خوش ہوتے ہوئے بولی تھی۔ تینوں بچے اور جنت باہر کی رونق دیکھنے میں مگن تھے۔

وکیل صاحب نے گاڑی پارکنگ لٹ میں لے جا کر روکی۔ اور اپنی فیملی کو لیے ایک الگ تھلک بنے ہوئے کیمین میں جا کر بیٹھ گئے۔ دریں اثناء امجد میاں نے سرگوشی میں جنت سے کچھ کہا تھا۔

”بھائی جان میں امجد کو داش روم میں لے جا رہی ہوں۔ آپ آتی دیر میں سچ منگوا لیے گا۔“ جنت نے اتنا کہہ کر امجد کا ہاتھ تھا ما اور کچھ فاصلے پر ایک قطار میں بنے ہوئے واش روم کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

وکیل صاحب کے آرڈر کے مطابق وین سچ لے آیا۔

کچھ دیر بعد جنت امجد کو لیے واپس آگئی اور سچ شروع کر دیا گیا تھا۔

کھانے کے دوران وکیل صاحب ہلکی پھلکی گفتگو سے سب کو ہنساتے رہے۔ جب ہی کیمین کے دروازے کو ٹوک کیا گیا۔ وکیل صاحب نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ آدھا گھنٹہ پورا ہو چکا تھا۔ جنت نے فوراً نقاب چہرے پر گرالیا۔

”آ جاؤ بھئی۔“ وکیل صاحب نے با آواز بلند وینر کو مخاطب کیا تھا۔

وینراندر داخل ہوا اور کولڈ ڈرنک میز پر سجانے لگا۔ معاف جنت کے ہاتھ سے چمچ چھوٹ کر پلیٹ میں گرا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھی رہ گئی۔

”ارے ارے..... کیا ہو گیا تمہیں۔“ زیب نے کھانا چھوڑ کر جنت کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھ کر سوال کیا۔

”ہاں ہاں! بتاؤ بیٹی جنت یہ اچانک کیا پریشانی لاحق ہوگئی آپ کو؟“ وکیل صاحب تشویش ناک لہجے

میں گویا ہوئے۔

”جنت۔“ وینر نے چونکتے ہوئے حیرت سے دہرایا۔

”صاحب جی یہ جنت ہیں؟“

”ہاں میاں یہ ہماری چھوٹی بہن جنت ہے۔ مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”صاحب جی! میرا نام امجد ہے۔ میری پیاری بیوی کا نام بھی جنت ہے جو مجھے دنیا کی دوزخ میں جلا ہوا چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلی گئی ہیں۔“

”اچھا تو تم ہی ہو وہ سنگدل انسان۔“ وکیل صاحب خشکی نظروں سے چند لمحے امجد کو گھورتے رہے پھر بولے۔

”مسٹر امجد جنت خود سے نہیں گئی تھیں انہیں آپ نے گھر چھوڑ کر چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ شوہر پرست بیوی گھر سے نہ نکلتی تو اور کیا کرتی۔ کیوں کہ دوسری صبح

آپ اُن کو وہ تکلیف دہ الفاظ سنا دیتے جن کو میں وکیل ہوتے ہوئے اپنی زبان پر لانا نہیں پسند کرتا۔ کاش اتنا تو سوچا ہوتا کہ ایک گھر بیلوٹنگی جس نے تنہا نکل کے کبھی باہر

کی دنیا نہ دیکھی ہو۔ وہ ایک معصوم جان کو لیے کہاں چھکتی پھرے گی۔“

جنت خدا پر توکل کر کے اور آپ کے حکم سے مجبور ہو کر نکلی تھیں۔ تو وہ نالکب کائنات اپنے چاہنے والوں کو

کیسے بے آسرا چھوڑتا۔ یاد رکھیے مسٹر امجد دنیا کے آسرے ختم ہو جاتے ہیں مگر جو خدا کے آسرے اور اس

کی مدد پر ایمان دہین رکھتے ہیں وہی لوگ عظیم ہوتے ہیں۔ جنت میری بیگم کو ملیں اور بیگم انہیں گھر لے آئیں۔

اللہ تعالیٰ نے جنت کو بھگنے نہ دیا اور نہ ان کی عزت پر کوئی حرف آیا۔ اب جنت ہم میاں بیوی کی چھوٹی بہن کی حیثیت سے باعزت زندگی گزار رہی ہیں۔

”اور آپ..... مسٹر امجد خدائے بزرگ و برتر نے آپ کو خود اسی سزا سے گزارا ہے جو آپ نے اپنی معصوم

اور پاکباز بیوی کے لیے جو بیزگی تھی۔ جنت بیٹی کو وہی مقام حاصل رہا جو اُن کے پیاروں کی موجودگی میں اُن کو حاصل تھا۔

مگر اب آج خود کو دیکھیں کس عالم میں ہمارے

سامنے کھڑے ہیں۔ کتنی شرم آ رہی ہے آپ کو اس جلیے میں دیکھ کر ہم سب کو۔ اس کو کہتے ہیں مکافات عمل۔ شکر کیجیے امجد صاحب آپ کی نیک بیوی نے ہمیشہ آپ کی بہتری کی دعائیں مانگی ہیں اور آپ خدا کے غضب سے صرف اتنی ہی سزا کے مستحق ٹھہرے۔ ورنہ ایک وکیل ہونے کے حیثیت سے خدا کے چاہنے والے بندوں پر ظلم کرنے والوں کے میں نے بڑے بھیا تک حشر ہوتے ہوئے دیکھے ہیں۔“ وکیل صاحب نے حتی الامکان سخت لفظوں سے بچتے ہوئے سخت غصے کے عالم میں دل کھول کر امجد کی خبر لی تھی۔ جنت کی موجودگی میں امجد کے لیے فی الحال اتنا ہی ڈوز کافی تھا۔

”صاحب جی مجھے اپنا ہر تصور منظور ہے۔ ایک مرتبہ صرف ایک مرتبہ مجھے اپنی جنت سے معافی.....“

”میری تربیت میں اللہ کی رضا اور شوہر کی عزت اور مرتبے کا احترام شامل ہے۔“ جنت نے نقاب الٹ کر اپنے شوہر کو مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”کتنی عظیم ہیں میری بہن آپ۔ اس پر آشوب اور نئے حیاتی کے دور میں مذہب اسلام کی سیپ سے نکلے ہوئے آپ جیسے گوہر نایاب کو دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔“ وکیل صاحب کچھ دیر تک جنت کو تعریفی نظروں سے دیکھتے رہے پھر وہ امجد سے مخاطب ہوئے۔

”جائے اور جا کر منیجر کو بلا کر لائیں۔“ کچھ دیر بعد منیجر بوکھلایا ہوا کہین میں داخل ہوا تھا۔

”سر کیا میرے ویئر سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی؟“

”غلطی ہوئی نہیں بلکہ ہوگئی تھی اور یہ حضرت اس کی سزا بھی پا چکے ہیں..... خیر یہ بتانا ضروری نہیں ہے آپ صرف اتنا کریں ان کا کلیئر کر کے ذرا جلدی فارغ کر دیں۔“

”ابھی لیجیے سر! صرف پندرہ منٹ کی اجازت دے دیں۔“

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وکیل صاحب کی فیملی واپس روانہ ہو چکی تھی۔ البتہ اس فیملی میں ایک فرد کا اضافہ ہو چکا تھا اور وہ تھا امجد۔

☆☆☆

”زیب۔“ وکیل صاحب نے برابر میں بیٹھی ہوئی

اپنی بیگم کو مخاطب کیا۔

”زیب جنت بیٹی کو دس ہزار روپے دے دو۔“ وہ امجد کو خالی ہاتھ اور ایک ہی میلے جوڑے میں دیکھ چکے تھے۔ پھر وہ جنت سے مخاطب ہوئے تھے۔

”جنت بیٹی آپ لوگ آج آرام کریں۔ اور کل صبح شہر جا کر امجد جو بھی پسند کریں آپ انہیں وہ کپڑے اور شوژ دلوا دینا۔ ٹھیک ہے۔“

”بہت بہتر بھائی جان۔“ جنت نے اوب سے جواب دیا تھا۔

اس دوران زیب رقم نکال چکی تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے رقم جنت کے ہاتھ میں تھمائی۔ پھر جنت کے قریب بیٹھے ہوئے امجد کے گال کو کچڑ کر دو تین ہولے ہولے جھٹکے دیے۔

”گڈ لک۔“ زیب نے امجد سے کہا۔

”ٹھینکس۔“ امجد نے جھینپے ہوئے انداز میں جواب دیا تھا۔

گاڑی کوٹھی میں داخل ہوئی اور باوروی ڈرائیور فوراً ہی گاڑی کے قریب آ کر اوب سے کھڑا ہو گیا۔

”سنو یوسف۔“ وکیل صاحب نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔

”جی مالک حکم۔“

”کل صبح کار تیار رکھنا۔ کل تم بیٹی جنت اور ان کے شوہر کے تابع رہو گے۔“

”جو حکم مالک۔“ ڈرائیور نے اوب سے جواب دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

نجر کی اذان کے شروع ہوتے ہی جنت کے ساتھ ساتھ امجد میاں بھی گھبرا کر بیدار ہو گئے۔ امجد میاں ماشاء اللہ اتنا قرآن مجید پڑھ چکے تھے جس سے نماز کے مطلوبہ فرائض ادا کر سکیں۔ دونوں ماں بیٹے نے جلدی جلدی وضو کیا اور امجد نماز کے لیے مسجد میں جانے کو تیار ہو گئے۔

”امجد۔“ اچانک امجد نے آواز دی اور امجد میاں چونک کر جی اڑ گئے ہوئے امجد کے قریب آ کھڑے ہوئے۔

READING  
Section



”کہاں جا رہے ہیں؟“

”ابو.....م..... مسجد میں نماز پڑھنے۔ اللہ میاں سے باتیں کرنے۔“ امجد میاں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

”بیٹا آپ اکیلے ہی جا رہے ہیں۔ اپنے گنہگار ابو کو ساتھ میں نہیں لے جائیں گے؟“

”سچ ابو آپ بھی نماز پڑھنے چلیں گے؟“ امجد سے امجد نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں بیٹا! جس ذاتِ عظیم نے آپ ساٹھا فرشتہ اور آپ کی ماما کی صورت میں جسے دنیا ہی میں جنت بخش دی ہو وہ بد نصیب کب تک اپنے پیدا کرنے والے کی نافرمانی کرتا رہے گا۔“ یہ کہہ کر امجد نے بھی اٹھ کر وضو کیا۔ دو رکعت سنت موکدہ گھر میں ادا کی پھر بیٹے نے باپ کی انگلی پکڑی اور دونوں مسجد کی جانب روانہ ہو گئے۔

”ابے میرے اللہ آج انہوں نے فلاح کی جانب پہلا قدم رکھا ہے۔ تو ان کے قدموں کو استقامت بھی بخشنا۔“ جنت نے مسکراتے ہوئے خدا سے دعا کی۔

آج جنت بہت خوش تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر لان میں آگئی۔ لان میں مور اور مورنی کا جوڑا دانہ ڈنکا چگنے میں مصروف تھا۔

”اے مجھ ناتواں کو خوشیوں کی دولت سے نہال کرنے والے کس زبان سے تیرا شکر کروں۔ ہر ہر مقام پر میری دستگیری فرمائی۔ دلوں کے بھید جاننے والے وہ آرزویں جو ابھی میرے دل میں تھیں اور زبان تک نہیں آئیں تھیں۔ میرے بن کے وہ بھی ٹونے پوری کر دیں۔ میرے غفور و الرحیم کتنا مہربان ہے تو۔ جو ہاتھوں کے اٹھنے سے پہلے ہی میری مرادوں کو بر لاتا ہے۔“

تب جنت دو زانو ہو کر نرم و ملائم گھانس پر بیٹھ گئی۔ وہ ساتوں قراتوں پر مکمل عبور رکھتی تھی۔ جنت نے ہاتھ سینے پر باندھے آنکھیں بند کیں اور چوتھی قراتوں میں تلاوت شروع کر دی۔

باغ میں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی باد صرصر آہستہ آہستہ یادِ نسیم کے خوشگوار جھونکوں میں تبدیل ہو کر بیٹھ گئی۔ درختوں پر چھپھاتے پرندوں کا شور مسمم گیا۔ لان میں دانہ

ڈنکا چگنے والے مور اور مورنی کے جوڑے نے اچانک گردنیں اٹھا کر جنت کو دیکھا۔ وہ برابر ٹھٹھکی باندھے جنت کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جنت کے قریب پہنچ کر اس کی زانو سے دائیں بائیں لگ کر بیٹھ گئے۔ جنت نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اپنے ہاتھ مور مورنی کی پشت پر رکھ کر دوبارہ تلاوت میں مصروف ہو گئی۔ معصوم پرندوں کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنی گردنیں جھکائے یوں کلام ربانی کو سن رہے تھے جیسے وہ اس عظیم کلام کے ایک ایک لفظ کے معنی اور مطلب کو سمجھ رہے ہوں۔

آج کا انسان چاہے اس دے جانے والے درس سے سبق حاصل نہ کرے۔ وہ قرآن کی تلاوت ایک عام انداز میں کر کے گویا اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ لیکن جنت اللہ سبحانہ تعالیٰ کی عنایات کو پا کر اس کی محبت میں ڈوب کر تلاوت کر رہی تھی۔ تو پھر اس مقدس کلام کا اثر بادر صرصر و درختوں پر چھپھانے والے پرندوں اور موروں کے جوڑے پر کیوں نہ ہوتا۔

☆.....☆.....☆

ایک دفعے بعد دوپہر کے کھانے پر وکیل صاحب نے امجد کو مخاطب کیا۔

”امجد میاں آپ کل تیار ہو کر ٹھیک دس بجے گڈ لک کا سمینکس اینڈ لیدر گارمنٹ لپنی چلے جانا۔ وہاں منیجر سلیز کی آسای خالی ہوئی ہے۔ اور کل انٹرویو ہیں، یہ بہت بڑی کمپنی ہے اس کے مالک کا نام سر جنید ہے۔ وہی انٹرویو لیں گے۔ آدی گو کہ بہت سخت ہیں مگر آپ گھبرانا مت اور پوری آزادی سے سوالوں کے جواب دینا۔“

”بہت بہتر بھائی جان، میں آج ہی اپنی سی دی تیار کر لیتا ہوں۔“ امجد نے جواب دیا تھا۔

کمپنی کے ہال میں کنڈیڈٹس کی بڑی تعداد موجود تھی۔ امجد کو ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ بالآخر چڑا ہی نے اس کا نام پکارا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

سر جنید خاموشی سے امجد کی سی دی کو دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے امجد سے ان کے دادا کا نام پوچھ کر خود ہی سی دی کو مکمل کیا تھا۔ سر جنید مختلف سوالات کرتے رہے اور امجد اپنے جوابات سے انہیں مطمئن کرتا

READING

58 سچی کہانیاں

”افسوس جنت، میں ناکام رہا؟“  
 ”چلیں کوئی بات نہیں دل چھوٹا نہ کریں۔ اللہ ضرور  
 کوئی وسیلہ پیدا فرمائے گا۔“

”جنت میں نے تو پورے خلوص کے ساتھ اپنے  
 رب کے آگے سر جھکا یا ہے۔ شاید اُس کی بارگاہ میں  
 میرے سجدوں کو شرف قبولیت حاصل نہیں ہے۔“  
 ”ایسا نہیں کہتے اللہ تعالیٰ سجدوں کی توفیق بھی انہی کو  
 بخشا ہے جن کے سجدے قبول فرماتا ہے۔“ جنت نے  
 محبت سے سمجھایا تھا۔

بچوں کے اسکول سے آتے ہی دوپہر کا کھانا لگا دیا  
 گیا۔ وکیل صاحب بھی آچکے تھے۔ چنانچہ کھانا شروع  
 کر دیا گیا۔ دریں اثناء امجد نے اپنے انٹرویو کے نتیجے  
 سے وکیل صاحب کو آگاہ کیا اور کھانا کھا کر خاموشی سے  
 بیٹھا رہا۔

”بھائی جان..... انہیں افسوس سے خدا نے ان کے  
 سجدوں کو شرف قبولیت نہیں بخشا اسی لیے انٹرویو میں قیل  
 ہو گئے ہیں۔“ جنت نے وکیل صاحب سے کہا۔ وکیل  
 صاحب نے مسکراتے ہوئے پہلے جنت پھر امجد کی طرف  
 دیکھا۔

”امجد بنیاں جب کسی گتھکار اور بھنگے ہوئے بندے  
 کی پیشانی اپنے رب کے حضور زمین سے جاگتی ہے تو اس  
 کی رحمت یہ گوارا ہی نہیں کرتی کہ اس کے آگے جھکنے  
 والے سر کو بے مراد رکھے۔ یہ لیجیے۔“ وکیل صاحب نے  
 ایک لٹافہ امجد کی سمت بڑھایا۔

”کیا ہے بھائی جان اس میں؟“ جنت نے بیٹابی  
 سے سوال کیا۔

”اس لٹافے میں ان کا اپائنٹمنٹ لیٹر ہے۔ سر جنید  
 نے انہیں سیز ٹیمر کے عہدے پر رکھ لیا ہے۔ تنخواہ پچاس  
 ہزار روپے ماہانہ ہے اور کمپنی کو فائدہ پہنچانے کی مد میں  
 مزید ترقی کے مواقع بھی ہیں۔“

کچھ دیر بعد امجد جنت کے ہمراہ مبارکباد وصول  
 کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ امجد میاں باہر بہنوں  
 کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

”جنت کیا واقعی خلوص دل سے مانگی جانے والی  
 دعاؤں اور سجدوں میں ایسی تاثیر ہوتی ہے؟“ امجد نے بی

”مسٹر امجد! آپ کی قابلیت اور تجربے نے ہمیں  
 خاصا متاثر کیا ہے۔ تاہم ہمارے ساتھ پرائیلم یہ ہے کہ  
 ہماری حریف کمپنی ہمیں ہر میدان میں شکست دے رہی  
 ہے۔“

”دراصل ہماری پروڈکشن اتنی نہیں ہے کہ ہم دیے  
 گئے آرڈرز کی مانگ پوری کر سکیں۔ لامحالہ ہمیں اپنی  
 پیداوار بڑھانے کے لیے دو نمبر مال کا سہارا لینا پڑے  
 گا۔ کیا آپ باہر کے ممالک میں ہمارے مال کی کھپت  
 کے لیے تیار ہیں؟“

”سوری سر، میں دو نمبر مال کے فیور میں نہیں  
 ہوں۔“

”مسٹر یہ کمیشن کا دور ہے۔ ہر شے میں ملاوٹ  
 ہو رہی ہے۔“

”اور آپ کیا یورپ والوں کو اتنا بیوقوف سمجھتے  
 ہیں۔ ان کی جدید لیبارٹریز دو منٹ میں کھرا اور کھوٹا  
 الگ کر دیں گی۔“

”جب آپ یہ رسک لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو  
 انٹرویو دینے کیوں تشریف لے آئے۔ جائے جا کر کسی  
 مسجد کے پیش امام بن جائیں۔“

”تھمیک یوسر۔“ امجد اٹھا اور سب لوگوں پر ایک  
 طائرانہ نظر ڈالتا ہوا دروازے پر پہنچ کر رُک گیا۔ وہ سب  
 اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”افسوس دینی تعلیم میں اتنا قابل نہیں ہوں جو کسی  
 مسجد کے پیش امام کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ البتہ بے  
 ایمانی کے کام میں اپنا ضمیر بیچنا اور وطن عزیز کی عزت کو  
 دوسرے ممالک کی نظروں میں گرانا قبول نہیں۔“ امجد اتنا  
 کہہ کر تھکے تھکے قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہو گا۔

سر جنید نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھتے  
 ہوئے گردن ہلائی۔ اور پھر تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر  
 مسکرانے لگے۔ پھر سر جنید نے چیز اسی کو حکم دیا۔  
 ”دوسرے امیدوار کو بھیجو۔“

☆☆☆

”انٹرویو کیسا رہا؟“ جنت نے امجد کے جوتے  
 اتارتے ہوئے پوچھا۔

READING  
 Section



وی آن کرتے ہوئے جنت سے سوال کیا۔

اس سے پہلے کہ جنت کوئی جواب دیتی۔ ٹی دی پر دکھائی جانے والی تو ابلی امجد کے سوال کا جواب دہرا رہی تھی۔

خلوص دل کے سجدے رائیگاں جایا نہیں کرتے  
خدا کے نام لیوا غم سے گھبرایا نہیں کرتے

☆.....☆.....☆

امجد نے اپنی ساری توانائی کمپنی کی ترقی پر خرچ کر ڈالی تھی۔ کمپنی پہلے ایک شفٹ کام کرتی تھی مگر بڑھتی ہوئی مانگ نے دوسری اور پھر تیسری شفٹ کھولنے کی راہ ہموار کر دی۔ نتیجتاً لوگوں کو نہ صرف روزگار ملا۔ بلکہ کمپنی کی آمدنی کا ہدف لاکھوں سے نکل کر تیزی سے کروڑوں تک پہنچ گیا تھا۔

آج چھٹی کا دن تھا اس لیے سب گھر پر ہی موجود تھے۔ اجانک ٹیلیفون کی گھنٹی گنگنائے لگی۔

”ہیلو“ وکیل صاحب نے ریسیور کان سے لگا کر کہا۔ وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے کی جانے والی گفتگو کی آواز سنتے رہے پھر بولے۔

”بہت بہت شکریہ سر، ہم لوگ ضرور حاضر ہو جائیں گے۔“ یہ کہہ کر وکیل صاحب نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ”کس کا فون تھا؟“ زیب نے سوال کیا۔

”سر جنید تھے لائن پر۔ انہوں نے ہم سب کو لٹچ پر مدعو کیا ہے۔ آپ لوگ جلد از جلد تیار ہو جائیں۔ سر جنید وقت کے بہت پابند ہیں ہمیں ٹھیک ایک بجے ان کی کوئی پر پہنچنا ہے۔“

کار میں وکیل صاحب ان کی بیگم پچھلی سیٹ پر امجد، جنت، امجد اور دونوں بچیاں موجود تھیں۔ امجد میاں امجد کی گود میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”بیگم ہم شاید کسی غلط کوٹھی میں آگئے ہیں۔ وکیل صاحب نے کوٹھی کے مین گیٹ پر کھڑے اجنبی چہروں کو دیکھتے ہوئے بیگم کو مخاطب کیا۔

”واقعی وہ سر جنید اور ان کی بیگم تو نہیں لگ رہے۔“ زیب نے تشویش کے عالم میں جواب دیا۔ گاڑی آہستہ روی سے چلتی ہوئی رُک گئی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ

اجانک کھلا اور جنت ٹرپ کر باہر نکلی وہ بے قراری کے

عالم میں تیزی سے اجنبی شخص کی جانب لپکی اور دادا جان کہتی ہوئی اجنبی شخص کے سنے سے لپٹ گئی۔

”میری بیٹی کہاں کھو گئی تھی تو۔“ دادا جان نے بھرائی ہوئی آواز میں جنت کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

وکیل صاحب اور زیب سمجھ گئے کہ گیٹ پر کھڑے ہوئے مرد اور عورت جنت کے دادا، دادی ہیں۔ امجد دادا

دادی سے مل کر شرمندگی سے سر جھکائے اپنے ابو ہار دن میاں کے سامنے کھڑے تھے۔ اور ہار دن جنت کو

لپٹائے ہوئے سخت نظروں سے امجد کو گھور رہے تھے۔ بال آخر ان کے چچا رشید میاں نے بڑھ کر امجد کے سر پر

ہاتھ پھیرا پھر مسکرا کر بولے۔

”شام کا بھولا اگر دوپہر کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“ اس بگڑی ہوئی مثال پر سب مسکرائے لگے

تھے۔ رشید میاں نے فوراً ہی وضاحت بھی کر دی تھی۔

”در اصل یہ شام کو اپنی دوسری بیگم کے ہمراہ گھر سے نکلے تھے اور آج دوپہر کو واپس آئے ہیں۔“ سب

مل کر کوٹھی میں داخل ہوئے۔ سر جنید اور ان کی بیگم ہاتھوں میں پھولوں کے خوبصورت ہار لیے کھڑے

ہوئے تھے۔ سر جنید نے امجد کے گلے میں ہار ڈال کر اُس کی پیشانی چوم لی۔

”شکریہ سر“ امجد نے ادب سے سر جنید کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرا ہار سر جنید کی بیگم نے جنت کے گلے میں ڈال

کر اُسے امجد کے ملنے پر مہار کہا دوئی تھی اور جنت نے اُن کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا تھا۔

”باقی باقی بعد میں پہلے دعوت سے انصاف فرمائیں۔“ سر جنید سب مہمانوں کو کھانے کی میز پر لے آئے۔

کھانا پُر تکلف اور بہت مزیدار تھا سب نے سیر ہو کر کھایا تھا۔ جب نوکروں نے میز صاف کر دی تو سر جنید نے گفتگو کا آغاز کیا۔ تین خوشیاں مجھے ایسی ملی ہیں کہ میں

رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

پہلی خوشی، آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ میں امجد میاں کے دادا سے کیسے واقف ہوں۔ تو بھئی یہ

میرے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔ امجد کی سی وی پر میں اُن کا نام لکھتے وقت چونکا تھا۔ کیا میرے بچپن کا کلاس فیلو اور جگری دوست تو نہیں ہے۔

”ہاں میرے دوست تمہارا پوتا ان بلندیوں سے زیادہ کا اہل ہے۔ اور اب یہ صرف تمہارا ہی نہیں میرا بھی پوتا ہے۔ اور یہ بات میں دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں۔“

☆.....☆.....☆

سب لوگ چلتے ہوئے کوشی کے طویل و عریض خوبصورت باغ کو عبور کرنے کے بعد کوشی کے دیو قامت گیٹ سے اندر داخل ہوئے اور ان کے قدم یکدم ایک جھکے سے رُک گئے۔ سامنے جنت کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہی جھکی ہوئی گھنیری پللیں اور چہرے پر برستا ہوا نور جس کو کمرے کی آنکھ نے بہت خوبصورتی سے فوکس کیا تھا۔ جنت کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اُس کی بھنوں کو چھو رہی تھیں جبکہ بائیں ہاتھ اندر کی جانب چلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

جنت یقیناً اپنے پیاروں کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے گھر آنے پر مبارکباد دے رہی تھی۔ ایک شعر آسمان اور زمین کی جنتوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔

بانا کہ آسمان پر جنت کا ہے وجود  
ہوئی اگر ہو نیک گھر جنت سے کم نہیں  
سب ہال میں پہنچ کر نشستوں پر بیٹھ گئے۔ امجد جنت کو اپنے کمرے میں لے جانے کے لیے اوپر لے آیا تھا۔  
ہال میں واوا جانی سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”دیکھ لیا آپ لوگوں نے امجد میان اپنے مرکز سے کتنے دور جا چکے تھے۔ مگر دوبارہ وہیں واپس آ گئے ہیں۔ اور انشاء اللہ اب وہ بھی بھی مرکز سے جدا نہیں ہوں گے۔“

”جنت اپنے مبارک ہاتھوں سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولو۔“ امجد نے جنت کی طرف تالے کی چابیاں بڑھائیں۔ جنت نے گھنیری پللیں اٹھا کر امجد کو دیکھا اور بولی۔

”میرا کمرہ.....! کہیں میں پھر سے بے دخل تو نہ کر دی جاؤں گی۔“

”نہیں جنت ایسا وقت آنے سے پہلے میں خود اپنی زندگی سے بے دخل.....!“ جنت نے تڑپ کر امجد کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”اللہ نہ کرے۔ آئندہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے نہ سنوں۔ چلیے دروازہ آپ کھولیں۔“  
”نہیں دروازہ تم ہی کھولو گی۔“

بعد کی تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ یہ حضرت وہی ہیں۔ میں ان سے ملنے ان کے گھر جا پہنچا۔ دونوں میاں بیوی اپنے پوتے پوتی کے غم میں ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ میں نے ان کو دلاسا دیا اور بتایا کہ امجد میری کمپنی میں ملازم ہیں تو دونوں کی دُھار سن بندھی اور خوشی بھی ہوئی۔

”دوسری خوشی بیٹی جنت آپ سے وابستہ ہے۔ آپ نے جو عمل اپنے شوہر کے حکم پر کر کے دکھایا۔ اُس نے دُعا سلام کے پاکیزہ کردار کو زندہ کر دکھایا ہے۔ آپ جس مقدس ذات کے محبوب ہیں ان پر آنکھوں پر درود و سلام پڑھتی رہتی ہیں وہ بھلا آپ کو کیسے تنہا اور بے سہارا چھوڑ سکتے تھے۔ آپ وکیل صاحب کے گھر آ گئیں۔ امجد میاں آپ کو آپ کی گستاخی کی سزا ملی۔ تاہم آپ کی محترم بیوی اور بچے کی دعاؤں پر خدا کی رحمت جوش میں آئی اور اُس نے آپ کی سزا معاف کر کے دوبارہ جنت بیٹی سے ملوادیا۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں جو اتنی نیک شریک حیات آپ کو ملی ہے۔ درود و سلام پڑھنے والوں سے خدا اس لیے بھی زیادہ محبت کرتا ہے کیونکہ وہ اس کے محبوب ہیں۔“

”اب تیری خوشی!“ سرجنید نے رُک کر اپنی بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتی ہوئی انھیں اور ایک خوبصورت لفاظی امجد کو دیتے ہوئے بولیں۔

”بیٹا! امجد ہماری کمپنی میں جہز فیجر کی پوسٹ مبارک ہو۔“

”شکریہ ماوام بہت بہت شکریہ۔“ خوشی کے مارے امجد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سب ہی نے امجد کو مبارکباد دی تھی۔

”یہ لومیاں امجد یہ چابیاں اس کوشی کی ہیں جو وکیل صاحب کی کوشی کے عین سامنے بنی ہے اور یہ دوسری چابی کار کی ہے۔ کوشی ویل ڈیکوریٹڈ ہے۔ خانساماں، چوکیدار، مالی اور دیگر گھریلو ملازمین معہ کار ڈرائیور ہر وقت آپ لوگوں کے لیے کوشی میں موجود رہیں گے سارے ملازمین کی تنخواہیں پہنی کے ذمے ہیں۔“

”بھئی جنید تم نے تو میرے پوتے کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔“ فاوا جان مسکرائے۔



برداشت نہیں کر پاتی۔ مگر جنت اپنے شوہر کی خوشی کے لیے سب سے ٹکرائی تھی۔ اور دہن کو سچ پر لے جاتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھی۔

جنت کمرے سے اور پھر مشہودہ کے کہنے پر اپنے شوہر کے حکم پر گھر سے بے گھر ہوئی۔ تو مسکرا رہی تھی۔ اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا غم ضرور تھا مگر لبوں نے مسکراتا نہیں چھوڑا۔ مشہودہ کا ڈرائیور اسے بسپانک دیرانے میں بے یار و مددگار چھوڑ گیا۔ مگر جنت مسکراتی رہی۔ تاہم جنت آج پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور اس خوف سے گریہ کناں تھی کہ کوئی بے ادبی نہ ہو جائے۔

”میرے آقائے دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ میرا ناپاک وجود، بے ادب زبان گنہگار آئیں اور آپ کی بارگاہ سے اذن بازیابی، یہ گنہگار سخت شرم سار ہے۔ آپ کے دربار عالی وقار میں تو غوث، اولیائے کرام اور بزرگان دین جنہیں اللہ کا دوست بننے کا شرف حاصل ہے آپ کے حضور بے ادبی کے خوف سے لرزاں بد اندام رہتے ہیں۔ تو اس خاک کی کیا قیمت، ذرتی ہوں میرے درود و سلام کے جواب میں (لا) کی صدا نہ گونج اٹھے۔

جنت رو رو کر سارے جہانوں کی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے رو برو حاضری کے خوف سے لرزنی رہی۔ اچانک جنت کو ہلکی سی غنودگی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ہاتھ کی شیریں آواز سن رہی تھی۔

”وہ تو سراپا رحمت اور کرم ہی کرم ہیں انہوں نے صرف بازیابی بخشا ہے تو دل کیوں چھوٹا کرتی ہو۔ اُن کا حکم ہے کہ اُن کی بارگاہ بے کس میں سب سے پہلے تمہارے سلام کا جواب دیا جائے گا۔“

جنت نے غنودگی سے بیدار ہو کر فوراً آنکھیں کھول دیں۔ دل کو سکون مل گیا، بے قرار روح کو قرار آ گیا۔ جنت کی نگاہیں دیوار میں لگے سبز گنبد کے کمین کے طغر سے پر پہنچ کر رُک گئیں۔ جنت گنبد خضر کو آنکھوں میں بسائے ہوئے ہوئے گنگنا نے لگی تھی۔

جسے چاہا، رہے بلا لیا جسے چاہا اپنا مالیا۔ یہ بڑے کرم ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

☆☆.....☆☆

”یہ آپ کا حکم ہے؟“ جنت مسکرائی۔  
 ”نا بابا۔ میری توبہ میرے باپ کی توبہ جو سبھی حکم دوں البتہ التجا ہے۔ ریویسٹ ہے۔“

امجد دونوں کان پکڑ کر اٹھک چٹھک کرتے ہوئے گھٹکتھکیا تھا۔ اور جنت کھلکھلا کر ہنس دی۔  
 جنت نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور امجد اسے بازوؤں سے پکڑ کر کمرے میں آیا۔ امجد نے دوبارہ وہی شعر پڑھا تھا۔

مانا کہ آسمان پر جنت کا سے وجود بیوی اگر ہو نیک گھر جنت سے کم نہیں یکبارگی جنت کی تھکی ہوئی نگاہیں امجد کی نگاہوں سے ٹکرائیں تب وہ آگے بڑھی اور امجد کے سینے سے جا لگی۔

”سرتاج۔ اتنی بلندی نہ عطا کریں۔“  
 ”میرے بلند اور پاکیزہ کردار رکھنے والے ساتھی آپ کا مقام آسمان پر ہے۔ جسے پانے کی آرزو ہر مسلمان کے دل میں چمکتی رہتی ہے۔“

”اس عزت افزائی کے لیے ممنون ہوں۔“  
 ”جنت میں نے آپ کو کبھی کوئی تحفہ نہیں دیا تھا مگر آج ضرور دوں گا۔“  
 ”کیسا تحفہ..... کیا وہ کوئی قیمتی تحفہ ہے؟“

”تحفہ ہے تو بہت قیمتی۔“  
 ”اُف اللہ! سرتاج جلدی سے دکھائیے نا۔ وہ ایسا کون سا قیمتی تحفہ ہے؟“ جنت نے بے تابی سے پوچھا۔

جواب میں امجد نے جیب سے پلاسٹک اور ہوائی جہاز کے ریژن گٹ لکال کر جنت کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”جنت جن محبوب خدا کی محبت میں ڈوب کر آپ آٹھوں پہر درود و سلام پڑھتی رہتی ہو۔ اب اُن کے روضہ اطہر کے سامنے ادب سے کھرے ہو کر درود و سلام پڑھنا، ہم سب ایک میں عمر سے کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ میں یہ خوشخبری نیچے سب لوگوں کو سنانے جا رہا ہوں۔“

امجد اتنا کہہ کر کمرے سے چلا گیا تھا۔ اتنا عظیم تحفہ پا کر جنت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ تو بہت صابر و شاکر اپنے خدا کی رضا میں خوش رہنے والی لڑکی تھی۔ کوئی بھی اپنے سر پر سوکن کا لانا

دوسری طویل سچ بیانی

# تم مل گئے ہو!



محمد یوسف لغاری

پرت در پرت قسمت کی تاننا کیوں سے بڑی، ایک بہت خاص داستان، امریکہ عظیم سے



Downloaded From  
Paksociety.com

READING  
Section



”دیکھو جھولا اتنے زور سے دینا ہے کہ میرے پاؤں اُس نبی کو چھبنے چاہئیں“ تارفہ نے اپنی بہن عروشہ کو کہا۔

”اور کوئی حکم عروشہ نے کہا۔

”اور ہمیں شاعری کا وہ انتخاب بھی مٹانا ہے جو تم ابھی روشان کے کمرے سے لائی ہو۔ مگر دھیان رہے جب میں جھولے میں لہراتی ہوئی دو دروازوں تو تم خاموش ہو جانا اور جب میرے کان تمہارے پاس آئیں تو پھر دوبارہ شروع ہو جانا۔“ تارفہ نے شان بے نیازی سے حکم چلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے ملکہ عالیہ کوئی اور حکم؟“

”نہیں بس اب ہم جھولے پر بیٹھ کر پرواز کرنے لگے ہیں۔“ تم جھولے کو اڑانے کی تیاری کرو۔“ اس نے بھی خاص ملکہ کے اسٹائل میں جھولے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ویسے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ جوں ہی روشان صاحب کے آفس سے واپسی کا ٹائم ہوتا ہے، آپ بالکل گیٹ کے سامنے جھولے پر کیوں آ جاتی ہیں۔“ عروشہ نے جھولے کو پکڑتے ہوئے کہا۔

ہم اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہیں۔“ اس نے جھولے پر بیٹھتے ہی آنکھیں موند کر جواب دیا۔

”ادہ اچھا اگر باقی کوئی حکم رہ گیا ہے تو وہ بھی بتادیں۔“

”ہاں چلو انتخاب پہلے ہی سنا دو۔“

”اچھا جی لو سنو۔“ عروشہ نے کہا۔

دل چاہتا ہے، جب تم آفس سے تھک کر آؤ،

پھر میں تمہارے نال سہلاؤں،

تم مجھے اپنے آفس کی، دن بھر کی روداد سناؤ،

باتوں باتوں میں پھر جاناں،

ذکر کرو اک دو شیزہ کا،

اس کی محبت کا، اس کی وفا کا،

تب میں موڈ بناؤں، آنکھوں میں آنسو بھر لاؤں،

پھر تم ہنس کر سوری بولو،

میرے کانوں میں رس گھولو،

دل چاہتا ہے

دل چاہتا ہے!!!

”آئی انتخاب ختم ہو گیا ہے اور آپ اپنے بیلٹ کس

لین نہیں تو کوئی اینٹ ساتھ رکھ لیں۔ یہ نہ ہو آپ اڑ

جا سکیں کیونکہ جھولا پرواز کے لیے تیار ہے۔“ وہ جھولے کو کافی پیچھے لے جاتی ہوئی بولی۔ لگتا تھا وہ کسی شرارت کے لیے تیار تھی۔ مگر تارفہ کچھ نہیں بولی البتہ چہرے پر معصومیت صاف نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا وہ ابھی تک اسی نظم کے زیر اثر تھی۔ عروشہ نے جھولا کافی پیچھے لے جا کر اچانک زور کا دھکا دیا، ایک تو جھولا کافی پیچھے سے زور سے آ رہا تھا اور دوسرا عروشہ کا دھکا، جب کہ تارفہ نہ جانے کسی کے خوابوں میں گم سم جھولے پر بیٹھی تھی۔ اتنی اڑان برداشت نہیں کر سکی اور گھبرا کر چیخ پڑی اور فوراً جھولے کو پکڑ کر نیچے اتر کر عروشہ کو برا بھلا کہنے لگی جب کہ عروشہ اس کی حالت پر ہنس کر کہنے لگی کہ جناب بولا بھی تھا کہ اپنے بیلٹ کس لیں۔ نہیں تو کوئی اینٹ ساتھ رکھ لیں۔ یہ نہ ہو آپ اڑ جائیں اب چکھ لیا نہ مزا۔“

”یو بد تمیز، تم ہنس رہی ہو، میری جان نکل رہی ہے۔“ اس نے جوتا اُتار کر اس کو پارا، اب شو می قسمت

کہ عروشہ بالکل گیٹ کی جانب تھی وہ تو ہٹ گئی اور

وہاں سے سیدھا اندر آ رہے تھے جناب اسٹنٹ کمشنر

روشان اور وہ جوتا سیدھا اس کے ماتھے پر لگا اور

روشان ہائے اللہ میں مر گیا کہہ کر بیٹھ گئے۔ اب دونوں

بہنوں کی شکل دیکھنے والی تھی۔

روشان نے جلدی سے رومال نکال کر ماتھے پر

رکھا۔ وہاں سے خون جاری ہو چکا تھا۔ اس نے امید

بھری نگاہوں سے دور کھڑی تارفہ کو دیکھا، تارفہ نے یہ

دیکھ کر عروشہ کو کہا کہ جلدی سے ائی کو بلاؤ۔“

”ارے نہیں خالہ پریشان ہوں گی۔ بس تم جلدی

سے میرا فرسٹ ایڈ بیگ لے آؤ۔“ اُس نے عروشہ کو کہا

۔ کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ تارفہ اور اس کے بچے بہت کچھ

ہونے کے باوجود، بہت کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے دل میں

ہے، اس کی چوٹ پر پریشانی اس کے چہرے سے

صاف عیاں تھی۔

تھوری دیر بعد وہ عروشہ کی مدد سے اپنی پٹی کر چکا تھا

۔

”اب جلدی سے یہ سارا سامان واپس رکھ دو تاکہ

خالہ کو چنانہ چلے۔“ وہ اب درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھ

پر چکا تھا۔

”اچھا ویسے کیا استقبال تھا۔ وہاں آفس میں سارا

دن سر جی، سر جی ہوتی ہے اور یہاں آتے ہی کیسا

شاندار استقبال۔ ویسے کیا اب میرا نام بھی اس لسٹ میں لکھا جائے گا کہ فلاں شہری نے جوٹا اچھا لیا دیا کیوں عروشہ۔" وہ اپنے مزاحیہ سوڈ میں آگیا تھا۔

"مشکل ہے کیونکہ آپ صدر، وزیر اعظم نہیں ہیں، ویسے ایک اور لسٹ میں آسکتے ہیں۔" عروشہ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟؟؟"

"وہ یہ کہ شادی سے پہلے ایک لڑکی نے اپنے..... اس سے پہلے عروشہ کی بات عمل ہوئی۔"

"عروشہ کی بچی۔" تارفہ کی عصبانیت کی آواز سنائی دی ٹمبر میں تجھ سے پوچھتی ہوں۔ اور اس نے دوسرا جوٹا اتارتے ہوئے کہا، یہ دیکھ کر عروشہ اندر کی جانب کی بھاگی اور تارفہ اس کے پیچھے لپکی۔ اور روشان ان دونوں کو دیکھنے لگا۔

مگر تارفہ ایک لمحے کے لیے رک گئی۔

"روشان صاحب وہ جوتے کے لیے پوری ہمیں پتا نہیں تھا کہ آپ اندر آ رہے ہیں۔ ہم نے عروشہ کو مارا تھا اور وہ آپ کو لنگ گیا۔"

"اُس کے کوئی مسئلہ نہیں۔ ابھی تو وہ اتنا زور کا لگا ہے تو کوئی بات نہیں یہ شکر ہے وہ خالی تھا ورنہ اگر اُس کے اندر انسانی وجود خود موجود ہوتا تو میرا کیا حال ہوتا۔" روشان نے اپنی عادت کے مطابق کے مسکراتے ہوئے کہا۔

مگر یہ بھی تازہ تھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس اتنا کہا کہ کھانا رکھا ہوا ہے میں آتے کے کمرے میں بھجوا رہی ہوں۔" اور کمرے میں چلی گئی۔

"تارفہ کب تمہاری زبان کا تالا کھلے گا۔ اتنا تو ہم خوب جانتے ہیں کہ تمہاری دل کی دھڑکن میں ہم بستے ہیں مگر بد قسمتی سے آپ بھی میری طرح شرمیل ہو اور شاید ضدی بھی کہ اقرار روشان کی طرف سے ہو، اور ہم بھی یہ بات سوچتے ہیں کہ اقرار تارفہ صاحبہ کی طرف سے ہو۔ اب بات ضد کی ہے اچھا دیکھتے ہیں کہ کتنا صبر ہے اور ویسے بھی صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے مگر یہاں تو کڑواہٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ روشان صاحب۔" وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا کمرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

READING  
Section

شام کو روشان کی ڈی سی اوصاحب کے ساتھ فلڈ پلان پر میٹنگ تھی، اگر وہ کھانا کھاتا تو تھری پیس استری نہ کر سکتا تھا اس لیے اس نے تھری پیس استری کر لیا اور کھانا چھوڑ دیا، اب آئے روز کی میٹنگز کی وجہ سے بہت پریشان ہوتا، اب اس کو زندگی کے کسی جیون ساٹھی کی ضرورت تھی۔ تارفہ کے سوا وہ کسی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ خود اس کے ماں باپ بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے تو تارفہ کی ای مطلب اس کی خالہ زہرہ نے اس کو پالا پوسا تھا اور خالہ زہرہ کے شوہر انکل زیدی بھی فرشتہ صفت انسان تھے۔ انہوں نے بھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا جب کہ روشان نے خود بھی کبھی ان کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

اب جب کہ اس کو کسی سہارے ضرورت تھی تو وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ کس سے بات کرے اگر خالہ سے بات کرتا ہے تو خالہ ناراض ہی نہ ہو جائیں، تو اس کے ذہن میں آیا کیوں نہ عروشہ سے بات کی جائے تاکہ وہ خالہ زہرہ سے بات کرے، اس بات پر وہ مطمئن ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

تارفہ اور عروشہ دو بہنیں مگر گہری دوست زیادہ تھیں دکھ سکھ، خوشی غمی ایک دوسرے کے ساتھ بانٹتا اور ان کو کسی اور سہیلی کی ضرورت نہ تھی۔ خالہ اور انکل زیدی کی جان تھی، تارفہ بہت شرمیلی تھی۔ مجھ سے بلکہ خاندان کے کسی بھی لڑکے سے تنہائی میں یا سب کے سامنے بات چیت سے گھبراتی تھی اور اور اپنا راز کسی کے ساتھ نہیں بانٹتی تھی۔ عید پر اپنی شانگل بھی نہیں کرتی تھی اس کے لیے جو آجاتا تھا وہ بہن لیتی تھی۔ عیدی جوں جوں وہ چپ کر کے لے لیتی تھی مگر اس کے برعکس وہ گھر کے کاموں میں طاق تھی اور خالہ زہرہ کی خوب مدد کرواتی تھی اور اس لیے اپنی چھوٹی بہن کی نسبت اپنے امی ابو کی آنکھوں کا تارا تھی مگر ایک خای تھی کہ کانوں کی بجلی تھی۔ کسی نے اُس بتا دیا کہ فلاں تمہارے بارے میں یہ بولا ہے تو وہ بنا تصدیق کیے اس سے بول چال بند کر دیتی تھی۔ جب کہ عروشہ اس کے برعکس تھی۔ وہ اتنی شرمیلی تھی نہ بہت چالاک۔ سب سے بات چیت کرتی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ حد سے تجاوز کر جاتی۔ اس میں یہ خای تھی وہ مذاق مذاق میں دوسروں



کی لڑائی کروا کر اٹھوئے کرتی۔ اس کی گندی عادت سے سب خائف تھے مگر وہ باز نہیں آتی تھی اور تاروفہ کی نسبت شرمیلی نہیں تھی اور بہت ضدی تھی اور دل میں ٹھن جائے کہ میں نے یہ چیز حاصل کرنی ہے تو بس اس کو حاصل کر کے ہی رہتی تھی، خود میرا بھی یہی حال تھا میں بھی شرمیلا تھا اور بے پناہ ضدی تھا۔ تاروفہ اور عروشہ کے سوا کسی اور لڑکی سے بات کرنے پر میری جان نکلتی تھی۔ میں اپنے کردار کو مضبوط رکھنا چاہتا تھا تو بس میرا گھرانہ بھی یہی تھا خالہ اور انگل زیدی نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور میں ضلعی انتظامیہ آفس میں اسسٹنٹ کمشنر تھا۔

میرے دل میں تاروفہ کے لیے کب محبت پیدا ہوئی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ پھر یہ کب محبت سے طوفانی محبت میں بدلی اس کا بھی مجھے اندازہ نہیں ہوا، اور اس بات کا مجھے بھی اندازہ تھا کہ تاروفہ کے دل میں میرے لیے ضرور پیار بھرے جذبات ہیں مگر ہمارا اصل مسئلہ وہی میرا شرم و حیا اور شرمیلے پن کا تھا کہ اظہار کون کرے اور وہ اپنے راز کسی سے باقی بھی نہیں تھی۔

جبکہ میں اتنے سالوں کی محبت کو میں اپنے ہونٹوں پر لا کر جوں ہی میں تاروفہ کے سامنے آتا میرا سارا طوفانی پیار ہوا کی طرح اڑ جاتا۔ ایک دفعہ میں نے ہمت کر کے اس کو کہنے کی کوشش کی تو ابھی میں اپنے سارے الفاظ زبان پر لایا ہی تھا کہ میری ٹانگیں کانٹنے لگیں۔ زبان تالو سے چپک گئی اور تاروفہ میری شکل دیکھنے لگی اور وہ میرے سامنے ہلکی دفعہ ہنسی اور بھاگ کر چلی گئی۔ پھر میں نے اندازہ لگایا یوں ”اظہار محبت“ ہمارا کام نہیں ہے اور سوچا کہ کیوں نہ کسی کی مدد لی جائے۔ پھر جس شام کو میری ڈی سی اوصاحب کے ساتھ فلڈ پلان پر میٹنگ تھی، اگر میں کھانا کھاتا تو تھری پیس استری نہ کر سکتا تھا اس لیے تھری پیس استری کر لیا اور کھانا چھوڑ دیا، اب آئے روز کی میٹنگز کی وجہ سے میں بیست پریشان ہوتا، اب مجھے زندگی کے کسی جیون ساگی کی ضرورت تھی تاروفہ کے سوا میں کسی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا تو میں کارڈ رائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کس سے بات کرنا خالہ سے بات کرتا ہوں تو خالہ ناراض ہی نہ رہیں، تو میرے ذہن میں آیا کہ عروشہ سے بات کی جائے تاکہ وہ آگے اپنی ای

سے بات کرے، اس بات پر میں مطمئن ہو گیا تھا۔ میٹنگ میں یورپی ٹیم نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ ہمیں اپنا اسٹاف دیں ہم ان کو ساتھ امریکہ لے جائیں گے اور ان کی فلڈ پلان پر ٹریننگ کروائی جائے گی جس پر مجھ سمیت پانچ بندوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اب ہمیں جلد ہی چھ ماہ یا ایک سال کے لیے امریکہ جانا تھا۔

میں شام کو لوٹا تو دل بہت اداس تھا میں تو تاروفہ کے بنا ایک دن نہیں گزار سکتا تھا یہاں تو سات سمندر کی دوری دانی بات تھی تو میں نے فیصلہ کیا کہ کیوں تاکہ عروشہ سے بات کر کے اس کو ساری حالت بتا دوں تاکہ وہ خالہ زہرہ سے بات کر لے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور تاروفہ کا ہاتھ مانگ کر نہ لے جائیں۔

☆☆☆

شام کو میں نے عروشہ کو بلایا اور دنیا کی ساری ہمت اپنے اندر اکٹھی کی۔ مگر پھر بھی بولا نہیں گیا، آخر کار عروشہ ٹھگ ہو گئی تو اس پوچھا کہ روشاں کوئی کام ہے تو بتاؤ۔

”ہاں۔“ میں توانائی اکٹھے کرتے ہوئے بولا۔ ”بات یہ ہے کہ میں آج تم سے زندگی کی اہم ترین بات کرنا چاہتا ہوں تو وہ بات یہ ہے کہ میں، وہ.....“ میں پھر ہمت کھونے لگا تھا۔

”اے روشاں کیا میں، میں لگا رکھی ہے اتنا شرمانے دانی کیا بات ہے جو بولنا ہے وہ بولو۔ میں آپ کے دل کی حالت سمجھ سکتی ہوں۔ عروشہ نے میری ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں عروشہ بس بات یہ کہ مجھے تم پلیز کسی سے کچھ کہنا مست پتا نہیں میرے دل میں کب محبت پیدا ہوئی۔۔۔۔۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔۔۔۔۔ پھر یہ کب محبت سے طوفانی محبت میں بدلی۔ اس کا بھی مجھے اندازہ نہیں ہوا، مجھے اظہار محبت کرنا نہیں آتا میں کئی دفعہ کوشش کی ہے مگر ناکام ہوا ہوں۔ اب بہت ڈسڑب ہوتا ہوں۔ مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت ہے اب ہر روز خالہ کو تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اتنے بچے تازہ گرم کھانا چاہیے یا میں اتنے بچے گھر آؤں گا تو آپ اتنے بچے گیٹ کھولنا، پھر میری چیزیں ادھر ادھر ہو جاتی ہیں چلو کوئی بندہ ان کی حفاظت کرنے والا ہوگا۔ مجھے کپڑے وغیرہ وقت پر مل جائیں گے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تم خالہ تک اور تاروفہ

یورپی ٹیم نے جب سے ہم کو سلیکٹ کیا تھا اس کے فوراً بعد ہماری امریکہ جانے کی تیاری شروع ہو چکی تھی جو کہ میری لیے سوہان روح تھا مگر یہ سب برداشت کرنا تھا۔ ویزا، پاسپورٹ کو کچھ ابھی کچھ دن باقی تھے اس کے لیے سرکاری سطح پر کوشش جاری تھی اور جلد ہی یہ کام منٹ جانا تھا۔ اس پہلے ہی مجھے عروشہ کی طرف سے جواب چاہیے تھا۔

پھر ایک دن میں صبح سوکر اٹھا تو میں حیران رہ گیا کہ میرے جوتے اور کپڑے سلیتے سے پینگر پر لٹکے ہوئے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آ سکی کہ یہ کس کا کارنامہ ہے تاہم یہ فائدہ ضرور ہوا کہ میرا ٹائم بچ گیا اور پھر اس طرح ہر روز ہونے لگا۔ میری ہر چیز مجھے ٹائم بڑھاتا ہو کر ملنے لگی مگر یہ بات معترض رہی کہ یہ کون کر رہا ہے۔

پھر آخر وہ دن بھی آ گیا جس دن مجھے امریکہ روانہ ہونا تھا۔ اس دن میں سوچا ہوا تھا کہ اچانک میرے کمرے میں کوئی چیز گرنے کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا تو عروشہ میری شرٹ پینگر پر لٹکا رہی تھی اور میری خینڈ بیدار ہونے پر کہنے لگی کہ سوری روشان میں شرٹ رکھ رہی تھی تو یہ گلہ ستہ کر گیا۔

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے اس کو اپنے کمرے پا کر اچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

تو یہ سب کئی دنوں سے عروشہ کر رہی تھی۔ میں نے سوچا۔

”اچھا سنو! میں نے اس کو پکارا۔“

”جی۔“ وہ جاتے ہوئے پٹائی۔

”وہ تم نے تاروف سے بات کی تھی؟“ میں نے کہا۔

میری چھوڑو آپ نے خود بات کی۔“ عروشہ نے کہا۔

”اب تم کیسی بات رہی ہو تم کو پتا بھی ہے میں اس معاملے میں کورا ہوں اور میری زبان نہیں کھلتی۔ اس لیے میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔“

”ہاں میں نے اس سے بات کی تھی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے آپ کو کہا تھا نا کہ وہ پتھر کا مجسمہ ہے۔ روشان صاحب اس کے دل میں آپ کے لیے شاید کوئی فیصلہ نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے وہ پتھر کا مجسمہ ہوگی مگر دنیا میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو پتھر کے مجسموں کو پوجتے ہیں اور ان

سے تک میرا یہ پیغام دو میں تاروف سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔“ میں نے آخری الفاظ بہت مشکل سے حلق سے آواز نکالتے ہوئے کہا۔

”کیا کہا تم نے، تم تاروف کی بات کر رہے ہو۔“

عروشہ نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔“ میں نے کہا۔

”کیا وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے۔“ اس نے حیرانی سے سوال کیا۔

”اس نے کبھی کہا تو نہیں پر اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے کچھ نظر ضرور آتا ہے۔ ویسے بھی وہ شریکی ہے نا۔“ میں نے کہا۔

”آنکھوں سے جھلکتا پیار، روشان صاحب فلموں کے ڈائلاگ مت بولو حقیقی دنیا میں آؤ۔“ وہ ہنسے ہوئے بولی۔

”ہاں، مگر فلمیں جھوٹی مگر ڈائلاگ سچے ہوتے ہیں۔ اچھا ویسے اس نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا ہوا۔“ میں نے اس کو پوچھا۔

”روشان صاحب میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ حقیقی دنیا میں آپس کی آنکھوں میں کچھ نظر آنے سے پیار نہیں ہو جاتا۔ لازمی نہیں آپ کو آپ سے پیار ہو، اور ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی عزت کرتی ہو، کیونکہ اس نے کبھی مجھ سے ایسی ویسی کوئی بات نہیں کی اور مجھے نہیں لگتا جو آپ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہو اور تاروف آپ سے پیار کرتی ہو۔“ اس نے کافی آہنی سے کہا۔

”کیا کہہ رہی تم۔“ میں نے پریشان ہو کر کہا۔

”اچھا خیر چھوڑیں۔ اب مجھے کیا کرنا ہے۔“

عروشہ نے کہا۔

”ہاں تم میرا پیغام تاروف اور ای تک پہنچا دو کیونکہ مجھے ڈر لگتا ہے۔ کئی دفعہ کہنے کی کوشش کی ہے مگر ہمت نہیں ہوئی اور لگتا ہے کہ میں زندگی بھر نہیں کہہ سکوں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں مگر روشان صاحب میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ انسان کو اگر دو راستے نظر آ رہے ہوں تو لازمی نہیں کہ انسان کو صرف ایک ہی راستہ دیکھنا چاہیے بلکہ دوسرے راستے پر نظر ڈال سنی جا سکتا ہے۔ وہ راستہ آسان ہو، بہر حال میں آپ کے لیے ضرور کوشش کروں گی۔“ عروشہ یہ کہہ کر چل گئی۔

مجھے ان بات کی بالکل سمجھ نہ آ سکی۔



کی مورتیاں گھروں میں رکھتے ہیں اور ان سے پیار کرتے ہیں مگر ہمارا معاملہ تو ایک زندہ مجسمے کے ساتھ ہے۔ جس کو بوجھتے نہیں ہیں مگر پیار کرتے ہیں بس چنگاری تو ہے مگر آگ لگانی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے روشن صاحب مگر شاید اس چنگاری کو آگ لگاتے لگاتے آپ کی عمر ہی ضائع نہ ہو جائے۔“ عروشہ لختی سے کہتی ہوئی باہر چلی گئی یہ لختی اور غصے میں۔ کیوں لختی سے میں نے سوچا۔

وہ دن میرے لیے سوہان روح تھا جس دن ہمیں امریکہ روانہ ہونا تھا۔ ایئر پورٹ پر ہمیں سب رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ انکل اور آنٹی تو بس رو رہے تھے عروشہ کی حالت بہت خراب تھی اور تاروفہ نہ رو رہی تھی نہ آنسو بہا رہی تھی، بس اس کی حالت ایسی تھی جیسے اس کا جسم کانپ رہا ہو اور اس کے جسم سے کسی نے خون پھوڑ لیا ہو۔

تجھے اظہارِ محبت سے اگر نفرت ہے  
تو نے ہونٹوں کو لرزے سے تو روکا ہوتا  
بے نیازی سے مگر کانپتی آواز کے ساتھ  
تو نے گھبرا کے مرانا نہ پوچھا ہوتا  
☆☆☆

نہ جانے لوگ پردہ میں کیسے رہتے ہیں۔ میں تو دو دن میں ہی پورا ہو گیا تھا۔ میرا جسم تو امریکہ میں تھا مگر دل پاکستان میں تھا۔

ہماری ٹریننگ شروع ہو چکی تھی یہ ٹریننگ لوگوں کو سیلاب کی صورت میں ڈوبنے سے بچاؤ، وغیرہ سے متعلق ہوتی تھی۔ جو کہ خاصی تھکا دینے والی ہوتی تھی پانی کی بہتی لہروں کو دیکھ کر مجھے تاروفہ یاد آ جاتی تھی اور میں جھنجھلا جاتا تھا، جس کی وجہ سے میں اکثر خیالوں میں رہنے لگا تھا پھر ان خیالات کی وجہ سے مجھے اکثر ڈانٹ بھی پڑنے لگی۔ ایک دن حد ہی ہو گئی۔ جب مجھے دوبار مخاطب کیا گیا مگر میں تو خیالوں میں پاکستان کھویا ہوا تھا۔ بس اس دن مجھے بہت غصہ آیا کہ یہ محبت کیا ہے۔ یہ دوری کیا ہے، کسی کو کھودینے کا نام کسی پالینے نام، یہ اذیت میں کب تک برداشت کروں گا۔ آخر میری آنکھیں کسی کی منتظر کب تک رہیں گی۔ کب تک کہتے ہیں تاکہ جس نے محبت نہیں کی اس نے اذیت محسوس

نہیں کی۔ محبت تو صبر کا نام ہے محبت لازمی مضمون ہے۔ جس نے اس کو اختیاری کے طور پر لیا وہ محبت کی لطافت کو چھپو لینے سے بھی محروم ہو گیا پھر میں نے اس دن عروشہ کو غصے میں کال کی اور تاروفہ کی خیریت پوچھی اور دھیرے سے اپنا مقصد پوچھا اور اس واضح کہا کہ آج تم مجھے ہر حال میں جواب دو کہ تاروفہ کیا کہتی ہے۔“

”روشان صاحب میں نے تو آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ان کے دل میں ایسا ویسا کچھ نہیں۔ یہ سب آپ کی غلط فہمی ہے۔ دنیا بہت وسیع ہے کسی اور جگہ نظر میں چھما میں۔ ہو سکتا ہے کوئی اور آپ کا منتظر ہو۔“

”عروشہ پلیز یہ دل ہے کوئی کمپیوٹر کاری سائیکل بن یا کوئی کچرا بن نہیں جس میں کسی کے لیے ہر روز بنی جگہ بن جائے یا جب فل ہو جائے تو ڈیلیٹ کر کے کسی اور Item کو گھس لیا۔ اس میں صرف بس اس کی ہی گنجائش ہے۔“

”اچھا!!! تو پھر تاروفہ تاروفہ کا الاگ لاتا ہے  
رہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”ہاں عروشہ تم کو ہنسنا آ رہا ہے نا کوئی بات نہیں تم ابھی محبت کے اس لطیف جذبے سے دور ہو تو نا اس لیے اس اذیت سے دور رہی رہو۔ اب بس میری یہ آخری کال ہے اور.....“ اس پہلے میں اپنی بات مکمل کرنا عروشہ نے فوراً میری بات کاٹ دی اور کہنے لگی۔

”کیا میں اس لطیف جذبے سے دور کیا میں اذیت سے دور ہوں۔ وہ کہتے ہیں تاکہ تمہیں اس سے محبت کرنی چاہیے جو تم سے محبت کرتا ہو مگر روشن تم کتنے بھولے اور سادہ ہو۔ محبت کی زبان صرف آئی لو یونہیں ہوتی۔ یہ آپ کو دوسرے بندے کی آنکھوں اور.....“

”بالکل عروشہ میں بھی یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے عروشہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تاروفہ نے گواہی زبان سے اظہار نہیں کیا کہ اس مجھے تو ایسا لگتا ہے مگر اب شاید ہمارا عشق، عشق ناقص بن چکا ہے اور یہ میری آخری کال ہے۔ آج کے بعد میں کوئی کال نہیں کروں گا۔ اپنا یہ نمبر ہمیشہ کے لیے بند کر رہا ہوں اور پھر کبھی پاکستان لوٹ کر نہیں آؤں گا میں تاروفہ کے سائے سے بھی دور چلا جاؤں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں، انکل اور آنٹی کی خدمت نہ کر سکا۔“ میں روتے ہوئے کہا۔

”نہیں روشن پلیز ایسا مت کرنا پلیز روشن میری بات تو سنو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ عروشہ یکدم میرے اس فیصلے پر گھبرا کر دوسری طرف سے زور زور سے کہنے لگی۔

مگر میں نے کال کاٹ دی اور پھر سم کے تمام نمبر موبائل میں سیو کیے اور سم کو توڑ کر پھینک دیا اور دوسری نئی سم لے لی اس فلڈ ٹریننگ جاب سے دل اچاٹ ہو چکا تھا اس جاب سے جان چھڑانی تھی مگر یہ سموزے مشکل مراحل تھے۔

اگلے دن میں نے اپنے پاکستان میں اپنے چند اعلیٰ افسر دوستوں کو فون کیا اور ان کے توسط سے یہاں سے جان چھڑائی اور یہاں سب کو بتایا کہ میں پاکستان واپس جا رہا ہوں مگر یو کے کی ایک کمپنی کے ساتھ میری بات ہو چکی تھی۔ یہ ایک بحری جہاز کمپنی تھی۔ وہاں مجھے جنرل منیجر کے اچھے عہدے کے پُرکشش تنخواہ کے لیے رکھ لیا گیا تھا۔

اور یہاں میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اپنا سب ماضی بھلا کر۔ ایک سال، دو سال، حتیٰ کہ پانچ سال گزر گئے۔ کسی نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کسی کو مجھ تک آنے کے لیے راستہ نہیں مل رہا تھا۔ میں اپنی زندگی میں مصروف ہو چکا تھا بس بھی کبھی دل کے کسی کو نے گھدڑے سے آواز آنی کے تارزہ کیسی ہوگی، عروشہ کدھر ہوگی، دونوں کی شادیاں ہو چکی ہوں گی۔ بچے کتنے ہوں گے۔ بس یہ یادیں تھی تو میں مسکراتا تھا۔

عہد فرصت میں کسی یار گزشتہ کا خیال جب بھی آتا ہے تو جیسے رگ جاں کھینچتا ہے

☆☆☆

ایک دفعہ جب میں اپنے کام میں مصروف تھا تو میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے دیکھا تو حیران رہ گیا پاکستان کا نمبر تھا۔ ریسیو کر کے کانوں سے لگایا تو دوسری طرف سے خالد زہرہ کی آواز تھی۔

”اسلام علیکم روشن“

”جی..... وعلیکم السلام میں ڈرتے ہوتے جواب دیا۔“  
”بیٹا اور کتنا دور بھاگو گے، ماں سے بیٹا دور نہیں بھاگ سکتا۔“ خالد نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”نہیں وہ بس خالد۔ میرے منہ سے مارے

شرمندگی کے ایک لفظ بھی نکل نہ سکا۔

”اچھا تم دو دن تک پاکستان پہنچ جاؤ۔“

”کیوں خالد خیریت تو ہے۔“

”ہاں خیریت ہی ہے وہ تارزہ کی شادی ہے اور

کام کو بوجھ ہوگا اس لیے تم جلدی سے آ جاؤ۔“

یہ بات سنتے ہی مجھ پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

”جی مگر خالد ادھر کاشی کام ہیں میں نے کہا۔“

”روشان تم نے آتا ہے یہ ہمارا حکم ہے۔“ خالد

نے اپنا پرانا حربه استعمال کرتے ہوئے کہا۔

”مگر وہ خالد!!!“

اس سے پہلے کوئی اور بات ہوتی رابطہ کٹ گیا۔ یہ قسمت میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی تھی۔ کیا تارزہ کی شادی اب ہو رہی تھی۔ میں کیسے جاؤں اس کے سامنے وہ میرے سامنے کسی دوسرے کی دلہن بن جائے گی میری آنکھیں بہہ اٹھیں۔ مگر دوسری طرف حکم تھا اور جس کی بجا آوری لازمی تھی۔

☆☆☆

آج میں پانچ سال کی طویل مدت کے بعد پاکستان واپس آیا تھا۔ پانچ سال اپنوں سے دور رہنا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔

سب لوگوں نے بڑی خوشی سے میرا استقبال کیا۔ کسی نے ماضی کو کریدنا کہ اتنا عرصہ کہاں تھے۔ بڑی مشکل سے سب کو جھوٹی جی کہانیاں سنا کر مطمئن کیا۔

میں تارزہ سے نہیں ملا تھا نہ ملنا چاہتا تھا اور نہ ہی مجھے عروشہ نظر آئی تھی۔ دوسرے دن نکاح تھا اور گویا مجھ پر پہاڑ گرنے والا تھا، نکاح کے دن جب مجھے انکل زیدی نے کہا کہ جا دیتا تارزہ سے نکاح فارم پر سائن کر داکر لے آؤ۔“

جی ہاں کیوں کہ اس کا نکاح کسی اور کے ساتھ ہو رہا تھا تو مجھے ایسے لگا جیسے میں مر جاؤں گا۔ میں جیسے تھے اس کے کمرے میں گیا کیونکہ اُسے تو میری دلہن بن کر آتا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کی کیا رہے تھے۔ اس نے دستخط کر دیے۔ میں رجسٹر لے کر گھڑا ہوا تو آخر اس کا ضبط جواب دے گیا تارزہ رونے لگی وہ سسکیاں بھرنے لگی جو کچھ اس نے مجھ سے کہا وہ میرے لیے



نا قابل برداشت تھا وہ مجھے سے کہنے لگی،  
”روشان تم ایسا کیوں کیا؟“

میں حیران رہ گیا۔ میری سماعتیں حیران تھیں کہ  
ایک مجسمہ بولا تھا۔  
”میں نے کیا کر دیا ہے۔“ میں نے حیران ہو کر  
پوچھا۔

”تم نے ہمیں پیار کا جھانسا دیا دھوکہ دیا“ فریب  
دیا۔ ”وہ روتے ہوئے بولی۔

”کیا کہہ رہی ہو تم، میں نے تم کو دھوکہ دیا۔ میں  
نے تم سے کئی دفعہ بات کرنے کی کوشش کی مگر حوصلہ نہیں  
ہوا جو کہ تم خود جانتی ہو۔ پھر میں نے عروشہ کا سہارا لیا۔  
اور عروشہ نے تم کو کہا تو تم نے صاف انکار کر دیا کہ تمہارا

دل میں میرے لیے کوئی جذبات نہیں ہیں۔ اس  
لیے میں نے جبر کیا اور ہمیشہ کے لیے تم سے دور چلا گیا۔“  
”بس کرو روشان جھوٹ مت بولو اور کتنا جھوٹ  
بولو گے۔ تم عروشہ سے پیار کرتے تھے۔ اس سے

میرے بہانے گھنٹوں بات کرتے تھے۔ اس سے بات  
کرتے وقت تو تم کو پسینہ نہیں آتا تھا۔ تم تو محبت کے فلاسفی  
بنتے تھے اور شاعری پر مبنی ڈائریاں لکھتے تھے۔ روشان

تم کو صرف مجھ سے بات کرتے وقت ڈر لگتا تھا۔ یہ سب تم  
دونوں کی چال تھی اور وہ تم سے پیار کرتی تھی۔“

”تاریفہ پلیز خدا کا واسطہ عروشہ اور ہمارے بیچ ایسا  
کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں اس کا احترام کرتا ہوں۔“  
”روشان وہ مجھے تمہاری ہر کال دکھائی تھی کہ آج

ہم نے اس موضوع پر بات کی۔ فلاں موضوع پر بات  
کی اور اور حتیٰ کہ اس نے تمہارے ساتھ کی گئی دو، دو  
گھنٹے کی کال سہری بھی دکھائی تھی اور تم اس سے شادی

کرنے والے تھے۔ تاریخہ بدستور سسکیاں بھر رہی  
تھی۔  
”اوہ میرے خدا! تاریخہ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں

کہ میری اس سے بھی دس منٹ سے بھی زیادہ بات نہیں  
ہوئی۔ اچھا میں ابھی عروشہ کو بلا کر لاتا ہوں اس کے منہ پر  
سب حقیقت پوچھ لو۔“ میں نے شدید غصے میں کہا۔

”روشان صاحب! مردے گواہی دینے نہیں  
آتے۔“  
”کک..... کیا مطلب۔“

جب آپ نے آخری دفعہ کال کی تھی تو آپ نے کہا  
70

تھا کہ میں ادھر امریکہ میں ہی کسی اور لڑکی سے شادی کر  
رہا ہوں اور وہ بے چاری تم سے یہ کہتی رہ گئی کہ روشان  
پلیز ایسا مت کرنا۔ پلیز روشان میری بات تو سنو! میں تم  
سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ مگر تم نے اس کی کال کاٹ دی  
اور اس صدمے سے اس کو ہارٹ اٹیک ہوا کیونکہ وہ تم  
سے بہت پیار کرتی تھی اور وہ بیچ تو گئی اور ایک سال تک  
تمہارا نمبر ٹرائی کرتی رہی اور پھر تمہاری جدائی کا صدمہ  
برداشت نہ کر سکی اور اس نے ایک دن خودکشی کر لی۔“

”کیا عروشہ نے خودکشی کر لی۔ اوہ مائی گاڈ۔“ یہ  
میرے لیے نیا صدمہ تھا۔  
اچانک دروازہ بج اٹھا باہر تارنہ کی خالدہ تھی۔  
”بیٹا جلدی آؤ۔“

”جی بس آیا۔“ میں نے کہا جس پر وہ چلی گئی۔  
لیکن تارنہ یہ پانچ سال پرانی بات ہے اور شاید  
میں نے آخری کال پر میں نے اس کو ایسا کچھ نہیں کہا

تھا۔ میں نے جب بھی اس کو کال کی تمہارے حوالے  
سے کی تھی اور اس دن بھی میں نے تمہارا ہی کہا تھا کہ  
میں اپنا یہ نمبر ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا۔ میں تمہارے

سائے سے بھی دور چلا جاؤں گا اور پھر کبھی پاکستان  
لوٹ کر نہیں آؤں گا اور کسی دوسری لڑکی کی بات بھی نہیں  
ہوئی تھی اور۔“

اس سے پہلے کوئی اور بات ہوتی تاریخہ نے  
میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور روتے ہوئے کہا پلیز  
یہاں سے چلے جاؤ اور تم نے جو ہم کو دھوکہ دینا تھا وہ

وہ دیا اور ہمارے منہ سے تم اقرار سنا چاہتے تھے نا  
تو سنو روشان! تم ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑتے  
تھے مگر اب ہم کوشش کریں گے یہ سب بھلا کر ایک نئی

زندگی کی ابتدا کر سکیں اور پلیز اب چلے جاؤ۔ اس کے  
بعد تاریخہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میرے پاس  
صفائی میں کچھ نہ تھا۔

میں کل بھی خالی دامن تھا اور آج بھی خالی دامن تھا۔  
میں نے بڑی مشکل سے رجسٹر ان لوگوں کے  
حوالے کیا اور شادی والے گھر سے باہر نکل آیا اور میں

نے کسی کو بتائے بنا اپنا سامان اٹھایا اور چپ چاپ  
پاکستان سے نکل آیا اور واپس اس دن اسٹیشن ٹکٹ بک  
گروا کر پو کے لوٹ آیا۔  
میرے ساتھ جو ہوا تھا کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا

ہوئے۔ عروشدہ کے ساتھ کیا ہوا تھا تارفہ نے کہا تھا کہ عروشدہ تم سے بہت پیار کرتی تھی، مگر عروشدہ نے تو مجھے کبھی نہیں کہا تھا۔

اجانک اس کی باتیں مجھے یاد آنے لگیں جب میں نے پہلی دفعہ عروشدہ کو کہا تھا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم خالہ تک اور تارفہ تک میرا یہ پیغام دو کہ میں تارفہ سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔ تو عروشدہ نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔

”کیا کہا تم نے۔ تم تارفہ کی بات کر رہے ہو۔“ عروشدہ نے حیرانی سے کہا تھا۔

”کیا وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے۔“ اُس نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔

وہ حیران کیوں ہوئی تھی؟؟؟؟

”روشان صاحب میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ انسان کو اگر در راستے نظر آ رہے ہوں تو لازمی نہیں کہ انسان کو صرف ایک ہی راستہ دیکھنا چاہیے بلکہ دوسرے راستے پر نظر ڈال لینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ راستہ آسان ہو۔“

وہ آسان راستہ کیا تھا؟؟؟؟

”سوری روشان میں شرت رکھ رہی تھی تو یہ گلہ ستم کر گیا!!!!!!“

”دنیا بہت وسیع ہے۔ کس اور جگہ نظریں گھما میں ہو سکتا ہے کوئی اور آپ کا منتظر ہو!!!!“

میرا منتظر کون تھا، عروشدہ؟؟

اور آخری دفعہ اس سے میری کیا بات ہوئی تھی۔ میں سوچنا نہیں چاہتا۔ میرا دماغ بو بھل ہو رہا تھا۔

کیا میں اس لطیف جذبے سے دور ہوں۔ کیا میں اذیت سے دور ہوں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ تمہیں اس سے محبت کرنی چاہیے جو تم سے محبت کرتا ہو مگر روشان تم کتنے بھولے اور سادہ ہو۔ محبت کی زبان صرف آئی لو یو نہیں ہوتی یہ آپ کو دوسرے بندے کی آنکھوں اور۔“

مگر اس کے آگے میں نے اُس کی کال سنی ہی نہیں تھی میں تو سمجھ رہا تھا۔ جو تارفہ کہہ رہی ہے اس نے سچ کہا تھا کہ روشان تم کتنے بھولے اور سادہ ہو، میں بھولا اور سادہ نہیں تھا۔ میں بے وقوف تھا۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی مجھ سے۔ روشان پلیز ایسا مت کرنا پلیز روشان میری بات تو سنو۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی

ہوں۔ مگر پھر اس شاید میرے خلاف تارفہ کو بھڑکایا ہوگا اور تارفہ کانوں کی ہنسی تھی۔ اس نے یہ سب سچ سمجھ لیا ہوگا۔ آہ سب اس عشق کی ہنسی فصلوں میں پھنس گئے۔

”عروشدہ تم نے یہ سب کیا کر دیا۔“ میں چیخ اٹھا۔

”تارفہ، عروشدہ۔“ میں چلانے لگا۔ تھوڑی بعد میں دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ آخری احساس جو مجھے تھا وہ یہ تھا کہ میرا اسٹاف بھاگ کر میری جانب آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہلکے سے درد کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ اعصاب پر نشہ سوار تھا۔ میں نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو یہ اسپتال کا کمرہ تھا۔

”میں کہاں ہوں۔“ میں نے تصدیق کرنی چاہی۔

اسپتال میں ہو اور تم بے ہوش ہو گئے تھے۔“

میرے انچارج نرس بخاری نے جواب دیا۔ یہ بھی پاکستان کے ہی تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد مجھے چند انجکشن لگائے گئے پھر مجھے چابنے کی اجازت دے دی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہم واپس آ گئے۔

”روشان ایک بات تو بتاؤ۔“

”جی سر۔“

”یہ عروشدہ اور تارفہ کون ہیں؟؟“

”سر۔۔۔ وہ۔۔۔ جانتا نہیں۔“ میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”جب تم گریے تھے تو تم نے یہی دو نام لیے تھے۔ دیکھو بتانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“

پھر میں نے مختصر سی داستان اُن کو سنا دی۔

”اچھا روشان اب میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔“ نرس بخاری صاحب نے میری کہانی سننے کے بعد کہا۔

”آج سے کئی سال پہلے کسی ملک کا ایک گاؤں تھا۔ اس میں ایک طاقت ور، وڈیرا اور جاگیر دار خاندان رہتا تھا، پورے گاؤں کی لگام باگ دوڑ اس کے ہاتھ میں تھی پھر اس گاؤں میں چند غریب خاندان بھی رہتے تھے اُن غریب خاندان کے لڑکے کو اُس طاقت ور، وڈیرے اور جاگیر دار خاندان کی ایک لڑکی سے پیار ہو گیا، یہ پیار یواگئی، چاہت کی آخری حدوں



وجد سے میں مہرین کو بھولنا شروع ہو گیا اور حیران بھی تھا کہ یہ کیا ہے ہم تو ایک ہیں ایک دوسرے کے بنا بھی نہیں گزار سکتے تھے اور پھر ماریہ کی محبت میں مہرین کو بالکل ہی بھول گیا اور اب ایک ہفتہ پہلے مجھے مہرین یو کے میں نظر آئی اور اس کا حلیہ ایسا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ وہ چنٹ شرٹ میں ملبوس تھی جب میں اس سے ملا معذرت کی کہ میں یوں اس کو چھوڑ کر آ گیا تو اس نے کہا کہ کوئی بات نہیں اُس کی شادی ہو گئی ہے اور بہت خوش ہے اور یہ اچھا ہوا کہ تمس میری شادی تم سے نہیں ہوئی۔

اگر تم سے ہوئی تو کیا میں اتنا آزاد ہوئی؟

روشان لگتا ہے تم اپنی محبت کی باز میں الجھ گئے ہو، روشان اس نے سچ کہا تھا میں واقعی اس کو اتنی آزادی نہ دیتا اور جب امی بیمار ہوئی تھیں تو کیا جتنی خدمت ظاہر کرنے کی تھی اُسی مہرین کرتی؟ گو یا یہ سب عشق کی ہتھی فصلیں ہیں کوئی محبت کو پا کر خوش رہتا ہے اور کوئی اس کو کھو کر خوش رہتا ہے جیسے میں آج ماریہ کے ساتھ بے حد خوش ہوں۔ اور روشان تم تو ابھی سے بہت ہار گئے ہو میں تمہارے لیے کوئی اچھا سارشتہ تلاش کرتا ہوں اور تمہاری شادی کروا دیتا ہوں اب فی الحال اٹھو۔ چلو اٹھو شاہا شہ۔

سرخس کی باتوں سے میری ہمت بندھ گئی تھی میں چند دن بعد دوبارہ ڈیوٹی پر جانے لگا وقت وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا پانچ سال بیت گئے میں یو کے کا ہی ہو کر رہ گیا۔ سرخس صاحب مجھے شادی پر زور دینے لگے تھے مگر میں اس کو ٹال رہا تھا۔

تاریف کی یاد آتی تو بھولنے کی کوشش کرتا مگر سوچیں جان ہی کب چھوڑتی ہیں کہ وہ کیسی ہوگی۔ اس کے بچے کتنے ہوں گے۔ اس طرح کے کئی خیالات آتے تو میں ذہن کو جھٹک کر کام میں مصروف ہو جاتا۔

☆☆☆

تم سے بچھڑنے کے بعد جی رہا ہوں اس طرح تیز آندھی میں ٹھٹھا رہا ہو چراغ جس طرح ایک دن بطلال کی امی میل آئی کہ اس کی شادی ہے تو تم پلیز تم جلد از پاکستان آؤ میں نے معذرت کی اور کام کی مصروفیت کا بتایا کہ میں نہیں آ سکتا۔

مگر اگلے دن اس کی پھر میل آئی ہوئی تھی جس میں اس نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا تھا اور آنے پر زور دیا تھا۔

کو چھونے لگا مگر ملن کی صورت نظر نہ آئی تو وہ لڑکی ضد کرنے لگی کہ وہ اس کو بھگا کر لے جائے مگر اس لڑکے نے ایسی گندی حرکت نہیں کی۔ اپنی محبت کو ہوس پر حاوی نہیں آنے دیا اور کسی کی پگڑی کو زمین پر نہیں گرنے دیا اور اُس لڑکے نے اس کو سمجھایا کہ مناسب وقت کا انتظار کرو۔ پھر اُس لڑکے کا بڑا بھائی اور بہنوئی کسی طرح بیردن ملک جانے میں کامیاب ہو گئے اور اور اچھی طرح سیٹل ہو گئے۔ پھر ایک دن طاقت ور خاندان نے معمولی سے جھگڑے پر ناحق اس لڑکے کے باپ کو مردادیا تو وہ لڑکی مزید گھبرائی اور اس کو دہا ل سے بھاگ جانے کا کہنے لگی۔ انتقام تو لڑکے کے دل میں بھی تھا مگر اس نے صبر کیا۔ پھر ایک دن اس لڑکے کی ماں کو اس کے پیار کا پتا چل گیا تو اس کو سخت صدمہ ہوا کہ جس نے اس کے باپ کو قتل کیا وہ وہاں شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ کئی دن اس سے ناراض رہی پھر ایک رات اس کی ماں کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ وہ لڑکا اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا ماں نے اس سے کہا میری خواہش ہے کہ تم میری بھانجی سے شادی کر لو اس نے وعدہ کر لیا۔

سرخس سانس لینے کے لیے رکا۔

میں نے اس کو سسکا کر دیکھا، یہ کہانی مجھے بہت دل چسپ لگ رہی تھی۔

”پھر کیا ہوا سرخس؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔  
”ہوا کیا آج وہ لڑکا سرخس بخاری تمہاری سامنے ہے۔“

”کیا وہ آپ تھے سرخس؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا، مگر آگے کیا ہوا تھا؟

”ہاں وہ میں ہی تھا میں نے امی کی بھانجی ماریہ سے نکاح کیا اور چپ چاپ ادھر یو کے آ گیا۔ یہ دس سال پہلے کی بات ہے۔“

”اور وہ لڑکی؟“ میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

یاد تم سنو تو سہمی وہی تو بتا رہا ہوں۔ یہ محبت والے اتنے جذباتی کیوں ہوتے ہیں، اس لڑکی کا نام مہرین تھا۔ ماریہ سے شادی کر کے میں بہت ادا رہا مگر اس نے آتے ہی سب کے دل جیتنے شروع کر دیے امی کی طبیعت خراب رہتی تھی اس نے بہت خدمت کی میں سوچتا تھا وہ ساری امی کے سرہانے بیٹھی رہتی تھی اور اس

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



پاکستان جانے کو تو دل میرا بھی کر رہا تھا مگر فی الحال میں نے بطل کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چند دنوں تک میں پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ سب سے پہلے میں نے پاکستان میں بطل کو بتائے بغیر اپنے لیے چند دن کے لیے ایک فلیٹ اور کار کا انتظام کیا تاکہ مشکلات نہ ہوں۔

اور آج آٹھ سال بعد میں پھر واپس پاکستان آ گیا تھا اور آنے کی ایک وجہ بطل کی شادی تھی اور اس کا اصرار بھی تھا مگر ہم نے اس کو انکار کر دیا تھا اور چلے بھی آئے۔ ہمارا ارادہ بطل کو سر پر اتار دینے کا تھا۔

شادی کی تقریب انکل زیدی کے میں گھر تھی ہمیں حیرانی بھی ہوئی کہ بطل کی شادی کی تقریب وہاں کیوں ہو رہی ہے۔ یہ کنفیوژن وہاں جا کر دور ہو گئی کہ ان کا مکان کافی بڑا ہو گیا تھا کیونکہ میں تو آٹھ سال بعد آیا تھا اور یہاں کافی تبدیلیاں ہو گئی تھی اور شاید اس لیے بطل کی شادی کا فنکشن وہاں رکھا گیا تھا کیوں بطل زیدی صاحب کا بھانجا بھی تھا اور دوسری وجہ یہ تھی ان کا گھر بالکل ساتھ ساتھ تھا ہم ٹھوڑا لپٹ ہو گئے تھے مگر تصویر بعد ہم مکان کے اندر تھے فی الحال ہم پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی لگتا تھا کہ نکاح کی تقریب شروع ہو چکی ہے ہم آہستگی سے نکاح کے رٹس کی جانب بڑھتے گئے میری کوشش تھی کہ میرا سامنا تارفہ سے نہ ہو۔ میں ابھی وہاں قریب ہی پہنچا تھا کہ اچانک مجھے زور دار آواز سنائی دی۔

”رودشان تم، یہ رودشان تم ہو بیٹا۔“

میں نے دیکھا تو خالہ زہرہ بھی اس کے ساتھ سب لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔

”ارے ہاں یہ رودشان ہے۔“

”مگر کیا زندہ ہے۔“

”یہ کدھر تھا۔“

”طرح طرح کی آوازیں آنے لگی تھیں۔“

ابھی میں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اپنے عقب سے نسوانی آواز سنائی دی

”رودشان تم؟؟“

اس آواز کو تو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا یہ تارفہ کی آواز تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا میرے باؤں نے زمین نظر گئی۔

وہاں دلہن کھڑی تھی مگر وہ تارفہ تھی۔ دلہن کے لباس میں میری تارفہ تو گویا بطل کی شادی تارفہ سے ہو رہی تھی۔ تو کیا یہ تارفہ کی دوسری شادی تھی۔

”تارفہ تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ چلو اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اس کی امی نے تارفہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ مگر لگتا تھا کہ اس نے سنا ہی نہیں۔

”رودشان کیوں آئے ہو یہاں، کیوں بار بار ہماری زندگی کو برباد کرنا چاہتے ہو۔“ تارفہ نے مجھے کہا۔

میں خاموش کھڑا تھا!!!

”بولو جو اب دو خدا کے لیے سرجاؤ، ہم نے سوچا تھا کہ تم مر گئے ہو، خدا کے لیے چلے جاؤ ہماری دنیا سے۔“ وہ یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔

یہ سب سننے کے بعد میں اپنے آپ کو گھسیٹ کر باہر کار تک لے آیا اور کار میں بیٹھ کر اپنے فلیٹ میں آ گیا۔

فلیٹ میں آتے ہی میں فرش پر ڈھے گیا اور بے اختیار رونے لگ کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا اور دوسری شادی کا کیا چکر تھا اچانک میرے روم کا دروازہ بج اٹھا۔

”کون۔“ میں نے ڈور کھولنے سے پہلے حیرانی سے پوچھا کہ ادھر کون آ سکتا ہے۔

”رودشان بھائی میں عشرت ہوں۔ بطل کی بہن۔“ دروازہ کھولے۔

(عشرت، تارفہ کی بیٹی تھی اور ہم دونوں کے بارے میں اچھی طرح جانتی تھی)

جس پر میں نے دروازہ کھول دیا۔

”عشرت آئی آپ؟“

میں نے حیرانگی سے اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”جی بھائی بہت مشکل سے سراغ ملا ہے آپ کا اس بار آپ کو کھودتی تو نہ جانے پھر کب موقع ملتا۔“

”اچھا خیریت تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ کیا حالت بنا رہی ہے تم ہاں اور کتنا بھاگو گے بھیا؟“

”فی الحال تو پتا نہیں کسی کو اپنی بے گناہی کا احساس دلانا ہے کہ میں بے دانا نہیں تھا اچھا خیر یہ بتاؤ کہ یہ دوسری شادی کا کیا معاملہ ہے۔“

”تاریفہ آئی اپنی پہلی شادی کے بعد آپ کو بھول نہیں سکی وہ مجھے بھی کہ آپ نے اس کو دھوکہ دیا مگر اس معاملے میں عروشہ کے خط نے ہماری مدد کی۔“

تاریفہ آئی شادی کے بعد اپنے دن رات کے شب روز معاملات اپنی ڈائری میں لکھتی رہی جس میں آپ کا احوال ہوتا تھا بد قسمتی سے وہ گھر میں اس کی ساس کے ہاتھ لگ گئی تو اس نے فوری طور پر اپنے بیٹے کو کہا کہ وہ یہ ڈائری تاریفہ کے ابو کے دکھائے اور اس کو طلاق دے۔ مگر میں نے اس کی ساس کے پاؤں پڑ کر معافی مانگ لی اور تاریفہ نے خود خلیج لے لی اور اس طرح شادی کے چوتھے ماہ ہی وہ اپنی ازادواجی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں سے مہندی بھی نہیں اتری تھی۔“

عشرت نے مجھے سسکیاں لیتے ہوئے بتایا۔  
”اور وہ عروشہ کے خط کی کیا کہانی تھی۔“ میں نے آنسو روکتے ہوئے پوچھا۔

آپ کو بتاتا تھا کہ عروشہ مذاق مذاق میں دوسروں کی لڑائی کروا کر انجوائے کرتی تھی۔ مگر ایک خالی تھی تاریفہ کی کہ وہ کانوں کی ہنگی تھی کسی نے اس کو بتا دیا کہ فلاں تمہارے بارے میں یہ بولا ہے تو وہ بنا تصدیق کیے اس سے بول چال بند کر دیتی تھی تو بس ایسا ہی ہوا۔ تم نے اپنے پیغامات کے لیے عروشہ کو چنا اور تمہارے بولنے کا انداز اس طرح تھا کہ وہ کافی اس طرح یہ سمجھتی رہی کہ تم اس سے محبت کرتے ہو مگر جب تم نے انکشاف کیا تو وہ محبت کی انتہا تک پہنچ چکی تھی جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی۔ پھر تم عروشہ سے بات کرتے تو وہ تاریفہ کو بڑھا چڑھا کر بتلاتی پھر جب اس کو معلوم ہوا تم اس سے نہیں بلکہ تاریفہ سے محبت کرتے ہو تو وہ جیسے مری مئی۔ تو پھر تم نے اچانک سب سے رابطہ ختم کر دیا تو عروشہ نے سوچا کہ اگر تم اُسے نہیں مل سکتے تو وہ تاریفہ کو بھی حاصل نہیں کرنے دے گی تو اس نے تاریفہ کو تمہارے بارے میں اس قدر بھڑکایا اور پھر چونکہ وہ کانوں کی ہنگی تھی اور کہ وہ تم سے بدول ہو گئی پھر تاریفہ کی شادی ہو گئی مگر عروشہ کو احساس ہونا شروع ہوا کہ اس نے کسی کی محبت چھین کر اچھا نہیں کیا تو اس احساس جرم میں پیار پڑ گئی پھر ایک دن صبح اس نے اپنے آپ کو خود ہی شام تک کی مہلت دی کہ وہ اگر روشن شام تک واپس آ گیا تو ٹھیک ورنہ وہ خودکشی کر

لے گی مگر تم نہیں آئے تو اس نے مرنے سے پہلے دو خط لکھے ایک تمہارے نام جو اس نے مجھے فون کر بتایا تھا کہ اگر کبھی تم واپس آ جاؤ تو تمہیں دسے دوں مگر وہ خط مجھ سے گم ہو گیا تھا مگر جب اس کی موت ہوئی تھی تو میں نے پڑھا تھا تو اس میں اتنا لکھا تھا کہ وہ اپنے کیے کی سزا پارہی ہے اور شاید کسی کی محبت کو حاصل کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ہو سکے تو روشن مجھے معاف کر دینا۔ اور ایک خط اس نے تاریفہ کو لکھا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ روشن صرف تم سے پیار کرتے تھے اور تم صرف دو تھے تیسری میں آ گئی۔ ہو سکے مجھے معاف کر دینا تب تاریفہ کو حقیقت کا علم ہوا۔“ عشرت نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”مگر جب تاریفہ کی شادی تھی تو میں اس سے نکاح فارم پر دستخط کروانے گیا تو اس نے چہری کوئی بات نہیں سنی تھی اور وہ اللہ مجھے الزام دیتی رہی تھی۔“

”ہاں وہ اس بات پر بھی بہت شرمندہ ہے مگر یہ آپ کی بد قسمتی ہے کیونکہ اس کی شادی کے بعد عروشہ کو یہ احساس ہوا کہ اس نے اچھا نہیں کیا تب اس نے ساری حقیقت تاریفہ کو بتائی مگر تم اس وقت یہاں سے جا چکے تھے۔ وہ تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی مگر تمہارا کوئی رابطہ نہیں تھا تو اس نے بھی تمہارے نام ایک خط دیا تھا اور کہا تھا اگر کہیں تم مل جاؤ تو یہ خط آپ تک پہنچا دوں اور اس کے علاوہ وہ تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی تھی۔“

”وعدہ!! کیسا وعدہ؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔  
”اس نے کہا تھا اگر تم نے شادی کر لی ہو تو ٹھیک ورنہ پلیز آپ کو ہماری محبت کی قسم شادی ضرور کر لینا۔“  
”عشرت آئی یہ کیسا وعدہ لینا چاہتی وہ مجھ سے میں ایسا قطعاً نہیں کروں گا۔“

”روشان یہ تمہاری مرضی مگر یاد رکھو اس نے تمہیں اپنی محبت کا واسطہ دیا ہے اب چو اس تمہارے سامنے ہے محبت کا واسطہ یا تمہاری ضد اس کا فیصلہ تم نے خود کرنا ہے اور یہ لو تاریفہ کا خط اس کو پڑھ کر مزید فیصلہ کر لینا۔“

”اچھا میں تاریفہ سے خود ملنا چاہتا ہوں اس سے خود بات کرنا چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے اس کے ساتھ یہ حالات پیش آئے اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں ایک بار سے میری ملاقات کروادو۔“

”نہیں روشن میں نے تاریفہ کو کہا تھا کہ ایک



پہنچ گیا جہاں مجھے شمس بخاری صاحب لینے آئے ہوئے تھے اُن کے ساتھ اب بھلائی کے تعلق دوستی میں بدل چکا تھا۔  
”ارے کیسا رہا تمہارا پاکستان کا سفر۔“ شمس صاحب نے گھر پہنچتے ہی بے تاب لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

”بس سر کچھ نہیں ایک گئی ہوئے پتنگ کی طرح حالت ہو چکی ہے میری اور اب ایسے وعدے کی پاسداری کرنی ہے جو شاید میرے لیے ممکن نہ ہو اگر وعدہ نبھاتا ہوں تو تب بھی سوہان روح ہے اور اگر نہیں نبھاتا تو تب بھی مجھ پر قرض ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے شمس صاحب کو تارفہ کا خط بھی پرھنے کے لیے دے دیا تاکہ ان کو پوری بات سمجھ میں آسکے۔

”ارے یہ تو اچھی بات ہے اس نے بہت اچھا لکھا ہے۔“ انہوں نے خط پڑھ کر کہا۔  
”سریہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یہ اچھی بات بھلا کیسے ہوئی۔ میں اس کے سوا کسی ساتھ زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”روشان تمہاری بات ٹھیک ہے محبت کے وعدے کو بھلانے میں ناگم لگتا ہے مگر اس نے تم کو اپنی محبت کا واسطہ فرے کر ٹریپ کیا ہے اور تمہارا بھلا سوچا ہے تاکہ تم بولیں اکیلے در در نہ بھٹکو ایک مرد عورت کے ساتھ تھوڑا سا کام تو گزار سکتا ہے مگر اس کے بنا اکیلے پوری زندگی اکیلے گھر میں نہیں گزار سکتا اگر وہ تم سے ایسے ہی کہتی کہ تم شادی کر لو تو تم اس کی بات بالکل نہ مانتے مگر اس نے کہیں دوسرے طریقے سے ٹریپ کیا ہے۔ اس لیے پلیز اس بار بے ضرور سوچو۔“

لیکن شمس صاحب ابھی اتنی جلدی میں اس بارے کچھ نہیں کرنا چاہتا لیکن کوشش کر رہا تھا تارفہ کے وعدے کی تکمیل کر سکوں۔“

☆.....☆.....☆

اس بات کو ایک ماہ گزر چکا تھا میرے معمولات زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں صبح اٹھتا نماز قرآن کی تلاوت کے بعد کام پر جانے سے پہلے تارفہ کے خط کو پڑھتا اور اسی خط سے معذرت کرتا کہ میں نے تمہارے وعدے کی تکمیل ناممکن ہے پلیز مجھے معاف کرنا اور پھر کام پر چلے جانا۔

ایک دن میں حسب معمول میں کام پر گیا تو شمس

مرتبہ تم دونوں مل لو مگر وہ کسی صورت راضی نہیں ہوئی۔ وہ اپنی بہن کی موت کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتی ہے۔ اس لیے تم سے بالکل نہیں ملنا چاہتی ہے نہ بات کرنا چاہتی ہے اور بہتر یہی ہے کہ تم بھی اس کا خیال ذہن سے نکال دو اس کو بھول جاؤ اور جس نے تم کو بھولا دیا اسے بھول جانے کی دعا کرو۔“ عشرت نے اس مسکراہٹ کے ساتھ مجھے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے عشرت آپنی میں کوشش کروں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے رویشان بھائی میں چلتی ہوں اپنا خیال رکھنا۔“ عشرت نے مجھ سے اجازت لیتے ہوئے کہا۔  
”ہاں ٹھیک ہے۔“

عشرت کے جانے کے بعد میں نے بے تابی سے تارفہ کا خط کھولا تو اس میں میرے نام چند سطریں لکھی ہوئی تھیں۔

”روشان مجھے حقیقت کا کچھ علم نہیں تھا جب علم ہوا تو میرا سب کچھ بکھر چکا تھا۔ اب لفظ محبت سے بھی مجھے نفرت ہے یہ سب مجھے دھوکا لگتا ہے فریب لگتا ہے آپ کا اور میرا ملنا تقدر میں نہیں تھا تم نے بھی درختوں پر ریشم کے کیڑے کو دیکھا ہے جو اپنے ارد گرد ہی خول بنا تا ہے پھر اس کے اندر ہی پھنس کر مر جاتا ہے بس میں بھی اس ہی ریشم کے کیڑے کی طرح محبت کے خول میں پھنس چکی ہوں جس سے رہائی ممکن نہیں اور نہ ہی تمہارے پاس واپسی ممکن ہے۔ بس اگر میری خوشی چاہتے ہو تو پلیز تم جلد از جلد شادی کر کے اپنا گھر بسالو اور تم کو یہ میری محبت کو واسطہ پلیز تم ایسا لازمی کرنا اور یہ بھی وعدہ کرو کہ تم جس عورت سے بھی سے بھی شادی کرو گے اس کو میرا مقام دو گے اس سے میری طرح محبت کرو گے۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم وعدے کی پاسداری کرو گے۔“

یہ میرے لیے خط نہیں تھا بلکہ اس طرح کا سوچنا بھی سوہان روح تھا اس طرح پریشانی میں میری آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح میں خالہ اور انکل وغیرہ سے ملنا چاہتا تھا مگر اُس گھر میں میرا جانے کو بالکل من نہیں کر رہا تھا جہاں سے تارفہ دو بار دہن بن کر گئی تھی۔

☆☆☆

اب میری منزل دوبارہ یو کے ہی تھی۔ میں یو کے

صاحب نے مجھے بلا لیا۔

”کیسے ہو روشن۔“

”سرخٹیک ہوں آپ سنائیں کیسے ہیں۔“

”میں تو ٹھیک ہوں مگر تم نے شادی کا کیا سوچا۔“

”سرا بھی تک دل میں کسی کی محبت کے زخم

پرانے نہیں ہوئے یہ محبت برسوں پر محیط ہے ان کے

مرا سم بہت پرانے ہیں یہ بس عشق کی جتنی فصلیں تھی جو

ابھی کئی نہیں تھیں ورنہ ان کے خط سے دفا اور محبت کی

جھلک نظر آتی ہے جو میں ہر صبح پڑھتا ہوں اور ہر رات

پڑھ کر سوتا ہوں بس اسی وفا اور محبت کی جو جھلک نظر

آ رہی اس میں ہی جینا چاہتا ہوں۔“ میں نے بمشکل

اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے جواب دیا۔

”روشان بیٹا دیکھو۔ تم ٹھیک کہتے ہو اس طرح

زندگی نہیں گزرتی اور کسی کے پھڑکنے سے محبت مرنے نہیں

جاتی۔ یہ تو ایک کھیل ہے اس میں عشق محبت وصل کے

لمحے ہوتے ہیں اور ”فلاسفر فیڈرس“ نے کیا خوب کہا تھا

کہ محبوب کی موجودگی میں کوئی عاشق بزدلی کا مظاہرہ

نہیں کر سکتا۔ مجھے عاشقوں کی فوج دو میں تمہیں ساری

دنیا فتح کر کے دکھا دوں۔“ اور پھر تمہارا تو ابھی سب

کچھ موجود ہے تم کیوں بزدلی کا مظاہرہ کر رہے ہو اور

پھر یہ بھی تو سوچو کہ کیا تم تاروفہ کے وعدے کی تکمیل نہ کر

کے اس کے پیار کو دھوکہ تو نہیں دے رہے۔“

نہیں سرا میں اس کو دھوکہ..... نہیں سر قطعاً بالکل

ایسی بات نہیں ہے۔“ روشن کے چہرے پر ایک لمحے

کے لیے ریٹانی نمودار ہوئی۔

”دیکھو بیٹا مجھے تم اپنے بیٹے اور چھوٹے بھائی جیسے

لگتے ہو مجھے اس لیے تم سے ہمدردی تھی باقی تمہاری

مرضی۔“

شمس بخاری صاحب سے میرا کیا رشتہ تھا کچھ بھی

نہیں، مگر وہ ایک مخلص انسان تھے، ان کے اس پیار اور

بے حد اصرار پر شرمندگی بھی ہوئی مگر میں نے کہا تھا کہ

سر میرا بل مانا تھا تو رشتہ تلاش کرنے کا آپ کو ہی بولوں

گا۔“

اس کے چند ماہ بعد شمس صاحب نے مجھ سے

دوبارہ پوچھا تو میں خوب صورتی سے اس بات کو نال دیا

تھا۔

ایک دن میں میں آفس میں بیٹھا اور بٹس کی رو

انگی کی قائل دیکھ رہا تھا کہ میرے سوا بائیں کی گھنٹی بج گئی

میں نے دیکھا تو اسکرین سرشمس کا نام آرہا تھا۔

”اسلام علیکم سر۔“

”روشان بھائی میں ماریہ بول رہی ہوں۔ ان کی

پیگم ادہ شمس کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے آپ جلدی سے

ہمارے گھر آ جائیں۔“

دوسری طرف سے ماریہ بھائی کی گھبرائی ہوئی آواز

سنائی دی۔

”ادہ! آپ ڈاکٹر کون فون کریں میں آتا ہوں۔“

”جی بھائی ڈاکٹر صاحب آگئے ہیں بس جلدی

سے۔“

”جی جی میں آرہا ہوں۔“ میں نے ان کی بات

کاٹ کر جواب دیا۔

میں تھوڑی دیر میں ان کے گھر پہنچ چکا تھا۔

ڈاکٹر صاحب ان کا چیک اپ کر رہے تھے ماریہ

بھائی ایک طرف کھڑی تھیں ان کی حالت کافی خراب

تھی۔ میں نے جاتے ہی ڈاکٹر سے ان کی طبیعت کا

پوچھا تو ڈاکٹر نے کہا کہ اٹیک نازل ہوا ہے مگر یہ شکر ہے

بھائی نے بردقت فون کرنے کے مجھے بلا لیا اب میں نے

ان کو انجکشن لگا دیے ہیں تھوڑی تک ان کی حالت بہتر

ہو جائے گی گھبرانے والے کوئی بات نہیں ہے بس بھائی

کو حوصلہ دیں۔“

میں نے ماریہ بھائی کو جا کر سمجھانے لگا میرے

سمجھانے پر ان کی حالت تھوڑی دیر میں سنبھل گئی میں

اور ڈاکٹر صاحب دوسرے روم میں جا کر باتیں کرنے

لگے۔ کچھ وقفے کے بعد ایک لڑکی چائے کے دو کپ

لے کر اندر آئی میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو بس دیکھتا ہی

رہ گیا۔ اس کا چہرہ کسی محتاب کی طرح تھا میں اس کو غور

سے دیکھنے لگا میں ایک لمحے کے لیے بھول گیا کہ سامنے

ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے جلدی سے

نظریں سے نظریں نیچی کر لیں، وہ لڑکی جا چکی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم چائے پی کر فارغ ہی ہوئے

تھے ماریہ بھائی بھاگی ہوئی اندر آئی اور بولی کہ شمس کو

ہوش آ گیا ہے۔“

ہم جلدی سے اندر چلے گئے۔ جیسے ہی ان کی

نظر مجھ پر پڑی تو وہ مسکراتے ماریہ سے پوچھنے سے لگے

کہ۔“ آپ نے روشن کو کیوں تکلیف دی تو اس پر

READING Section



مگر جب میں اگلی صبح اٹھا تو معمول کے مطابق کا خط پڑھنے کے بعد مہتاب کا سراپا ایک بار پھر زائل ہو چکا تھا۔

چند دنوں کے بعد شمس صاحب ڈیوٹی پر بھی آگئے بقول ان کے اب ان کی طبیعت کافی بہتر ہے اس طرح ان کے ساتھ میری ہر روز تو ملاقات تو نہ ہوتی مگر بھی کبھی ہو جاتی۔

ایک دن میں اپنے آفس کے کام میں مشغول تھا کہ میرے موبائل کی بیل گنگنا اٹھی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو سکرین پر ”سرخس“ کا نام جگمگا رہا تھا۔ یا اللہ خیر! میں نے جلدی سے فون ریسیو کرتے ہوئے سلام کیا۔

”روشان بھائی، آپ کی بھابی بول رہی ہوں۔“ دوسری طرف سے ماریہ بھابی کی پریشان کن آواز سنائی دی۔

”ارے بھابی کیا ہوا سب خیریت۔“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”جی بھائی وہ آج پھر آپ کے بھائی کو اٹیک ہوا تھا اور ہمارے وہی ٹیلی ڈاکٹر ان کو ہسپتال لے گئے تھے ابھی واپسی ہوئی ہے اور ابھی ان کو کچھ ہوش آیا ہے تو میں ان سے پوچھا ہے کیا روشان کو بلا لوں تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا کہ وہ مجھ سے پریشان ہوگا، مگر میں ان سے چوری آپ کو فون کر رہی ہوں۔ آپ کوئی بہانہ کر کے ہمارے گھر آ جائیں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے بھابی میں کوئی بہانہ کر دوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں اور میں ابھی آتا ہوں۔“

☆☆☆

میں تھوڑی کے بعد ان کے گھر موجود تھا مجھے دیکھتے ہی سب اور شمس صاحب یکدم پریشان ہو گئے کہ میں اچانک کیسے، لیکن چونکہ یہ پلان پر درگرم تھا تو میں نے ان کو بتلایا کہ میں ایک ضروری کام کے لیے جا رہا تھا تو میں نے سوچا کہ آپ سب سے ملتا چلوں مگر آپ کے گھر میں ڈاکٹر کی موجودگی سب خیریت تو ہے نا بھابی۔“ میں نے سب کچھ پتا ہونے کے باوجود بھی انجان بنتے ہوئے کہا۔

”ارے ہونا کیا تھا بھائی پھر اٹیک ہوا ہے یہ تو شکر

ماریہ بھابی نے کہا کہ جب آپ کی طبیعت خراب ہوئی تو آپ نے فوراً روشان کا ہی نام لیا تھا فوراً اس کو ہی بلا یا جائے۔“

ڈاکٹر صاحب نے چند ادویات دیں اور آرام کا مشورہ دیا جس میں نے کہا انہیں ہسپتال لے جایا جائے تو ڈاکٹر نے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں اور پھر وہ اجازت لے کر چلے گئے۔

میں شمس صاحب کی طبیعت پوچھنے لگا ابھی میں ان سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ اچانک وہی لڑکی دوبارہ آگئی اس نے آتے ہی شمس صاحب سے اداس لہجے میں پوچھا کہ شمس بھائی طبیعت کیسی ہے آپ کی۔“ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اس کی آواز سن کر مجھے ایسے لگا جیسے میرے چاروں جانب کھٹکھٹوؤں کی جھنکار سی بج اٹھی ہوں۔

”جی بیٹا بس اللہ نے نئی زندگی دی ہے۔“ شمس کی آواز نے میرا سکوت توڑا۔

”روشان بیٹا یہ آپ کی بھابی کی بہن ہے۔ ان کا نام مہتاب ہے اور یہ ہمارے پاس ہی رہتی ہیں، اور مہتاب بیٹا یہ روشان صاحب پاکستان سے ہیں اور میرے آفس اسسٹنٹ ہیں جن کی میں اکثر باتیں کرتا رہتا ہوں۔“ شمس صاحب نے ہم دونوں کا تعارف کرادیا۔

”جی اچھا!“ مہتاب نے میرا تعارف سن مجھ کو مسکرا کر سلام کیا۔ میں اس کے مسکراہٹ بھرے سلام میں ایک لمحے میں کھو گیا مگر کمرے میں دوسرے افراد کی موجودگی سے یہ احساس چھپانا تھا۔

میں کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا وہاں ان سب سے باتیں ہوئی رہیں۔ ماریہ بھابی اور مہتاب دونوں ہی بہت باتونی داغ ہوئی تھیں مگر مہتاب تو دو قدم کچھ زیادہ ہی تھی۔ خاصی تعلیم یافتہ تھی اور گھرداری میں ماہر تھی۔ میں ان کے گھر میں برسوں کے بعد جی بھر کر مسکرایا تھا۔

شام کو جب میں شمس صاحب کے گھر سے کھانا کھا کر نکلا تو میں ان سب کے لیے اجنبی نہ رہا تھا اور مہتاب میرے پورے دل و دماغ پر پوری طرح سوار تھی وہ میرے تصور میں مسکرا رہی تھی ساتھ میں بھی گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا مسکراتا جا رہا تھا۔

READING  
Section

سے بھابی ساتھ تھی اور مجھے کال کر دی اور میں بروقت پہنچ گیا اور ان کی جان بچ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔  
 ”کیا مطلب جان بچ گئی کیوں مگر کیسے۔“ اب میں نے سچ میں پریشان ہو کر پوچھا۔

”وہ اسی لیے جان بچ گئی کہ اس دفعہ ایک کی نوعیت زیادہ تھی مگر بروقت فون کال آنے کی وجہ سے میں جلدی آ گیا اور اس طرح ان کی جان بچ گئی مگر اب یہ تشویش لاحق ہو گئی ہے اب ان کو یہ ایک کسی بھی وقت ہو سکتا ہے اور اگر اس وقت ان کے پاس کوئی نہ ہو تو شمس کی زندگی کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب پلےزیو تو نہ کہیں۔“ ماریہ بھابی روہانی ہو کر فوراً بول پڑیں۔

چند لمحوں کے بعد ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور میں شمس صاحب پر ناراضگی کا اظہار کرنے لگا کہ انہوں نے مجھے کیوں نہیں بتایا مگر ان کا کہنا تھا کہ تمہاری بھابی تو کہتی رہی کہ روشنان کو فون کرتے ہیں مگر وہ کسی کو بلاوجہ تکلیف نہیں دینا چاہتے ان لیے انہوں نے مجھے فون نہیں کیا۔

ان کی بات سن کر میں شرمندہ سا ہو کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے شمس صاحب نے انداز کرے میں جانے کو کہا جس پر میں نے ان کو سہارا دے اندر لے گیا تو وہ لیٹتے ہی مجھ سے بہت سنجیدگی سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

”روشنان جینا میں تم آج بہت سنجیدہ بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میری کوئی اولاد نہیں بس جب ہم پاکستان سے یہاں آئے تھے ماریہ کی بہن مہتاب بھی ہمارے ساتھ آئی تھی ہم نے اس کو اولاد کی طرح پالا ہے اور ہم اس کو نہ کھونا چاہتے ہیں اور نہ ہی اپنی نظروں سے دور کر کے پاکستان میں بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اب میری طبیعت کا تم حال تم دیکھ رہے ہو میری زندگی کا کچھ بتائیں ہے۔ میرا ساتھ سانس کی ڈور سے کب ٹوٹ جائے اور میں چاہتا ہوں اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے جانے کے بعد کوئی اپنے وطن اپنا کا ایسا ہو جو میری جیسی کو سنہال سکے اور جو مہتاب کا جیون سا بھی بن سکے تاکہ مجھے آرام و سکون مل سکے۔“ شمس صاحب یہ سب مجھے بتاتے ہوئے گلو گئے۔

میں ان کی حالت پر ایک دم بالکل پریشان ہو گیا تھا میں اب تو یکدم انکار کر سکتا تھا اور نہ ہاں مگر اس وقت ان کی دل جوئی کرنا ضروری تھا تاکہ ان کا دل نہ ٹوٹے۔  
 ”ارے نہیں شمس صاحب اللہ آپ کو لمبی زندگی دے آپ کسی باتیں کر رہے ہیں۔ پلےزیو آپ مایوس نہ ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دیں گے۔“ میں نے ان کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”مگر بیٹا تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”سر میں اب انکار تو نہیں کر سکتا مگر آپ جس طرح سے میرا خیال کرتے ہیں میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔“ آخر کار میں نے ان کی حالت دیکھ کر اپنی ضد کا اثر دھاڑا ہی دیا۔

”روشنان مجھے کل ہی جواب چاہیے ورنہ میں پھر جلد از جلد اس کام کو کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ یہ نہ ہو کہ اگر میرا بلاوا آجائے تو میں سکون سے نہ جا سکوں۔“ شمس صاحب ادا اس مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

رات کی گم سم تنہائی میں، میں اپنے فلیٹ میں لیٹا ہوا تھا اب جو تنہائی مجھے سکون دیتی تھی اور محفلیں اذیت دیتی تھیں اب مجھے اس سے تکلیف ہونے لگی تھی اور پھر تار فہ کا دیا ہوا وعدہ اور ساتھ شمس صاحب کا بڑھتا ہوا اصرار۔



دوسرے دن میں نے شمس صاحب کو بنا شرمائے ہاں بول دیا وہ میرے اس فیصلے پر بہت خوش ہوئے اور اتنی دعائیں دیں کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے ارد گرد دعاؤں کا حصار ہو۔

پھر چند دنوں تک شمس صاحب کے وہیں کے رہنے والے دوست احباب اور کچھ آفس کولیگز نے مل کر میری ممکنگی کا اہتمام کیا اور بیس دن کے بعد میری شادی ہونا طے پانی اور اس میں مہتاب کی مرضی بھی شامل تھی۔

میں نے زندگی کے نئے سفر کو شروع کرنے کے لیے دوسرے دن شمس صاحب کے گھر سے تھوڑا فاصلے پر ایک اچھا سا گھر دیکھ لیا تھا اس کی تزئین و آرائش شروع کر دادی تھی میں بھی اس طرح سہانا سپنا دیکھ رہا تھا اور بہت خوش تھا۔



بالا آخر وہ صبح بھی آگئی جس دن میری شادی تھی آج میں اپنے نئے گھر میں موجود تھا کیونکہ میں پہلے اپنی کی طرف سے دیے گئے فلیٹ میں رہتا تھا۔ کل سے میرے اس نئے گھر میں چوڑیوں کی کھنکار کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز ہونے والا تھا۔

دو پہر تک میرے ٹمس صاحب کے اور وہیں کے رہنے والے دوست احباب اور کچھ آفس کولیکٹرز اور دونوں اطراف کے بارانی میرے گھر میں موجود تھے۔ ہم نے کچھ دیر میں ٹمس صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہونا تھا اور میں جانے سے پہلے آخری بار تار فہ کا دیا ہوا وہ خط پڑھنا چاہتا مگر جب میں اپنی الماری کی طرف گیا جہاں سے کل آفس سے واپس آیا تھا اور سامان رکھا مگر اس میں مجھے تار فہ کا خط نہ ملا۔

میں نے ساری الماری دیکھی، اپنا والٹ دیکھا مگر تار فہ کا خط نہ ملا۔ میری پریشانی بڑھتی گئی کہ آخر وہ خط کہاں گیا۔ تو پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں کل آفس سے نکلا تھا وہ خط غالباً آفس میں ہی رہ گیا تھا۔ اب میرے دل میں کسک تھی زندگی کے اس نئے آغاز سفر میں، میں نے وہ خط ہر حال میں لازمی پڑھنا ہے مگر اب ادھر سے نکلنا مشکل تھا۔ میں نے ٹمس صاحب کو فون کیا کہ میں تھوڑی پریشانی میں ہوں پلیز آپ میرے گھر آ جائیں۔

ٹمس صاحب کا گھر چونکہ ساتھ میں تھا وہ چند لمحوں میں آگئے مگر ان ساتھ ماریہ بھائی بھی تھیں ان دونوں کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی کہ کہیں میری شادی کی رائے تو نہیں بدل گئی۔

”کیا ہوا۔“ انہوں نے آتے ہی پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

”سرمہوا کچھ نہیں وہ میں نے بتایا تھا نہ کہ تار فہ نے مجھے خط لکھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ آپ شادی کر لو تو اب میں چونکہ میں اپنے زندگی کے نئے سفر کا آغاز کرنے جا رہا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں وہ خط آفس میں ہی بھول آیا ہوں، میں اس خط کو آخری بار پڑھنا چاہتا ہوں اور پھر جلا دینا چاہتا ہوں تاکہ میں اپنی زندگی کا یہ سفر ایک اچھے اور نئے انداز سے شروع کر سکوں اور اس لیے میں نے آپ کو یہاں بلا یا ہے آپ کی اجازت

لینے کے لیے۔ اگر اکیلا جاؤں گا عجیب لگے گا، ساتھ کسی آفس کولیکٹ کو لے جاتا ہوں اور کوئی بہانہ کر کے ابھی آجاتے ہیں۔“

”مگر بیٹا تم کس خط کی بات کر رہے ہو۔“ ماریہ بھائی نے پوچھا۔

”بھائی وہ آپ کو ٹمس صاحب بتا دیں گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

”ارے کس خط کی بات کر رہا تھا، یہ لڑکا۔“ روشاں کے جاتے ہی ماریہ نے اپنے شوہر ٹمس سے پوچھا۔

”ماریہ بس چھوڑو۔ یہ جی کہانی ہے وہ تو مر گئی مگر اس لڑکی کا بھوت ابھی تک اس کے ذہن سے نہیں اترتا۔“

”مگر ٹمس ایسا تو نہیں کہ اس کو ہمارے اس پلان کا پتا چل گیا ہو کہ تمہارا یہ سب ایک کا بہانہ تھا ہو سکتا ہے اس کو کسی نے بتایا ہو۔“ ماریہ نے کہا۔

”اس کو کون بتائے گا ڈاکٹر بھی اپنا آدی تھا اور اس کو میں نے اچھا خاصا پتہ دیا تھا اور پھر ایک کو پلان اس وقت کیا گیا جب مہتاب گھر نہیں ہوتی تھی تو کسی کو کیا پتا اور پھر تم نے تو کسی سے کچھ نہیں کہانا؟“ ٹمس نے پریشانی کے عالم میں ماریہ سے پوچھا۔

”ارے نہیں میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔“ ماریہ نے پریشانی کے جلدی سے کہا۔

”بس ٹھیک ہے اب دعا کرو کہ وہ جلدی سے یہ آجائے ورنہ سب چو پٹ ہو جائے گا۔“

☆.....☆.....☆

ہمارا آفس سمندر کے ساتھ بالکل کنارے پر تھا اور ہم اس پر بیٹھ کر آنے والے بحری جہازوں اور مختلف چھوٹی شپس، بوٹس کو روانگی کے احکامات جاری کرتے تھے۔ میں جیسے ہی سمندر کنارے پر بنے آفس میں داخل ہوا تو آفس کولیکٹ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میں شادی کے روز یہاں کیسے.....

”جی بس ڈیئر وہ میں نے اپنا اے ٹی ایم کارڈ بھول گیا تھا وہی لینے آیا تھا۔“ میں یہ کہہ کر

اپنے آفس کی جانب بڑھ گیا وہاں مجھے اپنی الماری میں تارفہ کا خط مل گیا۔

”سوری تارفہ میں یہ خط جلاتا نہیں چاہتا تھا مجھے شمس صاحب سے مجبوری کی بنا پر اُن سے یہ کہنا پڑا ورنہ میں تمہاری یادوں کو کیسے جلا سکتا ہوں میں تو تمہارے وعدے کی تکمیل کرنے سے پہلے تمہارے اس خط کو بڑھنا چاہتا تھا اور اب اس کو سمندر برد کر دوں گا مگر جلاؤں گا نہیں۔“ میں نے اپنے آپ سے خود کھائی کرتے ہوئے کہا۔

میں جیسے ہی آفس سے باہر نکلا تمام اہلکار پریشان ہو کر بھاگتے نظر آئے۔

”کیا ہوا۔“ میں نے ایک اہلکار جیفر کو روک کر پوچھا۔

”سر وہ بوٹ۔“ اس نے دور سمندر میں اشارہ کیا۔

”مسئلہ کیا ہے۔“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔  
”دور دور بین سے دیکھیں۔“ ایک اور اہلکار نے مجھے دور بین دیتے ہوئے کہا۔

جب میں نے دور بین سے دیکھا تو مجھے دور سمندر میں ایک بوٹ نظر آئی جو کہ پھولے کھا رہی تھی اُس میں ایک جوڑا سوار تھا اس طرح اکثر ہوتا تھا کہ اکثر جوڑے یا میان بوی سیر کو آتے تھے اور بوٹ میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کو نکل آتے تھے پھر بعض اوقات وہ سمندر کی گہری لہروں کی نظر ہو جاتے تھے یا ہماری ٹیم اُن کو بچا لیتی تھی مگر اس طرح اُن کا کہرے پانی میں جانا ممنوع تھا مگر یہ بوٹ بہت زیادہ آگے جا چکی تھی۔

”ادہ مائی گاڈا“ میرے منہ سے پریشانی سے نکلا اچھا اس وقت شمس صاحب کے بعد چارج کس کے پاس ہے۔“ میں نے پوچھا۔  
”سر مائیکل کے پاس، مگر وہ اس وقت کھانا کھانے گئے ہوئے ہیں۔“

”اوہ نو۔ اُن کو تو آتے ہوئے دیر ہو جائے گی۔ ہم انسانی زندگی کا رسک نہیں لے سکتے مجبوری ہے۔ میری چھٹی کے باوجود بھی آپ کو مجھے قالو کرنا ہوگا۔“ میں نے اُن سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جی سر مگر قانونی یا دفتری پیچیدگی نہ ہو۔“  
سرے اسٹنٹ نے تھوڑا پریشان ہو کر کہا۔

کچھ نہیں ہوگا اگر کچھ ہوا تو میں سب دیکھ لوں گا دیے بھی اس وقت میرے سوا کوئی ٹیم کو گا میڈ کرنے والا نہیں ویسے بھی یہ انسانی زندگیوں کا سوال ہے اس لیے جلدی سے اپنا ضروری سامان اور بوٹس نکالو۔“

تھوڑی دیر میں ہم اُس بوٹ کے پیچھے تھے۔ مجھے واقعی اس بوٹ کی حالت خراب لگ رہی تھی۔ بوٹ میں اپنی بوٹ مرمت نہیں کرواتے تھے اور آنے والے سیاحوں اور جوڑوں کو کرائے پر دے دیتے تھے جو کہ اُن کے لیے پریشانی کا باعث بنتی تھی۔ اس بوٹ کی حالت بھی قابلِ رحم تھی۔

بوٹ میں مرد اور عورت سوار تھے وہ مرد بڑی مشکل سے کشتی کو کنٹرول کر رہا تھا مگر وہ اُس سے کنٹرول نہیں ہو رہی تھی۔ ہمیں اُن کی پشت نظر آرہی تھی۔ اب ہم نے کسی طرح اُن کو Save کرنا تھا۔  
اب ہم ان کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے جیسے ہی اُنہوں نے ہم کو دیکھا تو وہ مرد زور سے چلایا۔

”پلیز ہیلپ می۔“  
میں نے چونک کر اُس کی جانب دیکھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔  
”بطل، تارفہ۔“

میں نے دوبارہ غور سے دیکھا وہ بطل تھا اور اس کے ساتھ تارفہ تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے غن ہو کر رہ گیا میں تو اپنی نئی زندگی کے آغاز پر صرف تارفہ کا خط پڑھنے آیا تھا مگر یہاں تو پوری تارفہ ہی آگئی تھی۔  
میں اچانک تارفہ کی تیج سن کر ہوش میں آ گیا۔  
”بطل تارفہ کو پکڑو۔“ میں نے زور سے چلاتے ہوئے کہا۔

بطل اور تارفہ نے میری جانب چونک کر دیکھا۔ تارفہ نے مجھے ایک لمحے میں پہچان لیا مگر بطل مجھے حیرانگی سے دیکھ رہا تھا کہ میں کون ہوں کیوں کہ وہ مجھے کالی عرصہ بعد دیکھ رہا تھا۔

اچانک ایک اہلکار نے ان کی جانب ری اچھال دی جس پر میں نے بطل کو کہا کہ وہ جلدی سے ری کو اپنے اور تارفہ کے ساتھ باندھ لے۔

ان کی کشتی میں پانی بھرنے لگا تھا اور وہ آہستہ آہستہ ڈوب رہی تھی۔  
”بطل جلدی کرو۔“ میں نے چیختے ہوئے کہا۔



اچانک بوٹ مکمل طور پانی میں ڈوب گئی مگر ابھی تک بظال نے تارفہ کو رسی نہیں باندھی نہیں تھی۔  
”جینر ہمارے پاس کتنے تیراک ہیں۔“ میں نے اہلکار سے پوچھا۔

”تیراک تو ہیں مگر ہم جلدی میں سانس لینے کے لیے آکسیجن بوکس اٹھانا بھول گئے ہیں تو اب پانی گہرا ہے اس لیے اُن کو تار تار سک والی بات ہوگی بس اس رسی سے کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”اُوہ میرے خدا! میں نے اُس کی بات پر سر پیٹ لیا اور جلدی سے بظال کی طرف متوجہ ہو گیا۔ □  
”بظال جلدی سے تارفہ کا ہاتھ پکڑو اور اپنے ارد گرد رسی باندھو اور اس کا ہاتھ مت چھوڑنا۔“ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

مگر اُس وقت اس کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور اس نے ابھی تک تارفہ کو رسی بھی نہیں باندھی تھی اور پھر وہی ہوا جس کا ہم سب کو ڈرتھا۔

اُن کی بوٹ مکمل طور پر پانی میں ڈوب گئی بظال چونکہ اپنے آپ کو رسی سے باندھ چکا تھا تو اس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تو اہلکاروں نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

جبکہ تارفہ گہرے پانی اور بوٹ کے اندر ہی رہ گئی تھی۔

”تارفہ۔“ میں زور سے چلایا اور ایک منٹ میں فیصلہ کیے بغیر کہ آگے کیا ہونے والا ہے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

تیز لہریں مجھ کو ادھر ادھر کر رہی تھی میں نیچے گہرے پانی میں تیرتا چلا گیا۔

میں ہر صورت اس کو بچانا چاہتا تھا اس کو اوپر لانا چاہتا تھا اور وہ جب میرے سامنے تھی تو اس کو کچھ سچائی بتلانا چاہتا تھا گزرے ماہ و سال کا حساب دینا چاہتا تھا اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور کچھ بتلانا چاہتا، اور یہ بھی کہنا چاہتا تھا ویسے تارفہ آج کتنا خوش نصیب دن ہے جس کی تکمیل کے لیے تم نے مجھے کہا اور آج میں وعدہ نبھار ہا ہوں۔

وہ مجھ کو نیچے پانی میں نظر آگئی۔  
میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور اس کو بازو سے پکڑا اور اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور پھر نیچے جانے لگی۔

میرا سانس ٹوٹنے لگا تھا میں نے پھر جلدی سے اس کا بازو پکڑا اور جلدی سے اوپر لے جانے کی کوشش کی اور بولنے کی کوشش کی مگر پانی میں میری آواز لمبے بن کر رہ گئی میری سانس اور ہمت بالکل جواب دے چکے تھے کیونکہ میں خود اتنا بڑا تیراک نہیں تھا اور پھر مجھے ایسا لگا جیسے اُس کا وجود میری حالت دیکھ کر مجھے اوپر لے جانے کی کوشش کر رہا ہو۔

پھر ہم پانی کی ادھری سچ پر تھے اور بوٹ کا بالکل مدھم سا شور اور تارفہ کی آواز میرے کانوں میں آرہی تھی کہ روشاں آنکھیں کھولو ہمت کرو اور رسی پکڑو، رسی پکڑو کی آوازیں بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

مگر مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر میرے کانوں میں تارفہ کی سسکیاں اور رونے کی مدھم سی آوازیں آنے لگی تھیں۔ اچانک ایک بار پھر مجھے پانی میں جانے کا احساس ہوا اور کسی نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا مگر اس دوران سانس نے میرا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔

تیزی سے پانی میرے منہ میں داخل ہو رہا تھا اور.....

اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ اب بھی تھا۔

کون کہتا ہے موت آئی تو مر جاؤں گا  
میں تو دریا ہوں سمندر میں۔ اتر جاؤں گا

☆☆☆

اور آج پورے پچیس برس بعد، جب میں تارفہ کے ساتھ اپنی زندگی کے نشیب و فراز شیئر کرتا ہوں تو وہ سارے پل، سارے امتحانات جو ہماری زندگی میں آئے تھے کہیں بہت دور چلے جاتے ہیں۔ سچ ہے۔ قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں ٹان سکتا۔ میں اور تارفہ۔ آج ایک ہیں۔ ہمارا خوشحال گھر انہ ہے۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہمارا اثاثہ ہیں۔ جو ماشاء اللہ اب جوانی کی ولہیز یہ قدم رکھ چکے ہیں۔ ہماری محبت کی چمکی فصلیں اب چمک کر تیار ہو چکی ہیں اور اب نئی فصلیں اپنی اٹھان بھر رہی ہیں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ ہماری زندگی کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا کیجیے۔

☆☆☆.....☆☆☆

## انداز پرے درے

روشنائے عہد القیوم

اُس عورت کا قصہ بلاخیز، جس نے گدڑی نشینی کو کھیل بنا کر زن کھیل

شوق بنا تھا۔ وہ نامی گرامی زمین دار سیاست دان تھے۔ ان کے خاندان کا اک نام تھا۔ جو اب ان کی صورت میں رہ گیا تھا۔ کروڑوں کی زمین و جائیداد کا اکیلا وارث، کچھ کم سلطانہ بھی نہ تھیں۔

وہ اپنی حیثیت سے بخوبی آگاہ تھیں۔ اسی لیے اُس کا غلط فائدہ بھی خوب اٹھا رہی تھیں۔

اب کی بارنگلینہ نے ہاتھ مسلے اور آنسوئی دروازہ دھا کر کے ذرا سا جھانکا۔ وہ قرآن پاک کی تلاوت مکمل کر کے بند قرآن کو چوم رہی تھیں۔

”باجی جی!“ اُس نے ڈرتے ڈرتے ذرا سرگوشی میں کہا تھا۔

”کہو؟“ وہ قرآن پاک رکھ کر پلٹی تھیں۔

”وہ جی باہر گاؤں کی کچھ عورتیں آئی ہیں جی،

بڑی مجبور ہیں اگر آپ شنوائی کر دیتیں تو۔“ اُس نے

بہت مسکین سی صورت بنا کر لجاجت سے کہا تھا۔

مگر سلطانہ جلال میں آگئی تھیں اُس پہ

آنکھیں نکالیں۔

”برسوں ہو گئے تمہیں اس حویلی میں..... کیا

تمہیں یاد دہانی کر دانی پڑے گی کہ جمعرات کو حویلی

میں نیاز کی دہلیں چڑھائی جاتی ہیں، ہمارے بزرگوں

وہ بار بار دروازے تک آتی اور بے چین سی واپس پلٹ جاتی۔ سلطانہ باجی کی رُعب دار شخصیت اور پاٹ دار آواز و انداز سے اُس جیسی تیز طرار لڑکی بھی خائف تھی۔

سارا گاؤں کیا مرد، کیا عورتیں ہر کوئی اُن کا احترام کرتا تھا۔ اُن کی بات پتھر پر لکیر کا درجہ رکھتی تھی۔

پیر محی الدین گدہ نشین کی اکلوتی بیٹی جو ان کے چھوٹے بھائی غیاث الدین ہرحوم کے بیٹے کی بیوی تھی۔

غوث علی شاہ پڑھے لکھے رحم دل انسان تھے۔

سلطانہ کے انداز اُنھیں سخت ناپسند تھے۔ سلطانہ سے

ان کی اولاد نہ تھی۔ تاپانے خود ان کی شادی خاندان

میں کر دی تھی۔ دوسری بیوی فرخندہ دھیمے مزاج کی

سادہ سی خاتون تھی۔

سلطانہ باپ کی وجہ سے خاموشی پر مجبور تھی مگر نہ

غوث علی شاہ کو سہل سکھانا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

وہ کچھ بھی کر لیتی کوئی ان کے خلاف منہ کھولنے کی

جرات نہیں کر سکتا تھا۔

وہ سب کی نظر میں ایک بڑی ہستی تھیں۔ پیر محی

الدین کی اکلوتی اولاد، باپ کی وفات کے بعد ہر سیاہ و

سفید کی مالک۔ غوث علی شاہ کو حاکم کہلانے کا کوئی

READING

Section



کی روایت ہے جسے میں نے آج تک جاری رکھا ہے۔ جمعرات کا دن اللہ اور اس کے مسکین عاجز بندوں کے لیے باقی پورے دن مسئلے مسائل کے لیے، جاواپس بھیج دے، کل آجائیں ساری، جو بھی مسئلہ ہوگا دیکھ لوں گی۔“ وہ سونے کے زیورات دیکھتی اشارہ کر کے بولی تھیں۔

”جی اچھا۔“ گمبہ دروازے کی سمت چلی۔

”اور سن؟“ پیچھے سے ان کی آواز آئی تو وہ دوبارہ پیچھے پلٹی تھی۔

”جی ہا جی جی! حکم دی مسکین ہی صورت۔“

”پیغام دے کر جلدی آنا ذرا دیکھوں تو نیازی دیکھیں پوری ہیں کہ نہیں۔“

حویلی کے پچھواڑے تائیوں نے بڑی بڑی دیکھیں چڑھائی ہوئی تھیں۔ جن کو چکھنا اور پورا جائزہ لینا سلطانہ نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ ویسے بھی وہی حویلی کی کرتا دھرتا تھیں۔

غوث علی شاہ کو پیری مریدی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اپنی ذات میں گم رہتے، گدی سنبھالنے کی باری اب ان کی تھی مگر وہ مانتے نہ تھے اور سلطانہ ہر بار انھیں طعنہ ضرور مارتیں۔ بزرگوں کی روح کو تڑپانے کا ذمہ دار قرار دیتیں اور دل ہی دل میں مطمئن بھی رہتیں کہ اس گدی کے بہانے وہ ہر سیاہ و سفید کی مالک بنی بیٹھی تھیں۔ جو دل چاہتا حکم جاری کرتیں۔ کسی کی مجال نہ تھی ان کے فیصلے سے انحراف کرنے کی۔

”جو آپ کا حکم، میں بس گئی اور لوں آئی۔“ وہ سر ہلاتی تیز تیز قدموں سے دروازہ پار کر گئی۔

انھوں نے سونے کے جھمکے پہنے، گلے میں مالا ڈالی، انگوٹھیاں انگلیوں میں پہنی، سونے کے موٹے موٹے کڑے پہنے، دوپٹہ سر پر جمایا، کندھوں کے گرد شال لپیٹی، تب تک گمبہ آ پہنچی۔

”چلیں ہا جی جی۔“ اس نے ہاتھ احترام سے آگے کر کے انھیں بڑھنے کی جگہ دی۔ وہ زمین کو گویا

Downloaded From  
Paksociety.com

READING  
Section

اُس کی۔ بس مجبور ہوں، اپنے خاندان کی وجہ سے، اپنے پرکھوں کی عزت کے خیال سے، تم تو سب چیزوں سے باخبر ہو پھر کیوں میرا زخم تازہ کرتے ہو؟“ وہ ہمیشہ کی طرح لاڈ سے بولی تھی۔

”زیادہ ڈرامہ بازی مت کرو سلطانہ بیگم! باپ دادا کی عزت نے نہیں، غوث علی شاہ کی دولت نے تمہیں مجبور کر دیا تھا، مجھ جیسے سیلانی صفت بندے سے تمہیں کیا مل جاتا۔“ وہ نوجوانوں کی طرح دل پر ہاتھ رکھے ہنساتا تھا۔

”تم کچھ بھی کہہ دو، اک تمہاری باتیں ہیں جو بڑی نہیں لگتی۔ تمہاری محبت منہ زور سہی پر خاندان کی بھلائی اور فائدے کے لیے مجھے قربان ہونا ہی تھا، ذرا آ کر دیکھو تو سہی وہ دھان پانی ہی سلطانہ کیسے پورے گاؤں پر اپنا حکم چلاتی ہے۔ کسی کے باپ کی مجال نہیں کہ آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے مجھے۔ میرے فیصلے سے انکا تو بہت دُور کی بات ہے، یہ سب مجھے تم سے مل سکتا تھا بھلا، اب وقت آ گیا ہے کہ سب سے چھٹکارا کیا کر میں تمہارے پاس آ جاؤں، بہت ہو گیا، اب اور تمہیں سہہ سکتی۔ میری ساری طاقت اور دولت مجھ سمیت تمہاری ہے۔“ وہ ادا سے بولی تھی۔

”دیکھو تو تمہاری محبت میں اب تک کنوارا ہوں۔“ ایک جاندار قبچہہ لگا یا تھا اُس نے۔ سلطانہ کی روح سرشار ہو گئی۔

وہ گاؤں کے اسکول سے میٹرک کا امتحان دینے جاتی تھی۔ مظفر جو ہر خوب صورت جگہ پہنچ جاتا تھا۔ گاؤں کی خوب صورتی دیکھنے آیا تھا۔ وہ منظور تھا، شاعری اور حسن کا دلدادہ، سلطانہ کی گاڑی سے نکل آیا تھا اور یہ تصادم دونوں کو پاس لے آیا، اس کا گھر بار نہ تھا، کبھی ایک شہر میں رہتا تو کبھی کسی دوسری جگہ، ہمیں ایک جگہ ٹکنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

باپ کینسر کا مریض تھا تو عدم توجہ اور پیسے کی کمی کی وجہ سے وفات پا گیا۔ یوں وہ اکلوتے خونی رشتے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا، سیماب فطرت کو کوئی فرق نہ پڑا بلکہ اب تو آوارہ گردی کو مزید موقع ملا۔ وہ موچی کا بیٹا تھا اور سلطانہ کروڑوں کی مالک، ایک خاندانی گدی نشین

قدموں سے رگڑتی، روندتی قدم بہ قدم چلنے لگیں۔ حویلی کے پچھوڑے گہما گہما کی گئی۔ سلطانہ بی بی آئیں سلطانہ بی بی آئیں۔ رستہ خالی ہونے لگا، سر جھک گئے۔ پیر محمد الدین کی صاحبزادی کو سلامتی دی جانے لگی۔ ہر کوئی سلام میں پہل کر کے برکتیں سینٹا چاہتا تھا۔

ہر دیک میں سے سلطانہ نے چکھا، قبولیت اور پسندیدگی کی سندوی۔ ان کے ہاتھ سے پہلی نیاز بانٹی گئی، پھر تو گویا عید کا سماں بندھ گیا، گاؤں کے غریب سادہ لوح عوام انہیں دعائیں دینے لگے۔ وہ راستے سے گزر کر حویلی آئی، دیو قامت آبنوی داخلی درازے کی سمت جانے کے بجائے وہ بائیں باغ چلی آئیں۔

”خیریت باجی جی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ نگینہ جوان کے ساتھ ہی حویلی میں برسوں سے رہ رہی تھی۔ تشویش سے بولی۔ کیوں کہ وہ بہت کم اس طرف آتی تھیں۔

”تھوڑی دیر تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتی ہوں، مجھے اکیلا چھوڑ دو، کسی کو اس طرف مت آنے دینا۔“ انہوں نے حکم دیا۔

”جیسے آپ کا حکم۔“ وہ حکم کی غلام سر بھلاتی تیزی سے نیچے کو بھاگی تھی۔

”شکر ہے اس بلا سے تو جان چھوٹی۔“ انہوں نے سکھ کا سانس لیا اور اسمارٹ فون سامنے کر کے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔

اُن کا دل کسی نوخیز لڑکی کی طرح دھڑکنے لگا تھا اور کیوں نہ دھڑکتا؟ وہ اُن کی پہلی محبت تھا، جو پہلی بارش کی طرح ہر شومعطر خوشبو اور تازگی بکھیر دیتا ہے، دوسری طرف ہشاش بشاش ہی آواز ابھری تھی۔

”ز سے نصیب سلطانہ بیگم۔ ہم تو تمہارے لیے ترس کر رہ گئے ہیں۔“

”مظفر خان ترسنا کیا ہے یہ مجھ سے پوچھو، باپ کی محبت میں قربانی کا جانور بن گئی، سچ پوچھو تو آج بھی میرے دل پر تمہاری حکمرانی ہے، وہ مٹی کا پتلا غوث علی شاہ، میرے پالتو جانوروں جتنی اہمیت بھی نہیں



آج جمعے کا بابرکت دن تھا۔ حویلی کے احاطے میں بڑی سی نشست پر سلطانہ کسی ریاست کی ملکہ بنی بیٹھی تھیں۔

آج کے دن وہ گاؤں کے سادہ لوح عوام کو درس دیتی تھیں۔ ایک جھوم ان کے آگے سر جھکائے ادب سے بیٹھا تھا۔

زیادہ تعداد عورتوں اور کم عمر لڑکیوں کی ہی تھی، مروخال خال تھے۔

”جیسا کہ آپ سب جانتے ہو آج میرا پسندیدہ موضوع بیان ہوگا، یعنی پردہ۔ اور میں اس بیان میں سورۃ نور سے تھوڑا حوالہ بھی پیش کروں گی، تاکہ آپ سب خواتین کو معلوم ہو، قرآن میں پردے کا کیا حکم ہے؟“ ان کی بات پر سارے جھوم کے جھلکے سر ہلے تھے۔

وہ آیت مکمل کر کے اب سمجھائی جا رہی تھیں ساتھ میں حدیثوں کے حوالے بھی شامل کرتی اور سارے سادہ لوح بے علم لوگ سر دھنتے بے شک، محبوب بیٹھے تھے۔

”امید ہے آج کی نشست سے آپ لوگوں کو بہت کچھ جاننے کا موقع ملا ہوگا۔“ وہ شمال سنبھالتی اٹھیں۔

”تھکینہ؟“

”جی ہاں جی، جی آٹھم؟“ وہ فوراً آگے آئی۔

”سوغات تقسیم کرو، ہر ایک کو ملے کوئی خالی ہاتھ نہ جائے حویلی سے۔“ وہ حکم دے کر آگے بڑھ گئی تھیں۔

جھوم میں بے ساختہ خوشی کی لہر دوڑی تھی، سارے با آواز بلند سلطانہ بی بی کو دعا میں دے رہے تھے۔ یہ آوازیں ایک نیم جُردہ وجود کے دماغ پر ضرب کی طرح پڑ رہی تھیں۔

ان ادھ بھلی آنکھوں سے آنسو بہہ کر سیکے میں جذب ہوئے تھے۔

☆.....☆.....☆

راہداری سے گزرتی سلطانہ بیگم شگ کرڑکی تھیں۔ داخلی دروازہ کھلا تھا اور اُس پار کے منظر نے ان کو آگ لگا دی تھی۔

تیس سالہ خوب صورت سی نازک سی فرخندہ بی

شخص کی اکلوتی بیٹی۔ بے تحاشا محبت کے باوجود بھی سلطانہ اس واضح فرق کو بخوبی پہچانتی تھی۔ اپنی وجہ سے چیرمچی الدین کا سر نہیں جھکا نا چاہتی تھی۔ یوں وہ غوث علی شاہ کے نکاح میں آ گئیں۔ شادی نے بھی ان کی محبت کو دور نہ ہونے دیا، رابطے کا ہر ذریعہ درمیان میں رہا، ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں، قسمت اچھی تھی کہ غوث علی شاہ سے ان کی اولاد نہ تھی۔ باپ اب رہا نہیں تھا۔ وہ آسانی سے جان چھڑا کر مظفر خان سے شادی کر سکتی تھیں، اس تعلق سے مظفر کو بھی فائدہ حاصل تھا۔ وہ جب چاہتا سلطانہ سے فرمائش کرتا اور یوں موٹی بگڑی رقم اور ٹکٹ لے کر ملکوں ملکوں گھومتا، اندرون ملک کے علاوہ بیرون ممالک کی بھی سیاحت کرتا، اچھا پہنتا اچھا کھاتا، سلطانہ سے محبت اس کی لاٹری تھی۔

وہ اُسے ناراض کر کے کیوں اس لاٹری سے ہاتھ دھوتا، کوئی بے وقوف ہی ہوتا جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر بیٹھے آئی دولت کو ٹھوکر لگاتا، اپنی چکنی چڑی باتوں سے

اُس نے سلطانہ کو پوری طرح مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔

”ہمیں ملے بہت وقت ہوا۔ سلطانہ پھر کب ملو گی؟“ مظفر نے جیسے سرگوشی کی تھی۔

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ضمیر نے طعنہ دیا سرزنش کی۔ چیرمچی الدین کی بیٹی تھیں یہ مقام زیب دیتا ہے،

تم کیا ہو اور کیا دکھائی دیتی ہو؟ گمروں نے ضمیر کی نہ سننے دی اُسے تھیک کر شلادیا اور سینہ تانے کھڑا ہو گیا

بچے کی طرح چل کر منہ بسورے ضد کرنے لگا۔ وصل..... وصل..... وصل!!!

”بہت جلد..... اور دعا کرو، پھر ڈوری درمیان میں نہ آئے۔“ اپنی ہی لے میں بولی تھیں۔

”میں انتظار کروں گا..... اپنی آخری سانس تک!!“ مظفر نے صور پھونکا اور سلطانہ پتھر بن گئی تھیں۔

”بھی دیکھا ہے تو نے عشق میں وجدان کا عالم۔

بس تو ہی تو، تو ہی تو اور تو ہی تو کا عالم مگر یہ عشق تو نہ تھا۔

زقوم کا درخت تھا..... کڑوا سیلا..... اک سزا۔

☆.....☆.....☆

READING Section

اس گھر کی بزرگ ہیں باقی کسی سے مت ڈرنا!! اُسے  
خوٹ علی شاہ کی باتیں یاد آئیں تو خود ہی ہمت ملی۔  
اُس نے پتھر کا جواب اینٹ دینے کی ٹھانی اور  
اینٹ اٹھالی۔

”ایک اور چیز بھی ہے میرے پاس جو آپ کے  
پاس نہیں۔“ اس کی بدلتی کیفیت اور بدلے انداز  
سلطانہ کو ٹھنکا گئے سوالیہ نظروں سے فرخندہ کو دیکھا۔

”میں اس حویلی اور پیر خوٹ علی شاہ کو وارث  
دینے والی ہوں، وہ شے جو آپ اب تک نہ دے  
سکیں، فرق تو بہت واضح ہوا پھر ہم دونوں میں؟“  
فرخندہ کی اینٹ کی ضرب نے سلطانہ کو لہو لہان کر دیا  
تھا۔ وہ پتھر کا بت بن گئی تھیں۔

فرخندہ ان کے پاس سے گزر کر جانے لگی تو ان  
کے پتھر ہوئے جسم میں حرکت ہوئی رُکو؟ حکم لہو لہو تھا۔

فرخندہ جو اُن سے دو قدم پیچھے تھی کوفت زدہ  
سانس خارج کرتے رُکی مگر پلٹی نہیں۔

”مجھے آپ کے مت نہیں لگتا۔“ یہ کہہ کر جانے لگی  
تھی کہ سلطانہ پلٹی اور اُسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف  
جھٹکے سے موڑا۔

فرخندہ کو لگا اس کا بازو کندھے سے جیسے الگ  
ہو گیا ہو۔

سلطانہ کی آنکھوں سے آگ کی لپٹیں نکل نکل کر  
فرخندہ کو لپیٹ میں لینے لگیں، وہ تھوڑا خوفزدہ ہوئی  
تھی۔

”پیر خوٹ علی شاہ کی نام نہاد بیوی! اس بے عزتی  
کا بدلہ میں تم سے لے کر رہوں گی وہ بھی سود سمیت،  
جس وارث کو پیدا کرنے کے چکر میں تم اٹھلا رہی ہو،  
اس کا تو وجود بھی نہ رہے گا مگر اس حویلی کی آئندہ  
نسلیں تمہارا نام لیتے ڈریں گی۔ اپنے انجام کا سوچو  
اور اُس وقت سے پناہ مانگو۔“ سلطانہ زخمی ناگن بنی  
پھنکاری تھی اور جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا۔

ان کی آنکھیں باہر کو اُبل رہی تھیں۔

”میرے انجام کا تعین کرنے والی آپ کون  
ہوتی ہیں؟ آپ طاقت ور سہی مگر ایک بڑی ہستی بھی  
ہے جو آپ سے ہر مظلوم کے ظلم کا بدلہ لے گی، اور وہ

شخصی غوث علی شاہ کے قریب کھڑی ان کے کندھوں پر  
پیار سے ہاتھ ڈالے۔ اٹھلا کر کچھ کہہ رہی تھی۔ اور وہ  
مسکرا کر اُسے دیکھ رہے تھے۔

(ہونہہ بالوں میں چاندی اتر آئی، مگر کم عمر بیوی  
سے محبت کا بخار نہ اتر سکا، کبھی مجھے تو اتنی محبت سے  
دیکھا نہیں؟ ہونہہ مجھے ایسے انداز اور ایسی ادائیں بھی  
کہاں آتی ہیں؟) وہ خود ہی سے سوال اور خود ہی سے  
جواب دے رہی تھیں۔

رقابت یونہی آگ لگاتی ہے دگر نہ وہ سوچتی تو  
بہت مشکل سے کوئی ایسا لمحہ ملتا جب وہ غوث علی شاہ  
کے قریب گئی ہوں یا اُن سے محبت سے بات کی ہو۔  
غوث علی شاہ کو رخصت کر کے فرخندہ مسکراتی  
ہوئی اندر داخل ہوئی تھی سامنے سلطانہ کو دیکھ کر اس کی  
مسکراہٹ سمٹ گئی۔

بہت پر پرزے نکل آئے تمہارے..... کہاں تو  
شروع شروع میں دوپٹہ منہ میں وا بے سہی سہی ہی اس  
حویلی میں پھرتی تھی، لگتا ہے مینڈکی کو بھی زکام  
ہو گیا۔“ سلطانہ مسخراڑاتے ہوئی تھی۔

”بیوی ہوں میں غوث علی شاہ کی۔“ وہ ذرا کمزور  
پڑی تھی، مقابلے میں سلطانہ جیسی شخصیت کا ہونا کوئی  
عام بات نہ تھی، ان کی ذات میں کوئی عجیب سی طاقت  
اور کشش تھی۔

”ہونہہ بیوی!“ سلطانہ قہقہہ لگاتی سر جھٹکتے مذاق  
اڑاتے ہوئی تھیں۔ ”بی بی! اس بھول میں مت رہنا،

سارے پرکاٹ ڈالوں گی، تم مجھے ابھی صحیح طرح سے  
جانتی نہیں۔ پیر محمد الدین کی بیٹی ہوں میں..... پورے  
خاندان میں ہمارے ہم پلہ کوئی نہیں نہ دولت میں اور نہ

منتصب میں..... تم اگر میری سوتن بنی ہو تو صرف میرے  
بابا پیر محمد الدین کی وجہ سے، دگر نہ تم میں سے ہی کیا  
سوائے خوب صورتی کے؟“ سلطانہ طیش میں آگئی تھیں۔

مارے تو ہیں کے فرخندہ کا چہرہ سلگ اٹھا۔ (تم  
میري بیوی ہو کسی سے دبے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں  
کوئی پتھر اٹھائے تو تم اینٹ اٹھا لینا، کمزور پڑنے کی

ضرورت نہیں، سلطانہ طاقت ور سہی، پر میری بیوی ہے  
ماں نہیں، تم پر میری ماں کی اطاعت فرض ہے کیوں کہ وہ



ہستی آپ کی سوچ سے بھی زیادہ طاقت ور اور بڑی ہے۔“ اُس نے ہمت کر کے جواب دیا تھا۔  
سلطانہ وہاں سے بغیر جواب دیے جا چکی تھی۔  
فرخندہ نے اپنے بازو سے آستین ہٹا کر دیکھا، وہاں سلطانہ کی انگلیوں اور انگوٹھیوں سے نیل بڑ گئے تھے۔  
تکلیف کی زیادتی سے اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

سلطانہ، مظفر خان کے خط نکالنے سے سرے سے پڑھ رہی تھیں اور سرشاری تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔  
”باجی جی! دروازہ کھولیں باجی جی۔“ گلینہ  
اوپچی آواز میں صدا دیتی دروازہ کھٹکتا رہی تھی۔  
”کیا آفت آگئی..... کے موت آگئی جو یوں  
داؤد بچا رہی ہے کینی۔“ وہ بکس میں سارے خط  
ڈال کر بند کرتی دروازے تک آئی اور دروازہ کھولا۔  
سائے حواس باختہ سی گلینہ کھڑی تھی۔

”بکو، کیا بات ہے؟“ وہ کھاٹ کھانے کو  
دوڑیں۔ (پیری کا عشق جو کہیں کا نہ رہنے دے، بے  
چاری سلطانہ)

”وہ بڑی بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے،  
پیر صاحب۔ ان کے کمرے میں آپ کا انتظار  
کر رہے ہیں، جلدی آئیں۔“ اُس نے پھولے سانس  
کے درمیان بات کھل کی۔

”تو یہ کون سی نئی بات ہے، جو تم نے اتنا شور مچا  
رکھا تھا، بڑی بی کی طبیعت تو روز خراب ہوتی ہے اور دو  
منٹ میں پھر سے سنبھل جاتی ہے۔ یہ تو روز کا ڈرامہ  
ہے۔ سارے موڈ کا ستیا ناس کر دیا۔“ غصے سے کہہ کر  
انہوں نے گلینہ کے سر پر بھاری ہاتھ مارا اور بگڑے  
تیوروں سے شال ٹھیک کرتی باہر آئی تھیں۔

بڑے کمرے میں غوث علی شاہ اپنی بیمار معذور  
ماں کے پاس بیٹھے ان کا ہاتھ سہلارہے تھے۔ بڑی بی  
بی جو قاج کا شکار تھیں بہت مشکلوں سے انھیں کچھ  
بتانے کی کوشش میں تھی۔

(یہ اور بات کہ غوث علی شاہ ان کے اشاروں  
کنایوں میں کہی باتوں کو سمجھ نہ سکے تھے، وہ ہر بار  
سلطانہ سے بے زاری ظاہر کرتیں اس کی شکایت

کرنے کی کوشش کرتی تھیں)  
”کیا ہوا بڑی بی بی کو؟ کیا بہت طبیعت خراب  
ہے۔“ سلطانہ اندر داخل ہو کر تشویش اور فکر مندی سے  
بولی تھیں۔

”اب طبیعت بہتر ہے، میں نے دوا کھلا دی  
ہے۔“ وہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

سلطانہ نے غوث علی شاہ سے نگاہیں ہٹا کر پاس  
کھڑی فرخندہ کو ناگوار انداز سے دیکھا تھا۔

”آپ نے آج پھر بڑی بی بی کو دوا نہیں  
کھلائی۔ بہت افسوس ہوا۔ آپ تو بہت ذمہ دار  
طبیعت کی مالک ہیں پوری حویلی کے معاملات خوش  
اسلوبی سے چلا رہی ہیں۔ پھر کیوں آج کل آپ سے  
اس معاملے میں کوتاہیاں ہو رہی ہیں؟ آپ جانتی ہیں  
مجھے اپنی ماں سے کتنی محبت ہے، اور مجھے آپ سے  
زیادہ کسی پر بھروسہ نہیں، سبھی ان کی ذمہ داری آپ کو  
دے کر میں باہر کے کام مطمئن ہو کر سنبھالتا ہوں۔“  
وہ ڈکھ سے بولے تھے۔ سلطانہ تھوڑا سا شرمندہ ہوئی  
تھیں۔

آپ جانتے تو ہیں، اتنی بڑی حویلی کے  
انتظامات مجھے ہی سنبھالنے پڑتے ہیں۔ پھر گاؤں  
کے لوگوں کے معاملات، ہر آئے گئے کا خیال، بس صبح  
سے جو مصروف ہوتی ہوں تو سر کھجانے کی بھی مہلت  
نہیں ملتی، مگر نہ آپ جانتے ہیں۔ پچھلے بیس برسوں  
میں، میں نے کیسے ہر کام سنبھال رکھا ہے، اس بات  
کے آپ بھی گواہ ہیں۔“ کون سا مہرہ کس وقت کیسے  
استعمال کرنا ہے یہ سلطانہ سے بہتر کون جانتا تھا۔

پیر غوث علی شاہ قائل ہو گئے۔

”یہ تو میں بخوبی جانتا ہوں، تا یا پیر محمد الدین  
مرحوم نے اس حویلی کے لیے بالکل صحیح آپ کا انتخاب  
کیا تھا، اپنے پڑکھوں کی ہر روایت کو آپ نے اب  
تک زندہ رکھا ہے، آپ کی ذہانت کا تو سارا گاؤں  
گواہ ہے۔“ وہ غصے سے بولے۔

سلطانہ ان لوگوں میں سے تھی جو سامنے تو ٹوٹ کر  
طرح بیٹھے ہوتے ہیں، مگر دار ہمیشہ پیٹھ پر کرنے کے  
قائل ہوتے ہیں، اُس نے بھی ساری زندگی گڑبگڑ میں کر

غوث علی شاہ کی جڑیں کھالی تھیں۔

وہ معصوم سادہ سے انسان سلطانہ کے دوسرے  
مکر وہ روپ سے ناواقف تھے۔

”شاہ صاحب اگر آپ مناسب سمجھیں تو ایک  
بات عرض کروں؟“ فرخندہ نے بالآخر خاموشی کو  
توڑا۔

”بولو..... بابا اجازت کی کیا بات ہے۔“ وہ محبت  
سے بولے تھے۔

”میں سارا دن فارغ رہتی ہوں، اگر بڑی بی بی  
کی ذمہ داری مجھے دی جائے تو میرے لیے بہت خوشی  
کی بات ہوگی۔ بزرگوں کی خدمت ہی ہمارے  
خاندان کی شان ہے۔“ وہ اپنائیت سے بولی تھی۔

”بات تو سو فیصد درست کہی تم نے فرخندہ! آپ  
کیا کہتی ہیں؟“ وہ اب سلطانہ کی سمت متوجہ ہوئے۔

”جو آپ مناسب سمجھیں۔“ اندر سے اس کی  
چالاکي رنگلا تھیں مگر بظاہر مسکرا کر بولی تھیں۔

”تو ٹھیک ہے۔ فرخندہ اب تم نے بڑی بی بی کی  
خدمت کرنی ہے۔ ان کا خیال رکھنا ہے۔ سلطانہ نے  
اتنے برسوں میں اچھی طرح اپنی ذمہ داری پوری کی  
اب اسے آرام ملنا چاہیے۔“ وہ مسکرائے۔

”بڑی بی بی نے خوش ہو کر ہاتھ بڑھانا چاہا کچھ  
پیماری کی نشاہت، ہاتھ واپس نیچے جا پڑا جو غوث علی  
شاہ نے محبت سے تمام کراپے سر پر رکھا اور ان کی  
دعائیں لی تھیں۔“

سلطانہ جیسی بلا سے ان کی جان چھوٹی تھی، وہ جتنا  
خوش ہوئیں کم تھا۔ فرخندہ نے آگے بڑھ کر سر نیچے کیا،  
بڑی بی بی نے محبت سے ان کا سر چوما۔

وہ سیدھی ہوئی تو جاتی نظروں سے سلطانہ کو  
دیکھا، ان کی تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”تمہارا تو اب کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا، پر لمبے  
کر لیے ہیں، اس سے پہلے کے اوچی اڑان بھرو،

تمہارے پر کاٹ کر تمہیں اڑنے کے قابل ہی نہیں  
چھوڑوں گی، تب تمہیں یاد آئے گا اور پچھتاؤ گی،

سلطانہ سے دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی فرخندہ  
جیگم۔ غوث علی شاہ کمرے سے نکل گئے۔ فرخندہ بھی

ان کے پیچھے گئی تھی۔

”تم جاؤ میں میں ابھی آتی ہوں۔“ سلطانہ نے  
گھینہ کو حکم دیا وہ فوراً سر ہلاتی چلی گئی تھی۔

سلطانہ قدم قدم چلتی بڑی بی بی تک آئیں۔  
انہوں نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔

”کس حال تک پہنچ گئی ہو تم بڑی بی بی، مگر اکڑ  
ویسے کی ویسے ہی ہے۔ افسوس کہ تم بول نہیں سکتی ہو،

اگر بول بھی لیتیں تو میرا کچھ نہیں بگڑتا، کون تمہارا نقین  
کرتا؟ میں جو کرتی ہوں بڑی صفائی سے کرتی ہوں،

اپنے بیٹے اور نام نہاد بہو کے زعم میں یہ مت سمجھنا تم  
مجھ سے میری طاقت چھین لوگی۔ وہ دونوں میری بساط  
پر بچھے مہرے ہیں۔ جب چاہوں، انہیں پیٹ سکتی

ہوں۔ شہ اور مات میرے ہاتھوں میں ہے، آخری  
بار کہہ رہی ہوں میرے راستے میں مت آؤ، تم کمزور  
ہو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ نہیں تو تمہیں ختم کرنے میں  
مجھے سیکند بھی نہیں لگے گا۔“

ان کی آخری بات نے بڑی بی بی کو کپکپا کر رکھ  
دیا اور منہ ان کی طرف موڑ کر دیکھا تو آنکھوں میں  
آنسو تھے۔

افسوس اور ملامت کے آنسو۔ کہ ان کے خاندان  
میں ایسی زہریلی ناگن کیسے پیدا ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”گھینہ، منشی کو بلاؤ، مجھے کچھ ضروری حساب  
کتاب کرنا ہے۔“ سلطانہ بہت عجلت اور بے تابی میں  
نظر آ رہی تھی۔ گھینہ سر ہلاتی تیزی سے گئی اور پندرہ

بیس منٹ بعد منشی سمیت واپس آئی تھی۔  
کھڑکی میں کھڑی سلطانہ نے منشی کو دیکھا تو شال

درست کرتی نیچے باغ کی طرف آئی تھیں۔  
”تم جاؤ۔“ گھینہ کو حکم ہوا وہ چلی گئی۔

”سلام بی بی جی۔“ وہ ہاتھ باندھے سر جھکائے  
کانپتے ہوئے بولا۔

(جانے حساب کتاب میں پھر سے کیا غلطی ہو گئی  
جو انہوں نے اتنی جلدی پیشی کے لیے بلایا تھا؟) اس

کا ڈر سچا تھا۔  
”تم سے ایک ضروری کام تھا، تمہارے سوا کسی

READING

88 سچی کہانیاں



پر بھروسہ کرنے کو دل نہیں مانا، امید ہے میری توقع پر پورا اترے گا، کام بڑا ہے، راز دارمی شرط۔ بڑے کام کا بڑا معاوضہ بھی دوں گی۔ اگر کر سکے تو؟“  
سلطانہ نے پتا پھینکا۔

وہ بے چارہ غلام تھا انکار کر کے موت کو گلے لگانا تھا کیا۔ فوراً حامی بھرنی۔

جو آپ کا حکم، جان مانگیں گی تو وہ بھی حاضر ہے، برسوں آپ کا نمک کھایا، آپ کے کام نہ آ کر نمک حرامی تھوڑی کرنی ہے۔“ وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔  
”یہ تو تم نے سولہ آنے درست بات کی ہے، کام ہی بڑی راز دارمی والا ہے۔“

”آپ حکم کریں؟“ وہ ان کی بات پر نہایت ادب سے بولا تھا۔

”بیر غوث علی شاہ کی دوسری بیوی فرخندہ کا چچا زاد، جو اس کے بچپن کا منگیترا بھی تھا معظم علی..... مجھے اس سے ملنا ہے۔ مگر یہاں۔۔۔ حویلی کے حدود سے ذرا دور اور یہ ملاقات جتنی جلدی ہو، اتنی ہی اچھی بات ہوگی، بولو اور نظام کرو گے؟“ وہ حکم بولیں۔

”خیریت تو ہے بی بی! معظم علی سے کیا کام پڑ گیا آپ کو؟“ وہ منسنانا۔

”حد میں رہو..... یہ مت بھولو کہ تم ہمارے غلام ہو اور غلام مالکوں سے سوال نہیں کرتے۔“ وہ حسب عادت جلد پیش میں آگئی تھیں۔  
”غلطی ہوئی بی بی..... معاف کر دیں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔“ وہ گھبرا کر بولا تھا۔

”یہ کام آج دوپہر تک ہو جانا چاہیے۔“ وہ کہہ کر جا چکی تھیں۔ شامت منشی کی آگئی اگر غوث علی شاہ کو بہتک بھی پڑ جاتی، اس کا زندہ بچنا ممکن نہ تھا۔

☆☆☆

”بدلے کی آگ میں جلنا کیسا ہے، مجھ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا معظم علی۔ بچپن کی غلطی کو ذرا سی خاندانی چپقلش کی وجہ سے توڑ دینا چھوٹی بات نہیں۔ تمہاری غیرت اور عزت کا سوال تھا، تم تو پھر اچھے تھے کہ بزرگوں کی وجہ سے خون کے گھونٹ پی گئے، اب بھی وقت ہے، میرا ساتھ دو گے تو وہ کبھی کسی کا گھر

نہ بسا پائے گی، تمہیں اجاڑ کر بھلا وہ کیسے خود سے بڑی عمر کے آدمی کے ساتھ ہنسی خوشی رہ سکتی ہے۔“ سلطانہ اُسے بھڑکانا چاہتی تھی، وہ تو جیسے پہلے سے ہی جلتے توڑے پر بیٹھا تھا۔

”ایسا بدلہ لوں گا اُس سے اور اس کے بھائیوں سے کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“ اس کے منہ سے آگ نکلی تھی۔

سلطانہ کے کلیجے میں ٹھنڈا تر آئی۔  
”تمہیں خود کو ہلان کرنے کی ضرورت نہیں میں جو کہوں بس اُس پر عمل کرتے جاؤ، باقی سارا کام میرا دیکھتا کیسے دنوں میں اُسے اور اُس کی ہنستے بستے گھر کو اجاڑتی ہوں۔“

”آپ واقعی ایک بہادر اور ذہین عورت ہیں، جتنا سنا تھا اُس سے بڑھ کر پایا ہے۔“ وہ ستاثر نظر آیا۔

میرے ساتھ مل کر کام کرو گے تو تمہاری ذہانت دو چند ہو جائے گی۔“ ان کی بات پر معظم علی نے قہقہہ لگایا تھا۔

☆☆☆

فرخندہ کی حرکات و سکنات آج کل غوث علی شاہ کو طیل ملی چونکا رہی تھیں۔ وہ کچھ گھبرائی گھبرائی سی رہنے لگی تھی۔ اکثر ایسے بڑ بڑا جاتی جیسے اچانک اُسے نیند سے بیدار کیا گیا ہو، سلطانہ تیلی جلا کر اب خاموشی سے تیل کی وھارو کھتی جا رہی تھیں۔

وقت آنے پر انھوں نے اپنا حصہ بھی ڈالنا تھا مگر فی الحال وہ خاموش تھیں۔

آج بھی وہ غوث علی شاہ کے ساتھ ناشتا کر رہی تھیں۔ فرخندہ کافی ویر سے فون پر کسی سے بحث کر رہی تھی۔

آواز تو اتنی دور سے سنائی نہ وے رہی تھی مگر اس کی حرکات اور چہرے کے زاویوں سے معلوم پڑ رہا تھا۔

”دیکھیں تو ذرا آج کل اس کے کچھ زیادہ ہی فون نہیں آنے لگے؟ جب دیکھو فون پر لگی رہتی ہے یا کسی نہ کسی بہانے حویلی سے نکل پڑتی ہے۔ آپ

معلوم تو کریں خیریت ہے؟“ وہ شیطانی سے کہتی آخر میں فکر سے بولیں۔ ان کی بات نے غوث علی شاہ کو سوچ میں ڈال دیا۔

”مجھے بھی یہ آج کل کچھ بدنی بدنی سی لگ رہی ہے۔ کافی دنوں سے محسوس کر رہا ہوں، سوچا تھا شاید میرا وہم ہو۔“ تیرنشانے پر لگا تھا۔ ڈائمنگ میل سے لاؤنج میں رکھانوں اور جگہ واضح دکھائی دے رہی تھی، وہ فون رکھ کر چہرے پر ہاتھ پھیرتی خوفزدہ سے انداز میں دائیں بائیں دیکھ کر ناشتے کے لیے جھکی نظروں سے سلام کر کے سلطانہ کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

”خیریت؟ کس کا فون تھا؟ اور تمہاری رنگت کیوں پھلی پڑ رہی ہے؟“ غوث علی شاہ کا انداز تشویش بھرا تھا۔

”نہیں تو..... خیریت ہی ہے..... کیا ہونا ہے مجھے؟“ وہ منہ پر ہاتھ دھرتے خوفزدہ ہوئی۔

صاف لگ رہا تھا وہ کچھ چھپانے کی کوششوں میں ہے۔ بظاہر جیسے زیرک عمر رسیدہ شخص سے کیسے کچھ پوشیدہ رہتا۔ سب صاف صاف نظر آ رہا تھا۔

”فون کس کا تھا؟“ اب کی بار ان کا لہجہ بدل چکا تھا۔

سلطانہ کا جی چاہا تہمت لگا کر خوشی منانے مگر بھینچ گئیں۔

”وہ..... میری سہیلی تھی۔“ اس نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری تھی۔ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی وہ گناہ گار ثابت ہو رہی تھی، موت کا مقام تھا، مگر وہ بے بس تھی۔

”کون سی سہیلی، پچھلے دو سالوں میں مجھے یاد نہیں پڑتا تمہاری ایسی کوئی سہیلی تھی جو تمہیں دن میں کئی کئی بار فون کرے؟“ شک کے ناگ کو موقع مل گیا تھا۔ غوث علی شاہ کو دل پر ڈسا تھا اور ٹھیک وقت پر ڈسا تھا۔

وہ ہے میری ایک سہیلی، بچپن کی دوستی ہے، کافی عرصہ سے ہمارا رابطہ نہیں تو اب اکثر ہم بات کر لیتے ہیں۔“ اس سے بات بھی ٹھیک سے ہو نہیں پائی۔

”بات کہاں کرتی ہو؟ مجھے تو لگتا ہے بس جھگڑتی

ہی رہتی ہو۔“ سلطانہ نے پتا پھینکا۔ فرخندہ کی رہی سہی بہت بھی ٹوٹنے لگی۔ غوث علی شاہ نے جواب میں کچھ نہ کہا کرسی دھکیلتے اٹھے اور بغیر ناشتا کیے چلے گئے۔

فرخندہ بمشکل آنسو ضبط کرتی اوپر کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ سلطانہ نے مزے سے ناشتا مکمل کیا اور کمرے میں آ کر دروازہ لاک کر کے مظفر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ پہلی بیل پر ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

”اجازت ہو تو میں بھی شامل آ کے ان میں ہو جاؤں۔“ سنا ہے کل تیرے در یہ جوم عاشقاں ہوگا۔“

”واہ تمہاری یہی ادا نہیں تو مجھے اچھی لگتی ہیں۔ بہت چالاک ہو مظفر، ہر حال میں جان جانتے ہو کہ میرے دل میں کیا ہے۔“ سلطانہ بہت خوش تھیں۔

”تو کب مل رہی ہو پھر؟“ وہ لطف لیتے بولا۔

آج کل میں بڑی بی بی کا پتا کٹ جائے گا۔ بس یہی آخری مہرہ بچا ہے، فرخندہ کو تو پھر آسانی سے انگلیوں میں مسل کر ختم کر لوں گی، یہی دوکانے بچے ہیں۔“ اور غوث علی شاہ؟ مظفر ٹھنکا۔ آخر کور قب تھا۔

جب سب کچھ ختم ہو جائے گا تو بھلا رسوائی کیسے جینے دے گی۔ وہ تو پھر خود ہی ختم ہو جائے گا اور پھر ہمارے خاندان کا آخری چراغ ہے وہ۔ اُسے ختم کر کے کیوں بزرگوں کی بددعائیں لوں..... یہ گناہ مجھ سے نہیں ہوگا۔“ وہ آخری جملے پہ ٹھہر کر آواز نکالتی ہوئی تھیں۔

”کتنی ذلالت ہے تم میں، اور کتنی کتنی شریف ہو، واہ بھی واہ تمہیں تو اتنی بہترین اداکاری پر سرکاری اعزاز ملنا چاہیے۔“ وہ نکاری سے بولا تھا۔

کافی دیر تک وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ فون بند کر کے وہ الماری کی طرف بڑھنے لگیں کہ دوبارہ فون بجنے لگا۔ معظم علی کی کال تھی۔ انھوں نے کان سے موبائل لگایا۔

”معمظم علی کل تیار رہنا تمہارا انتظار آخری مرحلے میں ہے، غوث علی شاہ پوری طرح اُس سے





نفرت ہے۔“ وہ نفرت سے بولی تھی۔  
مگر مجھے تم سے آج بھی اتنی ہی محبت ہے۔ بہت  
محبت۔“ اُس نے فرخندہ کے دونوں ہاتھ تھامے  
تھے۔

اب کی بار فرخندہ پتھر بن گئی تھی معظم کی  
حرکت نے نہیں کسی اور بات نے اُسے بت بنایا  
تھا۔ اُس نے فرخندہ کی نظروں کے تعاقب میں  
پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔

غوث علی شاہ، سلطانہ کے پہلو میں گم صم سے  
کھڑے انہی کی طرف متوجہ تھے۔ فرخندہ کے  
ساتھ معظم کو دیکھ کر ان کا چہرہ تاریک پڑ گیا تھا۔  
اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا یا کرتا غوث علی شاہ  
پیچھے کھڑی گاڑی میں بیٹھے تھے اور آندھی  
طوفانوں کی طرح چلے گئے۔

معظم علی نے برف بنی فرخندہ کے ہاتھ چھوڑ  
دیے، وہ وہیں کسی بے کس خالی ہاتھ فقیرنی کی طرح  
زمین پر گری روٹنے لگی۔

معظم اور سلطانہ میں نظروں کا تبادلہ ہوا وہ آگے  
بڑھ گیا۔ سلطانہ، فرخندہ کے پاس آ کر اُسے سہارا  
دیے اٹھانے لگی تھیں۔ مقصد پورا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”یوں لگ رہا ہے بھرے مجمع میں کسی نے  
میرے منہ پر کانک مل دی ہو، خودکشی حرام نہ ہوتی تو  
میں اس لمحے زندہ نہ ہوتا۔“ غوث علی شاہ کا لہجہ بہت  
شکست خورہ تھا۔

”ایسے باتیں مت کریں، اس خاندان کے  
دارث ہیں آپ، اگلو تے بیٹے، آپ کو ایسی یا پوسی کی  
باتیں زیب نہیں دیتی۔“ سلطانہ نے انہیں تسلی دی  
تھی۔ وہ خاموشی سے کچھ سوچتے رہے۔

”سلطانہ؟“ خاموشی بھرا سکوت ان کی بھاری  
آواز سے ٹوٹا۔

”جی!“ وہ دھڑکتے دل سے شکر تھیں۔

آریا پار فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چاہتی  
تو سفاک سے سفاک بات کر کے انہیں قائل  
کر سکتی تھیں۔

بدظن ہو چکا ہے اور تمہیں اس کے قریب دیکھ کر یہ  
شک بھی نہیں میں بدل جائے گا، آخر کو تمہاری اس  
سے محبت کوئی ڈھکی چھپی بات تو ہے نہیں، کل جمعہ ہے  
مزار پہ حاضری دینے جانا ہے۔ فرخندہ پہلے جائے گی  
تم وہاں موجود رہنا، میں غوث علی شاہ کے ساتھ عین  
ناگم پر پہنچ جاؤں گی، مگر یاد رہے..... تمہیں فرخندہ  
کے نزدیک آنا ہوگا۔ اتنا نزدیک کہ غوث علی شاہ بغیر  
سوچے سمجھے اُسے جان سے مار ڈالے۔“ وہ نفرت  
سے بولی تھیں۔ ”میں تیار ہوں، پوری طرح سے  
تیار۔“ وہ گہری سانس لیتا فون بند کر گیا۔

☆☆☆

”میں نے کہا میرا راستہ چھوڑو۔ کیا ہے یہ سب؟  
اب کیوں میرے راستے میں آ کر مجھے زسوا کرنا  
چاہتے ہو۔ کیوں ایسا کر رہے ہو میرے ساتھ؟“  
فرخندہ مزار کے احاطے میں اک طرف کھڑی تھی۔  
معظم علی اُس کے سامنے تھا، وہ چیخ نہیں سکتی تھی  
اُسے گریبان سے نہیں کچھ سکتی تھی۔ جس شخص نے اس  
کی زندگی اُس پر تنگ کر رکھی تھی وہ لوگوں کا خیال اور  
اپنی عزت کی وجہ سے اُس کو کچھ کہہ بھی نہیں پارہی  
تھی۔

”میں تم سے آج بھی بہت محبت کرتا ہوں  
فرخندہ..... میرا یقین کرو، تم کسی سے مت ڈرو۔ تمہیں  
غوث علی شاہ سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں  
ہوں تمہارے ساتھ، ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ ایک  
بار میری بات مان لو۔“ وہ التجائیہ لہجے میں بولا تھا۔  
”بکو اس بند کرو۔ ہوش میں تو ہو؟ یہ تم کیا کہہ رہے  
ہو؟“ وہ بمشکل نیچی آواز میں غرائی تھی۔

غصے کی زیادتی سے اس کا نازک وجود کانپ رہا  
تھا۔ ”اپنی گندی زبان سے میرا میرے شوہر کا نام  
پاں لینا دوبارہ۔ لعنت ہے تم جیسی گندی ذہنیت والے  
فحش پہ، میرا تم سے کوئی لینا دینا نہیں، آئندہ میرے  
راستے میں مت آنا۔ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا  
سمجھے تم؟“ وہ انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتی۔ دائیں طرف  
سے نکلنے لگی کہ معظم نے پھر سے اس کا راستہ روکا۔

”ہٹو سامنے سے۔ مجھے تمہاری صورت سے بھی

READING  
Section

کہہ کر بیڈ پر لیٹ گئے اور آنکھیں موند لیں۔  
 ”اس موضوع پر پھر کبھی بات ہوگی، ابھی اُس  
 سے کہہ دیں، میرے سامنے نہ آئے۔“ وہ آنکھیں  
 بند کیے ہی گویا ہوئے تھے۔

سلطانہ نے ساری لائیں آف کیں اور  
 کمرے سے نکل آئیں۔ اس رات فرخندہ ان  
 کے پاس آئی تھی بہت رو رہی تھی۔ اُن سے مدد کی  
 بھیک بھی مانگی۔ مگر انھوں نے دھتکار دیا، غوث  
 علی شاہ کی بات سن و عن دہرائی، وہ بہت نڈھال  
 سی ان کے کمرے سے نکلی تھی۔

☆☆☆

”گنیمتہ یہ شور کیسا ہے۔“ سلطانہ سیدھی ہوئیں،  
 گنیمتہ جوان کی ٹانگیں دبا رہی تھی باہر کی طرف بھاگی۔  
 سلطانہ تب تک بیڈ سے اتر کر دوپٹہ ٹھیک کیے  
 تیار کھڑی تھیں۔

”باجی جی! پیر صاحب نے فرخندہ لی بی کو بہت  
 مارا ہے، وہ روز رو کر معافی مانگ رہی ہیں، پیر صاحب  
 بہت غصے میں ہے۔“ وہ حواس باختہ سی بولی تھی۔  
 سلطانہ باہر آئیں، تو فرخندہ کو غوث علی شاہ کے  
 قدموں میں گرے روتے پایا۔ وہ گریہ کر رہی تھی۔

”پیر صاحب میں بے گناہ ہوں، یہ بہتان ہے  
 جھوٹ ہے، میں معصوم ہوں، آپ کے سوا کبھی کسی مرد  
 کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ وہ شخص جھوٹ کہہ  
 رہا ہے۔ میری کوکھ میں پیر خاندان کا وارث پل رہا  
 ہے کوئی گندا خون نہیں۔ میرا تھین کریں۔“ غوث علی  
 شاہ نے اُسے ہیر کی ٹھوک سے پرے کیا تھا۔

”سلطانہ اس بد ذات عورت سے کہو، چلی جائے  
 میرے سامنے سے، مجھے اس کی صورت سے بھی نفرت  
 ہے۔ چاہے یہ کتنی صفائیاں دے، جھوٹی قسمیں کھائے  
 مجھے اس کا تھین نہیں۔ یہ میری نظروں سے گر چکی  
 ہے۔“ وہ سلطانہ بیگم سے مخاطب ہوئے تھے۔

”شاہی شدہ عورت جب زنا کرتی ہے تو اس پر  
 کیا حد لگتی ہے ذرا یہ بھی بتادیں اس بے شرم اور ڈھیٹ  
 عورت کو۔“ ان کی بات پر فرخندہ مزید تڑپی گئی۔  
 ”نہیں پیر صاحب خدا کے لیے مجھ پر ایسی تہمت

”آپ لوگوں کے فیصلے کرتی ہیں، گاؤں کا ہر فیصلہ  
 آپ کی مرضی سے ہوتا ہے، اس بارے میں آپ کیا کہیں  
 گی؟“ ان کی بات پر وہ کچھ پل کے لیے ست رہ گئی۔  
 ”بولیے؟“ وہ بے تابی سے بولے تھے۔

”آپ کو برا نہ لگ جائے۔“ وہ جھجکیں تھیں۔  
 ”میرا دل بول رہا ہے، اگر آپ کچھ جانتی ہیں تو  
 بلا جھجک کہہ دیں، میں سبہ لوں گا۔“ ان کی آواز ذرا  
 سی کانپی تھی۔  
 سلطانہ کو اُن جیسے مضبوط شخص کی یہ کمزوری کچھ  
 عجیب سی لگی تھی۔

”آپ کے جانے کے بعد میں نے معظم علی سے  
 بات کی تھی کافی بُرا بھلا کہا، وہ قسم کھانے کو تیار ہے کہ  
 اکیلا وہ گناہ گار نہیں، فرخندہ خود اسے فون کر کے ملنے  
 پر مجبور کرتی ہے۔“

”اور یہ ملاقاتوں کا سلسلہ کب سے جاری  
 ہے؟“ آواز جیسے کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔

”کافی عرصے سے.....“ وہ خاموش ہوئیں تھوڑا  
 وقفہ لیا، اور یہ ملاقاتیں۔“ صرف دن تک ہی محدود  
 نہیں رات کے اندھیرے میں فرخندہ ملنے جاتی ہے  
 معظم علی سے۔“ سلطانہ نے بات بمشکل مکمل کی تھی۔

یہ بات نہیں تھی بھلا تھا جو کسی نے غوث علی شاہ  
 کے عین دل پر پڑوست کیا تھا۔ انھوں نے مضبوطی سے  
 سینہ تھاما، یوں لگ رہا تھا کہ اُن کے دل سے خون ابل  
 ابل کر بہ رہا ہو۔

”مجھے لگتا ہے جن وارث کو وہ پیر خاندان کا کہہ  
 رہی ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔“ سلطانہ نے بالآخر  
 تابوت پہ آخری کیل ٹھونک ہی دی۔

”گاؤں کے ایسے کسی مسئلے میں آپ کیا فیصلہ  
 کرتی ہیں؟“ ان کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”میں کسی انگریزی قانون کو نہیں مانتی، ہمارے  
 گاؤں میں بابا مرحوم اسلامی حدود نافذ کر گئے تھے،  
 میں اب بھی اسی قانون پر عمل کرتی ہوں، آپ نے  
 کبھی دلچسپی لینے کی کوشش بھی نہ کی..... کتنے بے خبر  
 رہے آپ۔“ وہ افسوس سے بولیں۔

”اسی بے خبری نے تو آج یہ دن دکھایا ہے۔“ وہ



مت لگائیں۔ میں زانیہ نہیں۔ معصوم ہوں۔ رحم کریں۔“  
غوث علی شاہ نے اس کی گریہ و زاری کو خاطر میں  
نہلاتے ہوئے کہا کہ حقارت سے اس سے منہ پھیرا تھا۔  
”شاہی شدہ مرد و عورت کے لیے سنگساری کا حکم  
ہے، اور یہ سنگساری عبرت کے لیے کچھ لوگوں کے  
سامنے یعنی کھلے مجمع میں وی جائے گی۔ معظم علی کو سو  
کوڑے لگیں گے اور فرخندہ کو سنگسار کیا جائے گا، مگر  
فرخندہ تو ماں بننے والی ہے اور بچے کی پیدائش تک  
اسے ہم سنگسار نہیں کر سکتے۔“ سلطانہ نے سفاکی کی حد  
کر دی تھی فرخندہ تڑپ تڑپ کر رہی تھی۔

غوث علی شاہ نے اپنی سرخ آنکھیں نکالیں۔  
”مجھے اس بچے سے کوئی سروکار نہیں۔ آج میں شہر سے  
باہر جا رہا ہوں ایک ضروری کام سے۔ سلطانہ آپ  
انتظام کریں، خاندان کے لوگ اور گاؤں کے کچھ  
لوگوں کو تیار کر لیجئے یہ سزا اکل ہی وی جائے گی۔ اس  
جیسی عورت کا انجام ہر کوئی دیکھے گا۔ جس نے ہمارے  
خاندان پر بھلا لگا دیا۔ پیر خاندان کو سراٹھانے کے لائق  
نہ چھوڑا۔ کل تک میں واپس آ جاؤں گا انتظام ہر  
صورت کھل ہونا چاہیے۔ میں مزید اسے اس حویلی میں  
رواہت نہیں کروں گا۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے  
جا چکے تھے۔

”میں اس انجام کی حق دار نہیں۔ میرا عقین  
کریں۔ آپ چار گواہ لائے بغیر مجھ پر ایسا سنگین جرم  
ثابت نہیں کر سکتے۔ مت کریں ایسا۔ نفرت کی آگ  
خود پر اتنی مت حاوی کریں۔ روزہ حشر کیا جواب دیں  
گے اللہ کو۔ پلیز مجھے وقت دیں۔ یوں رسوا مت کریں  
مجھے۔ میں بڑی عورت نہیں ہوں۔“ وہ زار و قطار روئی  
واہلا پھاری تھی۔  
سلطانہ بھی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

☆☆☆

غوث علی شاہ جانے کی تیاریوں میں تھے،  
سلطانہ انھیں مصروف پا کر بڑی بی بی کے کمرے میں  
چلی آئیں۔ آج تو ان کا پتا صاف گرووں۔ آج یہ،  
کل فرخندہ۔ دونوں کاٹنے نکل جائیں تو راستہ صاف  
ہوگا، پھر مجھے اور مظفر کو کوئی الگ نہیں کر سکے گا۔ یہ

چھپ چھپ کر ملنا بھی ختم، میں اب تھک گئی ہوں۔  
مزید یہ چھپ چھپائی نہیں کھیل سکتی۔ یہ کھیل اب ختم ہونا  
چاہیے۔“ وہ نیم اندھیرے میں ہنسی اٹھا کر بڑی بی بی  
تک آئیں وہ سکون کی نیند سو رہی تھیں۔

”تمہارا پتا کٹ چکا بڑی بی بی، یہ آخری لمحے ہیں۔  
اب آنکھ اگلے جہان ہی کھلے گی تمہاری۔“ وہ جھگی اس  
سے پہلے کہ نکیہ ان کے منہ پر رکھتیں وردازے پر کھٹکا  
ہوا تھا۔ وہ سیدھی ہوئیں چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔  
”ارے آپ..... اس وقت یہاں؟“ غوث علی  
شاہ کو دیکھ کر وہ سنبھلتے ہوئی تھیں۔

”جی میں فلائٹ کے لیے نکلنے ہی لگا تھا۔ سو چاہڑی  
بی بی سے مل لوں، سو رہی ہیں؟“ وہ آئیے آئے تھے۔  
”جی بس میں یہی دیکھنے آئی تھی، سکون سے سو  
رہی ہیں، میں نے وقت پرودا کھلا دی تھی۔“ وہ لہجے کو  
نارمل کرتے بولیں۔

ایک آپ ہی تو ہیں اس حویلی میں سب کا  
خیال رکھنے والی..... ہم تو خود سے بھی غافل ہیں۔“  
وہ اداسی سے بولے اور ماں کے پاس آ کر ان کا  
ماتھا چوما۔

”تین جا رہا ہوں، کل صبح تک واپسی ہوگی، تب  
تک حویلی اور اُس میں رہنے والوں کا خیال رکھیے  
گا۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ نکل گئے، سلطانہ ان  
کے پیچھے لپکی تھیں۔

انھیں رخصت کر کے جب وہ اندر کی طرف آئیں  
تو فون بج رہا تھا۔ پوری حویلی میں ہو کا عالم تھا، ہر  
طرف اداسی اور دیرانی چھائی ہوئی تھی۔  
”اس وقت کون ہے؟“ انھوں نے فون اٹھایا۔  
دوسری طرف سے مظفر تھا۔ وہ حویلی کے باہر  
کھڑا اندر آنے کی اجازت چاہ رہا تھا۔

”تم واپس چلے جاؤ..... پہلے ہی ہم پر مصیبت  
آئی ہوئی ہے، دو تین دن تک مزید صبر کر لو۔ پھر انتظار  
ختم۔“ وہ کوفت سے بولی تھیں۔

”تم جانتی ہو میں ضد کا پکا ہوں، اور اب تو پیر  
غوث علی شاہ بھی چلا گیا، حویلی میں کوئی نہیں ہے جس کا  
ڈر ہو..... وہ دو کبڑے عورتیں ہمارا کیا باڈل لیں گی؟“ وہ

یشاش لہجے میں بولا تھا۔

”کچھ دن انتظار نہیں کر سکتے تم؟“ وہ ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

”نہیں..... کچھ دن تو کیا ایک لمحہ، ایک پل بھی نہیں۔ یہ صرف خالی خولی دھمکی نہیں۔ بھلے تم فون بند کر لو۔ دروازہ مت کھولو۔ مگر میں یہاں سے ایک انچ نہیں ہلے گا۔ پھر دیتی رہتا لوگوں کو جواب۔ میں کون ہوں اور تم سے میرا کیا تعلق ہے۔“ اس نے لاڈ سے کہتے قہقہہ لگایا تھا۔

”ذلیل انسان رکو وہیں رہنا، میں آ کر دروازہ کھولتی ہوں، جانتے ہو تمہاری کوئی بات رد نہیں کرتی..... اس لیے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہو میری محبت کا۔“ اس نے مصنوعی غصہ دکھایا دو تین باتیں کہیں اور فون بند کر کے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتی داخلی دروازے کی طرف آئیں۔

بہت راز داری سے محتاط سی وہ اُسے اپنے کمرے تک لائی تھیں۔ وہ پہلی بار نہ آیا تھا وہ حویلی کے ایک ایک چپے سے واقف تھا۔ پچھلے برسوں میں کئی بار وہ یہاں آ چکا تھا۔

مگر آج کی رات کچھ عجیب سی تھی، سلطانہ اس کی آمد سے خوش تھیں مگر عجیب سی بے چینی نے دل کو گھیر رکھا تھا۔ ظاہری طور پر تو وہ مظفر کی سحر انگیز شخصیت کو دیکھ کے بہل گئی تھیں۔

اجانک سے موسم کے تیور بدلے تھے، بادل گریتے لگے، بجلی کی چمک کانوں کے پردے تک چیر رہی تھی۔

”دیکھو ذرا..... میں اتنے ظالم موسم میں اپنی محبت سے ملنے آیا ہوں، وہ دیکھو بارش شروع ہو گئی۔ کتنی طوفانی بارش ہے یہ۔ جان ہتھیلی پر رکھے میں سر پر کفن اوڑھے بغیر اپنی پرداہ کیے تم تک آ گیا، تم مجھے نالسی رہیں مگر میں آ ہی گیا۔ بہت گلہ ہے تم سے۔ بدلنے لگی ہوا بے گم، کہیں مجھے چھوڑ کے اُس غوث علی شاہ سے تو محبت نہیں ہو گئی تمہیں؟“ موسم نے اس کے شاعرانہ مزاج پر اثر کیا تھا۔

”غوث علی شاہ سے محبت کرنے لگیں میرے

دشمن۔ آئندہ مجھے ایسی گالی مت دینا۔“ سر سے دوپٹہ گرایا اور وہ ان کے گھٹنے لہے بالوں کی چوٹی کے بل کھولنے لگا۔

”مجھے تمہارے ساتھ ساتھ، تمہارے بالوں سے بھی عشق ہے۔ آج تک میں نے کسی عورت کے اتنے حسین بال نہیں دیکھے، یا شاید تم ہو ہی اتنی خوب صورت کہ مجھے مبہوت کر دیتی ہو۔“ اس کا لہجہ بدلنے لگا۔

”تمہاری یہ دیوانگی ہی تو ہے، جس نے مجھے باندھ رکھا ہے، مگر نہ میرے بال آج تک پیر غوث علی شاہ تک نے نہیں دیکھے، تمہارا میرے لیے جنون ہی دراصل میرا عشق ہے، میری آج تک کسی نے ایسی تعریف نہیں کی۔ نہ ہی کسی نے ایسا حق جتایا۔ جیسے تم میری ذات کو معتبر کر دیتے ہو، میرے لیے ذالہانہ پن جھلکاتے ہو، میں اول روز کی طرح آج بھی صرف تمہاری ہوں۔ تمہاری سنگت مجھے وہی کم عمر سلطانہ کی الدین بنا دیتی ہے۔“ وہ سرشار تھی۔

”ہم نے یہ حق کسی کو دیا ہوتا تو حق جتنا وہ بیچارہ۔“ مظفر نے ان کی چوٹی کا آخری بل کھولا اور جھٹکا دے کر بالوں کو بکھرا دیا۔

گھٹنے لہے بالوں نے ان کے پورے وجود کو ڈھانپ لیا۔

”آج میں بڑی بی بی کو ختم کرنے لگی تھی کہ میں باغ پر غوث علی شاہ پہنچ گئے اور میں ہاتھ ملتی رہ گئی۔ تمہاری محبت نے مجھے کتنا ظالم بنا دیا ہے۔ فرخندہ بھی کل سنگسار ہو جائے گی، مجھ سے مقابلہ کرنے چلی تھی۔ پیر خاندان کا وارث کیا پیدا کرتی میں نے اُسے کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ چھوڑا۔ پھر ہم دونوں ہی ہوں گے، پیر صاحب اپنے زخم اکیلے بیٹھ کر چائے پیتے رہیں گے۔“ انھوں نے قہقہہ لگایا۔

”اور وہ فرخندہ کا معیتر بے تم نے اس کے پیچھے لگایا تھا؟“ مظفر کو یاد آیا معظّم علی؟

”اس کو تو میں نے بھاری معاوضہ دے کر فرار کروا دیا ہے۔ جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے تو آ جائے گا۔“ پیسے میں بڑی طاقت ہے۔ سب کا منہ بند ہو جائے گا۔“ وہ اپنی ہی زعم میں مبتلا تھیں۔

READING

94 سچی کہانیاں



ہمت کر کے انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ دھکیلا اور جو منظر ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کی تکلیف اور ذلت کے لیے وتیا کا بڑے سے بڑا لفظ بھی چھوٹا تھا۔

بساط اُلٹ چکی تھی، جو کنواں انھوں نے فرخندہ کے لیے کھودا تھا وہ خود اُس میں جاگری تھیں۔

منظر جھکے سے سلطانہ سے الگ ہوا اور اپنا سامان اٹھا کر کھڑکی سے کود گیا۔ ساری ذلت سلطانہ کا مقدر بن گئی۔ جس عشق کو وہ سب کچھ سمجھتی تھیں اپنا نجات دہندہ کھو چکی تھی۔

”اپنی صنائی میں تم کچھ نہیں کہو گی۔ کیونکہ تمہارے پاس کچھ کہنے کو بچا ہی کب ہے؟ مجھے اللہ نے سبق سکھایا ہے اس رات کی سبقت فرخندہ کی خوش نصیبی نہیں تمہاری بد نصیبی کے لیے تھی۔“

مجھے اللہ نے اک محصوم کے قل سے بچالیا۔ میری نسل کو ختم ہونے سے بچالیا۔ تم بڑی عورت ہو، خود اپنی زبان سے تم نے اقرار کیا ہے میں تمہیں مزید بُرا بھلا نہیں کہنا چاہتا۔

تمہاری ذات اب قابلِ رحم ہے۔ آج کی اس طوفانی رات میں، تم میرے سامنے بے نقاب ہوئی ہو..... کل کی ذلت ابھی باقی ہے۔ جب دن کے اُجالے میں لوگ تمہاری اصلیت سے واقف ہوں۔ تم نے مجھے ہی نہیں یہاں کے ساوہ لوح انسانوں کو بھی دھوکا دیا ہے۔ ہمارے بھروسے کا خون کیا ہے، کل کے دن کی رسوائی ہی تمہاری سزا ہے، اس سے بڑی موت کیا ہوگی۔ جب سنگساری کا حکم دھڑلے سے سنانے والی پیرمگی الدین کی بیٹی خود یہی سزا جھیلے گی۔ تم کیا تمہیں اور کیا بننے کی کوشش کرتی رہیں۔ نہ اس دنیا کی رہتی اور نہ اُس جہاں کی۔ ظلم کی مدت جتنی بھی ہو۔ سزا کڑی اور طویل ہوتی ہے۔“

سلطانہ بیگم کے ہونٹ سل جکے تھے، اور رسوائی کے خوف نے ان کے لبوں کو مقل کروا دیا تھا۔ کل کے کوڑے اُنھیں آج ہی اپنی پیٹھ پر برستے محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆

”بے چاری فرخندہ کے ساتھ تم نے بڑی زیادتی کی، جو گناہ تم کرتی رہی ہو وہ سب اس کے سر منڈھ ویا۔ بڑا قابلِ رحم ہے پیر غوث علی شاہ کہ تم جیسی ناگن ناک کے بیچے کیا کیا کرتی رہی اور وہ ساری زندگی بے خبر رہا۔ اس کے رشتوں، اس کی دولت اور اس کے بھروسے کا خون کرنے والی سلطانہ ہی اس کے گھر اور ہر شے کی مالک بنی بیٹھی ہے، واہ مالک۔ تیرے رنگ نرالے۔“ وہ مکاری سے بولا تھا۔

”کہنے (موتی سی گانی) میرا کھاتے ہو اور مجھ پر ہی بھونکتے ہو، تمک حرام!“ سلطانہ نے بپتے ہوئے اس کے سینے پر مکا مارا۔

”تو کیا میں نے جھوٹ بولا؟ یہ سارے کارنامے تمہارے نہیں؟“ اس نے بھی ہنس کر جواب مانگا تھا۔

”ناقتی ہوں اور اعتراف کرتی ہوں یہ سب میں نے کیا۔ اب خوش؟“ سلطانہ نے لاڈ سے اس کے کندھے پر سر رکھا تھا۔

”ہاں خوش ہوں میں بہت خوش۔ تم بڑی عورت ہو اور ناقتی بھی ہو، بڑا دل گروہ ہے تمہارا۔“ اسے اعتراف کرنا پڑا۔

ہاں مگر صرف تمہارے سامنے۔ باقی دنیا تو مجھے بہت اچھا انسان سمجھتی ہے حالانکہ میں ایک بڑی عورت ہوں۔ بہت بڑی۔ وہ مظفر کے قربت میں آنکھیں بند کرتی بہت جذب سے بولیں تھی۔

پیر غوث علی شاہ جو کچھ دیر پہلے سلطانہ کے کمرے میں کیس کی ضروری فائل بھول گئے تھے سن کر کھڑے کھڑے مر گئے تھے۔

اتنا دھوکا..... اتنی مکاری..... اتنی برائی۔ ان پر اک پل میں قیامت گزر گئی تھی۔

ان کے وقار اور عزت کو مجروح کر کے سلطانہ نے انھیں کسی قابل نہ چھوڑا تھا۔ وہ عورت جس کی ہر بات کو انھوں نے بند آنکھوں سے تسلیم کیا تھا۔ وہ اس قابل تھی ہی نہیں کہ اُس پر بھروسہ کیا جاتا۔ ساری دنیا مل کر بھی سلطانہ کے خلاف کھڑی ہو جانی پیر غوث علی شاہ دنیا کو جھٹلا دیتا مگر اپنے کانوں سے سنا ان کا ہر اعتراف وہ نہیں جھٹلا سکتے تھے۔

## پتھر میرا نصیب

ناملکہ طارق

اس عورت کی در ماندگی کا قصہ الم، جسے ہر بار قدرت نے زیر کر دیا تھا۔

فون کرو اتنی دیر میں میں تمہارے لیے چائے بنا لیتی ہوں۔

میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود باجی کوثر چائے بنانے چلی گئیں۔ میں فون کر کے فارغ ہوئی تھی کہ وہ چائے لے کر آ گئیں۔ چائے پینے کے دوران ہم ادھر ادھر کی گپ لگاتی رہیں۔ آخر کار کوثر باجی مجھ سے بولیں۔

”سنا ہے تم رسالوں میں کہانیاں لکھتی ہو؟“  
”جی ہاں لکھتی تو ہوں لیکن صرف سچی کہانیاں۔“

میں نے جواب دیا۔  
”اگر میں تمہیں ایک سچی کہانی سناؤں تو کیا تم لکھو گی؟“

”کیوں نہیں لکھوں گی۔“ میں نے کہا۔  
”ٹھیک ہے میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے میں تیار ہوں آپ مجھے بتائیں۔“  
”آج نہیں بلکہ کل چار بجے میرے پاس آنا پھر میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں گی۔“

”میں نے کچھ لمحے سوچا اور پھر کہا کہ ٹھیک ہے میں کل چار بجے آؤں گی۔“ اگلے دن پورے چار بجے

میں نے جب بھی کوثر بی بی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ہمیشہ ہلکورے لیتا در دھسوس کیا۔ میں سوچتی کہ اس عورت کو آخر ایسا کون سا نم ہے جس کا اظہار اس کی آنکھیں کرتی ہیں۔ میں سوچ کر بھی اس سے پوچھ نہ سکتی تھی۔

آخر کار مجھے یہ موقع قدرت نے دے ہی دیا، ہوا یوں کہ میرا ٹیلی فون ڈیڈ ہو گیا۔ مجھے بہت اہم فون کرنا تھا، سو مجبوراً مجھے کوثر بی بی کے گھر فون کے لیے جانا پڑا۔

دروازہ خود انہوں نے کھولا۔ مجھے دروازے پر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں حیرت ابھر آئی۔ مگر لمحہ بھر میں وہ حیرت پھر سے اداسی میں بدل گئی۔

میرے ذہن میں آواز گونجی۔  
”اُف کیسی ہیں ان کی آنکھیں، پل میں رنگ بدلنے والی۔“

مجھے ٹھٹھک کر کھڑا دیکھ کر وہ بولیں۔  
”ارے آپ..... آئیے آئیے آپ کا اپنا گھر ہے۔“

”کوثر باجی مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے اگر آپ کا فون.....؟“ میں نے جھکتے ہوئے کہا۔

!!! تو اس میں اتنا شرمانے کی کیا بات ہے؟ تم



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

# Downloaded From Paksociety.com

عباس جو کہ برابر والے بیڈ پر سویا ہوا تھا، میں نے اُسے اٹھایا۔

”بھائی او بھائی اٹھو ماں اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔“ عباس میری پکار پر فوراً اٹھا۔

ہم ابھی منجھے میں پھنسے بستر پر بیٹھے، باہر نکلنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہمیں سسکیوں کی آواز سنائی دی۔

”ارے کوثر یہ تو ماں کی آواز ہے۔“ عباس بولا۔  
ماں کی آواز سیزھیوں سے آرہی تھی، جلد ہی ہم سیزھیوں کے پاس پہنچ گئے۔

”ماں تم کیوں رورہی ہو؟“ عباس بولا۔  
ماں نے گھٹنوں سے چہرہ اٹھایا تو اک لمحے کو میں کانپ گئی۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ سرخ اور

میں کوثر باجی کے گھر میں موجود تھی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ یوں مخاطب ہوئیں۔

”میں سیٹھ عابد کی بیٹی ہوں۔ جہاں نہیں میرے والد کو سیٹھ کس نے کہنا شروع کیا تھا۔ لیکن میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے والد کو سیٹھ کے روپ میں ہی دیکھا۔ میری ماں غلام فاطمہ ایک سیدھی سادی اور ملنسار عورت تھی۔ میں اور میرا بھائی عباس سارا دن کھیلتے اور رات کو نیندوں کے لمبے سفر پر چلے جاتے۔“

”وہ رات بھی ایک ایسی ہی رات تھی جب میری آنکھ کھل گئی۔ میری ماں اپنے بستر پر موجود نہیں تھی۔“  
”ماں..... ماں کہاں ہو تم؟“ میں نے ڈر کر

پکارا۔

میرے بار بار پکارنے پر بھی جواب نہیں ملا۔



آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ یوں لگا جیسے ماں کافی دیر سے رو رہی ہے۔

”تم؟ تم اس وقت کیوں اٹھ گئے۔“

”اس کوثر کی بچی نے مجھے اٹھا دیا اور بولی کہ ماں اپنے بستر پر موجود نہیں ہے۔“ عباس نے تفصیل سے جواب دیا۔

”ماں تم رو کیوں رہی ہو؟“ میں نے ایک بار پھر پوچھا۔ عباس بھی سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”میں کب رو رہی ہوں..... وہ تو مجھے اپنے بستر پر نیند نہیں آرہی تھی تو میں نے سوچا کہ میز بیوں پر آ بیٹھوں، یہاں خوب ہوا ہے نا؟“ ماں جلدی جلدی بولی۔ میں نے تو خیر یقین کر لیا لیکن عباس کی آنکھوں میں آنسو تھی۔

”ماں تم کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو؟“ عباس بولا۔

”دیکھو اگر تم نے سب کچھ مجھے سچ نہیں بتایا کہ تم کیوں رو رہی تھی تو میں کچھ بھی کر بیٹھوں گا۔“ عباس کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ ماں چونک گئی۔

”میں تمہیں بتانا چاہتی تھی لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تمہیں بتانا پڑے گا۔“ ماں دھیمے لہجے سے بولی۔

”تمہارے ابو نے دوسری شادی کر لی ہے۔“

”کیا.....؟ کیا کہا..... ابو نے دوسری شادی کر لی ہے؟“ میں اور عباس دونوں چونک گئے۔

”ہاں میرے بچو میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ ماں روتے ہوئے بولی۔

”بس آج کے بعد مت رونا، میرے ہوتے ہوئے تمہیں رونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مجھے یوں لگا جیسے عباس مجھ سے بڑا ہے۔ اُس کے لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ میں اُس سے بڑی ہوتے ہوئے بھی یکدم سہم سی گئی۔ اسی دن سے عباس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ اور زمینی سنبھال لیں۔ وہ یکدم سے جوان ہو گیا تھا۔

ابو نے شادی کے بعد عباس سے جھجکنے لگے تھے۔

اور میں تو انہیں دیکھ کر ہی کمرے میں چھپ جاتی۔ نبھانے وہ کیسا خوف تھا جو میرے اندر جم سا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب عباس ابو کے سامنے کھڑا ہوا تو وہ کچھ نہ بول سکے اور چپ کر کے پچاس مربعے بھائی کے حوالے کر دیے۔

عباس کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ میں بھائی کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ ابو ہمیں چھوڑ کر نئی بیوی کے ساتھ رہنے لگے تھے۔

پہلے تو وہ ہماری خیر خبر بھی رکھا کرتے تھے۔ لیکن جب سے عباس نے اپنی زمینی سنبھالی تھیں وہ ہم سے بالکل لا تعلق ہو گئے تھے۔ اور وقت پڑ لگا کر اڑتا جا رہا تھا پھر اُن کی بیوی سے بھی ایک بیٹا ہو گیا۔

میرے سوتیلے بھائی کا نام علی رضا رکھا گیا۔ مجھے تو علی رضا بھی اتنا ہی پیارا لگتا جتنا کہ عباس۔ میرے لیے تو دونوں بھائی برابر تھے۔

وہ بھی عام دنوں جیسا ایک دن تھا جب میری شادی کی بات ہونے لگی۔ میری پھوپھو کا ہمارے گھر کافی آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ اتنا کیوں آتی تھیں۔

میری یاں نے بھائی عباس سے مشورہ کر کے اُن کو ہاں کہہ دی تھی اور وہ دو سو سو دو سو روپے میری برأت لے آئیں۔ لہن بن کر میں خود کو ہوا اڑاتا میں محسوس کر رہی تھی۔ رخصتی کے وقت مین روتی بھی جا رہی تھی اور موقع پاتے ہی اپنے شوہر احمد عباس کو بھی کن آنکھوں سے دیکھ لیتی تھی۔ وہ مجھے بہت پیارا لگ رہا تھا۔

میں بہت خوش تھی کہ برادری میں سب سے زیادہ خوبصورت اور ذہین نوجوان میرا ہم سفر بنا ہے۔ میری شادی پہ میرے بھائی عباس نے بہت پیسہ خرچ کیا تھا جبکہ ابو مہمان بنے رہے تھے کیونکہ وہ دوسری بیوی کے اشاروں پر ناپتے تھے۔

میں اپنی آنکھوں میں نئے خواب اور دل میں نئی امتیں سجا کر سسرال پہنچی۔ احمد عباس بہت اچھا انسان تھا۔ دوستوں کا دوست، ہمدرد اور نیک طبیعت کا مالک، لیکن کانوں کا ڈرا کچا تھا۔ ماں کی ہر بات کو حدیث سمجھتا

تھا۔ میں نے کچھ ہی دنوں میں جان لیا کہ دیور فضل عباس انتہائی لاپٹی، مطلب پرست اور خود غرض انسان ہے۔ جبکہ نند بختاؤر فضل عباس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اب انہی کے ساتھ گزارا کرنا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے سمجھوتا کر لیا تھا۔

وقت کا کام ہے گزرتا، گزرتا رہا مگر احساس بھی ولاتا رہا کہ زندگی بڑی کٹھن ہے۔ اس دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ ساس کی آواز آئی۔

”کوثر اری او کوثر، کم بخت ماری ایک پکار پر جواب نہیں دیتی ہے۔“

”آئی پھوپو!“ میں بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔

”حرا مزادی کسی یار کے پاس تھی جو میری آواز سنائی نہیں دی۔“ وہ چہنیں۔

میں اس الزام پر تڑپ کر رہ گئی اور امداد طلب نظروں سے دیور کی طرف دیکھا جو مجھے بھرپور نظروں سے گھور رہا تھا۔

”اب کھڑی کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہے، جا جلدی سے جا کر میرے لیے دودھ پتی بنا کر لا۔“

گھر میں کئی نوکر تھے۔ لیکن پھوپو ہر کام مجھ سے کرواتیں۔

”اس بار احمد عباس آجائے تو اس سے میں کھل کر بات کروں گی کہ اس کی رکھوالی اب ہم سے نہیں ہوتی ہے۔“ پھوپو کی بڑ بڑاہٹ میں نے یکن تک سنی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

احمد شکار کھیلنے سندھ کے جنگلوں میں گئے ہوئے تھے۔ یہ موقع دیکھ کر میں نے پھوپو سے کہا۔

”پھوپو اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ای اور بھائی سے مل آؤں؟“ دراصل اس روز میرا دل بہت اُداس تھا ای لیے میں نے ساس سے اجازت مانگی تھی۔

”جانا ہے تو چلی جاؤ لیکن یہ سوچ کر جانا کہ پھر ادھر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اللہ کے واسطے پھوپو مجھ پر یہ ظلم تو نہ کرو۔ مجھے ایک بار اپنے بھائی سے ملنے دو۔“ میں

پو پتے ہوئے بولی۔

”میرے آگے بکواس کرتی ہے، بھونکتی ہے میرے آگے۔ ذلیل، کمین، ٹھہر میں تجھ سے ابھی پوچھتی ہوں۔“ میری ساس نے یہ کہہ کر مجھے چٹیا سے پکڑ لیا اور مارنا شروع کر دیا۔ میری نند بختاؤر بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئی۔

”میں رو رہی تھی، چلا رہی تھی لیکن میری فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ نوکروں کے کان پھرے ہو گئے تھے۔ میں خاموشی سے پٹ رہی تھی کہ

ایک لات میرے پیٹ پر لگی اور مجھے یوں لگا جیسے میرا کلیجہ منہ کے ذریعے باہر نکل آئے گا۔ پھر ایسا لگا کہ خون کا دریا پھراٹھا اور اس گھر کی وہ آس جو چار ماہ سے قائم تھی ٹوٹ گئی۔ گھر میں کلکاری گونجنے سے پہلے ختم ہو گئی۔

اس ظلم پر بھی نہ آسمان ٹوٹا اور نہ ہی زمین پھٹی۔ بس میں بے ہوش ہو گئی تھی اور جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں موجود تھی۔

مجھ میں ملنے جلنے کی سکت بھی نہ تھی۔ اسی رات احمد عباس آگئے۔ میری حالت دیکھ کر وہ بھی سکتے میں رہ گئے۔

”کوثر میری جان! یہ کیا حالت تم نے بنا رکھی ہے؟“ احمد مجھے اپنی ماںہوں میں لے کر بولے۔

میں نے جو ذرا سا ہمدرد لہجہ مناتا تو بکھر گئی اور پھر میں یوں تڑپ تڑپ کر روئی کہ خدا کی خدا کی جی جوش میں آجائے۔ میرے رونے کی آواز سن کر ساس میرے دروازے تک آگئی اور پھر اُس نے فوراً ہی احمد کو بلایا کہ اسے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ احمد کو جاتے دیکھ کر میرا دل کانپ کر رہ گیا کہ اب میری ساس نہ جانے کیا لگائی بھجائی کرے گی۔ اُن کی باتیں سننے کے لیے میں دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اُن کے کمرے تک پہنچ گئی اور دروازے پر کھڑی ہو کر اندر کی باتیں سننے لگی۔ پھوپو کہہ رہی تھیں۔

”احمد میں تمہاری ماں ہوں تم میری بات کا کہاں تک یقین کرو گے؟“

”ای جان خدا کے بعد میں آپ کا مقام سمجھتا



ہوں۔ آپ میری ماں ہیں۔ احمد کی سوہنہ آواز سنائی دی۔

”تو میری بات غور سے سنو، کوثر اب تمہارے قابل نہیں ہے۔“ ساس کی آواز مجھے تڑپاتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ای جان! احمد کی آواز میں حیرت تھی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں احمد عباس! میں نے سوچا تھا کہ کوثر کے ساتھ تمہاری جوڑی خوب رہے گی۔ تم دونوں مل جل کر رہو گے۔ لیکن مجھے افسوس ہے چنانکہ میں تمہیں اچھی بیوی نہ دے سکی۔ کوثر کے ایک شخص سے ناجائز تعلقات ہیں اور وہ شخص عباس کے پاس آتا جاتا ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ای جان؟“

”ہاں میرے بیٹے، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آج جب کوثر نے مجھ سے اپنے میکے جانے کی اجازت مانگی تو میں نے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ احمد آجائے تو اس کے ساتھ چلی جانا لیکن کوثر نے میری ایک نہ مانی اور مسلسل ضد پر جی رہی۔ میرے انکار پر اس نے مجھے بچہ ضائع کرنے کی دھمکی اور آخر کار اس نے پتا نہیں کیا چیز کھالی جس سے بچہ ضائع ہو گیا۔ مجھے کتنی حسرت تھی کہ میرے بیٹے احمد کے بچے ہوں اور میں انہیں کھلاؤں۔“ یہ کہتے ہی پھوپھو نے رونا شروع کر دیا۔

”ماں اسلام میں حکم ہے کہ اگر تمہاری بیوی تمہارے قابل نہیں ہے یا وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو پھر اس کی مرضی کے مطابق اسے طلاق دے دو بجائے اس کے کہ تم سے کوئی غلطی ہو جائے۔

بے شک اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ اس سے پہلے کہ احمد مزید کچھ بولتے پھوپھو نے اسے روک دیا۔

”بس چپ ہو جاؤ۔ میں مزید کچھ نہیں سن سکتی۔ اگر تم نے کوثر کو طلاق دے دی تو پھر میرا مرا ہوا منہ دیکھنا۔“

”پلیز ماں ایسا مت کہو بھلا میں ایسی گستاخی کر سکتا ہوں۔ جیسے تم کہو گی میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔“ احمد

جیسے رو دے۔

”جاؤ تم اپنے کمرے میں..... اور سنو احمد کوثر سے کچھ بھی مت کہنا۔ میں اپنے طور پر یہ معاملہ سنبھال لوں گی۔“

میں ایسی حالت میں بھی تیزی سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ دونوں کمرے برابر برابر میں تھے۔ مگر یہ فیصلہ بھی میں نے بہ مشکل طے کیا تھا۔ احمد کمرے میں آ کر خاموشی سے لیٹ گئے تھے۔ میری زبان پر حیرت نے نقل لگا دیا تھا۔ پھوپھو کو بھی انہوں نے روایتی ساس جیسا انداز اپنایا تھا تو مجھے اتنی حیرت نہیں تھی۔ مگر آج انہوں نے جو جو کچھ کہا تھا اس نے مجھے سکتے میں ڈال دیا تھا۔ اب میں احمد کے رد عمل کی منتظر تھی۔ میں خود سے انہیں چیخنا نہیں چاہتی تھی۔ بس دیکھے جا رہی تھی۔ رات کے بعد صبح ہو گئی مگر وہ کچھ نہ بولے بس ان کا رویہ سرد رہا۔

بال آخر میں نے ان سے پوچھ لیا۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں احمد؟“

”نہیں تو بھلا میں تم سے ناراض کیوں ہونے لگا؟“

”پلیز احمد اب اور دکھ اور رویے میں آئی سرد مہری کو ختم کر دو..... اب اور مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں تم سے صرف تم سے محبت کرتی ہوں احمد۔ مجھے خود سے دور نہ کرو۔“ میں بے اختیار رو پڑی۔

”بس اب چپ کر جاؤ، مت رو مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“ احمد کا لہجہ پا کر اگلے ہی لمحے میں خود سے بھی بے گانی ہو گئی۔

حالات ایک ہی دھارے پر رہے۔ میں بھی زبان پر نقل لگائے رہی۔ پھوپھی زیب النساء اور دیور فضل میرے سکون کو حیرت بھری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اسی دوران میں احمد کو ایک بار پھر شکار کا شوق چڑھا اور وہ سب کچھ بھلا کر اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر چلے گئے۔

انہی دنوں میں نے محسوس کیا کہ میں پھر امید سے ہوں۔ اس بار میں نے کسی کو بھی ہوانہ لگنے دی۔

جب چوتھا مہینہ شروع ہوا تب میری ساس کو پتا چلا اور انہوں نے کہا۔

کو بھی دی گئی۔ بیٹے کی پیدائش کا سن کر احمد بھی چلے آئے۔ میری قسم کی لاج رکھتے ہوئے عباس بھائی نے خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ پھر انہیں میرے پاس تنہا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

”آپ کو اب میری یاد آئی، میں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”یاد تو روز آتی تھی لیکن شاید تم نے قسم کھائی تھی مجھے سے نہ ملنے کی؟“

”میں نے قسم کھائی تھی؟ آپ سے ملنے کی قسم کھائی تھی؟“

”ارے کوئی اپنی جان سے بھی علیحدہ رہ سکتا ہے؟“

”پھر تم اپنا گھر چھوڑ کر کیوں آ گئیں؟“

”میں اس لیے آ گئی تھی احمد کہ مجھے وہاں اپنے بچے کے لیے خطرہ تھا۔ پھوپھو نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ میں یہ بچہ ضائع کر دوں۔ اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے عباس بھائی کے ساتھ چلی آئی۔ آہستہ آہستہ میں نے ساری بات احمد کو سنا دی۔

سب کچھ سن کر بھی وہ خاموش رہے صرف اتنا بولے۔

”ٹھیک ہے تم ادھر ہی رہو میں آہستہ آہستہ سب سنبھال لوں گا۔“

احمد نے مجھے گلے سے لگا لیا تو میں اپنے سارے غم بھول گئی۔ بیٹے کا نام انہوں نے ہی یوسف رکھا۔

یوسف بہت پیارا بچہ تھا۔ لوگوں نے دباؤ ڈالا تو پھوپھو بھی آ گئیں۔ انہوں نے یوسف کو پیار کیا اور پانچ ہزار میرے ہاتھ پر رکھ کر چلی گئیں۔

مجھے تو اب کھیلنے کو اک خوبصورت سا کھلونا مل گیا تھا۔ سارا دن بس یوسف میں ہی مست رہتی۔ بعض دفعہ احمد میرے پاگل پن پر خوب ہنستے۔

یوسف ابھی چار ماہ کا تھا کہ میں دوبارہ امید سے ہو گئی۔

”اُف احمد اب کیا ہوگا؟“

”ارے ہوگا کیا جان من اک پیاری سی بیٹی ہوگی اور بس۔“

”کوثر یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟“

میں کچھ بھی نہ بول سکی، بس نظریں جھکا کر رہ گئی۔

”یہ میرا حکم ہے کہ تو یہ بچہ گرا دے۔“

”تمہیں پھوپھو جان مجھ پر یہ ظلم نہ کریں، میں احمد کے بچے کو جنم دینا چاہتی ہوں۔“ میں روتے ہوئے بولی۔

”بس زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جو کبہ دیا سو کبہ دیا۔“ وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولیں۔

”اور ہاں رحمت ہو کہ وہی کو بلوالائے تاکہ تم اس بوجھ سے آج ہی نجات پاسکو۔“

اس سے پہلے کہ میری ساس رحمت ہو کہ بلواتی وہ خود ہی چلی آئی۔

”بنگم صاحبہ بہو کے بھائی صاحب آئے ہیں۔“

”کیا کہا عباس آیا ہے؟“ میں دوسرے ہی لمحے گیٹ کی طرف بھاگی۔

عباس مجھے اس طرح سے آتے دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

”کیا ہو گیا ہے کوثر اس طرح سے کیوں بھاگ رہی ہو؟“

”عباس اگر تمہیں میرا تھوڑا سا بھی خیال ہے تو مجھے اپنے ساتھ گھر لے چلو ورنہ پھوپھو اس آگن میں پھول کھلنے سے پہلے ہی اسے مسل دے گی۔“ میں روتے ہوئے بولی۔

”حوصلہ کر دو کوثر! میں ہوں ناں پھر تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

”پلیز عباس مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔“

”چلو ٹھیک ہے آؤ میرے ساتھ۔“

اور یوں عباس مجھے اپنے گھر لے آیا۔

میں نے راستے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ تو غصے میں بھراٹھا تھا مگر میں نے اسے اپنی قسم دے دی۔

مجھے میکے آئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ مگر احمد مجھے لینے نہ آئے اور وہ دقت بھی آ گیا جس روز میں نے بہت خوبصورت بیٹے کو جنم دیا۔ یہ خبر پھوپھو



”لیکن احمد ابھی تو یوسف بہت چھوٹا ہے۔“

”ارے بابا چھوٹا ہے تو کیا ہوا؟ اب یہ تو خدا کی مرضی ہے۔ ہم تم کون ہوتے ہیں اُس کی مرضی میں دخل اندازی کرنے والے۔“ احمد مسکراتے ہوئے بولے۔

میں چپ رہ گئی کیونکہ احمد کے ساتھ بحث فضول تھی۔ وقت گزرتا رہا اور خدا تعالیٰ نے میری گود میں بیٹی دے دی۔ بیٹی کی پیدائش پر مجھے دلی خوشی ہوئی۔ اس بار ہم دونوں میاں بیوی کو بیٹی کی خواہش تھی، سو اللہ نے ہماری خواہش پوری کر دی۔ میں نے اس کا نام معارج رکھا۔

یوسف کے مقابلے میں معارج کافی کمزور پیدا ہوئی تھی۔ اسے پیدا ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ مگر میری ساس نہیں آئی تھی۔

”احمد! مجھے لگتا ہے کہ پھوپھو کو بیٹی کی خوشی نہیں۔“

”نہیں، نہیں ایسا کچھ نہیں ہے، اصل میں اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ورنہ وہ ضرور آتیں۔“

میں سمجھ گئی کہ احمد مجھے بہلا رہے ہیں، سو چپ رہ گئی۔

ابھی ہم آپس میں باتیں کر ہی رہے تھے کہ معلوم ہوا کہ میری ساس اور میرا پورا پورا فضل عباس اور نند بختاور آئے ہیں۔ احمد کو میرے پاس دیکھ کر میری ساس کی تھوریاں چڑھ گئیں۔

”تم ہر وقت ادھر ہی مجھے رہتے ہو یا زمینوں پر بھی جاتے ہو؟“ پھوپھو دھاڑیں۔

”ارے ای جان دیکھیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتنی پیاری پوتی دی ہے۔“ احمد نے ماں کا دھیان بنانے کو کہا۔

پھوپھو نے معارج کو گود میں اٹھا کر سینے سے لگانا۔ احمد بھی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے اپنے بھائی فضل کو لے کر باہر چلے گئے۔

پھوپھو اور بختاور کافی دیر تک بیٹھی رہیں۔

ای اور عباس بھائی نے کھانا پکوا یا اور کئی طرح کی ڈشیں پکوائیں۔

پھوپھو نے رغبت سے کھانا کھایا میں بھی دل میں شکر ادا کرنے لگی کہ اللہ کرے ایسا ہی امن رہے۔

شام کو پھوپھو واپس جانے کو تیار ہو گئیں۔

میری گود سے معارج کو لیا اور ڈھیر سارا پیار کر کے مجھے واپس کر دیا۔

پھوپھو کے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میری بیٹی معارج ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے شور مچا کر پورا گھرا کٹھا کر لیا۔

سب سے پہلے بھائی عباس کو ہوش آیا، اُس نے لپک کر مجھ سے معارج کو چھینا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ باہر مردانے میں اُن کا دست گاڑی اشارت کیے کھڑا تھا۔

آمدگی طوفان کی طرح عباس ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور اُسے ساری صورت حال سمجھائی۔

ڈاکٹر فوراً معارج کو آپریشن تھیمز میں لے گیا۔ پورا ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد ڈاکٹر معارج کو بچانے میں کامیاب ہوا۔

”پتا نہیں اس بچی کو ایسی کون سی چیز دی گئی تھی کہ آہستہ آہستہ زہر اس کے بدن میں پھیل رہا تھا۔ اگر اسے بروقت نہ لاتے تو یہ مر جاتی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”ڈاکٹر عباس بھائی کا دست تھا اس لیے پولیس کیس نہ بنا۔“

مجھے جب ساری صورت حال کا پتا چلا تو میں تڑپ گئی۔ عباس مزے مارنے پر عمل گیا تھا کہ امی نے واسطے دے دے کر اُسے دھیمان کیا۔

”پھوپھو نے آخر ایسا کیوں کیا؟“ میں اور عباس سوچتے رہے۔

ان باتوں کا ذکر جب میں نے احمد سے کیا تو وہ مجھ سے اور عباس سے لڑ پڑے کہ تم دونوں بہن بھائی میری ماں پر الزام لگا رہے ہو۔ بھلا کوئی ماں اپنے بیٹے کے ساتھ ایسی زیادتی کر سکتی ہے کہ اُس کی اولاد کو مار دے۔ تم یہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہو، میں چپ رہا۔ بلکہ ہر ماہ خرچہ بھی دیتا رہا۔ تم نے جیسا کہا میں نے ویسا ہی کیا۔ ادھر میری ماں مجھے بہت کچھ کہتی رہی اور

میں چپ رہ کر سنتا رہا صرف اس لیے کہ ہمارا تماشنا نہ بنے۔ لیکن اب حد ہو گئی ہے کہ میری ماں پر یہ الزام کہ

اس نے بیٹی کو زہر دیا ہے۔“

عباس اور میں بالکل چپ بیٹھے رہے۔ آخر کار

عباس بولے۔  
 ”احمد بھائی میں بھی چپ رہ کر حالات کا جائزہ لیتا رہا ہوں۔ میری بہن کے ساتھ جو جو زیادتیاں ہوئی ہیں وہ سب میرے علم میں ہیں۔ میری بہن مجھ پر بھاری نہیں ہے۔ میں ساری زندگی اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ لیکن اگر یہ نہیں اپنے پاس ہی بٹھالی ہوں تو پھر ان کی شادی کرنے کا کیا فائدہ؟“

”اب بھی اسے وہاں سے نہ لاتا، رہ گئی الزام کی بات تو پھلا مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں الزام لگاؤں جو حقیقت تھی سو کہہ دی۔“ وہ سانس لینے کے لیے رُکے پھر بولے۔  
 ”اب بھی میرا مشورہ ہے کہ تم عورتوں کی نظر سے حالات کو مت دیکھو بلکہ اپنی سوچ کی گہرائیوں سے حالات پر نظر رکھو پھر حقیقت کیا ہے تمہیں خود ہی احساس ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے اب میں ہی کوئی فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ احمد یہ کہہ کر چلے گئے۔  
 پورا ہفتہ اسی کش کش میں گزار گیا کہ احمد کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ عباس بھائی بالکل چپ تھے اور میں اپنی قسمت کے فیصلے کی منتظر تھی۔

آخر ایک دن احمد سکرانے ہوئے آئے۔  
 بھائی عباس نے بڑی گرجوٹی سے ان کا استقبال کیا۔  
 ”عباس! تمہاری باتیں مجھ پر اثر کر گئی تھیں اور میں نے تنہائی میں بارہا سوچا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کیسا باپ ہوں کہ اپنی اولاد کی حفاظت نہیں کر سکتا اور میں کیسا شوہر ہوں کہ اپنی بیوی کی بھی حفاظت نہ کر سکا۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو علیحدہ رکھوں گا۔ میں نے علیحدہ گھر لے لیا ہے۔ کوثر اور میرے بچے علیحدہ رہیں گے۔ ان کے ساتھ دو ملازماں بھی رہیں گی، جبکہ گیٹ پر ایک اور ملازم پہرہ دے گا۔“ احمد مضبوط لہجے میں بولے۔

میں احمد اور عباس بھائی کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔ میری ماں نے مجھے آنسوؤں کے سنگ دو بارہ رخصت کیا۔

اب میں تھی احمد کی محبت تھی اور دور دور تک پھولوں کی راہ گزر تھی۔  
 میری ساس نے پہلے تو احمد کو خوب باتیں سنائیں، دودھ نہ بخشنے کی دھمکی بھی دی۔ پھر تھک ہار کر چپ ہو گئی۔

احمد نے حالات کو بخوبی سنبھال لیا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں سے قطع تعلق کر رکھا تھا اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا کہ ایک روز پھوپھو میرے گھر آ گئیں۔ انہوں نے رورو کر مجھ سے فریاد کی کہ میں احمد کو سمجھاؤں۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ میں نے ہاں بھری۔ احمد بھی اب خوش رہنے لگے تھے کہ ان کی ماں مان گئی ہے۔

میرے اللہ نے ایک بار پھر مجھے خوشی دکھادی میں دوبارہ امید سے تھی۔ یوسف زیادہ تر بھائی عباس کے پاس رہتا۔

جیسے جیسے میرے دن قریب آرہے تھے۔ میں گھبرا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

احمد مالٹوں کے ٹرک سندھ کی طرف بھیجتے تھے۔ حیدرآباد اور ساکنڈ میں تو ہمارا مالٹا خوب فروخت ہو جاتا تھا۔ کراچی میں البتہ دیر ہو جاتی۔ احمد نے فیصلہ کیا کہ اس بار وہ خود ٹرک کے ساتھ کراچی جائیں گے۔ آخر کار احمد چلے گئے اور جاتے جاتے مجھے خوب جوصلہ دے گئے۔ میری ساس اور نند میرے پاس تھیں۔  
 بھائی عباس بھی اپنے دوستوں کے ساتھ مری کی سیر کو گئے ہوئے تھے جبکہ ای اپنے گھر پر ہی مصروف تھیں۔

میں دن رات دعائیں مانگتی کہ اللہ تعالیٰ مجھے خیر و خوشی کے ساتھ فارغ کر دے۔ مجھے رات کو تکلیف ہو گئی۔ میری ساس کی نوکرانی بھاگ کر اپنی پرانی دائی کو بلا لائی۔ ساری رات میری تکلیف میں ہی گزر گئی۔ صبح کو میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔

دائی نے جلدی سے بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر میری چار پائی کے نیچے پھینک دیا۔  
 ”یہ کیا کر رہی ہو دائی ماں تم نے بچہ نیچے کیوں پھینک دیا ہے؟“ میں نے نقاہت سے پوچھا۔



”تم نے مردہ بچے کو جنم دیا ہے کوثر بی بی اس لیے میں نے بچہ چار پائی کے نیچے پھینک دیا ہے۔ تم اٹھنا مت میں ذرا تمہاری ساس کو خبر کراؤں۔“

میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ میں بے آواز رو رہی تھی، جب میری ساس اور اُس کی نندا اندر کمرے میں داخل ہوئیں۔ پیچھے پیچھے دالی بھی تھی۔

”یہ بچہ ہے بیگم صاحبہ۔“ دالی نے بچے کو چار پائی کے نیچے سے نکالتے ہوئے کہا۔

”ادھر مجھے دو۔“ جب پھوپھو نے اپنے پوتے کے اوپر سے کپڑا اٹھایا تو دیکھا کہ بچہ سانس لے رہا تھا۔ مجھے بھی محسوس ہو گیا تھا کہ میرا بچہ زندہ ہے۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھائے تاکہ پھوپھو مجھے بچہ دیں۔ میں جیسے جیسے ہاتھ آگے کرتی وہ بچے کو پیچھے کر لیتیں۔

”تمہیں بیٹا چاہیے؟“ کہلا تمہاری شکل ایسی ہے کہ تم بیٹا پیدا کر سکو۔“ پھوپھو خوشوار لہجے میں بولی۔ میں کانپ کر رہ گئی۔

”پلیز پھوپھو میرا بچہ مجھے واپس کر دیں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ میرا بیٹا مجھے دے دیں۔“ میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں بہو یہ لو اپنا بیٹا۔“ پھوپھو نے بچے کو میری طرف بڑھایا جیسے ہی میں تھامنے لگی اُس نے فوراً ہاتھ پیچھے کر لیا۔ میں رو پڑی۔

”ابھی سے کیوں روتی ہو بہو ابھی تو تمہیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔ یہ ایک نظارہ دیکھو۔“ یہ کہتے ہی میری ساس نے میری آنکھوں کے سامنے میرے بچے کو ایک ہاتھ سے پکڑا اور اس کا گلا اپنی گرفت میں لے کر بچے کی سانس ختم کر دیں۔ میرا بیٹا میری آنکھوں کے سامنے ختم کر دیا گیا۔ میری ظالم ساس نے اپنے ہی پوتے کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا۔

فضا خاموش تھی، ہوا میں ساکت ہو چکی تھیں اور تو اور خدا کی خدائی بھی چپ تھی۔ میں تو جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔

”مائیکر اونا ٹیگر.....“ میری ساس نے اپنے پالتو

کتے کو آواز دی۔ دوسرے ہی لمحے کتا حاضر تھا۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے ہی پالتو کتا بیٹھڑے جیسی مالکن کا حکم مان چکا تھا۔ کچھ دیر کے بعد بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہاں کوئی بچہ پیدا ہوا ہے۔ میری ساس فاتحانہ انداز سے میری طرف مڑی اور بولی۔

”تم نے مجھ سے میرا بیٹا چھینا اور میں نے تم سے تمہارا بیٹا چھین لیا ہے، حساب برابر ہو گیا ہے۔“

”پھوپھو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو، وہ عادل ہستی تم سے میرا انصاف کرے گی۔ تم نے اک ماں کی گودا جاڑی ہے۔ میری بددعا ہے کہ تمہاری گود بھی اُجڑ جائے۔ جن لوگوں کو خدا کا خوف نہیں ہوتا ہے، خدا ان کی رسی بھی دراز رکھتا ہے۔ اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ جب خداری کو کھینچے گا تو پھر ان کا کیا حال ہوگا۔“ میں روتے ہوئے انہیں کوس رہی تھی لیکن وہ ایسا چکنا چکنا گھڑا تھی کہ اس پر میری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

”بولتی رہو میری چندا تم بولتی ہوئی اچھی لگ رہی ہو۔“ میری ساس مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں نے کیا بولنا ہے پھوپھو..... میں تو تب بولوں گی جب میرا خدا تم سے میرا بدلہ لے گا۔ میں نے اپنا مقدمہ اللہ کی عدالت میں پیش کر دیا ہے۔“ میں روتے ہوئے بولی۔

”ضرور ضرور بولو مجھے خوب بددعا کریں دو۔“ میری ساس ہنستے ہوئے بولی اور پھر وہ مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ اُس کی نندا اور دالی بھی مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔ جبکہ میں اپنی قسمت پر رونے کو تیار رہ گئی۔

جب احمد سندھ سے واپس آئے تو انہیں ساری صورت حال کا پتا چلا۔ تب پہلی بار انہیں دل کا دورہ پڑا۔

بھائی عباس فوراً لاہور لے گئے۔ ڈاکٹرز نے فوراً اسپتال میں داخل کر لیا۔ اسی اور میں بھی اپنی گاڑی پر لاہور پہنچ گئے۔

میرا تو رو رو کر برا حال تھا۔ احمد تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے تھے۔ اس طرح انہیں بے بسی

کی حالت میں دیکھ کر میرا کلیجہ کانپ کر رہ گیا۔

ہم اسپتال میں پندرہ دن رہے اور جب احمد پوری طرح سے صحت مند ہو گئے تو ہم واپس آئے۔ گھر آ کر احمد نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”کوثر مجھے معاف کروینا کہ میری ماں ایک بار پھر اپنا وار کر گئی ہے۔ اور میں کتنا مجبور ہوں کہ ماں کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا ہوں۔ ہاں بس اتنا کر سکتا ہوں کہ ساری زندگی ماں کو اپنا منہ نہیں دکھاؤں گا۔“ بھائی عباس اور میں چپ کر کے بیٹھے رہے۔ پھوپھو نے اس بار اپنا وار خوب کیا تھا۔ میں نے اپنا معاملہ خدا کو سونپ دیا تھا۔ احمد جب بالکل ٹھیک ہوئے تو اپنے بھائی فضل عباس کے پاس گئے اور زمینوں کے جوڑے کی بات کی۔

”بھائی احمد مجھے امی نے منع کر دیا ہے کہ احمد کو ایک مرلہ زمین کا بھی نہیں دینا ہے پھر میں کیسے آپ کو سارا حصہ دے دوں؟“ فضل کیٹنگی سے بولا۔ احمد نے بہت زور لگا کر دیکھا لیکن انہیں زمین نہ ملی براوری نے بھی بہت زور لگا دیا لیکن پھوپھو نہ مانی۔ ہم صبر کر کے بیٹھ گئے۔ فضل عباس کی موج ہو گئی کہ مالٹے کے باغات اور ساری زمینیں اُسے مفت میں مل گئیں۔

ایک بار پھر عباس بھائی نے مجھے سہارا دیا۔ انہوں نے میرے حصے کی زمین تین مربع اور مالٹے کا باغ میرے نام کر دیا۔ میں نے مختار نام احمد کو دے دیا۔

احمد کا بیٹا سنجیدہ ہو گئے تھے۔ وقت اور حالات نے وہ گھاؤ لگائے کہ کبھی بھی ختم نہ ہوں۔ سب دوست اور شوق ختم ہو گئے تھے۔ سارا دن اپنے رقبے پر گزارتے اور شام کو گھیر آ جاتے۔ یوسف اور معارج میں تو گویا اُن کی جان تھی۔ وقت پڑ لگا کر اڑتا رہا احمد اپنے قول پر جبرے رہے۔ اس دوران میرے بڑا دل بچے ہوئے۔

بیٹے کا نام میں نے یوسف رکھا اور بیٹی کا نام مائدہ رکھا۔ میرے بچوں کی پیدائش پر میرے سر چھپ کر آئے۔ میں تو پھر بھی اُن سے بول پڑی لیکن احمد بالکل بھی نہ بولے اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔ میرے سر تھوڑی دیر بیٹھے اور واپس چلے گئے۔

پھوپھو کا اپنے میاں پر بھی خوب رعب تھا۔ وہ بیچارے کچھ بھی نہ کہہ سکتے تھے بس ایک خاموش تماشاکی تھے۔ باہر البتہ وہ خوب گل کھلاتے تھے۔ جائیداد وہ اپنی بیوی کے نام کر چکے تھے۔ اس لیے کسی بھی معاملے میں وہ نہ بولتے۔ زیب پھوپھو نے اپنی شادی کے کچھ عرصے بعد اُن کی ساری دولت جائیداد اپنے نام کر والی تھی۔

کچھ دنوں سے میں عباس کا رویہ بھی بدلا ہوا دیکھ رہی تھی۔ وہ بھائی جو میری ہر بات پر سر جھکاتا تھا اب اُس کے تیور بدلنے سے نظر آ رہے تھے۔ میں پریشان تھی کہ عباس کیوں بدلا سا لگتا ہے۔ ایک روز مجھے موقع ملا تو میں نے بھائی سے پوچھا۔

”عباس کیا بات ہے تمہارا رویہ مجھے تبدیل سا لگتا ہے؟“

”نہیں تو کوثر میں بھلا کیوں تبدیل ہوں گا۔ بس سارا دن اپنی زمینوں پر رہتا ہوں اُسی کی ٹینشن رہتی ہے۔“ عباس دھمکے لہجے سے بولا۔

”میں نہیں مانتی عباس تمہاری اس بات کو تم پہلے بھی مصروف رہتے تھے۔ لیکن ساتھ ساتھ میرا بچی پورا خیال رکھتے تھے۔ اور اب تو کئی کئی دن گزر جاتے ہیں تمہاری صورت ہی نظر نہیں آتی ہے۔ اور تو اور بچے بھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔ تم اپنی مصروفیت میں انہیں بھی بھول گئے ہو۔“ میں نے بھائی سے شکوہ کیا۔

”میں شرمندہ ہوں کوثر کہ بچوں سے غافل ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ بچے کہاں ہیں؟“

”ہم یہاں ہیں ماموں جان۔“ یوسف کی آواز دروازے سے آئی۔ معارج بھی ساتھ تھی۔

”آؤ میرے یار کہاں تھے تم؟“ عباس مسکراتے ہوئے بولے۔

”میں تو یہیں پر ہوتا ہوں ماموں جان لیکن لگتا ہے آپ کسی اور جہاں میں گم ہیں۔“ یوسف شرارت سے بولا۔

”بڑا شیطان ہو گیا ہے یار تو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟“

”بس سوسو ماموں جان ..... ویسے ایک بات



”دیکھو بیٹا تم مجھے سب کچھ بتا دو جو کچھ بھی تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔“ میں نے قدرے سختی سے پوچھا۔ یوسف میرے قدموں تلے بیٹھ گیا اور بولا۔

”ای جان میں آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ماموں عباس آج کل نزہت آنٹی کے گھر بہت چکر لگا رہے ہیں۔ اور میں نے خود کئی بار انہیں وہاں پر دیکھا ہے۔“

”لیکن تم وہاں کیا لینے جاتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا دوست حمزہ وہاں رہتا ہے، نزہت آنٹی کے پڑوس میں اُن کا گھر ہے۔ میں حمزہ سے ملنے جاتا ہوں اس لیے آتے جاتے ہیں نے کئی بار ماموں کی گاڑی وہاں کھڑی دیکھی ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ اور سنو کسی سے بھی اس بات کا تذکرہ مت کرنا۔“

”جی بہتر ای جان۔“ یوسف سر جھکائے باہر نکل گیا۔ میرا بھائی تو ایسا بالکل بھی نہیں تھا پھر وہ وہاں کیسے پھنس گیا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ نزہت کی ماں اور میری ساس نے مل کر مجھ پر کتنے ظلم کیے ہیں؟ وہ تو سب کچھ جانتا ہے پھر وہاں کیوں جاتا ہے۔“ میں پریشان ہوئی۔ چند دن اسی پریشانی میں گزر گئے۔

عباس آیا تو میں نے اُس سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”مجھے سچ بتاؤ عباس تم نزہت کے گھر کیا لینے جاتے ہو؟“ میرے اس طرح پوچھنے سے عباس گھبرا گیا۔

”میں نے بھلا وہاں کیا لینے جانا ہے۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔“

”مجھے کسی نے بھی غلط اطلاع نہیں دی ہے بلکہ میں خود رانا نگر گئی تھی۔ میری ایک ملنے والی نے مجھے میلاد شریف پر بلوایا تھا، تب میں نے وہاں تمہاری گاڑی دیکھی تھی اور وہیں سے مجھے پتا چلا کہ تم وہاں روزانہ جاتے ہو۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”اصل میں کوثر بات یہ ہے کہ میں نزہت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ عباس نے نظریں جھکاتے

بتاؤں میرا پڑھائی میں بالکل بھی دل نہیں لگتا ہے۔“

”بڑی بات یوسف! ایسا نہیں کہتے۔ تمہیں پڑھنا ہے اور بہت زیادہ پڑھنا ہے۔ معارج کا بھی خیال رکھا کرو تا کہ اُس کی پڑھائی بھی خوب ہو۔“ عباس سنجیدگی سے بولے۔

”میری پڑھائی کو چھوڑیں ماموں آپ بھی تو آج کل خوب پڑھ رہے ہیں۔“ یوسف نے شوخی سے کہا۔

”میں پڑھ رہا ہوں؟ وہ کیسے بھلا؟“ عباس نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ ایسے کہ آپ آج کل نزہت اکیڑی میں کچھ زیادہ ہی پڑھ رہے ہیں اور باقاعدگی سے وہاں جا رہے ہیں۔“ یوسف کی بات سن کر عباس گھبرا گیا، جبکہ میں چونک گئی۔

”آؤ یار باہر بیٹھتے ہیں تھوڑی سی گپ شپ لگائیں۔“ عباس یوسف کو باہر لے کر چلا گیا، جبکہ میں نزہت میں کھوئی گئی۔

”نزہت رشتے میں میری کزن لگتی تھی۔ میری ساس کی تندگی اکلوتی بیٹی۔ میری ساس کی وہی نیند جس نے میری ساس کے ساتھ مل کر میرے بیٹے کا قتل کیا تھا۔ لیکن عباس وہاں کیوں جاتا ہے؟“ میں سوچنے لگی۔

اب یوسف آئے تو میں اُس سے سارا حال پوچھوں۔ یوسف کے آنے تک میں کئی چکر گیت کے لگا چکی تھی۔ اور جب وہ آیا تو میں تھک کر برآمدے میں بیٹھی گئی۔ عباس باہر سے ہی چلا گیا تھا۔

”یوسف تم کپڑے تبدیل کر کے میرے پاس آؤ۔ مجھے تم سے کچھ اہم اور ضروری بات کرنی ہے۔“

”جی ای میں ابھی پانچ منٹ میں آیا۔“ یوسف کے آنے تک میں نے کمرے میں کافی چکر لگا لیے تھے اور جب وہ میرے پاس آیا تو میں صوفے پر بیٹھی گئی۔

”جی ای فرمائیے کیا بات کرنی ہے؟“

”یوسف بیٹا مجھے یہ بتاؤ کہ یہ نزہت والی کیا بات ہے؟“ یوسف نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”ایسی تو کوئی بھی بات نہیں ہے ای جان۔“ مجھے یوں لگا جیسے میرا بیٹا مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔

”چھوڑیے بھی آپ تو ہر بات میں اپنی اور میری بات لے آتے ہیں۔“ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔  
جواب میں احمد کا بھرپور قبضہ فضا میں پھیل گیا۔

☆.....☆.....☆

ایکشن قریب آچکے تھے احمد کے دوست بڑے پر جوش تھے کیونکہ اُن کا ایک قریبی دوست ایم این اے کی سیٹ پر ایکشن لڑ رہا تھا۔ احمد سارا دن مصروف رہتے۔ نہ کھانے کا ہوش تھا اور نہ ہی کچھ پینے کا ہوش تھا۔ میں بعض دفعہ مذاق کرتی۔  
”مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے آپ کا دوست ایکشن نہیں لڑ رہا بلکہ آپ خود ایکشن لڑ رہے ہیں؟“  
”بس یوں ہی سمجھو کہ میں خود ایکشن لڑ رہا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”ارے ہاں کوثر تم شام کو ذرا تیاری رکھنا اور بچوں کو بھی تیار کر لینا۔ ہم سب آج عباس سے ملنے جائیں گے۔“  
”کیوں جناب خیریت تو ہے۔ میری ماں اور بھائی سے ملنے کا خیال کیسے آ گیا ہے؟“ میں نے قدرے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔  
”جی جناب بالکل خیریت ہے آپ اپنی والدہ سے مل لیجیے گا اور میں ذرا اپنے سائلے صاحب سے دو دو ہاتھ کر لوں گا۔ سنا ہے موصوف میرے مخالف گروپ میں ہیں۔“ احمد شرارت سے بولے۔  
”مخالف گروپ.....؟“ میں کچھ سمجھی نہیں۔

”ایک تو تم بہت بھولی ہو کوثر..... مخالف گروپ کا مطلب یہ ہے کہ عباس ہمارے مخالف امیدوار سے مل گیا ہے۔ وہ اور اُس کے تمام دوست ہمارے خلاف مجاز بننا چکے ہیں۔ ہر جگہ پر ہماری مخالفت کر رہے ہیں، حالانکہ عباس اچھی طرح سے جانتا ہے کہ جس شخص کا وہ ساتھ دے رہا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ کئی بار وہ جیل کی سیر کر چکا ہے اس کے باوجود وہ اُس کے ساتھ ہے۔“  
”میں حیران ہوں احمد کہ عباس ایسا کیوں کر رہا ہے..... حالانکہ وہ کبھی بھی ہمارا مخالف نہیں ہوا ہے بلکہ اُس نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے۔“ میں دکھ سے بولی۔

ہوئے کہا۔  
میرے بھائی نے بات نہیں کی اک دھماکہ کر دیا تھا جو سیدھا میرے دل پر ہوا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو عباس.....؟ کیا تم نہیں جانتے کہ اُس کی ماں نے میری ساس کے ساتھ مل کر مجھ پر کتنے ظلم کیے ہیں۔“ میں روتے ہوئے بولی۔  
”معاف کرنا کوثر..... میں اب کوئی بھی گزری بات نہیں دہرانا چاہتا اور پھر اس معاملے میں بیچاری نزہت کا کیا تصور ہے؟ اُس نے تو کسی کو بھی نہیں سکھایا کہ تم پر ظلم کیا جائے۔ وہ اچھی لڑکی ہے اور پھر اپنے خاندان کی ہے اس لیے میں اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں امی جلد ہی وہاں جانے والی ہیں۔“ عباس مضبوطی سے بولا۔

مجھ پر تقدیر ایک بار پھر وار کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ میں جان گئی تھی کہ عباس کو پھنسانے میں کس کا ہاتھ ہے، لیکن افسوس کہ اب معاملہ کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ میرا بھائی مجھ سے اتنا دور ہو جائے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

شام کو جب احمد گھر آئے تو میں نے انہیں ساری صورت حال بتائی۔

”تم پریشان نہ ہو کوثر میں عباس کو ضرور سمجھاؤں گا اور مجھے سو فیصد اُمید ہے کہ وہ میری بات مان جائے گا۔“ احمد مجھے دلا سادیتے ہوئے بولے۔  
”اور اگر وہ نہ مانا تو.....؟“ میں پریشان ہوئی۔

”میرے خیال میں وہ میری بات مان جائے گا تم تو اچھی طرح سے جانتی ہو کہ عباس میرا بہت لحاظ کرتا ہے اور میری ہر بات مانتا ہے۔ یقیناً وہ میری بات سمجھ جائے گا اور پھر نزہت میں ہے کیا کہ وہ اُس کے لیے یا گل ہو رہا ہے؟ امی جان پہلے میری شادی نزہت سے کرنا چاہتی تھیں لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ میں جیسی بیوی چاہتا تھا وہ ویسی نہیں تھی۔ اور پھر دل جس پر آجائے وہی زندگی کا ساتھی بنتا ہے اور چونکہ میرا دل تم پر آ گیا تھا اس لیے میں نے نزہت کو ٹھکرا کر تمہارا ہاتھ ممانی سے مانگا تھا۔“ احمد جب شرارت سے بولے تو مجھے شرم آگئی۔



”بس تم پریشان مت ہو شام کو تیار رہنا کٹھے چلیں گے اور اُسے سمجھانے کی کوشش کریں گے دیکھو شاید سمجھ جائے۔“  
شام کو میں تیار تھی بچے بھی تیار ہو چکے تھے اب ہمیں صرف اور صرف احمد کا انتظار تھا۔ رات گئے احمد آ تو گئے لیکن چار بندوں کے کندھوں پر سوار ہو کر۔ خون میں لت پت جسم دیکھ کر میں تو ہوش گنوا بیٹھی۔

”بھابی حوصلہ کریں خدا کو یہی منظور تھا۔ احمد گھر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں فائرنگ ہو گئی اور ایک ظالم گولی احمد کے سر میں لگ گئی جس سے احمد موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔“ احمد کا ایک دوست روتے ہوئے بولا۔

”بھیا یہ فائرنگ کس نے کی ہے؟“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

”جانتی نہیں بھابی مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ فائرنگ کس نے کی ہے؟“ خضر بھائی مجھ سے آنکھیں چراتے ہوئے جلدی سے بولے۔

مجھے یوں لگا جیسے خضر بھائی مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔

”آپ کو اللہ کا واسطہ ہے بھائی جان مجھے بتادیں کہ فائرنگ کس نے کی ہے؟ ورنہ میں اپنے ساتھ کچھ کر لوں گی۔“ میں روتے ہوئے بولی۔

”بھابی آپ تو جانتی ہیں کہ آج کل ایکشن کا زور ہے، شہر میں دو گروپ بن چکے ہیں۔ ہم سب دوست سیاسی جلسے سے ہو کر آ رہے تھے کہ بازار کی طرف سے فائرنگ ہونے لگی اور اُن فائرنگ کرنے والوں میں عباس بھی شامل تھا۔ اب پتا نہیں کس کی گولی احمد کو لگی ہے۔“

”عباس..... عباس.....“ میں نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میری دنیا ہی اُجڑ چکی تھی۔ کافی عرصے تک میری پاگلوں جیسی حالت رہی۔ آخر ایک روز عباس میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

”کوڑ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن سے میں افسوس کر سکوں۔ تمہارا دکھ بہت بڑا ہے اور میرے الفاظ بہت کم..... بس اتنا کہوں گا کہ تم صبر کرو اللہ تعالیٰ کی ہر مرضی تھی۔“

”اللہ تعالیٰ کی تو جو مرضی تھی سو تھی لیکن تمہاری یہی مرضی تھی کہ تم احمد کو راستے سے ہٹا دو، وہ تمہاری راہ میں روڑے کی طرح اٹک رہے تھے۔ تم نے انہیں مارا ہے وہ تمہارے ہاتھوں سے قتل ہوئے ہیں۔“ میں نے عباس کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے کوثر کہ میں نے احمد بھائی کو قتل کیا ہے۔ میں بھلا اپنے بہنوئی کو کیوں قتل کروں گا۔ بے شک اُس دن میں بھی جلسے میں تھا لیکن میں نے فائرنگ بالکل نہیں کی ہے۔ بلکہ اُس وقت میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ ہونٹ پر چائے پی رہا تھا جب فائرنگ ہوئی تھی۔ پولیس بھی اپنی تعینات کر چکی ہے میں ہر طرح سے بے قصور ہوں پھر بھی اگر تمہارا دل مجھے قاتل مانتا ہے تو اٹھاؤ پستول اور مجھ پر فائر کر دو۔ میں آف بھی نہیں کروں گا۔“ نہ جانے عباس کے لہجے میں کیا تھا کہ میں اُس کے سینے سے لگ کر زور زور سے رو پڑی۔ عباس بھی رو رہا تھا۔

احمد کی وفات کے بعد میں نے لوگوں کی بہت ساری باتیں سنیں۔ ہر موقع پر عباس مجھے دلاسا دیتا۔ اُس نے نزہت کے گھر جانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اُس نے کسی سے سُن لیا تھا کہ نزہت کی ماں لوگوں سے کہتی پھر رہی ہے کہ کوثر نے احمد کو مروایا ہے۔ الغرض ایسی باتیں سُن کر عباس کو کافی تکلیف ہوئی، سو اُس نے اُن کے گھر جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔

میری ساس بھی کچھ دن رو کر چپ ہو گئی۔ سر البتہ نیم پاگل سے ہو گئے تھے۔ میں اپنا انصاف خدا پر چھوڑ چکی تھی۔

کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ عباس کی حالت ڈھیلی ڈھیلی سی ہے۔ وہ کام میں بھی دل نہیں لگا رہا۔

”عباس کیا بات ہے آج کل تم کافی ست سے لگ رہے ہو؟“

”بس موسم کی تبدیلی ہے اور تو کوئی بات نہیں ہے۔“ عباس بولا۔

میرے دل میں پھانس سی اٹک گئی یوں لگا جیسے وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ میں اُس وقت تو چپ کر گئی لیکن

رات کو میں نے یوسف سے بات کی اور اُس نے مجھے جو جواب دیا اُس سے میں تڑپ اٹھی۔

”میرا بھائی نشہ کرتا ہے۔ عباس وانٹ پاؤڈر کا عادی ہے۔“ میں رونے لگ پڑی میرا اتنا کھجدار بھائی نشے کا عادی کیسے ہو گیا ہے۔ عباس چونکہ اب میرے ہی پاس رہتا تھا اس لیے میں نے اُس پر دن رات نظر رکھنی شروع کر دی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اپنا علاج کرواتے اور اس سلسلے میں، میں نے اُس سے بات بھی کی۔

”عباس بھائی تم اپنا علاج کیوں نہیں کرواتے ہو؟“  
 ”علاج..... کیا علاج کوثر۔“ وہ معصومیت سے بولا۔  
 ”مجھے پتا چلا ہے کہ تم نشہ کرتے ہو؟“  
 ”کس نے بتایا ہے آپ کو.....؟“ وہ چونکتے ہوئے بولا۔

”ایسی باتیں بھلا کہاں چھپتی ہیں، مجھے بھی خبر ہو گئی ہے۔“  
 ”ٹھیک ہے میں اپنا علاج کرواتا ہوں۔“  
 عباس نے کہا کہ باہر چلا گیا اور میں گہری سانس لے کر رہ گئی۔

عباس اب بہت بدل گیا تھا۔ میں کچھ کہتی تو لڑنے مڑنے کو تیار ہو جاتا۔ امی بھی اُس کی حالت سے کافی پریشان تھیں۔ ہم ماں بیٹی کچھ بھی نہ کر سکتی تھیں۔ ابو تو بہت پہلے سے ہی ہمیں چھوڑ چکے تھے۔ میں نے کافی عرصہ سے اپنے چھوٹے بھائی علی رضا کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں نئی امی نے اُسے کہاں چھپا کر رکھ دیا تھا۔

ہم سب عباس کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے لیکن وہ نہ سمجھا۔ اب تو اُس نے اپنی زمینیں بھی فروخت کرنی شروع کر دی تھیں۔ کچھ زمینیں تو وہ پہلے ہی فروخت کر چکا تھا۔

”آخر کب تک ایسے گزر بسر ہوگی عباس.....؟“  
 ایک روز میں نے پوچھا۔

”تم مسلسل اپنی زمینیں فروخت کر رہے ہو آخر یہ زمینیں کب تک ساتھ دیں گی؟“ عباس خاموشی سے ناشتا کرتا رہا جو اب میں کچھ نہ بولا۔

”ماموں امی آپ سے کچھ کہہ رہی ہیں۔“  
 میرے چھوٹے بیٹے یونس نے ماموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”امی تمہاری تو بس ایسے ہی بولتی رہتی ہیں۔“  
 عباس ناشتا چھوڑ کر چلا گیا جبکہ میں رونے لگی تھی۔ عباس کی حالت پر میرا دل ردتا تھا۔  
 انہی دنوں عباس کا دوست محمود لندن سے آ گیا۔ اُسے لندن عباس نے ہی بھیجا تھا۔

مجھ سے بھی ملنے آیا تو میں نے اُسے سارا حال دیا۔ وہ کافی دیر تک مجھ سے حالات پر افسوس کرتا رہا اور پھر عباس کو سمجھانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ مجھے بھی امید ہو گئی کہ عباس اپنے دوست محمود کا کہنا ضرور مانے گا۔

محمود بھائی نے اس طرح سے عباس کو سمجھایا کہ وہ ساری صورت حال سمجھ گیا۔ بلکہ اُس کے ساتھ لندن جانے کو تیار ہو گیا۔

”محمود تم عباس کو اپنے ساتھ لندن لے کر جا رہے ہو؟“

”جی ہاں باجی میں اُسے لے کر جا رہا ہوں۔“  
 عباس میرے ساتھ لندن میں رہے گا تو نشہ بھی چھوڑ دے گا اور میرے ساتھ مل کر کام بھی کرے گا۔“ محمود مسکراتے ہوئے بولا۔

”اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا بھائی سمجھ گیا ہے اس کے لیے میں تمہاری شکر گزار ہوں محمود بھائی۔“  
 ”اس میں شکر یہ والی کون سی بات ہے کوثر باجی یہ تو میرا فرض تھا۔“ میں محمود کو دعائیں دینے لگی۔

پندرہ دن بعد محمود اور عباس کی فلائٹ تھی۔ میں سب کی نظر بچا کر رو پڑتی۔

امی کی حالت تو مجھ سے بھی بری تھی لیکن بیٹے کی صحت کی وجہ سے وہ اپنے دل کو مضبوط کر لیتیں۔

پورے خاندان میں یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ عباس لندن جا رہا ہے۔ عباس باری باری سب سے مل رہا تھا۔ سب دوست احباب اُس کے ساتھ تھے۔

میرا بیٹا یوسف اور معارج کافی پریشان تھے کیونکہ اُن کا عباس سے کافی پیار تھا۔ البتہ یونس اور



ماندہ خوش تھے کہ اُن کا ماموں لندن جا رہا ہے۔

وہ اک خوشگوار صبح تھی۔ صبح سے آسمان پر کالے کالے بادل تھے اور خوب بھنڈی ہوا چل رہی تھی، موسم یکدم اچھا ہو گیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بجھا بجھا ہوا تھا۔ عباس اپنے چند دوستوں کے ساتھ سیر کرنے گیا ہوا تھا۔ آج کل اُس نے نشہ چھوڑ رکھا تھا اس لیے اُس کے دوست اُس کا دھیان بنانے کو کہیں نہ کہیں لے جاتے تھے۔

میں اور ای باتوں میں مصروف تھیں کہ اچانک گیٹ زور سے بجا..... یا الٹی خیر میرا دل زور سے دھڑکا۔

میری نوکرانی نور ایں گیٹ کھولنے لگی دوسرے ہی لمحے وہ بھاگتی ہوئی واپس آئی۔

”باجی باجی وہ عباس بھائی۔“ اُس نے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا ہوا عباس کو.....؟“ میں اور ای گیٹ کی طرف بھاگ پڑیں۔ عباس کے دوست چار پائی پر اُسے لے کر اندر داخل ہوئے۔ عباس بالکل ساکت تھا۔

”اُسے کیا ہوا ہے محمود بھائی؟“ میں نے چیخے ہوئے کہا۔

”کوثر باجی ہم سیر کر کے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک برف خانے پر عباس ٹک گیا اور ہم سے بولا کہ یہاں اُس کا ایک دوست رہتا ہے اُس سے بھی مل لیا جائے۔ ہم سب مل کر برف خانے چلے گئے اور وہاں گھنٹہ بیٹھے رہے، پھر پتا نہیں عباس کے من میں کیا سامی کہ اُس نے برف خانے کے سرد پانی میں نہانا شروع کر دیا۔ ہم سب نے منع کیا لیکن وہ نہ مانا۔ نہانے کے دوران ہی اُسے کچھ ہو گیا۔ ہم فوراً عباس کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے لیکن ڈاکٹر نے ہمیں جواب دے دیا ہے اُس کا کہنا ہے کہ اُس کا دل بالکل سرد ہو گیا ہے، اندر خون جم گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔“

”نہیں نہیں ایسا مت کہو۔ اللہ کرے میرے بھائی کو کچھ نہ ہو۔“ میں رونے لگی۔ ای تو نجانے کب بے ہوش ہو چکی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بھائی عباس

میرے سامنے دم توڑ گیا میں کچھ بھی نہ کر سکی۔

لوگوں کا ایک ہجوم ہمارے گھر میں اکٹھا تھا۔ سب ہی عباس کی جواں مرگی پر رورہے تھے۔ میری اور ای کی تو حالت ہی خراب تھی۔ میرا چھوٹا بھائی علی اور میرے ابو ہمارے پاس ہی رہ رہے تھے، جبکہ چھوٹی ای روز آتی تھی اور رات کو واپس چلی جاتی تھیں۔

ای ابھی تک کوڑے میں تھیں اور دن رات انہیں مختلف ڈاکٹر زائینڈ کر رہے تھے۔ اُن کی حالت بے حد سیریس تھی۔ آخر ایک دن مسلسل بے ہوشی میں رہتے ہوئے وہ بھی انتقال کر گئیں۔ مجھے پر تو یکے بعد دیگرے ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

میں بھی کتنی بد قسمت تھی کہ کوئی بھی رشتہ مجھے اس نہ آسکا۔ ای کے چہلم کے بعد میں نے ابو کے پاس رہنے کی خواہش کی۔

”نا..... بابا نا..... ہم تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتے ہیں۔“ تنی ای چمک کر بولی۔

”جو بھی تمہارے پاس رہا ہے یا پھر جس نے بھی تمہارا ساتھ دیا ہے وہ مر گیا ہے۔ تم منحوس ہو سزا قدم ہو۔ ہم تمہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے لیے مسائل پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ ہم سے جہاں تک ہو سکا ہم تمہاری مدد کر دیا کریں گے۔“ میری چھوٹی ای یہ سب کہہ کر ابو اور علی کو لے کر چلتی بنیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور میں اکیلی جان.....

عباس کی سب زمینوں پر میرے ابو قبضہ کر چکے تھے۔ میرے حصے کی وہی زمین تھی جو عباس نے میرے نام کی تھی۔

ایک دن میں ہمت کر کے اپنے سسرال جا پہنچی۔ میری ساس اپنے کمرے میں ہی موجود تھیں۔ میں چپ کر کے کمرے میں داخل ہو گئی۔

میری ساس کی جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی وہ چیخ پڑی۔

”اری منحوس ادھر کیا کرنے آئی ہے؟ تیرے قدم جہاں بھی پڑتے ہیں وہاں سوت پھیرا مارتی ہے ادھر کیا لینے آئی ہے؟“

”پھوپھو آپ کو اللہ کا واسطہ ہے ایسا مت کہیں۔“

میں آپ کی بہو ہوں، آپ کی بھتیجی بھی ہوں۔ آپ نے جو کچھ بھی کیا ہے۔ میں نے صبر سے کام لیا لیکن اب میں تھک گئی ہوں۔

”میں کہتی ہوں یہاں سے وفتح ہو جاؤ ورنہ دھکے دے کر نکال دوں گی۔“

”پھوپھو میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں میرے بچے بھنگ جائیں گے۔ آپ کے احمد کے بچے بھنگ جائیں گے۔“ میں رونے لگی۔

”میں کہتی ہوں میرا تیرے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جہاں گیا احمد وہیں گئی اُس کی اولاد۔“ زیب پھوپھو سختی سے بولی تھیں۔ آخر کار میں وہاں سے مایوس لوٹ آئی۔

اب میں تھی اور میرے بچے۔ اس صورت حال میں سب مجھے چھوڑ چکے تھے۔

میں نے اپنی زمینوں پر خود ہی کاشت کاری کرنے کا سوچا۔ اس سلسلے میں جب میں اپنی زمینوں پر گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہاں پر تو میرے دیور فضل عباس کا قبضہ ہے۔ وہ بھی وہیں پر سو جو تھا۔

”فضل تم میری زمینوں پر کیا کر رہے ہو؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”تمہاری زمینیں.....؟ بھلا تمہاری زمینیں کہاں سے آئیں.....؟“

”یہ تو میری ہیں۔“ فضل کا زاری سے بولا۔

”اپنی زندگی میں ہی عباس یہ زمینیں مجھے فروخت کر چکا تھا۔“

”لیکن یہ تو میرے نام تھیں۔“ میں نے پریشانی سے کہا۔

”آج کل بھلا کیا نہیں ہو سکتا ہے۔ ہم نے بھی تھوڑا سا پیسہ خرچ کیا اور سب کچھ ہمارے نام ہو گیا۔“

”یہ دھوکہ ہے، فراڈ ہے۔“ میں روتے ہوئے بولی۔

”اگر یہ دھوکہ ہے فراڈ ہے تو عدالت میں ثابت کرو یہاں پر کیا لینے آئی ہو۔“ فضل عباس ہنستے ہوئے بولا۔

میں اکیلی عورت بھلا میری کس نے سنی تھی میں

ایک بار پھر اکیلی ہو گئی تھی۔

بچوں کی خاطر میں نے لوگوں کے کپڑے سینا شروع کر دیے۔ اُن کا روزگار بھی تو بنانا تھا۔ میں دن رات محنت کر رہی تھی تاکہ میرے بچے پڑھ لکھ سکیں۔

اس دوران میری ساس نے مجھ پر ہزاروں الزام لگائے۔ ہر آئے گئے کو میرے بارے میں فرضی کہانیاں سناتی رہتی۔ جو عورتیں مجھ سے کپڑے سلوانے آتی تھیں وہ مجھے سارے حال کہہ دیتی تھیں۔ میں صبر و شکر سے وقت گزار رہی تھی۔ مجھ پر جتنے بھی ظلم ہوئے تھے میں نے اُن کا حساب اپنے خدا پر چھوڑ دیا تھا۔ میرا بڑا بیٹا یوسف میٹرک میں تھا، معارج نهم جماعت میں تھی، جبکہ یونس اور مائدہ آٹھویں جماعت میں تھے۔ وقت کا کام ہے گزرنا سو گزرتا رہا۔

مجھے اپنے سسرال اور میکے کی کچھ خبر نہ تھی۔ نہ ہی اُن لوگوں نے میری کوئی خبر رکھی اور نہ ہی میں نے اُن کی کوئی خبر رکھی۔

ایک دن رانا نگر سے مجھے ایک عورت ملنے آئی۔ وہ میری ساس کی کوئی لٹنے والی تھی۔ میں اُسے دیکھ کر حیرت زدہ تھی۔

”کوڑ جینی مجھے تمہاری نند نے بھیجا ہے۔ اُس نے تمہیں بلا یا ہے۔“

”مجھے بلا یا ہے..... لیکن کیوں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہاری ساس بہت بیمار ہیں اور اُس کی حالت ایسی ہے کہ اُس کا دم اٹک گیا ہے۔ وہ نہ مر رہی ہے اور نہ ہی جی رہی ہے۔ تم اک بار اُس کے سامنے چلی جاؤ ہو سکتا ہے تمہیں دیکھ کر وہ سکون سے مر سکے۔“

میں نے لوگوں سے سنا تو تھا کہ زیب پھوپھو بیمار ہیں لیکن ایسی حالت میں ہوں گی یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں دم بخود تھی۔ آج وقت میرے ہاتھ میں تھا اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کیا کروں؟

”کوڑ کیا سوچ رہی ہو.....؟“ ماسی سکینہ بولی تو میں چونک پڑی۔

”میں رانا نگر نہیں جاسکتی ہوں جس جگہ سے میں وہ کاری گئی ہوں وہاں نہیں جاؤں گی۔ چاہے جو کچھ



بھی ہو جائے۔" ماسی سکینہ آ خر مایوس داپس چلی گئی۔  
پھر اُس کے بعد میرے پاس کئی لوگ آئے لیکن  
میں نہ گئی۔

ایک دن میرے سر آگے اور میرے سامنے  
ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے سامنے میں مجبور  
ہو گئی اور اُن کے ساتھ رانا نگر چل پڑی۔  
جب میں پھوپھو کے گھر پہنچی تو برادری کے سب  
لوگ موجود تھے۔

میں سیدھی پھوپھو کے سامنے پہنچی۔ چار پائی پر یہ  
بیار عورت قطعاً میری پھوپھو نہیں لگ رہی تھی۔ یہ تو کوئی  
ادری عورت تھی۔ پھوپھو سر سے بالکل نجی ہو چکی تھیں  
پلکیں اور بھنویں بھی غائب تھیں۔ سارے جسم میں  
کپڑے پڑ چکے تھے، اس قدر بدبو تھی کہ لوگ دور دور  
ہو کر بیٹھے تھے۔ پھوپھو نے مجھے دیکھا تو میرے سامنے  
ہاتھ جوڑ دیے۔ میں تو خدا کا انصاف دیکھ رہی تھی۔  
قدرت نے پھوپھو کو عبرت کا نشان بنا دیا تھا۔

مجھے رہ رہ کے اُس کی زیادتیاں یاد آ رہی تھیں۔  
پھوپھو نے شاید میرے چہرے سے میرے دل کا حال  
پڑھ لیا تھا، اُس نے ایک بار پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑ  
دیے۔ میں خوفِ خدا سے کانپ اُٹھی۔

اگلے ہی لمحے میں کھڑی ہو گئی اور بلند آواز سے  
بولی۔

"پھوپھو آپ نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا اُس  
کے لیے میں آپ کو اس جہان میں معاف کرتی ہوں،  
اُس جہان میں بھی معاف کیا۔"

میری اتنی کہنے کی دیر تھی اور پھوپھو کا دم نکل گیا۔  
میں سر جھکائے وہاں سے نکل آئی کیونکہ اب وہاں کوئی  
کام نہیں تھا۔

میری سلائی کا زور تھا۔ میری محنت کا مجھے خوب  
پھل مل رہا تھا۔ میں تمام رشتے داروں سے علیحدہ بس  
اپنے بچوں میں ہی مصروف تھی۔ میں چاہتی تھی کہ  
میرے بچے اس معاشرے میں اپنا ایک علیحدہ مقام  
حاصل کریں۔

میرے پاس ایک لڑکی طاہرہ کپڑے سلوانے آتی  
تھی۔ میں اگر فارغ ہوتی تو اُس کے ساتھ خوب گپ

شپ لگا لیتی۔

اب کچھ دنوں سے طاہرہ کا والد قادر بھٹی آتا اور  
کپڑے لے جاتا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ طاہرہ بیمار ہے۔  
ایک دن میں جلدی کام سے فارغ ہو کر طاہرہ کے گھر  
چلی گئی وہ مجھے باہر صحن میں ہی مل گئی۔

"ارے آنٹی آپ.....؟ زبے نصیب زبے  
نصیب۔" طاہرہ مجھے دیکھ کر خوش دلی سے بولی۔

"میں نے سنا ہے کہ تم بیمار ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بس ایسے ہی کچھ دنوں سے بخار ہو گیا تھا اور  
آپ کو تو علم ہے کہ میری والدہ موجود نہیں ہیں، میں  
چھوٹی سی تھی جب وہ فوت ہو گئی تھیں اس لیے کام کا  
سارا بوجھ مجھ پر ہے۔ برادری والے اس مشکل گھڑی  
میں ساتھ چھوڑ چکے ہیں، اس لیے بعض دفعہ آنٹی کام  
کے بوجھ سے میں تھک سی جاتی ہوں۔" طاہرہ رنجیدگی  
سے بولی۔

میرا دل جیسے کسی نے منھی میں جکڑ لیا تھا۔ آگے  
بڑھ کر میں نے طاہرہ کو سینے سے لگا لیا۔

"نہ ادا اس ہو میری بچی..... مجھے اپنی ماں کی طرح  
سمجھو۔"

"ہائے سچ آنٹی۔ بالکل سچ طاہرہ۔" میں نے  
سکراتے ہوئے کہا۔

نجانے کیوں مجھے اُس وقت طاہرہ پر بے حد پیار  
آ رہا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری بیٹی منارج میرے  
سامنے موجود ہے۔

اب طاہرہ مجھ سے دنیا جہان کی باتیں کرتی اور  
مجھے بھی اُس کی باتوں میں مزہ آتا۔

آہستہ آہستہ میں قادر بھٹی سے بھی بات چیت  
کرنے لگی۔ اُس کی اپنی زمینیں تھیں۔ پیسے کی تنگی انہیں  
بالکل بھی نہیں تھی۔ طاہرہ اب مجھے اور بھی زیادہ پیاری  
لگتی تھی۔

وہ مجھ سے کپڑے سینا سیکھ رہی تھی۔ صبح کو قادر بھٹی  
اُسے میرے پاس چھوڑ جاتا اور رات کو داپس لے  
جاتا۔

یوسف اور قادر بھٹی کی آپس میں خوب دوستی تھی۔  
دو دنوں کا مشترکہ شوق تھا کبڈی۔ قادر بھٹی خود بھی کبڈی

کا بہترین کھلاڑی تھا۔ یوسف بھی کبڑی کا شوقین تھا اس لیے دونوں کی آپس میں خوب دوستی ہو گئی تھی۔

معارض اور ماکدہ البتہ اُس سے چھٹکتی تھیں۔ رہ گیا یونس تو اُسے اپنی پڑھائی سے ہی فرصت نہیں تھی۔

مجھے پتا بھی نہ چلا اور قادر بھٹی میرے حواسوں پر سوار ہو گیا۔ اب میں دن رات اُس کے خیالوں میں ہی کھوئی رہتی۔ میری اس کیفیت کو سب سے پہلے معارج نے محسوس کیا۔

”امی جی خیریت تو ہے، آپ آج کل بڑی گرم سی رہتی ہیں؟“ اب ہم پر بھی وہ توجہ نہیں ہے۔ خیریت تو ہے؟“

”ہاں بیٹا خیریت ہے ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بس آج کل طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”امی جی ہمارا آپ کے علاوہ کون ہے، ہماری خاطر آپ اپنا خیال رکھا کریں۔“ معارج نرمی سے بولی تو مجھے اُس پر بے اختیار پیار آ گیا اور میں نے آگے بڑھ کر اُسے گلے سے لگا لیا۔

میں قادر بھٹی کو بھول نہیں پاری تھی۔ وہ میرے لیے اہم ستون بنا جا رہا تھا۔ میں اپنی عمر کا سوچتی تو شرم سے پانی پانی ہو جاتی کہ دل مجھے کن راہوں پر لے چلا تھا۔

میری اس بدلی کیفیت کو شاید قادر بھٹی نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اب اُس کی نگاہیں مجھے پیغام دیتی نظر آتیں۔ ایک دن دروازہ بجا میں دروازے پر گئی تو آگے قادر بھٹی کھڑا تھا۔

بچے اسکول گئے ہوئے تھے، جبکہ یوسف اور معارج کالج میں تھے۔

”آپ اس وقت.....؟ خیریت تو ہے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں بالکل خیریت ہے، میں نے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی تھی اس لیے حاضر ہوا ہوں۔“ وہ انکساری سے بولا۔

”اس وقت میں گھر پر اکیلی ہوں بھٹی صاحب آپ پھر کسی وقت تشریف لے آئیں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”دیکھیے محترمہ میں بھی ایک شریف اور عزت دار آدمی

ہوں۔ مجھے خود سے زیادہ آپ کی عزت پیاری ہے۔ میں آپ سے جو بات کرنا چاہتا ہوں اُس کے لیے مجھے تہائی کی ضرورت ہے۔ آپ مجھ پر کھل بھروسہ رکھیں اور آرام سے میری بات سن لیں۔“ میں نے قادر بھٹی کی طرف ایک نظر ڈالی اور پھر کچھ سوچ کر راستہ دے دیا۔

”ہاں اب بولیں مجھ سے کون سی ضروری بات کرنی ہے.....؟“ قادر بھٹی جب کرسی پر آرام سے بیٹھ گیا تو میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”بات یہ ہے کوثر صاحبہ کہ میں آپ سے خلوص دل سے شادی کرنا چاہتا ہوں.....“ قادر بھٹی نے گویا میرے سر پر دھماکہ کیا۔

”جی.....؟“ میں لڑکھا گئی۔

”میں کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے اس معاملے میں بات کروں لیکن ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔

بس آج ہمت کر کے چلا آیا ہوں۔ اصل بات کچھ یوں ہے کہ آپ مجھے اچھی لگی تھیں۔ میں دل سے آپ کی عزت کرنے لگا۔ جب مجھے طاہرہ کے ذریعے آپ کے

خالات کا پتا چلا تو میرے دل میں آپ کے لیے اور بھی عزت بڑھ گئی۔ میری بیوی کو فوت ہوئے دن سال ہو گئے ہیں، میں نے اپنی بیٹی کو ماں اور باپ کا پیار دیا ہے۔ اُس کی ہر بات مانی ہے۔ لیکن اب میرا دل چاہتا ہے کہ میری بھی کوئی ساتھی ہو جو میرے دکھ سکھ بانٹے،

میرا خیال رکھے، مجھے پیار کرے۔ میں نے جب بھی اپنی ساتھی کے بارے میں سوچا آپ چھم سے میری نگاہوں کے سامنے آ گئیں۔ میں نے دن رات آپ کے بارے میں سوچا ہے اور اب طاہرہ سے مشورہ کر کے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

میں جو قادر بھٹی کی باتوں میں گم تھی آخری بات پر چونک گئی۔

”جی کیا کہا آپ نے..... طاہرہ سے مشورہ۔“

”ارے آپ تو گھبرا گئی ہیں، اصل میں طاہرہ کو جلدی ہے کہ آپ اُس کی امی بن جائیں، مجھ سے پہلے اُس نے اپنی اس خواہش کا اظہار مجھ سے کیا ہے۔“

”لیکن بھٹی صاحب یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ایک

یہ عورت ہوں اور میرے چار بچے بھی ہیں جو کہ ماشاء



الغدا اب جوان ہیں۔ میں دوسری شادی کیسے کر سکتی ہوں اور وہ بھی اس عمر میں.....؟

”عمر کی تو آپ بات چھوڑیں۔ ہمارے مذہب اسلام میں شادی کی ضرورت کو ہم سمجھا گیا ہے عمر کو نہیں اور پھر کس جگہ پر لکھا ہے کہ بیوہ عورت شادی نہ کرے.....؟ شادی آپ کی بھی ضرورت ہے اور میری بھی۔ میں آپ کی اور بچوں کی کفالت کر سکتا ہوں۔ میں نے اسلام کے حکم کے مطابق جائز طریقے سے آپ کا ہاتھ مانگا ہے۔“ قادر بھٹی سنجیدگی سے بولا۔

”ٹھیک ہے بھٹی صاحب میں اس معاملے میں سوچوں گی اور پھر آپ کو جواب دوں گی۔“

”ضرور سوچیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن فیصلہ میرے ہی حق میں ہونا چاہیے۔“ قادر مسکراتے ہوئے بولا اور مجھے اُس سے بے اختیار شرم آ گئی۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ واپس چلا گیا، جبکہ میں سوچوں کے گہرے سمندر میں ڈوب گئی۔

میری حالت بالکل دیوانوں والی ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں آخر کیا کروں کدھر جاؤں، کس سے مشورہ مانگوں؟ ”بھٹی دوبارہ میرے پاس نہیں آیا تھا۔“

خاندان میں بھی کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جس سے میں مشورہ کر سکتی۔ میرے تو دن رات سخت پریشانی میں گزار رہے تھے۔ ابھی میں نے کوئی بھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ قادر بھٹی آ گیا۔

”ہاں کوثر اب بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے.....؟“ قادر بھٹی اندر کر کے میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے بھٹی صاحب، مجھے تو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی۔“ میں بے بسی سے بولی۔

”آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے.....؟“ اس نے استغہامیہ انداز میں پوچھا۔

”مسئلہ تو کوئی بھی نہیں ہے بھٹی صاحب، اصل میں، میں بچوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو میرا دل پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ اب بڑے سارے ہیں

میرے بارے میں کیا سوچیں گے.....؟ یوسف تو کالی جڈ ہوتی ہے وہ تو مرنے مارنے پر تہل جائے گا۔“ میں

نے انتہائی پریشانی سے کہا۔

”دیکھو کوثر تم کوئی بھی غلط کام نہیں کر رہی ہو۔ جائز اور حلال طریقے سے نکاح کر رہی ہو اور نکاح کرنا کوئی جرم نہیں ہے، کوئی گناہ نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں کوثر اور ہمیشہ تمہارا ساتھ دوں گا۔ رہ گئی بچوں کی بات تو میں خود اُن سے بات کر لوں گا۔ یوسف اور معارج بڑے ہیں، وہ یقیناً میری بات سمجھ جائیں گے۔ باقی رہ گئے یونس اور ماندہ تو اُن سے بعد میں بات کر لیں گے۔“ قادر بھٹی بڑے اطمینان سے بولا۔

میں اُس کی تمام باتوں پر ایمان لے آئی اور شادی کے لیے رضامندی دے دی۔

ٹھہرا ٹھہرا میرا اقرار سنتے ہی قادر بھٹی خوشی سے ناچ اٹھا، جبکہ میں شرم سے سرخ ہو گئی۔

اُسی شام میں نے قادر بھٹی سے نکاح کر لیا۔ قادر اپنے تین دوستوں کے ساتھ آیا۔ مولوی صاحب بھی ساتھ تھے، ہمارا نکاح ہو گیا تو سب رخصت ہو گئے۔

کمرے میں قادر اور میں رہ گئے۔ بچے یوشن پڑھنے گئے ہوئے تھے اس لیے میں نسلی سے بیٹھی تھی۔

قادر نے میرے گلے میں سونے کی چین پہنائی اور تاجر ساتھ دینے کا وعدہ کیا، کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلا گیا کیونکہ بچوں کے آنے کا ٹائم ہو گیا تھا۔ قادر کی قربت میں میں بہت خوش تھی۔ جب بچے پڑھنے چلے جاتے تو وہ میرے پاس آ جاتا۔ ہم ایک دوسرے میں مست ہو جاتے۔ اور جب مجھے ہوش آتا تو میں قادر سے کہتی۔

”تم نے یوسف سے بات کی ہے.....؟“

”جلدی بھی کیا ہے جان من میں کوئی دور بھاگا جا رہا ہوں۔ بس جلد ہی کوئی اچھا سا موقع دیکھ کر اُس سے بات کر لوں گا۔“ قادر مجھے تسلی دیتا۔

”ویر نہ کرو بھٹی..... جلد ہی یوسف اور معارج سے بات کر لو۔ اب تو تمہاری آمد پر آس پاس پڑوس والے بھی باتیں کرنے لگے ہیں۔ میں ایسی صورت حال سے پریشان ہوں۔“

”تم پریشان نہ ہو میں جلد ہی اُن سے بات کرتا ہوں۔“ قادر بھٹی مجھے تسلی دیتا ہوا چلا گیا۔

بھٹی سے شادی کرنے کے بعد میں کچھ زیادہ ہی

پریشان رہنے لگی تھی۔ پڑوسنیس بھی مجھ پر پاتیں کرنے لگی تھیں۔ میں بھٹی کے نقش میں مکن سب کچھ بھلائے ہوئے تھی۔

بھٹی میرے پاس روز ہی آتا تھا۔ طاہرہ بھی اکثر آتی تھی۔ اُسے ہماری شادی کا پتا تھا۔ بعض دفعہ مجھے طاہرہ سے بھی شرم آ جاتی۔

ایک دن بھی میرے پاس آیا تو میں اُس سے لڑ پڑی۔

”مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ تم میرے ساتھ دھوکہ کرو گے۔“

”دھوکہ.....؟ کون سا دھوکہ کوثر؟“ وہ مصنوعی حیرت سے بولا۔

”تم نے مجھے کہا تھا کہ تم جلدی بچوں سے بات کرو گے لیکن تین مہینے گزرنے کے بعد بھی تم نے بات نہیں کی ہے۔ مجھے تو اب خود سے بھی شرم آنے لگی ہے۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔

”ارے تم تو واقعی رونے لگی ہو۔ پلیز رومنت دیکھو میں آج ضرور ہی کچھ کرتا ہوں۔ یوسف کو کسی ہوٹل پر لے جاؤں گا اور پھر اُس سے تسلی کے ساتھ بات کرتا ہوں۔“

اس سے پہلے کہ قادر مجھ سے کوئی اور بات کرتا۔ دھرام سے دروازہ کھلا۔ میں اور قادر دونوں چونک پڑے، دروازے پر یوسف کھڑا تھا۔ یوسف کو دیکھتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں جلدی سے بھٹی سے علیحدہ ہو گئی۔

”تم..... ذلیل انسان میرے ہی گھر میں نقب لگادی۔ میں تم سے کبڑی سیکھتا تھا اور تمہیں اپنا دوست سمجھتا تھا اور تم نے میری دوستی کو داغ لگا دیا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ یوسف نے بڑے خونخوار لہجے میں کہا اور قادر پر حملہ کر دیا۔

”میری بات سنو یوسف پہلے تسلی سے میری بات سن لو۔“ قادر نے یوسف کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

اور پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ پلک جھپکتے میں ہی یوسف نے چھری کے وار سے قادر بھٹی گودھیر کر دیا۔

میں جو پہلے ہی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی یہ

صورت حال دیکھ کر مزید ڈر گئی اور ڈر کے مارے بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

میری چیخوں سے پورا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ یوسف پچھلے دروازے سے بھاگ گیا تھا۔ قادر کو فوراً اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹرز کی مسلسل محنت بھی رنگ نہ لائی اور قادر بھٹی زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہیں اسپتال میں انتقال کر گیا۔

میرے سب محلے داروں کو میرے نکاح کا پتا چل گیا تھا۔ میری حالت سب سے بری تھی۔ نقدیر ہر بار مجھ پر ہی کیوں وار کرتی ہے۔

معارض اور ماندہ مجھ سے بولنا چھوڑ گئی تھیں جبکہ یونس گھر سے غائب تھا۔ میرے دونوں بیٹے غائب تھے۔

پھر مجھے کسی نے بتایا کہ یوسف اپنے ساتھ یونس کو لے گیا ہے۔ اور وہ دونوں ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔

معارض اور ماندہ مجھے چھوڑ کر اپنی پھوپھو کے پاس چلی گئیں۔ پتا نہیں کب سے وہ دونوں اپنی پھوپھو کے پاس جانے لگی تھیں۔ میں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ جاتے جاتے

معارض مجھ سے بولی۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماں ایسی ہوتی ہے۔ آپ نے قادر بھٹی سے شادی کر کے ہماڑے منہ پر کالک ٹھوپ دی ہے۔ ہم کہیں بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی ہیں۔ دونوں بھائی تو دیسے بھی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں اب ہمارا اور کون ہے جو ہمیں سہارا دے۔ اس مشکل گھنری میں پھوپھو نے ہمیں سہارا دیا ہے۔ وہ ہم دونوں بہنوں کو اپنی شفقت میں لینے کو تیار ہیں۔ اس لیے ہم دونوں رانا نگر جا رہی ہیں اپنی پھوپھو کے پاس۔ اور ہاں آج سے ہمارا آپ سے ہر رشتہ ختم ہو گیا۔ ہم سمجھیں گی کہ ہماری پیدائش پر ہماری ماں مر گئی تھی۔“

قدرت کے اس ستم ظریف کھیل پر میں اب تنہا بچی تھی۔ سسکتی بلکتی اپنی زندگی گزارنے کے لیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ قدرت نے مجھ سے کس بات کا انتقام لیا تھا یا کہ یہ میرا امتحان تھا۔

☆☆.....☆☆



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

# پھر سچ ہوگی!

محمد سلیم اختر



لیچرڈ لکھناری کی طرف سے، کشمیری پس منظر پر ایک یادگار داستان

اپنے کام میں مصروف تھا۔ کہ کسی نے اسے پکارا۔ ”مولوی صاحب!“ اس نے اپنے ہاتھ روک لیے اور نظر اٹھا کر دیکھا۔ تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک خوب صورت اور نوجوان لڑکی اور بھارتی فوج کا کوئی میجر کھڑا تھا۔

”ہاروری میجر! بھلا اس کا یہاں کیا کام؟“ مولوی امین نے سوچا۔

”مولوی صاحب! ہم ایک مجاہد یاسین کی قبر تک جانا چاہتے ہیں۔ کیا تم ہمیں بتا سکو گے کہ اس کی قبر کون سی ہے؟“ میجر نے مولوی امین کی انجمن وود کر دی۔

”وہ جو ایک ہفتہ قبل شہید ہوا ہے۔“ مولوی امین نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ میجر نے جواب دیا۔

”میجر صاحب..... یاسین تو شہید ہو چکا ہے۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ خدا کے لیے۔ اسے اب اور اذیت مت دیجیے گا۔ اسے اب تو آرام کرنے دیں۔“ مولوی امین نے نہایت ہی دروناک لہجے میں کہا۔ تو میجر کے ساتھ کھڑی وہ حسین لڑکی رونے لگی تھی۔ مولوی کو حیرت ہوئی کہ یہ لڑکی کون ہے!

کشمیر کی واوی اس دن سورج کی کرنوں سے منور تھی۔ ہر چیز صاف اور واضح دکھائی دے رہی تھی۔ کیواڑہ سے تین کلومیٹر پر ایک بڑا قبرستان ہے۔ جہاں سیکڑوں آزادی کے مجاہد شہادت کے درجات پا کر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ قبرستان کے ارد گرد پہاڑیاں اور جنگل ہے۔ اکثر مجاہدین کا ٹھکانہ یہی جنگل اور پہاڑیاں ہیں۔ بھارتی فوجیوں سے اکثر جھڑپیں اسی علاقہ میں ہوتی ہیں۔ قبرستان کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ جو بھی کبھی ہی آباد ہوتی ہے۔ جب مجاہدین اس مسجد سے آ کر نماز ادا کرتے ہیں۔ بھارتی سورا مسجد میں بھی ان پر گولیاں برسوانے سے باز نہیں آتے۔ مسجد کا امام امین نامی ایک شخص ہے۔ جو نہایت ہی منطقی شخصیت اور بہادر انسان ہے۔ وہ مجاہدین کا ہمدرد اور ان کی مدد بھی کرتا ہے۔ بھارتی فوج اکثر اس مسجد کو بھی مسمار کر جاتے ہیں مگر مولوی انھیں پھر سے خدا کے گھر کو آباد کر دیتا ہے۔

اس روز بھی مولوی امین مسجد کی مرمت میں مصروف تھا۔ وہ درود پاک کا ورد کرتا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ درود پاک کا ورد کرتا ہوا



دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جبکہ میجر راکیش دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تیرنے لگی تھی۔ مولوی امین حیران ہو کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا کہ یاسین نے ان لوگوں پر کون سا احسان کیا تھا کہ ایک ہندو میجر احترام کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہے اور ایک ہندو لڑکی اس کی قبر پر بیٹھی رو رہی ہے۔ اسے یہ سب کچھ ناقابلِ یقین لگ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہندو اور وہ بھی فوجی تمام کشمیریوں کے جانی دشمن ہیں۔ ان سے کسی قسم کے انصاف اور ہمدردی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی اسے ان دونوں بہن بھائی کا یہ انداز کوئی ڈرامہ ہی لگ رہا تھا۔ اس نے آج تک کسی بھارتی کی زبان سے کسی مجاہد کے لیے ایسے الفاظ سنے تھے۔ اس نے پوچھا۔

”میجر صاحب! میں جانا چاہوں گا کہ یہ یاسین شہید نے آپ پر کون سا احسان کیا تھا کہ جن کا بدلہ

ور یاسین کی شہادت کا سن کر رونے کیوں لگی ہے۔“  
 ”مولوی صاحب! تم ہماری یہاں آنے کی وجہ کو غلط سمجھ رہے ہو۔ میں میجر راکیش ہوں اور یہ میری بہن ارچنا ہے۔ یاسین ہمارا محسن ہے ہم اس کا شکر یہ ادا کرنے یہاں آئے ہیں۔“

”ایک مجاہد تمہارا محسن۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“  
 مولوی امین حیرت بھرے لہجے میں بولا۔  
 ”یہ سچ ہے مولوی صاحب! آپ ہمیں اس کی قبر تک لے چلیں۔“ میجر نے جواب دیا۔

مولوی امین نے چند لمحے سوچا اور پھر ان دونوں کو ساتھ لے کر ایک طرف چل پڑا۔ اسے معلوم تھا کہ تین دن قبل ہی بھارتی فوج نے یاسین کو بڑی بے دردی سے شہید کر دیا تھا۔ مولوی صاحب نے یاسین کی قبر کے سرہانے پہنچ کر ان کو بتایا کہ یاسین شہید کی قبر ہے۔ یہ کشمیر کے مجاہد کی آخری آرام گاہ ہے۔“  
 میجر کی بہن ارچنا قبر کے قریب بیٹھ گئی اور پھر

Downloaded From  
 Paksociety.com

READING  
 Section

چکانے آپ قبرستان تک چلے آئے ہیں؟“  
 ”مولوی صاحب! میں بتاتی ہوں کہ یاسین  
 شہید نے مجھ پر کون سا جہان کیا ہے۔“  
 ارچنا بولی۔ پھر اس نے ہانا شروع کیا۔

☆☆☆

ہمارے پتاجی آری میں کرل تھے۔ اب وہ  
 ریٹائرڈ ہو چکے ہیں ان کی اولاد میں ہم دو ہی بہن  
 بھائی ہیں۔ میں راکیش بھیا سے چھوٹی ہوں۔ ہم  
 دونوں کو بڑے ناز و نعم سے پالا گیا۔ ہم دونوں کی  
 ہر خواہش پوری کی گئی۔ راکیش میٹرک میں تھا اور  
 میں مڈل میں تھی۔ جب ہمارے پتاجی کا تبادلہ کشمیر  
 کر دیا گیا۔ ہمیں اور پتاجی کو بھی ان کے ساتھ ہی  
 آنا پڑا۔ کشمیر کے قدرتی حسین اس کی برف پوش  
 چوٹیوں اور دلکش نظاروں کو دیکھ کر میں بہت خوش  
 ہوئی۔ وہاں ہی ہم نے تعلیم بھی حاصل کی۔ اور کشمیر  
 کے بارے میں بہت ساری معلومات بھی ملیں۔ پتاجی  
 کی ذہانت میں یہ ہی سنتی تھی کہ کشمیر میں دہشت  
 گرد بنتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی جان کی کوئی  
 اہمیت ہی نہیں ہے۔ وہ بہت ظالم اور بے رحم ہیں۔  
 وہ نہ صرف بھارتی فوج کو نقصان پہنچاتے ہیں۔  
 بلکہ وہاں کے مقامی باشندوں کو بھی بوٹے اور  
 مارتے ہیں۔

پتاجی کی باتیں سن کر اور وہاں کے مقامی لوگوں کو  
 دیکھ کر میں سوچتی کہ یہ کتنی بھڑکے ہوئے ہمارے  
 فوج سے نکل لیتے ہیں اور وہ کیا سوچ کر جان بھیلی پر  
 لیے پھرتے ہیں۔ پتاجی مجھے ان مجاہدین کی بے رحمی کی  
 ایسی کہانیاں سناتے کہ میں ان سے نفرت کرنے لگتی۔  
 میں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ میں تعلیم مکمل کرنے کے  
 بعد ان مجاہدین پر تحقیقات کروں گی۔ اور اصل معاملہ  
 تک پہنچ کر دم لوں گی۔

☆☆☆

یوں ہی برسوں گزر گئے۔ پتاجی ریٹائرڈ ہو گئے  
 اور ہم لوگ بمبئی میں رہنے لگے۔ اس عرصہ میں  
 راکیش بھائی بھی آری میں بھرتی ہو گئے تھے۔ پتاجی  
 کے ایک دوست بھی کرل ریٹائرڈ تھے۔ ان کی آپس

میں گہری دوستی تھی۔ کرل مہتا کا ایک بیٹا بلرام بھی  
 کیپٹن تھا۔ میں نے ایک دو بار ہی اسے دیکھا تھا۔ وہ  
 مجھے ایک آنکھ نہ بھایا۔ اس کی حرکات ہی ایسی تھیں۔  
 پتاجی میری شادی بلرام سے کرنا چاہتے تھے۔ مگر  
 میں نے بلرام کے ساتھ شادی کرنے سے صاف انکار  
 کر دیا۔ بلرام مجھے پسند کرتا تھا۔ اس لیے میرے  
 انکار نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اور ایک  
 روز سر بازار مجھے روک کر وارننگ دی کہ یہ اس سے  
 شادی سے انکار مجھے بہت مہنگا پڑے گا۔

مگر میں نے اس کی کسی دھمکی اور دھونس کی پرواہ  
 نہ کی اور سر بازار اس کے چہرے پر تھپڑ جڑ دیا۔ اور  
 غصے سے گل کھاتی ہوئی گھر لوٹ آئی۔

راکیش اور بلرام کی یونٹس الگ الگ تھیں۔ پھر  
 بھی ان میں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ان دنوں دونوں  
 کی یونٹس کشمیر میں ہی موجود تھیں اور آج بھی ہیں۔  
 میں نے اپنی تعلیم مکمل کی تو مجھے شملہ اور کشمیر کی سیر کا  
 شوق چرایا۔ ساتھ ہی میں کشمیری مجاہدین کی زندگی  
 کے بارے میں بھی جانتا جا رہی تھی۔

پتاجی سے بڑی مشکل سے اجازت ملی تھی۔ مگر  
 انھوں نے گاڑی اور ڈرائیور میرے ہمراہ کر دیا اور  
 راکیش بھائی کو بھی اطلاع کر دی کہ میں کشمیر آ رہی  
 ہوں۔ وہ میرا خیال رکھے۔ اور مجھے اکیلا وادی میں نہ  
 گھومنے دے کیونکہ مجاہدین نہ صرف دہشت گرد ہیں  
 بلکہ ہماری عورتوں کی عصمتوں کے لیبرے بھی ہیں۔

☆☆☆

گاڑی جب کشمیر کی حدود میں داخل ہوئی تو  
 راستے میں کئی فوجی چوکیوں پر ہماری گاڑی کو روکا  
 گیا۔ میں بھائی کا حوالہ دیتی تو ہمیں آگے جانے دیا  
 جاتا۔ کشمیر کی وادی میں داخل ہو کر یوں محسوس ہو رہا  
 تھا جیسے میں کسی اور دیس میں نکل آئی ہوں۔ ہر  
 طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اونچے اونچے پہاڑ اور ان  
 پر چڑ کے لمبے لمبے درخت، صاف ستھرا آسمان  
 اور پھر جھاگ بناتی ہوئی ندیاں۔ کشمیر کے فطری  
 لازوال حسن نے مجھے مسحور کر دیا۔ ہمارا ڈرائیور کشمیر  
 ہی کا رہنے والا تھا۔ مگر وہ ہندو تھا۔ اسی لیے پتاجی



نے اسے میرے ساتھ بھیجا تھا۔ وہ کشمیر اور وہاں کے باشندوں کے بارے میں معلومات رکھتا تھا۔ اس لیے میں خوش تھی کہ یہ مجھے کشمیر کی خوب سیر کرائے گا۔ ابھی ہم بس کلو میٹر ہی آگے گئے تھے کہ ہمیں ایک فوجی چوکی پر روکا گیا۔ وہاں ایک فوجی چیپ کھڑی تھی۔ اس میں ایک کیپٹن اور پانچ مسلح فوجی بھی سوار تھے۔ کیپٹن کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ جب چوکی پر مجھ سے شناخت کرانے کو کہا گیا تو میں نے اپنے بھائی کیپٹن راکیش کا نام لیا تو چیپ میں سوار کیپٹن فوراً آڑا۔ تو میں اس کو دیکھ کر گھبرا گئی وہ کیپٹن بلرام تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بولا۔

”اس کی شناخت کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے لڑکھڑاہٹ کے انداز میں کہا۔ میں پھر چونک گئی۔ اس نے تو ہنی رکھی تھی۔

”تم ہوش میں تو ہو بلرام۔ میں ارچنا ہوں۔ کیپٹن راکیش کی بہن۔“ میں غصے سے بولی۔

”اس سے کیا فرق پڑے گا۔ آج تو میں نے تم سے تھپڑ کا حساب چکانا ہے۔ جو ٹوٹنے مجھے سرعام مارا تھا۔ میں نے کہا تھا نا کہ تمہیں یہ تھپڑ بہت مہنگا پڑے گا۔ اور وہ وقت آج خود ہی چل کر میرے قدموں میں آ گیا ہے۔ آج رات تم میری مہمان بنو گی۔“

”جو اس بند کرو کیپٹن بلرام۔“ میں نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔ ”مجھے جانے دو ورنہ یہ تمہارے لیے اچھا نہ ہو گا۔“ میں نے پھر دھمکی کے انداز میں کہا۔

”کیا اچھا ہو گا اور کیا برا؟ یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ ابھی تو تم میرے ساتھ چلو۔“ اس نے میری گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”ڈرائیور! گاڑی بھگاؤ۔“ میں پوری قوت سے چیخی۔

ڈرائیور نے گاڑی تیزی سے بھگا دی۔ مگر بلرام نے بھی اپنی فوجی گاڑی پر ہمارا پیچھا شروع کر دیا۔ دونوں گاڑیوں کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ میں اس وقت بہت ہی پریشانی کا شکار تھی اور اس وقت کو کوسنے لگی۔ جب میں نے کشمیر کی سیر کا پروگرام بنایا تھا۔

”ڈرائیور گاڑی اور تیز چلاؤ۔ وہ حرام زادہ ہمارے قریب آ چکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ڈرائیور اپنی پوری کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اندھا دھند گاڑی چلانا بھی تو خطرناک تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف اتنی گہری کھائیاں تھیں کہ ان میں گر کر زندہ رہنا ناممکن تھا۔

”ارچنا جی اب ہمارے پاس ایک ہی راستہ باقی ہے کہ ہم کسی گاؤں کے قریب گاڑی روک کر آبادی کی طرف بھاگ نکلیں۔ یوں ہمارے بچنے کی امید ہو سکتی ہے۔“ ڈرائیور نے مخاطب کر کے بولا۔

”ہم کو کون پناہ دے گا؟ اور ہم وہاں کیسے پہنچیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم کوشش اور ہمت سے کسی آبادی میں پہنچ سکتے ہیں۔ جو ہوگی تو مسلمانوں کی مگر وہ ہماری حفاظت کی حامی بھر لیں تو ہم پر کوئی آج نہ آئے دیں گے۔ یہ ان لوگوں کی ریت ہے۔“ ڈرائیور نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ جیسے تم مناسب سمجھ کر دو۔“ میں نے سب کچھ ڈرائیور کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

اس عرصہ میں ہماری گاڑی کافی آگے نکل آئی تھی۔ تاہم فوجی گاڑی مسلسل ہمارے تعاقب میں تھی۔ ایک جگہ آبادی دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی کچے راستے پر اتار لی۔ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب اس نے گاڑی روکی۔ ہم اترے اور اندھا دھند آبادی کی طرف بھاگنے لگے۔ ہم تھوڑی ہی دور پہنچے تھے کہ پیچھے سے ایک فائر ہوا۔ میں نے دیکھا ڈرائیور خون میں لت پت ہو کر زمین پر گر پڑا۔ مگر میں نہرکی اور اپنی زندگی اور عزت بچانے کی خاطر بھاگتی رہی۔ مجھے یہ یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے زندہ پکڑنا چاہیں گے۔ آخر کار میں ایک بستی میں داخل ہو گئی۔ ایک گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا تو میں اس کے اندر جا گھسی سامنے ایک عورت بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔

”آپ..... مجھے پناہ دے دو۔ بھگوان کے لیے میری زندگی خطرے میں ہے۔“ میں کہتے ہوئے اس عورت کے پاس جا کر گر پڑی۔ اس عورت نے مجھے اٹھایا۔ تسلی دی اور پوچھا۔

”کیا بات ہے بیٹی! اتنی بدحواس کیوں ہو؟“

”وہ..... تم..... میرے پیچھے۔“ میں نے بدحواسی سے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اتنے میں سامنے والے کمرے کے اندر ایک بزرگ نکلے اور بولے۔

”کون ہے تمہارے پیچھے بیٹی؟“

”وہ..... بلرام..... فوج کیپٹن۔“ میں نے بوکھلاہٹ میں جواب دیا۔

”تم اب کوئی فکر مت کر دو بیٹی۔“ انہوں نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”اب تم ہماری مہمان ہو ہماری پناہ میں ہو۔ اب ہم یوں تمہیں کسی کے حوالی نہیں کریں گے۔ ہم گھر آئے مہمان کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم پر کوئی آج بے آواز آنے دوں گا۔“

اتنے میں ایک دوسرے کمرے سے ایک نوجوان لڑکی نکلی اور میری اور اپنے باپ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس کے باپ نے اسے بتایا کہ بیٹی ایہ ہماری مہمان ہے۔ فوج اس کے پیچھے لگی ہے تم اسے اندر گودام میں جا کر چھپا دو۔“

وہ لڑکی آگے بڑھی۔ میرا ہاتھ پکڑا اور کمرے کے اندر لے گئی اور پھر وہاں سے ایک تنگ اور تاریک راستے کے ذریعے ایک اندھیرے کمرے میں داخل ہو گئی۔ جہاں گھناؤبہ اندھیرا تھا۔ اس لڑکی نے چراغ جلا لیا تو میں نے دیکھا کہ وہاں غلے کی بہت سی بوریاں پڑی تھیں۔ اس لڑکی نے مجھے ان بوریوں کے پیچھے چھپنے کو کہا۔ کہ جب تک میں نہ کہوں باہر نہیں نکلنا اور نہ ہی آواز نکالنی ہے۔ ”یہ کہہ کر اس نے چراغ بجھایا اور وہاں سے چلی گئی۔“

میں پریشان سی ہو گئی اور سوچنے لگی کہ کیا یہ لوگ واقعی میری حفاظت کریں گے؟ کہیں میں کسی نئی مشکل میں تو نہیں پھنس گئی؟ پھر میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور دل ہی دل میں بھگوان سے خیریت کی دعائیں مانگتی رہی۔ کچھ دیر ہو گئی تو باہر سے دروازہ پینے کی آواز آئی۔ تو میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو گئی۔

”یہاں ایک لڑکی آئی تھی بڑھے! وہ کہاں ہے؟“ مجھے بلرام کی زوردار کراخت آواز سنائی دی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

”کپتان صاحب! آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہاں تو کوئی لڑکی نہیں آئی۔“ بوڑھے نے کہا۔

”جھوٹ مت بول بڑھے۔ مجھے کئی اطلاع ملی ہے کہ وہ لڑکی اس گھر میں داخل ہوئی ہے۔“

بلرام کی آواز سن کر مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نے میری جان گھسی میں لے لی ہو۔

”کپتان صاحب! آپ تسلی کر لیں۔ یہاں کوئی لڑکی نہیں آئی۔“ بوڑھے نے پراعتماد انداز میں کہا۔

”میں نے دائر لیس پر اطلاع دے دی ہے۔ مزید فوجی چیکنے والے ہیں۔ پھر میں دیکھوں گا کہ لڑکی یہاں سے کیسے برآمد نہیں ہوتی۔“ بلرام کی غصہ بھری آواز سنائی دی۔

”کچھ ہی دیر بعد کوئی اس اندھیرے کمرے میں آیا۔ اس نے چراغ روشن کیا تو میں نے دیکھا کہ یہ وہی بوڑھی عورت تھی جس نے مجھے اٹھایا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک وجیہہ، دراز قد اور نہایت ہی خوب صورت نوجوان تھا۔“

”بیٹی! اس کیسے کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم یہاں ہو۔“ اس عورت نے کہا۔

”اب کیا ہوگا؟“ میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بیٹی تم بے فکر ہو جاؤ۔ ہم وعدہ نہ جانے والوں میں سے ہیں۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے یا سیں۔ یہ تمہیں گھر کے عقبی دروازے سے نکال کر لے جائے گا۔“

کیونکہ یہاں اب شدید خطرہ ہے۔“ اس بوڑھی عورت نے کہا۔

”مگر آپ لوگ میری خاطر اتنا بڑا خطرہ کیوں مول رہے ہیں۔ آپ مجھ اجنبی کے لیے اپنی زندگی خطرے میں کیوں ڈال رہے ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں۔ کہاں سے آئی ہوں؟“

میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

”بیٹی! ہمیں ان باتوں کی پروا نہیں ہے۔ ہم



فاصلے پر ایک گاڑی ہے۔ باڈیاں وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں اس سے گھوڑا ادھار لے کر تمہیں کپواڑہ چھوڑ آؤں گا۔“ یاسین نے کہا۔  
 ”یاسین بھائی! اب اگر تم جاہو تو بھارتی فوجیوں کی زیادتیوں کا بدلہ ایک کمپین کی بہن سے لے سکتے ہو۔ مجھے یرغمال بنا کے۔“

”ارچنا بہن! شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہم ایک بادشاہ اور اصول پسند قوم ہیں۔ ہم مرتو سکتے ہیں لیکن دشمن کی ہنسی خواتین اور بچوں کو قتل کرنا ہمیں کسی حال میں بھی منظور نہیں۔ ہمارا مذہب اور ہمارا معاشرہ اس بات کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔“

میں مطمئن اور خاموش ہو گئی۔ ہم چلتے رہے۔ شدید سردی اور بھوک کی وجہ سے میری رفتار دھیمی پڑنے لگی تھی کہ یاسین بولا۔

”جلدی چلو۔ ہمیں رات کی تاریکی میں ہی کپواڑہ پہنچنا ہے۔“ یاسین نے میری دست رقرار دیکھ کر کہا۔ پھر میں نے اپنا کوٹ اتار کر مجھے پہنا دیا۔ کیونکہ میرے پاس تو دو پٹہ تھا۔ جس وجہ سے میں سردی سے کانپنے لگی تھی۔ ہم کچھ دیر بعد ایک کچی سڑک پر آ گئے۔ اب میں آسانی سے اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ کافی آگے جا کر ہمیں دو بھارتی فوجیوں نے روک لیا۔ تو میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔

”تم لوگ کون ہو؟ اور اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“ انھوں نے ہمیں روک کر پوچھا۔

مہاراج! یہ میری پتی ہے شدید بیمار ہے نزدیکی قصبے ددائی لینے جا رہا ہوں۔“ یاسین نے بہانہ بنایا۔  
 ”اچھا۔ میں بھی ذرا دیکھو تمہاری پتی کو۔“ ایک فوجی شیطان لہجے میں بولا۔ اور میری طرف بڑھنے لگا۔ یاسین کو غصہ آ گیا۔ اس نے فوراً ہی اپنی رائفل کا بیٹ اس کے سر پر مارا۔ اس فوجی کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

”ارچنا! اب جلدی سے یہاں سے بھاگ نکلو۔“ یاسین نے کہا تو ہم نے سڑک چھوڑی اور جنگل میں گھس گئے۔ بھاگتے ہوئے دو چار منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ پیچھے سے فائرنگ شروع ہو گئی۔

نے تمہیں پناہ دی ہے۔ اب اگر ہماری بوٹیاں بھی نوجلی جائیں تو ہم تمہیں کسی کے حوالے نہیں کریں گے۔“ اس بوڑھی عورت کا لہجہ مضبوط اور اٹل تھا۔ پھر وہ اپنے بیٹے سے کہنے لگی۔

”بیٹا یاسین! اس لڑکی کی حفاظت اب ہماری ذمہ داری ہے تم نے اس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرنی ہے۔ اس لڑکی پر آنچ آئی تو سمجھ پورے کشمیر کی مہمان نوازی پر داغ لگ جائے گا۔ یہ بھی یاد رکھو۔ اگر اس لڑکی کو کچھ ہو گیا اور تم زندہ بچ کر لوٹ آئے تو میں اپنا دودھ تمہیں کبھی نہ بخشوں گی۔“

”آپ فکر نہ کریں ماں جی! میں اپنی ریت بھانا خوب جانتا ہوں۔ میں نے اس اجنبی بہن کو اس کے ٹھکانے پر پہنچا کر ہی لوٹوں گا۔“ یاسین نے تسلی دیتے ہوئے ماں سے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا اور کہنے لگا۔

”جلدی کرو بہن! اس سے پہلے کہ بھارتی فوج کی کمک پہنچ جائے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ یاسین نے اپنی رائفل اٹھائی اور مجھے چلنے کو کہا۔

”جاؤ بیٹیا! میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔“ اس کی ماں نے کہا۔

ہم بڑی احتیاط کے ساتھ گھر کے عتی دروازے سے باہر نکلے۔ تھوڑی آگے جا کر یاسین نے چلتے چلتے پوچھا۔ ”کہاں جاؤ گی؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پھر بولا۔ ”تم نے جواب نہیں دیا کہ تم نے کہاں جانا ہے؟“

”میں ہندو ہوں اور ایک بھارتی کمپین راکیش کی بہن ہوں۔ وہ کپواڑہ میں رہتا ہے۔ میں نے اس کے پاس جانا ہے۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”تو تم اب کپواڑہ جاؤ گی؟ تمہارے پاس بھائی کا پتا ہے؟“ یاسین نے بے نیازی سے پوچھا۔ جیسے ایک کمپین کی بہن ہونا اس کے لیے حیرت کی کوئی بات ہی نہ ہو۔

”ہاں میں بھائی کے پاس کپواڑہ جانا چاہتی ہوں اس کا پتا مجھے معلوم ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”چلتی رہو تم میرے ساتھ۔ یہاں سے کچھ

شاید ان لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ یاسین نے میرا ہاتھ چکڑ لیا اور ہم بھاگتے رہے۔ میں بدحواس ہو کر پتھر لیے راستے پر گر پڑی مگر پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

یاسین کہنے لگا۔ ”اس طرح تو ہم مارے جائیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھے اپنے کندھے پر لادا اور بھاگنے لگا۔ بھارتی فوجی کتوں کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جب فائرنگ بڑھی تو ہم ایک ٹیلے کی اوٹ میں ہو گئے۔

”اب تو ان کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔“ یاسین نے یہ کہہ کر رائل لوڈ کرنے لگا اور پھر بولا۔ ”ارچنا! تم فکر مت کرو۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“

پھر وہ ٹیلے کی اوٹ سے جوانی فائرنگ کرنے لگا۔ دس منٹ گزر گئے تھے اچانک ایک گولی اس کا دایاں کندھا چیرتے ہوئے نکل گئی۔ لیکن وہ بہادری سے لڑتا رہا۔ پھر اس نے فائرنگ کے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹنے کی ترکیب اپنائی۔ وہ جوانی فائرنگ کرتا ہوا آخر ٹیلے تک جا پہنچا میں بھی اس کے ہمراہ تھی۔ میں نے دیکھا۔ ڈھلوان کی طرف نیچے کسی آبادی کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یاسین کا جسم خون سے تر ہو گیا تھا۔ اس کی ساری لمبھن خون سے بھیگ گئی تھی۔ اوپر سے سردی۔

”بھائی۔ یہ خون۔“ میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ”پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“ وہ اپنی تکلیف چھپاتے ہوئے بولا۔ ”ہم اب آبادی کی طرف جائیں گے۔“ اس نے روشنی والی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیسے اسے اپنی مطلوبہ شے مل گئی ہو۔ بھارتی فوجیوں کی فائرنگ بدستور جاری تھی کہ اچانک ایک اور گولی اس کے بازو میں پھوسٹ ہو گئی۔ اس کے حلق سے آہ نکل گئی لیکن اس نے اپنی چیخ دہائی۔

”ارچنا بہن!“ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”میرے پاس گولیاں بہت کم رہ گئی ہیں۔ میں ان کو روک رکھتا ہوں۔ تم اس گاؤں چلی جاؤ۔ جہاں

روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔ وہاں مسجد کی پشت پر میرے دوست جمیل کا گھر ہے۔ اسے یہ رہنمی رومال دے دینا اور کہنا کہ مجھے یاسین نے بھیجا ہے۔“ اس نے جیب سے ایک کڑھائی والا رومال نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ یہ رومال دیکھ کر جان جائے گا اور تمہیں تمہارے بھائی کے پاس پہنچا دے گا۔“ اس نے نجیف آواز میں کہا۔

”لیکن یاسین بھائی۔ آپ تو زخمی ہیں۔ میں آپ کو چھوڑ کر۔“

”تم میری فکر مت کرو۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ جاؤ۔ ویر مت کرو۔ میرے پاس اب مزید وقت نہیں ہے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

”میں اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر اس وقت فائرنگ مزید بڑھ گئی۔ یاسین کے اصرار پر مجھے اٹھنا پڑا مگر میرے پاؤں تو جیسے وہاں ہی چپک گئے تھے۔

”جاؤ ارچنا جاؤ۔ ورنہ تم بھی یہیں ماری جاؤ گی۔ ویر مت کرو۔ جاؤ۔“

☆☆☆

میں اسے خون میں لت پت چھوڑ کر گاؤں جا پہنچی۔ یاسین کے دوست جمیل نے جب اس رومال کو دیکھا اور میری پٹائی سنی تو وہ سب سمجھ گیا۔ اس نے بھی میری حفاظت کی اور مجھے رائیش بھائی کے پاس پہنچا دیا۔

☆☆☆

ارچنا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”مولوی صاحب! یاسین ایک عظیم مجاہد تھا۔ میں اس کی ماں کے کبے ہوئے الفاظ کبھی نہ بھول پاؤں گی۔ آہ۔ کتنے عظیم ہیں یہ لوگ جو اپنا عہد نبھانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں۔ یہ دہشت گرد نہیں ہیں بلکہ انسان کی سوگند۔ یہ عظیم انسان ہیں۔“ ارچنا کی ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کیپٹن رائیش کی آنکھیں بھی برسے لگی تھیں۔ وہ بھی سسکیاں لیتے



ہوئے بولا۔

## مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

800/-	ایم اے راحت	جادو
300/-	شاز یہ اعجاز شازی	تیری یادوں کے گلاب
500/-	غزالہ جلیل راؤ	کانچ کے پھول
500/-	غزالہ جلیل راؤ	دیا اور جگنو
500/-	غزالہ جلیل راؤ	انائیل
500/-	نصیرہ آصف خان	جیون جھیل میں چاند کریم
500/-	نصیرہ آصف خان	عشق کا کوئی انت نہیں
500/-	عطیہ زاہرہ	سلگتی دھوپ کے صحرا
300/-	محمد سلیم اختر	یہ دیا بچنے نہ پائے
400/-	ایم اے راحت	وش کنیا
300/-	ایم اے راحت	درندہ
200/-	ایم اے راحت	تعلی
200/-	ایم اے راحت	بھرم
400/-	خاقان ساجد	چہون
300/-	کاروق انجم	دخواں
300/-	کاروق انجم	دھڑکن
700/-	انوار صدیقی	درخشاں
400/-	اعجاز احمد نواب	آشیانہ
500/-	اعجاز احمد نواب	جزیرہ
999/-	اعجاز احمد نواب	نامن

### نواب سنز پبلی کیشنز

1/92، کوچہ میاں حیات بخش، اقبال روڈ

کمپنی چوک راولپنڈی 051-5555275 Ph:

لاہاری، ہمیں اپنا ناول سنا کر

کروانے کے لیے رابطہ کریں

0333-5202706

”مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ دہشت گرد یہ لوگ نہیں بلکہ ہم ہیں۔ کشمیری خواتین کے ساتھ زیادتی کرتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر یہی سب کچھ ہماری بہن، بیوی یا بیٹی کے ساتھ ہوتا تب ہمیں کیسا لگے گا۔ آہ یاسین! آج تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اور مجھے بھی میرا اصلی چہرہ دکھا دیا ہے۔ تم لوگ حق پر ہو۔ کشمیر تمہارا ہے۔ اسے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہ بہت جلد آزا ہو گا۔“

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔  
”مولوی صاحب! آج سے میں نے فوج کی نوکری چھوڑ رہا ہوں۔ میں اور ارچنا دونوں مسلمان ہونا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں اسلام میں داخل کریں اب ہم لوٹ کر نہیں جائیں گے۔ اب ہمارا جینا مرنا کشمیریوں کے ساتھ ہے۔“

مولوی امین نے ان دونوں بہن بھائیوں کو گلے پڑھایا اور ان کے نام بھی مسلمانوں والے رکھ دیے۔ اس کے بعد کمپنیشن راکش نے فوجی انداز میں تن کر یاسین کی قبر کو سیلوٹ کیا اور تھوڑی دیر اسی حالت میں کھڑا رہا۔ جیسے وقت ٹھم گیا ہو۔ ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا۔ اس نے پھر اپنے سر سے فوجی ٹوپی اتاری اور یاسین کی قبر کے قدموں میں رکھ دی۔ پھر اس نے مولوی صاحب کا دیا ہوا کشمیری لباس پہنا۔ اس کے بعد اس نے فوجی وردی اور ٹوپی کو ایک طرف رکھ کر آگ لگا دی۔

راکش۔ ارچنا اور مولوی امین۔ وردی کو جلتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ اتنے میں بلرام اور پانچ سپاہیوں کے ہمراہ جیپ میں سوار وہاں پہنچا۔ انھوں نے بغیر کوئی بات کیے۔ بند توں کے منہ کھول دیے گولیوں کی بو چھاڑنے راکش، ارچنا اور مولوی امین کی زندگیاں چھین لیں۔ اور کپواڑہ کے قبرستان میں تین شہیدوں کی قبروں کا اضافہ ہو گیا۔ دھند چھٹنے لگی تھی۔ سورج نکل آیا تھا اور اس کی کرنیں اعلان کر رہی تھیں کہ غلامی کی دھند بہت جلد چھٹنے والی ہے۔

☆☆☆

## چند روز سے عبدالرحمن تنگ

نقصہ سعید

اُس نوجوان کا قصہ 'عجب' جسے قدرت کراہی سے حق کی جانب لے آئی تھی

ہے، کیا قائدہ تیرے رونے پینے کا، خواجواہ بلکان ہو رہی ہے۔ اسے دیکھ سارے غموں سے بے فکر کیسے نشے میں دھت ہے۔" شائق نے ماں کو چپ کر داتے ہوئے بے زاری سے کہا۔ جبکہ اس سارے ہنگامہ سے بے خبر چند فرس پر ہی لڑھک گیا تھا۔ اب پتا نہیں یہ نیند کا غلبہ تھا یا نشے کا، جو بھی تھا وہ اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر فرس پر دھت پڑا تھا۔

"اسے کیا پتا کس طرح میں دن رات محنت مزدوری کر کے ان کا پیٹ کا دوزخ بھر رہی ہوں۔ یہ بے غیرت تو جہاں موقع ملتا ہے میری محنت کی کمانی جس میں اڑا دیتا ہے۔ ایسی اولاد سے تو میں بے اولاد ہی اچھی تھی۔" سکھاں دیوار سے ٹیک لگا کر وہیں فرس پر ہی ٹانگیں پیار کر بیٹھ گئی۔ تھکاوٹ اس کے لہجے میں عیاں تھی۔

"میں نے نورین بی بی کے سارے کپڑے سلائی کر دیے ہیں۔ کام پر جاتے ہوئے لے جانا اور جو سلائی کے پیسے ملیں ان کا مل جمع کروا دینا۔ اب اس جڑی کے ہاتھ میں گولی جیسے نہ دینا۔ خواجواہ برباد کرنے کے لیے۔"

شائق نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے اک نظرت بھری نگاہ اپنے بھائی پر ڈالی اور مشین ڈھک کر رکھ دی۔ سارے بکھرے ہوئے کپڑے سمیٹے اور برآمدے ہی

"کوئی بھی انسان خود بُرا نہیں ہوتا۔ بُرے تو اس کے وہ اعمال ہوتے ہیں جو اسے بُرا بنا دیتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ بڑائی سے نفرت کر دو۔ بُرے انسان سے نہیں اور یہ ہی ہمارے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں انسانوں سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ نفرت نہیں۔"

عبدالرحمن بڑے جذب کے عالم میں درس دے رہے تھے۔ بولتے بولتے ان کی آواز میں رخت آگئی اور یاد اللہ میں ان کی آنکھ سے بہنے والے آنسو ان کی سفید داڑھی کو بھگو گئے۔ درس سننے والے تمام افراد نہایت ہی ادب اور عقیدت و احترام سے بیٹھے تھے۔ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جسے عبدالرحمن کے سانولے سلونے چہرے پر دکھ اور کرب کے گہرے سائے نظر آتے۔ لیکن اندر بیٹھی فاطمہ کو اپنے بھائی کے لہجے میں بولتا دکھ اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"تیرا کا لکھ نہ رہے بلذات، تو ملیں کی رقم بھی جس بھی پی گیا۔ اب جو بجلی کٹ گئی تو میں کرم جلی کہاں دھکے کھائی پھروں گی۔" سکھاں نے دھائی دیتے ہوئے کہا۔

"کس کو سنا رہی ہے اماں۔ وہ تو بے سدھ پڑا

READING SECTION

124 سچی کہانیاں



”شانقی سے لے دے۔ شام کو اس کی سلائی کے  
 پیسے آئے ہیں۔ میں اسے واپس کر دوں گا۔“  
 چندر نے بہن کی جانب دیکھتے ہوئے حتی الامکان  
 اپنی آواز کو دھیمّا کرتے ہوئے کہا۔ چندر کی بات سنتے ہی  
 شانقی کا مشین چلاتا ہاتھ ذرا سی وپر کوست پڑا اور اس نے  
 مڑ کر ایک تیکھی نظر چندر پر ڈالی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی  
 کیونکہ وہ اس وقت کسی قسم کا کوئی لڑائی جھگڑانہ چاہتی تھی۔

کے کونے میں بنی چھوٹی سی رسوئی کی جانب چل دی تاکہ  
 روٹی پکا کر گھر کے باقی افراد کے پیٹ کو ایندھن فراہم  
 کر سکے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب اس کی ماں نے صبح تک  
 اسی طرح فرش پر بیٹھ کر اپنا غم غلط کرتا ہے اور مشکل ہی تھا  
 جواب سکھاں کے حلق سے ایک نوالہ نیچے اترتا۔  
 ☆☆☆

”ماں مجھے پچاس روپے دے دے صرف پچاس



”ان پیسوں کا میں گھر کے لیے راشن لے آئی جو  
 تیرے نشے سے زیادہ ضروری تھا۔“ سکھاں نے رکھائی  
 سے جواب دیتے ہوئے کہا۔  
 ”دیکھ مائی یہ تو اچھا نہیں کر رہی میرے ساتھ۔ میں  
 تجھے چھوڑوں گا نہیں۔“ سکھاں کے جواب سے یک دم  
 ہی چندر غصہ میں آ گیا۔  
 ”کیا اچھا نہیں کر رہی، بول کیا اچھا نہیں کر رہی میں

روپے۔“ چندر جانے کب سے سکھاں کی منت سماجت  
 کر رہا تھا۔ اس کا مطالبہ دو سو سے شروع ہوا تھا اور آہستہ  
 آہستہ وہ پچاس روپے پر آ گیا تھا۔ اور اب باقاعدہ اپنی  
 ماں کے پاؤں پکڑے بیٹھا تھا۔  
 ”میرے پاس ایک دس روپے نہیں ہیں میں تجھے  
 پچاس روپے کہاں سے لا دوں؟“ سکھاں نے بے بسی  
 سے اسے پرے بٹاتے ہوئے کہا۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



تیرے ساتھ۔ بڑا آیا بڑا آیا میرے ساتھ بڑا کرنے والا۔“ سکھاں نے غصہ سے اسے پرے کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارے پیٹ کا ویزخ میری جان سے زیادہ ضروری ہے۔ کیسی ماں ہو تم! بیٹا مر رہا ہے اور تمہیں احساس نہیں۔“ اب وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور غصہ کی زیادتی سے اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا اور منہ سے رال بہ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کچھ ہو اور وہ اپنی ماں کو دے مارے۔ شانتی اس کا غصہ دیکھ کر گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مہارا کہیں وہ غصہ میں کوئی حرکت ہی نہ کر دے۔

”یہ تو ہی ہے جس نے ماں کو سکھا سکھا کر میرے خلاف کیا ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ اب چندر اس کی جانب غصہ سے دیکھ کر پھنکا رہا۔

”مجھ پر تیری اس بکواس کا کوئی اثر نہیں ہونے والا۔ جاتنی غیرت سے تو نکلا کر دکھا پھر میں تجھے مانوں، تنکے تنکے کو ہاتھ پھیلائے والا اتنی باتیں کرتا اچھا نہیں لگتا۔“ شانتی نے اسے دو بدو جواب دیتے ہوئے کہا۔ چندر کچھ دیر خاموش کھڑا رہ کر شانتی کو خونخوار نگاہوں سے گھورتا رہا اور پھر پھینکا رہا ہوا بولا۔

”تجھے تو میں دیکھ لوں گا۔“ ساتھ ہی ماں کو دھکا دیتا ہوا وہ نہایت ہی جارحانہ انداز سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

پھر اگلی آنے والی صبح اس گھر کے لیے ایک نئی آفت لے کر آئی۔ صبح اٹھتے ہی شانتی نے دھائی مچادی کیونکہ اس کی سلائی مشین اپنی جگہ پر نہ تھی۔ جانے چندر ظالم رات کس وقت آیا اور اس کی مشین اٹھا کر لے گیا۔ شانتی کا روزمرہ کام معمول تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر بھگوان کی پوجا کرتی اور پھر اپنی مشین کو صاف کرنے کے بعد گھر کا کوئی اور کام کرتی، آج بھی ایسا ہی ہوا جب وہ پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر مشین کی جانب آئی تو خالی جگہ سے منہ چڑا رہی تھی۔ شانتی تو مانو تڑپ ہی اٹھی۔ مشین میں تو اس کی جان تھی۔ اس کے بنا تو وہ بالکل بے کار تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ سوائے رونے پینے کے وہ ماں بیٹیاں کچھ

نہ کر سکتی تھیں۔ سارا دن ہی غم اور دکھ کی کیفیت میں نکل گیا۔ مشین کے غم میں ان دونوں نے کچھ نہ کھایا اور نہ ہی معذور روشن کو بھوک لگی۔ حالانکہ وہ تو بھوک کا بہت ہی کچا تھا یہاں تک کہ دونوں چھوٹوں نے بھی کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ غرض سارا ہی گھرا ایک سوگ کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ ایسے جیسے ان کا کوئی پیارا مر گیا ہو لیکن کب تک پیٹ تو آخر ایندھن مانگتا ہے۔ یہاں تو مرنے والوں کا صبر آجاتا ہے۔ یہ تو پھر ایک بے جان مشین تھی۔ رات تک شانتی کو خود ہی احساس ہوا کہ باپ اور چھوٹے بہن بھائی بھی اس کے دکھ میں بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔ لہذا خاموشی سے اٹھی، ڈبے میں موجود چاول ابا لے اور اچار کے ساتھ سب کو کھانے کے لیے دیے۔ لیکن اس کا اپنا دل بالکل نہ چاہ رہا تھا۔ اسے تو صرف یہ احساس مارے ڈال رہا تھا کہ اب مشین کے لیے اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟ اور جو کپڑوں کا ذخیرہ لگا ہے وہ کیسے بیلے گا۔

☆☆☆

دو پہر ڈھلے سکھاں کام کر کے گھر واپس لوٹی تو ہاتھ میں پکڑے شاپرز جو مختلف گھروں سے لائی تھی۔ تھی کے حوالے کر دیے۔

”شانتی کہا ہے۔“ سکھاں نے یہاں وہاں نظر دوڑاتے ہوئے تھی سے سوال کیا۔

”صبح سے ہی اندر تخت پر لیٹی ہیں۔ نہ کچھ کھایا اور نہ ہی پیا۔“ تھی جواب دے کر جلدی جلدی تھیلیوں میں جھانکنے لگی تاکہ اپنی من پسند کھانے کی چیز پہلے ہی الگ کر سکے۔ سکھاں تھی کی مامی اندر جا کر شانتی کے پاس بیٹھ گئی۔ جس نے ماں کو دیکھتے ہی کر دٹ بدل لی۔

”کپڑے واپس کر آئی ہے اماں۔“ شانتی نے دھیرے سے سوال کیا اس کے لہجے کا دکھ سکھاں کا دل زخمی کر گیا۔

”ہاں باجی نورین نے تیرے لیے ایک کام بتایا ہے۔ اگر تو نے کرنا ہو تو۔ اب مشین تو ہے نہیں جو سلائی کرے گی۔“ اتنا کہہ کر سکھاں نے شانتی کے چہرے پر اک نظر ڈالی جہاں کوئی بھی تاثر نہ تھا۔ بالکل سپاٹ اور بے تاثر چہرہ تھا۔

”کیا کام بتایا ہے وہ بتاؤ۔“ چار پائی پر بیٹھے

ہوئے وہ اپنی ماں سے مخاطب ہوئی۔

”نورین بی بی کی جانتے والی کسی اسکول میں استانی ہے۔ اس کا ایک چھوٹا بچہ ہے۔ بس وہ ہی سنبھالنا ہے۔ صبح سات بجے سے چار بجے تک۔ تنخواہ بھی مناسب ہے اور پھر کام بھی زیادہ نہیں۔ لوگ بھی اعتماد والے ہیں۔ نورین بی بی انھیں بہت عرصے سے جانتی ہیں شاید وہ نورین بی بی کے ہی رشتہ دار ہیں۔ کہے تو حامی بھریوں؟ اب یہ تیری مرضی پر ہے میری کوئی جو زبردستی نہیں۔“ سکھاں نے امید بھری نظروں سے شانتی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ شانتی منہ سے تو کچھ نہ بولی۔ بس صرف گردن اثبات میں ہلا دی اور سکھاں کے لیے یہ بھی کافی تھا۔

☆☆☆

اور پھر زندگی اسی مقام پر آگئی۔ جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ تو بچپن سے ہی اپنی ماں جیسی سمجھتی تھی۔ آٹھ سال کی عمر سے ماں کے ساتھ کام پر جا رہی تھی اور اپنے شوق کی بنا پر تیرہ سال کی عمر میں کام کے ساتھ ساتھ قریبی سرکاری مرکز سے سلائی بھی سیکھنے لگی تھی اور پھر ایک پیگم کی کوششوں سے اسے فلاحی مرکز کی جانب سے مفت سلائی مشین بھی مل گئی۔ ماں اس کی تو ساری مرادیں ہی پوری ہو گئیں اور پھر جو اس نے مشین سنبھالی تو بھی نہ چھٹکی۔ ماں کے کام پر جاتے ہی ننھی اور مٹھو کو ناشتا کروا کر قریبی سرکاری اسکول بھیجتی۔ ابا کو ناشتا کروا کر پورا گھر صاف کرتی، جلدی جلدی کپڑے، برتن دھوتی اور پھر جو سلائی مشین سنبھالتی تو اس وقت چھوڑتی جب سب گھر آجاتے۔ جلدی جلدی روٹی ڈالتی اور رات کے سامن کے ساتھ سب کو کھانا دے کر پھر مشین سنبھال لیتی۔ رات کا کام سکھاں کی ذمہ داری تھا۔ مکان کا کرایہ بھی تھا۔ بجلی، گیس کے بل نے الگ کمر توڑ رکھی تھی اوپر سے پانچ سال سے روشن کی معذوری نے اخراجات میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی دو ادارہ کا خرچہ اضافی تھا۔ جب تک روشن تندرست تھا سب ٹھیک تھا لیکن اس کے معذور ہوتے ہی نہ جانے کیسے چندر کو نشے کی لت لگ گئی۔ اچھا بھلا سرکاری اسکول جاتا تھا باپ کے حادثے کے بعد ماں نے اسکول چھڑوا کر میکینک کی دکان پر بیٹھا

دیا۔ اور ہمیں سے اسے جس جس کی لت لگ گئی۔ جس نے چندر کے ساتھ ساتھ سارے گھر والوں کی زندگی کو بھی جہنم بنا دیا۔ جب اسے نشے کے لیے کہیں سے پیسہ نہ ملتا تو وہ گھر میں اک ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ گالی گلوچ کرتا یہاں تک کہ ماں اور بہن پر ہاتھ اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتا۔ جس کے علاوہ وہ کچھ اور منشیات کا استعمال بھی کرنے لگا تھا۔ وہ خود تو نشہ کر کے دنیا جہاں سے بے خبر ہو جاتا اور گھر والوں کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیتا۔ اس نے خود تو اپنے حالات کو نشہ میں گھول کر پی لیا تھا۔ لیکن اس کی اس عادت نے ماں، باپ اور بہن بھائیوں کی زندگی کو مزید اجیرن کر دیا تھا۔ جس کا اسے کوئی احساس نہ تھا۔ ایک شانتی بھی جس کا ارمان تھا کہ پیسے جمع کر کے ایک سلائی مرکز کھولے گی لیکن دوسرے ادھورے خوابوں کی طرح اس کا یہ خواب بھی ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ خواب دیکھنا ہر انسان کا حق ہے۔ لیکن ان کی تعبیر ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے۔

☆☆☆

پانچ دن تک چندر کا کوئی پیمانہ چلا سب جانتے تھے کہ مشین بیچ کر جو پیسے ملے ہوں گے اس کی جن خرید کر کسی درگاہ کے باہر پڑا ہوگا۔ جہاں دی جانے والی خیرات کی بیگیوں کے چاول کھا کر وہیں احاطے میں اپنے جیسے دیگر چھیوں کے ساتھ وہ دنیا فیہا سے بے خبر ہوگا۔ روشن جو ایک رات چندر کے گھر نہ آنے پر پریشان ہوا اٹھتا تھا۔ اس بار بالکل خاموش تھا۔ ہاں بھی کبھی سکھاں کو جو یاد آ جاتا تو اس کے منہ سے کونے ہی نکلا کرتے۔ سوائے بددعاؤں کے اس کی زبان پر کبھی بھی چندر کے لیے کوئی الفاظ نہ آئے اکثر بیٹھے بیٹھے وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی اور پھر کہتی۔

”تیرا ناس جائے چندر! تو نے ہمیں کسی جوگانہ

چھوڑا۔ اور رہی بے چاری شانتی اس کے دل سے تو اپنی مشین کا غم ہی نہ جاتا تھا باقی وہ چندر کو کیا یاد کرتی۔ اس کے روز و شب تو پھر گزرے برسوں جیسے ہو گئے تھے۔ وہ ہی صبح سویرے اٹھ کر کام پر جانا چار پیسوں کے لیے لوگوں کی باتیں سننا جو کبھی استانی جی خوش ہتی تو وارے نیارے اور اگر جو موڈ خراب ہو تو بے چاری شانتی کی



”اس بے غیرت سے کہہ ابھی نکل جائے میرے گھر سے اور دوبارہ کبھی یہاں واپس نہ آئے مر گیا یہ ہمارے لیے۔“

”رات رہ لینے دے ابا میں اتنی رات کو کہاں جاؤں گا۔ بس ایک رات رحم کروے۔“ چندر نے گھنگھیا تے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”وہیں جا..... جہاں اتنے دنوں سے پڑا تھا۔ میرے گھر سے چلا جا۔ ہمیں تیری ضرورت نہیں۔“ روشن نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

”درگاہ پر تو پولیس کا چھاپہ پڑ گیا۔ میں بڑی مشکل سے جان بچا کر نکلا ہوں۔ رات رہ لینے دے ابا۔ میں دن چڑھتے ہی نکل جاؤں گا۔ اماں تو بھی سمجھا ابا کو۔ ابھی باہر نکلا تو پولیس پکڑ لے گی۔ سب کو اٹھا کر لے گئی ہے۔“ باپ سے بات کرتے کرتے اُس نے اپنا رخ ماں کی جانب موڑا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ماں کو بلیک میل کرنا نسبتاً آسان ہے۔ لیکن جانے کیوں آج تو سکھاں کا دل بھی پتھر ہو چکا تھا۔

”تیرا باپ ٹھنک کہتا ہے۔ تو جا یہاں سے۔ اب ہمارے گھر میں کچھ نہیں ہے سوائے ان بچیوں کے اور تیرے جیسا کم ظرف شیطان صفت شخص کسی کا سکا نہیں ہوتا۔ جانے تو کیا سوچ کر آج گھر آیا ہے۔ جا چلا جا چندر۔ میں سمجھوں گی تو مز کیا کیونکہ اگر تو زندہ رہا تو ہم سب کو مار دے گا تو تو۔ میرے بچے اپنے نشے کے لیے بیچ دے گا۔ چلا جا ورنہ میں خود تجھے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔“ روتے روتے سکھاں وہیں فرش پر بیٹھ گئی چندر نے ایک نظر ماں اور باپ کی طرف دیکھا اور پھر ایک امید بھری نگاہ بہن پر ڈالی لیکن ہر طرف واضح انکار دیکھ کر نشے کی حالت میں لڑا کھڑا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

وہ کتنی دیر سے پیدل چل رہا تھا اسی طرح چلتے چلتے وہ قبرستان سے ملحق خالی میدان میں پہنچ گیا۔ یہ غالباً کھیل کا میدان تھا۔ تھک ہار کر اس نے قبرستان کی دیوار سے ٹیک لگائی اور ٹانگیں لمبی کر کے سو گیا۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا جب کسی نے اُسے آواز دے کر جگا یا وہ

شامت۔ پانچ بجے شام جب وہ سکھاں کے ساتھ گھر آتی تو کسی سے بات کرنے کو بھی من نہ کرتا۔ سر شام ہی خاموشی سے منہ سر لپیٹ کر پڑ جاتی اور سکھاں اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی اور یہ ہی وقت ہوتا جب وہ چندر کو جھولیاں بھر بھر بدعائیں دیا کرتی اور پھر خود ہی رونے لگتی۔ وہ جانتی تھی شانتی کو سلائی مشین سے عشق تھا۔ اور اب جو مشین ہی نہ رہی تو جانو دنیا میں اس کے جینے کا کوئی مقصد ہی نہ رہا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ جب باہر سے آنے والے شور کی آواز سے شانتی کی آنکھ کھل گئی وہ یک دم گھبرا کر تخت سے اٹھی۔ پہلا خیال اس کے دل میں روشن کا آیا کہیں ابا کو کچھ نہ ہو گیا ہو۔ نیچے فرش پر مٹھو اور کبھی بچپن کی بے خبر نیند سوس رہے تھے۔ شانتی احتیاط سے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے کمرے کے دروازے تک جا پہنچی۔ ٹاٹ کا پردہ اٹھاتے ہی سامنے نظر آئے والے منظر نے رات کے اس سے اسے خاصا بد مزہ کیا۔ سامنے ہی چندر کھڑا تھا۔ جسے ابا اپنی بے ساسھی سے خوب پیٹ رہا تھا اور وہ چپ چاپ پٹ رہا تھا۔ حیرت شانتی کو چندر کے بیٹھے پر نہ تھی بلکہ روشن کے بیٹھے پر تھی۔ چندر تو ایسا ہی تھا نشے کی حالت میں بھی بلی بن جاتا اور جوشہ ٹوٹنے لگتا تو الامان لیکن روشن تو پچھلے پانچ سالوں سے معذوری کے بعد کبھی اور بھی آواز میں نہ بولا تھا۔ چہ جائیکہ اس قدر غصہ کا اظہار..... غصہ کی شدت سے وہ ہانپ رہا تھا اور پاس ہی کھڑی سکھاں جھولیاں بھر بھر کر بیٹے کو بدعائیں دے رہی تھی کچھ دیر تو شانتی نے خاموشی سے کھڑے ہو کر اس ہنگامہ کو دیکھا آخر کار اس سے برداشت نہ ہو خاموشی سے آگے بڑھ کر اس نے روشن کا بیساکھی والا ہاتھ تھام لیا۔

”جانے دے ابا! تو کیوں اپنا آپ خراب کرتا ہے۔ چھوڑ اسے اپنے کیے کی خود بھگتے گا۔“ روشن ہانپتا کانپتا شانتی کے سہارے پاس پڑی چار پائی پر گر گیا۔ شانتی نے ایک حقارت بھری نگاہ اپنے بھائی پر ڈالی اور قریب ہی موجود منکے سے کٹورا بھر کر باپ کو پانی دیا جو وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

نیند میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”بابا کھانا کھا لو۔“ نہ جانے وہ کون تھی جو چندر کی بڑھی ہوئی شیو سے دھوکا کھا گئی۔ چندر نے چندھی چندھی آنکھیں کھول کر اس کی جانب نکا۔ ایک عورت بھی ہاتھ میں رکابی لیے ہوئے کھڑی تھی۔ یکا یکا چندر کو بھوک کا احساس ہوا اس نے خاموشی سے ہاتھ بڑھا کر پلیٹ تھام لی۔ بیٹھے چاول شاید کسی نذر و نیاز کے تھے، وہ خاموشی سے کھا گیا۔ اور اب یہ اس کا معمول بن گیا۔ صبح اٹھتا یہاں وہاں پھرتا کبھی کسی مین ہول کا ڈھکن چراتا، کبھی کسی کھمبے سے بلب اتار لیتا، کبھی کسی کے گھر کے باہر سے جانی کا ڈھکن نکال لیتا، اور بیچ کر نشہ پورا کرتا لیکن شام ہوتے ہی اپنی مخصوص جگہ آ جاتا جہاں کوئی نہ کوئی سے کھانا دے جاتا۔ اب وہ درگاہ جانے سے ڈرتا تھا کہیں جو اگر پولیس پکڑ کر لے گئی تو پیچھے آنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ یہ سوچ اُسے درگاہ کی جانب جانے سے روکتی تھی اور اب تو اسی جگہ اُسے اپنے مقدر کا ارتق بیٹھے بٹھائے ہی ملنے لگا تھا تو پھر کیا ضرورت تھی کہیں اور دھکے کھانے کی اسی طرح نہ جانے کتنے دن بیت گئے۔

ایک دن جب وہ عورت کھانا لائی تو کچھ پریشان تھی۔ کھانا رکھتے ہی وہ چندر کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ ”بابا جی میزے لیے دعا کریں اللہ میری پریشانی دور کرے۔“ وہ رو رہی تھی۔

”حق اللہ... جا اللہ نے تیری سن لی۔“ چندر نے بھر پور اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے درگاہ سے سیکھا ایک نعرہ بلند کیا اور خدا کی کرنی منج ہوتے ہی اس عورت کا شوہر جیل سے رہا ہو گیا۔

اب تو جیسے بابا جی کے نام کا ڈنکا پورے محلے میں بج اٹھا۔ اس عورت کی زبانی چار سو بابا جی کے کارناموں کی کہانیاں پھیل گئیں۔ شام ہوتے ہی چندر کے واپس آنے پر آس پاس سے کچے ایمان والی اندھی عقیدت مند عورتیں اس کے گرد جمع ہو جاتیں اور اپنے لیے دعاؤں کا کہتیں۔ وہ تو اس وقت جس کے نشے میں سرشار ہوتا خود کو کوئی (نعوذ باللہ) پہنچی ہوئی ہستی سمجھتا۔ خوب حق اللہ کے نعرے لگاتا اور دعائیں دے لے جاتا۔

”جا اللہ تجھے چاند سا بنا دے۔ اللہ تیری بیٹی کا

نصیب جلد کھولے۔ تیرے میاں کی نوکری جلد ہی لگے گی۔ تیرا بیٹا بہو کو چھوڑ دے گا۔“

غرض اسی طرح کے بے شمار مسائل عورتوں کے پاس ہوتے جنہیں سن کر بابا جی دعائیں دیتے نہ تھکتے اب اللہ کی کرنی جو کام ہونے والا ہوتا وہ ضرور ہو جاتا اور اسی نہ انی کام میں نام بابا چندر کا آ جاتا، جس کی ماں اسی دن کو کوئی تھی جس دن اس نے یہ بیٹا جنم دیا تھا۔

آہستہ آہستہ میدان والا بابا آس پاس مشہور ہوتا گیا۔

ایک دن میونسپلٹی والے آئے میدان خالی کر دینے چندر کے عقیدت مندوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا لیکن ”بابا“ کو وہاں سے نہ جانے دیا۔ یہاں تک کہ بابا کے کسی عقیدت مند نے اسے دھوپ سے بچانے کے لیے ایک ساتبان سا بھی بنا دیا۔ جو پہلے تو کالے کپڑے کا تھا۔ پھر جانے کس نے کالے کی جگہ ساتبان کا کپڑا ہرا کر دیا اور قریب ہی ایک جھنڈا بھی گاڑ دیا۔ چندر کی بد حالی جاہل عقیدت مندوں نے خوش حالی میں تبدیل کر دی۔ اب وہ ہر وقت ہر اچو غا پہنے رہتا۔ گلے میں موٹے موٹے منکوں کی نالا جو وہ عبد اللہ شاہ غازی سے لایا تھا۔ سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں سچ جس کے دانوں پر سوائے حق اللہ کے وہ کچھ پڑھنا نہ جانتا تھا اور یہ حق اللہ بھی اس نے مختلف رنگا ہوں پر رہ کر سیکھا تھا۔ آہستہ آہستہ اسی جیسے چند دوسرے لوگ بھی اس کے گرد جمع ہو گئے۔ کوئی اس کے ہاتھ دابتا کوئی پاؤں یہاں تک کہ اب اسے جس کی خاطر چھوٹی موٹی چوری بھی نہ کرنی پڑتی۔ وہ بھی یہیں مل جاتی۔ غرض یہ کہ حج معنوں میں آسمان سے ”نہن“ برسنے کا نظارہ چندر نے بھی اپنی زندگی میں دیکھ ہی لیا تھا۔ آہستہ آہستہ چندر کا چہرہ ایک چھوٹی سی درگاہ میں تبدیل ہو گیا جو وقت کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتی گئی۔ چندر کے پاس ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم جمع رہتا۔ کوئی تعویذ لینے آتا، تو کوئی دم کر دینے، کبھی کوئی جن بھی اتروانے آ جاتا۔ ہجرے کے باہر ہی ایک صندوقچی رکھ دی گئی جہاں لوگ نذر و نیاز کے لیے پیسے ڈالا کرتے۔ ہر ماہ کی آخری جمعرات یہاں خوب میلا لگتا ساری رات تو الیاں ہوتیں اور خسرے ناچتے۔ وہ



شانتی کا ہاتھ تھا ہے آگے بڑھ گئی اور باباجی کے حجرے کے سامنے لگی بسی قطار میں بیٹھ گئی۔ اپنی باری کے انتظار میں دوپہر سے شام ڈھل گئی، بیٹھے بیٹھے اس کی کمر اکڑ گئی۔ لیکن اُس نے امید کا دامن نہ چھوڑا آخر کار شانتی سے برداشت نہ ہوا اور وہ اُنھ کھڑکی ہوئی۔

”چل اماں گھر چلیں، پھر آ جائیں گے۔ تھک گئی ہوں میں۔“ اس سے قبل کہ سکھاں، شانتی کی اس بات پر غور کرتی چادر میں ملبوس ایک موٹی سی عورت ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور سکھاں کے نزدیک ہوتے ہوئے بولی۔

”باباجی سے ملنا ہے۔“

”جی! سکھاں نے مختصر جواب دیا۔

”ایسے تو تمہارا نمبر نہیں آنے والا ساری رات نکل جائے گی۔“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کیسے آئے گا یہاں تو سب اسی طرح لائن میں بیٹھے ہیں۔“ سکھاں نے حیرت سے جواب دیا۔

”ایسا کھرے کے باہر موجود خاکی کپڑوں والے مجاور سے بات کر، اسے کچھ دے دلا کر جلدی کا نام لے لے،

ورنہ یہاں ہی رات ہو جائے گی اور عشاء کے بعد تو باباجی ویسے بھی کسی کو نہیں دیکھتے، پھر کچھ بات کھل پر گئی۔“ اس

عورت نے اپنے تئیں مخلصانہ مشورہ دیا اور پھر اس عورت کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے سکھاں نے میٹھ سے

بنوا نکال کر دیکھا۔ بیس روپے اور کچھ سکے بنوے میں رکھے تھے اس نے ایک لمحے کو سوچا اور شانتی کو بیٹھا چھوڑ

کر اس عورت کے ساتھ چل دی۔

حجرے کے باہر دو تین مجاور موجود تھے جن کے ڈنڈوں پر گھنٹھرو لگے ہوئے تھے۔ وہ زور سے اپنا ڈنڈا

زمین پر مارتے اور رات کے سے میں ایک عجیب سی دل ہلا دینے والی آواز سنائی دیتی۔ سکھاں کی سامنے عورت

نے اپنے مطلوبہ مجاور سے آہستہ آہستہ کچھ بات کی اس کی بات کے جواب میں مجاور سر ہلاتا گیا پھر اس نے ایک

نظر سکھاں پر ڈالی اور دوسری نظر ڈور دور بیٹھی شانتی پر اور

ایک دم اٹھ کر حجرے میں داخل ہو گیا اور چند ہی سیکنڈ بعد اس کی واپسی ہوئی۔ وہ مجاور سیدھا سکھاں کے پاس آیا۔

اس کے ہاتھ میں منزل واٹر کی ایک چھوٹی بوتل تھی، جس

لڑکیاں جن پر بقول ان کے گھر والوں کے جنات آتے تھے وہ بھی اس جمعرات احاطے میں لائی جاتیں۔ جہاں وہ خوب دھمال ڈالتیں۔ غرض ایک عجیب سا منظر ہر طرف دکھائی دیتا۔ چندر اپنی مطلب براری کے لیے نہ جانے کتنی ایسی ہی لڑکیوں کو استعمال کر چکا تھا۔ جس کا علم کسی کو نہ تھا۔ کوئی لڑکی چندر کے خوف سے زبان نہ کھولتی اور اگر جو کھول بھی لیتی تو ان کی کس نے سنی تھی۔ اور نہ جانے کتنے برس اسی طرح گزر گئے۔

ان گئے برسوں میں چندر کو کبھی اپنے گھر والے یاد نہ آئے اور نہ ہی کبھی اس نے پلٹ کر پیچھے کی جانب دیکھا وہ تو گمراہیوں کے راستہ پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ سچ ہے گناہ کی لذت جو پڑ جائے تو پیچھا پیچھا دانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے۔

☆☆☆

شانتی تقریباً تیس برس کی ہو چکی تھی۔ ننھی کی شادی کو بھی دوسرا برس تھا اور وہ ایک بچے کی ماں بھی بن گئی تھی۔ روشن کوفت ہوئے بھی سال بھر سے اوپر ہی ہو گیا

تھا۔ مٹھو سکھرا اپنی خالہ کے پاس رہتا تھا۔ مہینے کے مہینے آتا ماں بہن سے مل جاتا اور اپنی کیا کی بھی دے جاتا

لیکن سکھاں اپنا گھر چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ نا جانے اُسے کس کا انتظار تھا اور اس کا ساتھ دینے کو آج بھی شانتی

موجود تھی جس کا نصیب جانے کیوں سویا ہوا تھا۔ ایسے

مایوسی کے عالم میں جب سکھاں کو کسی نے میدان والے بابا کا بتایا تو وہ فوراً ہی شانتی کو لے کر وہاں جا پہنچی۔

جس دن سکھاں وہاں گئی جمعرات کا دن تھا اور مزار پر خوب ہی رش تھا۔ مزار کے احاطے میں ایک مصنوعی قبر

بنادی گئی تھی جہاں ویسے تو ہر وقت زائرین کا رش ہوتا لیکن جمعرات کا دن یہ رش عام دنوں سے زیادہ ہو جاتا۔

آج بھی وہاں خوب رش تھا۔ مزار کے ایک طرف ہار پھول والوں کی دکانیں تھیں اور کچھ بدست لوگ احاطے

میں بیٹھے اپنے اپنے پسندیدہ نشوں میں ڈوبے ہوئے ہر دو سیکنڈ کے بعد حق ہو کا نعرہ لگاتے جس سے ماحول میں

اور ہیبت طاری ہو جاتی۔ درگاہ میں آنے والے عقیدت مند ان کے آگے رکھے کشتکول میں کچھ پیسے حسب

استطاعت ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔ سکھاں بھی

میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی بوتل سکھاں کے ہاتھ میں دے دی۔

”چل جلدی سے پی لے اور آخری ایک گھونٹ اپنی بیٹی پر ڈال دے۔“

”لیکن سائیں میں تو باباجی کے پاس اپنی بیٹی کے لیے آئی ہوں پھر پانی کی بوتل میرے لیے کیوں۔“

سکھاں نے حیران ہوتے ہوئے مجاور سے دریافت کیا۔

”اومائی باباجی کو سب پتا ہے لیکن اب عشاء ہو گئی ہے اب وہ کسی سے نہیں ملتے۔ تو یہ پانی پی اور جیسا کہا ہے ویسا کر۔ تیری بیٹی کا تین دن کا چلہ ہو گا تجھے درگاہ پر ہی رہنا ہو گا۔ اگر منظور ہے تو بیٹھو ورنہ جا اپنا کام کر۔ ہمارا

شیم نہ ضائع کر۔“

”ناراض نہ ہوں سائیں سرکار! میں تین دن بیٹھوں گی۔ اپنی بیٹی کے ساتھ۔“

مجاور بغیر کوئی جواب دے کر ہلاتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ سکھاں آہستہ آہستہ اپنی جگہ واپس آگئی۔ شانتی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ وہ بھی اس کے قریب ہی

خاموشی سے بیٹھ گئی۔ نہایت عقیدت و احترام سے پانی کی بوتل کا ڈھکن کھولا اور آہستہ آہستہ سارا پانی پی گئی۔

صرف آخری ایک گھونٹ بچا لیا اور یہ گھونٹ اس نے شانتی کے سر پر ڈال دیا اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ

وہیں جگہ بنا کر لیٹ گئی۔

”حق ہونے کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور پھر وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔“

☆☆☆

علاقے میں نیا تھا نیدار آیا تھا جو کئی دنوں سے چندر کو تنگ کر رہا تھا۔ وہ چندر کے تمام غیر قانونی دھندوں سے واقف ہو چکا تھا۔ جس کی بنا پر چندر کو بہت سی

مشکلات پیش آرہی تھیں۔ اس کا دباؤ چندر پر بڑھتا جا رہا تھا۔ پیسے کے ساتھ ساتھ اس کی اور بھی ڈییمانڈ بہت

تھیں۔ جنہیں وہ وقتاً فوقتاً پورا کرنے کی کوشش کرتا تاکہ اس کا دھندا ماند نہ پڑے۔

ویک اینڈ شروع ہوتے ہی اس انسپکٹر کے پاس ایک لڑکی بھیجنا ضروری ہوتا جس کے لیے چندر کے کارندے جمعرات والے دن اچھی طرح

کام کرتے اور کوشش کرتے کہ مال جتنی جلدی ہو سکے

ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے تاکہ وقت پر کام نہ ہونے کی صورت میں وہ انسپکٹر کی ممکنہ مداخلت سے بچ سکیں۔

چندر کی خانقاہ کے اندر ایک خفیہ راستہ تھا۔ وقت ضرورت وہ وہاں سے ایسے نکلتا کہ کسی کو علم بھی نہ ہونے

پاتا اور جب بھی ایسا ہوتا مریدوں پر عام تاثر یہ دیا جاتا کہ باباجی غائب ہو گئے ہیں اور اس کے زیر اثر اس کی

مریدی میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا، جس کا فائدہ خانقاہ میں موجود ہر فرد کو ملتا۔ ابھی بھی وہ اندر بیٹھا چرس کے سونے

لگا رہا تھا جب اس کا خاص الخاص مجاور اندر داخل ہوا اور چندر کے گھٹنوں کے پاس آن بیٹھا۔

”کام ہو گیا؟“ چندر نے ہلکی سی آنکھیں کھول کر اپنے سامنے بیٹھے مجاور سے سوال کیا۔

”جی باباجی مال پہنچ گیا ہے“ مجاور اس کا سوال سمجھ چکا تھا اس لیے آہستہ سے بولا۔

”حق اللہ!!“ جو اب چندر نے ایک زوردار نعرہ لگایا جس کے جواب میں باہر بچتے گھٹکھروؤں کی آواز تیز ہو گئی۔

☆☆☆

جانے کتنا وقت لگا سکھاں کو ہوش کی دنیا میں واپس آتے۔ کون سا دن اور کیا ناٹم تھا، ہوش میں آتے ہی اسے سمجھ نہ آیا۔ وہ تو یہ بھی بھول گئی کہ اس وقت وہ کہاں

ہے۔ اپنا چکر اتا سر تھام کر وہ مشکل اٹھ بیٹھی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے اپنی ٹانگیں لمبی کیں اور گہری سانس

کے ذریعے ہوا کی آکسیجن کو اپنے اندر اتارا، ساتھ ہی گھٹکھرو اور ڈھول کی تیز آواز اس کے کانوں سے

ٹکرائی۔ وہ جیسے یک دم ہوش میں آگئی۔

”شانتی..... شانتی۔“ شانتی کی تلاش میں اس نے یہاں وہاں نظر دوڑائی۔ وہ کہیں نہ تھی۔ سکھاں یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”شانتی۔ میری بیٹی کہاں ہے ٹو؟“ شور بہت تیز تھا، کانوں پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ایسے میں کوئی

سکھاں کی آواز کیا سنتا۔ وہ سب کو دھکے دیتی آگے پہنچ گئی جہاں ایک میلہ سا لگا تھا۔ تیز روشنی میں دھمال ڈالتے

لوگ اور وقفے وقفے سے ابھرنے والے نعرے، کوئی تیز بوبھی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔



عورت اس کا منہ سوتھکتے ہوئی ٹھنٹھ مار کر ہنس دی۔  
 ”جمعات چار دن پہلے تھی۔“ سکھاں اس عورت کو  
 قطعی نظر انداز کرتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑائی۔

”میں چار دن بے سدھ رہی اور میری شاتی کیس  
 غائب ہو گئی۔“ اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر  
 مسل ویا۔

”شاتی!!“ وہ حلق کے بل چلائی۔ محققہ روؤں کی  
 آواز اس کی چیخ تلے دب گئی۔ ”شاتی میری بچی  
 شاتی!!“

اس دفعہ اس کی چیخ پہلے سے زیادہ ہولناک تھی۔  
 یکدم سارا شور تھم گیا۔ اس پل بھرے کے اندر بیٹھے چندر  
 کے کان میں آنے والی چیخ نے اسے بے چین کر دیا۔ وہ

جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔  
 دروازے پر پڑا پردہ اٹھا کر باہر دیکھا۔ جہاں ایک  
 طرف رش جمع تھا۔ باقی سارا شور شرابا تھم چکا تھا۔

ایک مجاور سے دروازے پر کھڑا دیکھ کر وڑتا ہوا آیا۔  
 ”اس لڑکی کی ماں نے باہر ہنگامہ مچا دیا ہے۔“

وہ چندر کے کان کے قریب بولا۔ چندر نے کوئی  
 جواب نہ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا مجھے کے قریب  
 آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی سارا رش چھٹ گیا۔ لوگ  
 دور دور ہو گئے۔

”باباجی کی عبادت میں خلل پڑ گیا۔ عبادت چھوڑ کر  
 باہر نکل آئے۔“ مختلف آوازیں اس کے کانوں سے  
 گزرائیں جن پر توجہ دینے بنا وہ نیچے فرش پر بیٹھی مین کرتی  
 بوڑھی عورت کے پاس آن بیٹھا۔

”اماں۔“ اس کے ہونٹوں سے سرسراہٹ آواز نکلی۔  
 ”میری شاتی۔“ اماں روتے ہوئے ایک ہی نام  
 دیکار رہی تھی۔ اس پر ہر چیز واضح ہو گئی وہ خاموشی سے اٹھ  
 کھڑا ہوا۔

”اسے میرے ہجرے میں لے آؤ۔“ مجاور کو حکم دینا  
 تھکے تھکے قدموں سے وہ واپس آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں  
 اس کے ہجرے میں اس کی ماں اس کے بالکل سامنے بیٹھی  
 تھی، یہ جانے بنا کہ اسی کے سامنے بیٹھا بڑے بڑے بالوں  
 والا یہ شخص اس کا ایتنا بیٹا ہے۔ وہ بڑی طرح رورہی تھی اور  
 چند سر جھکانے ایسے بیٹھا تھا جیسے شاتی مر گئی ہو۔

چرس یہ یقیناً چرس کی بو تھی جو اکثر چندر کے پاس  
 سے آئی تھی۔ یہاں وہاں شاتی کیس نہ تھی۔ کولو والی جگہ  
 پاتھر دم غرض اس نے ہر جگہ چھان ماری تھی۔ اب وہ گھبرا  
 اٹھی اور ناپتے ہوئے ایک مجاور کو جا پکڑا۔

”میری بیٹی آئی تھی یہاں میرے ساتھ وہ کہاں  
 گئی۔“ نشے میں دھت مجاور اس کی بات سمجھ نہ سکا اور اسی  
 طرح وقتے وقتے سے ناپتا نعرے مارتا گیا۔

”کیا بات ہے اماں۔ پیچھے ہو کر جائے گی۔“ کسی  
 نے اسے دھکا دے کر پیچھے کیا۔ سکھاں کا دل بری طرح  
 گھبرار ہا تھا۔ رش شور شرابا اور بے شکم آوازوں نے اس  
 کا سر پھر سے بھاری کر دیا۔

”یہ کیا وقت ہوا ہے؟“ پاس کھڑے لڑکے کو اس  
 نے کندھے سے ہلاتے ہوئے سوال کیا۔

”تین بج گئے ہیں اماں۔“ اس کا مطلب وہ آٹھ  
 گھنٹے سوتی رہی۔ اتنی دیر میں شاتی کہاں گئی۔

”کیا ہوا اماں کسی کو ڈھونڈ رہی ہو۔“ اسے یہاں  
 وہاں نظر دوڑاتے دیکھ کر اس لڑکے نے دوبارہ سوال کیا۔

”میری بیٹی شام میرے ساتھ آئی تھی۔ مجھے جانے  
 کیا ہوا، ایسی نیند آئی کہ کئی گھنٹے سوتی رہی۔ اب جاگی تو  
 شاتی جانے کہاں گئی۔ کتنی دیر سے ڈھونڈ رہی ہوں۔ مل  
 کے ملی نہیں دے رہی۔“ بات کرتے ہوئے اس کی نگاہ

اسی چادر والی عورت پر پڑی جس کے کہنے پر اس نے  
 مجاور سے لے کر پانی پیا تھا۔ وہ بھاگ کر ہانپتی کا پانی اس  
 کے پاس جا پہنچی۔

”میری بیٹی تھی نارات میرے ساتھ۔ تم نے دیکھی  
 تھی نا، وہ نہیں مل رہی، جانے کہاں گئی۔“

”کون سی بیٹی؟ اور میں نے کہاں دیکھی تھی؟ میں تو  
 چار دن بعد ابھی ابھی یہاں آئی ہوں۔“ قطعی اجنبی لہجہ  
 میں وہ عورت حیرت سے بولی۔

”ہفتے بعد..... لیکن کل جمعات کی نذر میں تم وہاں  
 میرے ساتھ بیٹھی تھیں۔“ سکھاں حیران ہوتے ہوئے  
 بولی۔

جمعات کل نہیں۔ چار دن پہلے تھی۔ آج تو باباجی کا  
 عرس ہے مائی۔ جمعات کو گزرے تو کئی دن ہو گئی، تو نے  
 کوئی سونا شونا تو نہیں لگایا ہوا۔“

آگے، جہاں پہنچتے ہی چندر نے رو رو کر انہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ جسے سننے کے بعد مولوی صاحب نے اسے کچھ نہ کہا، نہ کوئی لعنت ملامت کی اور نہ ہی کوئی سخت الفاظ بولے۔ کہا تو صرف اتنا کہا۔  
”میری صرف اتنی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اب ہدایت کا راستہ نصیب فرمائے۔“

یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے تھے کہ جو چندر کے لیے راہ نجات ثابت ہوئے اور واقعی میں ہی وہ صداقت پا گیا۔

مولوی صاحب کے حسن سلوک نے اس کے دل کو یکسر تبدیل کر دیا۔ مولوی صاحب کی درخواست پر بابا جی کی درگاہ بھی بند کر دی گئی۔ جہاں سے غائب ہونے والے بابا جی آج بھی لوگوں کے لیے باعث عقیدت تھے۔ آہستہ آہستہ گزرتے وقت نے اس کے دل پر جی ساری میل دھو دی، اور اس کا دل بالکل آئینے کی طرح صاف شفاف ہو گیا۔

☆☆☆

کلمہ پڑھنے کے ساتھ ہی چندر کا نام عبدالرحمن اور شائقی کا فاطمہ تجویز ہوا جبکہ اماں سکھاں بنا اسلام قبول کیے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔

عبدالرحمن نے قاری صاحب سے نہ صرف قرآن شریف پڑھا بلکہ دینی علوم کا مطالعہ بھی کیا اور پھر مولوی صاحب کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی اصل محلہ اپنی مشکلات لے کر ان کے پاس آنے لگے، جسے وہ کتابوں کی مدد سے حل کرنے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سوہنار ب جسے چاہے بخش دے اور اس کا دل ایمان سے بھر دے۔ جسے چاہے اپنی پکڑ میں لے لے اور ہر عبادت کے باوجود ان کے دلوں کو ایمان سے خالی کرتا جائے۔ یہ میرے رب کی مشیت ایزدی ہے جسے بے شک وہی جانتا ہے۔ ہم تو صرف سوچ سکتے ہیں جانے کب کسی کو وہ بخش کر اپنے پیارے بندوں میں شامل کر لے۔ یہ اس کا اختیار ہے اور ایسے وہ کئی کافر دل لوگوں کو بدلتا ہے اور ان کے دل ایمان سے بھر جاتے ہیں۔ بے شک میرا سوہنار ب ہر چیز پر قادر ہے۔“

☆☆☆

☆☆☆

اجزی ہوئی شائقی نے گھنٹوں بنے سزاٹھا کر اپنے سامنے موجود شخص کو دیکھا۔ اتنے دنوں سے وہ جو عذاب بھگت رہی تھی اس میں اسے سارے چہرے ایک جیسے ہی لگنے لگتے تھے۔ کسی چہرے میں کوئی فرق نہ تھا۔ سب کے سب بڑے بڑے ذاتوں والے خون پیتے بھیڑیے تھے۔ اس وقت وہ چہرہ بھی ایک خون خوار بھیڑیے کا تھا جو یکا یک تبدیل ہو گیا۔ اس نے شائقی کے سر کو ایک چادر سے ڈھک دیا۔ اس کے سر پر رکھا اسی انجان شخص کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ شاید رو بھی رہا تھا۔ اور پھر کچھ دیر بعد ہی رات کے اندھیرے میں وہ شخص شائقی اور سکھاں کو لیے خفیہ راستے سے باہر ایسے نکلا کہ دوبارہ کسی نے اس خالقہ میں موجود بابا جی کو نہ دیکھا۔

☆☆☆

قدم قدم گھسیٹتا چندر اپنی ماں اور بہن کے ساتھ بالکل بے آسرا روڈ پر تنہا کھڑا تھا۔ اپنا ماضی ایک بار وہ پھر سے پیچھے چھوڑ کر آ گیا تھا، جب اس کی ملاقات مولوی دین محمد سے ہو گئی اور وہ اسے ساتھ لیے اپنے گھر آ گئے۔ جس کا راستہ مسجد سے ہو کر گزرتا تھا۔ چند ہی دنوں میں رک گیا۔

”میں غیر مسلم ہوں مولوی صاحب۔“ اپنے چہرے پر موجود داڑھی سے دوسروں کو دھوکا دینے والا مسجد میں جھوٹ بول کر داخل ہونے کی ہمت خود ہی نہ پارہا تھا۔  
”میں جانتا ہوں لیکن یہ خدا کا گھر ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں داخل ہو کر تمہارا دل بھی اپنے گناہوں سے تاب ہو جائے۔“ مولوی صاحب دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔

”ہم ناپاک لوگ ہیں مولوی صاحب۔ ایسے پاک گھر میں داخل ہونے کے اہل نہیں۔“ شائقی روتے ہوئے بول رہی تھی۔

”میں تمہیں اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں بیٹا، مسجد نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ میرے گھر کا راستہ اللہ کے گھر سے ہو کر نکلتا ہے۔“ وہ شائقی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے بولے اور پھر ان کی تھلید میں وہ سب مسجد کے برابر والی پٹی لگی سے نکلتے مولوی صاحب کے گھر

READING  
Section



## دو کوڑی کی عورت!

عقلیہ حق

خاص نمبر کے لیے، ایک بہت خاص داستان حال بہت خاص مصنفہ کی جانب سے

ملازمین! ابھی ابھی حل نہیں ہو سکتا۔ پتا ہے شہریار ہماری بیگم کی ہر دوسرے دن محلے کی خواتین کے ساتھ سنی فونک کا نفرنس ہو رہی ہوتی ہے اور اب جتنا ہوتا ہے۔ کیا ماسی آگنی؟

خواتین خوش نہیں ہیں شاید ایک دوسرے کو کال نہیں کرتیں لیکن مسئلہ ملازمین پر ڈیفنس کی خواتین کا اتحاد اور پگنگت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

میں نے آلیٹ کو فورک میں پھنساتے ہوئے اپنے کزن شہریار سے کہا جو کہ اسلام آباد سے چند دن کے لیے میرے گھر آیا ہوا تھا اور قبہہ مار کر ہنس دیا۔

”خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ بیباں پر ماسیاں تنگ بھی تو بہت کرتی ہیں، اب تم خود سوچو شہریار۔ میرے گھر آ کر ایک ماسی جو خود نیکم کالونی میں رہتی ہے اور ماسیاں اس کا کباڑ کا ٹھیلا لگاتا ہے کہہ رہی ہے کہ اوفوہ باجی یہ جو آپ نے لاؤنج میروں کبھی ٹیشن میں سیٹ کیا ہے۔ اس سے پھر آ رہے ہیں۔ اور مجھے پھروں کی عادت نہیں ہے۔ اب بتاؤ میرے گھر میں تم کو کوئی پھر نظر آیا۔ تم ہی بتاؤ۔ میں اس کو رکھوں گی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک اور آئی محترمہ کہتی ہیں باجی روٹی میں پکاؤں

مجھے ایسا لگا جیسے ساتوں آسمان دھڑ دھڑ مجھے آگرے ہوں..... اور اُن کے نیچے میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا ہو۔ میں نے سامنے لگے قد آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھا، میری آنکھوں میں وحشت تھی اور شرمندگی بھی۔

میں نے چہرے پر پھیلتا تھوک محسوس کیا اور پھر جب سے رومان نکال کر کیک پاتے ہاتھوں سے اس ان دیکھے تھوک کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے لگا۔ جو میرے چہرے پر نہیں تھا لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ میرے عکس نے مجھے ٹھوکا مارا۔ میرا ضمیر مجھ پر ہنسا۔ تو میں نے اپنے آپ سے آنکھیں چراتے ہوئے۔ اپنے وجود کے اندر شہر مچاتے طوفان کو دبانے ہوئے۔

اپنے آپ کو جھلاتے ہوئے۔ آہنگی سے۔ اتنی آہنگی سے کہ آواز مجھ تک نہ پہنچ پائے۔ اور کہا؟

☆☆☆

”بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں نے سارا دن کے لیے رکھی ہے۔“ تابندہ نے سر جھکائے پوچھا لگاتی ہوئی ملازمہ کی طرف دیکھتے ہوئے آہنگی سے کہا۔ ”یا اللہ آج پھر ماسی“

”ویسے ایک بات ہے آپ خواتین کا مسئلہ

چوٹی سے نکلے، گردن سے سانپ کی طرح لینے بال اور گردن سے نیچے کمر تک آتی موتیوں سی گندھی پسلیوں کی لڑی، جو کہیں کہیں سے بھگتے بلاؤز کو سحر انگیز بنا رہی تھیں۔

اس کا چہرہ کیسا تھا۔ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی کمر کیسی تھی میں سحر زدہ تھا، میں فطرتاً عاشق مزاج مرد تھا، خدا نے مجھے دولت کے ساتھ ساتھ ایک پرکشش شخصیت بھی دی تھی اور اس پرستم بالا دل..... میں عورتوں کو بخوبی سمجھتا تھا۔ میں گفتگو کے انداز سے عورت کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا۔

کچھ لوگ دنیا میں بہت شاندار نصیب لے کر آتے ہیں۔ تابندہ کودیکھ کر میں اکثر سوچتا تھا۔ تابندہ بے حد خوب صورت اور نالدار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سادہ تھی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور اعتبار بھی۔ بے چاری روایتی بیوی۔

گی میں نے کہا۔ ہاں کہنے لگی اور برتن۔ میں نے کہا۔ برتن بھی تم دھوگی۔ کچن بھی صاف کروگی اور ڈسٹنگ بھی کروگی۔ تو کہنے لگی ٹھیک ہے لیکن آپ صبح گاڑی بھیج کر مجھے بلوائیں گی اور ڈرائیور سے گھر واپس بھجوائیں گی۔ میرے تو یقین کر دتے بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا۔ بیگم صاحب آپ کا نکاح نہ کروادوں میں اپنے میاں سے۔

اس وقت میں نے چوکیدار سے کہا۔ اس کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔ اور آپ سن رہے ہیں نا۔“ تابندہ نے مجھے مخاطب کیا۔

لیکن میں اس کی سن ہی کب رہا تھا۔ میری نظر میں تو اس پتلی سی کروالی لڑکی پر جیسے ٹھہر ہی گئی تھیں۔

سفید زودھیا کمر جو سیاہ کاشن کے بلاؤز سے جھلکتی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ موبنی سی بالوں کی چوٹی، جو اس نے پیچھے سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھی ہوئی تھی۔

Downloaded From  
Paksociety.com



READING  
Section



گا۔ میں اس کے باپ کا نوکر ہوں۔ نا۔ جو اس کے باپ کے کاروبار کے لیے دن رات ایک کر دوں گا۔ میرے اندر کڑواہٹ گھٹنے لگی۔

اس وقت تابندہ مجھے زہر لگ رہی تھی۔ سیدھی چوٹی باندھے پھیلے بدن کو کپڑوں میں سمیٹنے کی ناکام کوشش کرتی روایتی بیوی۔

میرے منہ کا مزہ بگڑنے لگا۔ میرے آس پاس شامکہ مہک رہی تھی۔ اس کے بال، ابھی تک میرے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں اس کے ہونٹ لگتا ہے۔

”لگتا ہے آپ بہت تھک گئے ہیں۔“ میری خاموشی پر تابندہ نے محبت سے کہا تو جیسے میں ہوش میں آ گیا۔

”ہاں تابی۔۔۔ محنت تو کرنا ہوگی نا۔ آخر تمہارے ڈیڑی اس قدر مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔“ میں نے چہرے پر مصنوعی محبت کا خول چڑھاتے ہوئے اس عورت سے کہا۔ جو نکاح کے دو بولوں سے بندھی صبح سے میرے انتظار کر رہی تھی اور سب سے بڑی بات فیکٹریاں ابھی تک اسی کے نام تھیں۔

☆☆☆

”یہ بڈھا کون ہے؟ میں نے لان میں پودوں کو پانی دیتے اس کزور بدن بوڑھے کو دیکھتے ہوئے تابندہ سے پوچھا۔ دراصل میں بہت مصروف رہتا تھا۔ تو گھر کے تقریباً سارے ہی معاملات تابندہ دیکھتی تھی۔

کس کو رکھنا ہے؟ کس کو نکالنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ کس کو بلانا ہے؟ یہ بھی کوئی نیا ملازم تھا۔ ”یہ سویرا کاشوہر ہے۔“ تابندہ کا لہجہ لا پر دا تھا۔

”سویرا۔۔۔ سویرا کون؟ میں سویرا نام میں الجھ گیا۔ اتنا میٹھا نام۔۔۔ میرے ہونٹ میٹھے ہو گئے۔

ارے آپ بھول گئے۔ ہاں ظاہر ہے آپ مصروف بھی تو رہتے ہیں۔ وہ میری نئی ماسی۔۔۔ جس کو میں نے سارے دن کے لیے رکھا تھا۔“ تابندہ نے یاد دلایا۔

سیاہ بلاؤز پر پسینے کی لڑیاں۔ اور سفید کمر کا وہ خم

”آپ نے گھر پر کہہ دیا کہ آج آپ لیٹ آئیں گی۔“ میں نے اپنی خوب صورت ٹائپسٹ سے کہا۔ اس کی بہن کی شادی کے لیے قریضہ منظور کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور اثبات میں سر ہلاتی مجھے اور بھی خوب صورت لگی۔

دراصل میں تو آفس میں نوکری ہی خوب صورتی اور۔۔۔ کیا کہوں آپ خود سمجھو وار ہیں کس وجہ سے دیتا ہوں۔ میں عورتوں کا گھاگ شکاری تھا۔ شامکہ کوئی پہلی لڑکی نہیں تھی۔ درجنوں لڑکیوں کی مجبوریوں کو میں خرید چکا تھا۔ اس دنیا میں چیزوں کے ساتھ ساتھ ہر انسان کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے۔

میں بہت پنڈسم، ویل میزڈ اور گرینس فل مرد ہوں، گوکہ میرا تعلق ڈل کلاس سے تھا لیکن اس کے باوجود مجھے بھی اپنی قیمت کا اندازہ تھا۔ اور میری قیمت تھی۔ تابندہ۔

گروڑ پتی باپ کی اکلوتی۔ معصوم، سیدھی سادی بیٹی۔ میرا شمار ان خوش قسمت مردوں میں ہوتا ہے کہ زندگی ان کے اشاروں پر چل رہی ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ بیوی بھی۔۔۔

شامکہ ایک لوہڑ متوسط طبقے کی خواہشوں اور ضرورتوں میں ڈوبتی لڑکی تھی۔۔۔ چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو حسرت بنا کر وہ میرے سامنے آنکھڑی ہوتی تھی۔ اور اس کی خواہشوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے بعد۔ خواہش بھی نکلیا۔ چند ڈیزائنر کے سوٹ، ایمپورٹڈ شووز، فائینو اسٹارز ہوٹل میں ڈنر۔

اس بیوقوف کو تو اپنی قیمت بھی نہیں معلوم تھی۔ سو آج وہ میرے ساتھ جا رہی تھی۔ اور میں اس کا ڈرائیور تو نہیں تھا نا۔ میں، میں تھا۔ حیدر جمال۔

☆☆☆

آپ بہت کام کرنے لگے ہیں۔ اپنی صحت کا خیال کریں۔ تابندہ جو بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ رات کے ڈھائی بجے میرے گھر آتے پر فکر مندی سے بولی۔ اسٹوڈنٹ عورت!

میں حیدر جمال رات ڈھائی بجے تک کام کروں

مجھے یاد آ گیا۔ اودہ میرے منہ سے نکلا۔

”اچھا..... اچھا.....“ میں سنبھلا اور لاپرواہ انداز میں کہا۔ بہت ہی آجھی ہے۔ بے شک۔ میرے دل نے کہا۔

”بہت محنتی ہے تو میں نے اس کو رات دن کے لیے رکھ لیا ہے۔ پیچھے کو اثر بھی دے دیا ہے۔“

اودہ گھر میں موتیا مہک رہا ہے اور میں لاعلم رہا۔ میرے دل نے دہائی دی۔ تابندہ مجھے تفصیلات بتا رہی تھی لیکن سفید کمر کا خم مجھے کچھ اور سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

دراز قد..... ساڑھی میں کسا کسا بدن..... ماڈلز کو شرماتا فیکر۔ تراشیدہ لبوں پر جی ایک پرسکون مسکراہٹ۔ سفید مخروطی انگلیوں پر دکتی مہندی۔

وہ چائے لے کر اندر آ رہی تھی۔ اور میرے اندر نکا حیدر جمال مجھے گالیاں دے رہا تھا کہ میرے گھر میں۔ میرے گھر میں ایک شاہ کار موجود ہے اور میں اس سے محروم۔

”عبداللہ سویرا کامیاں ہے۔ مالی کام کرتا ہے۔ میں نے دونوں میان بیوی کو نوکری دے دی ہے۔“ تابندہ کی آواز مجھے دور خلا سے آتی محسوس ہوئی۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا۔ اس آسان شکار کو شکار کیسے کیا جائے۔ وہ چائے میز پر رکھ کر جا چکی تھی اور میں تصورات کی آوازوں میں اڑ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ ادھر چل پھر رہی ہوتی تو اس کا وجود میرے بازوؤں میں چل رہا ہوتا۔ وہ کچن میں مصروف ہوتی اور اس کے بال میرے شانوں پر بکھر رہے ہوتے۔ وہ برتن دھور رہی ہوتی۔ اور اس کی ساڑھی کا پلو میرے ہاتھ میں ہوتا۔ وہ فرش پر پونچھا لگا رہی ہوتی۔ اور اس کے وجود کی گرمی مجھے دبکا رہی ہوتی۔ تابندہ سو رہی تھی۔ اور سویرا اپنے کوارٹر میں تھی۔

اور رات کے ڈھائی بجے ٹیرس میں بے چین ٹہلتے ہوئے میں اپنے خیال سے کھیل رہا تھا بلکہ کسی ماہر کرتب والے کی طرح بہت ساری ڈوریاں اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا تھا اور ازخو و لطف لے رہا تھا۔

ابن کے بوڑھے اور لاغر شوہر کو دیکھ کر میری خوشی

کی انتہا نہیں رہی۔ میرے خیالات میں شکار تک رسائی آسان تھی۔

وہ ملازم تھی۔ ایک غریب عورت۔ جس کو غربت اور حالات نے کسی دوسرے کے گھر کا سا بھان دے دیا تھا۔ میں جن عورتوں میں گھرا رہتا تھا، ماڈرن خوب صورت تعلیم یافتہ خوشبوؤں میں بسی عورتیں۔ اُن عورتوں کے آگے وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ 5000 روپے میں سارے گھر کا کام کرتی معمولی درجے کی عورت لیکن بعض عورتیں خواہش بن جاتی ہیں۔ اتنا کی تسکین کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اور جب بہت زیادہ پیاس لگی ہو تو پھر آدی یہ نہیں سوچتا کہ پانی منزل ہے یا نل کا۔ بس وہ پیاس بجھانا چاہتا ہے اور میں بھی.....

☆☆☆

”یا اللہ آج آپ کو کیسے خیال آ گیا۔“ تابندہ نے حیرت اور مسرت کے ساتھ اپنے سامنے لگے کپڑوں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

آج بہت عرصے کے بعد میں اس کے لیے لان کے کچھ سوٹ خرید کر لایا تھا۔ عموماً اپنی خریداری وہ خود ہی کرتی تھی۔ لیکن بہت ساری بیویوں کی طرح اس بات کا ہمیشہ گلہ کرتی تھی کہ میں اس کے لیے شاپنگ نہیں کرتا۔ اور اس کی یہ شکایت بھی اس کی بہت ساری شکایتوں کی طرح میں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے دوکانوں کا میں اپنی دانست میں بالکل صحیح استعمال کر رہا تھا۔

”اور یہ“..... تابندہ کے ہاتھ میں گلابی آرکٹڈی کی ساڑھی تھی۔ تابندہ ساڑھی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں خاموش رہا۔ پتلی کمر پر کسا ہوا سیاہ بلاؤز اور بہتے پانی پینے کی وجہ سے جگہ جگہ سے گیلا ہوتا، چمکتا ہوا بلاؤز۔ میرے خیالوں میں لہرانے لگا۔

”حیدر جمال۔ یہ ساڑھی کیوں لائے ہیں۔ میں اس طرح کی سوتی ساڑھیاں تو نہیں باندھتی۔“ تابندہ نے دوبارہ تفصیل سے پوچھا۔

یہ ساڑھی میری جان تمہارے لیے نہیں ہے۔ یہ تمہاری مامی کے لیے ہے۔“ میرا انداز لاپرواہ تھا۔



ماسی کے لیے؟ کون سی ماسی کے لیے؟ تابندہ حیرت سے گویا ہوئی کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں ملازمین کو زیادہ لفت نہیں کروانا تھا۔ کجا کر ان کے لیے کچھ خرید کر لاتا۔

ارے وہی..... جس کا بڈھا سامیاں ہے۔ اس کے لیے کیا نام ہے اس کا؟ میں جان بوجھ کر انجان بنا ورنہ اس کا نام تو مجھے اپنے نام سے زیادہ اچھا لگتا تھا اور یاد رہتا تھا۔ جو اس کو ایک بار دیکھ لے۔ پھر وہ ساری زندگی اس کو اور اس سے وابستہ کسی بھی چیز کو بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

”اچھا..... اچھا آپ سویرا کے لیے لائے ہیں۔ چلیں اچھا کیا۔ بے چاری وہی دو ساڑیاں لپیٹے پھرتی تھی۔ میں دوں گی تو خوش ہو جائے گی۔ بلکہ میں اس کو ابھی دے دیتی ہوں۔“ تابندہ نے اس کو آواز دیتے ہوئے مجھ سے کہا۔ بیوی اگر خوب صورت ہو، مالدار بھی ہو تو عموماً مرد کو اس سے محبت ہو ہی جاتی ہے لیکن خوب صورت اور مالدار ہونے کے ساتھ ساتھ اگر یہ خوف بھی ہو تو پھر مرد کو اس سے عشق ہو جاتا ہے اور مجھے بھی تابندہ سے عشق ہو گیا ہے۔

”بہت مہربانی صاحب۔“ سویرا نے ہاتھ میں پکڑی ساڑی کو دیکھتے ہوئے خوشی سے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ساری زندگی اترا پنہنے والی۔ اس عورت کو کہاں ایسی ساڑی بھی نصیب ہوئی ہوگی؟ لیکن اس ساڑی کی قیمت۔ کیا ہے وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا۔ میں تو صرف اس کی طلب محسوس کرنا چاہتا تھا۔ خواہشوں کی ڈبی ہوئی۔ حسرتوں کی ماپ کھائی ہوئی عورت..... بڈھے کے ساتھ رہتی ہے۔ لاغر..... لاغر..... ہر وقت کھانستا بڈھا۔ مجھ جیسے وجیہہ، مالدار، خوشبوؤں میں بے مرد نے تو بھی اس کی طرف دیکھا تک نہیں ہوگا۔ میں اپنی اڑانوں میں تھا؟

کیا وہ بھی یہی چاہتی ہے؟ کوئی میرے اندر سے سوال کر رہا تھا۔ ”ہاں میں جانتا ہوں۔ اس کی مسکراہٹ بتاتی ہے۔ اس کی چال سمجھاتی ہے۔ وہ بھی وہی چاہتی ہے جو میں چاہتا ہوں۔“

میں نے اپنا دفاع کرتے ہوئے اپنے ضمیر کو تسلی دی۔ لیکن کب؟ میرے اندر سے کسی نے پھر سوال کیا۔ اس کا فیصلہ بہت جلد ہو جائے گا..... اس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ میں تو جس عورت کو ایک دفعہ نظر بھر کر دیکھ لوں وہ خود بخود میری طرف پھینچی چلی آتی ہے۔

گوکہ تابندہ اچھی تھی۔ لیکن روز، روز گھر کے کھانے سے میرا دل اکٹا گیا تھا۔ کبھی کبھی اکثر مجھے باہر کے کھانے کی طلب ہوتی۔ اور میں اپنی طلب۔ اپنی بھوک مٹاتا رہتا۔ آپ لوگ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں کیسا خراب مرد ہوں۔ بے وفاء ہر جانی، ایک شریف عورت کو دھوکہ دینے کے ساتھ ساتھ۔ بہت ساری عورتوں سے کھیل رہا ہوں۔

جو بہت اچھی تھی اس کو میں نے گھر میں قید کر لیا۔ نکاح کے دو بولوں کی پھٹکڑیاں اس کے پیروں میں ڈال دیں اور کبھی کبھی اپنی محبت سے بھی اس کو نوازا دیتا ہوں۔ لیکن یہ عورتیں، یہ عورتیں بھی تو میرے ساتھ برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ تو صرف میں ہی خطا کار کیوں؟ اور میں۔ یعنی حیدر جمال۔ میں تو ایک حسن پرست آدمی ہوں اور ایسی حسین عورت میری گھر کی جھاڑو لگا رہی ہے۔ نہیں، نہیں میں برواشت نہیں کر سکتا۔ میں اکثر سویرا کو کسی نہ کسی کام کے لیے پکارتا رہتا اور وہ بھاگ بھاگ کر میرے کام کرتی۔ میں تابندہ کے ذریعے اکثر اس کی مدد کرتا رہتا اور وہ میری احسان مند رہتی۔

”سویرا آپ کی بہت عزت کرتی ہے۔“ تابندہ نے ایک دن مجھ سے کہا۔

میرنی عزت کرنے لگی ہے۔ ارے عزت و زنت کیا۔ یقیناً مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ بوڑھے لاغر مالی کی بیوی۔ دو کوڑی کی معمولی عورت۔ میرے اندر کے کینے اور منکبہ مرد نے ایک عورت کو میسے کے ترازو میں تولا۔

میں تابندہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس کو کیا پتا میں کیا سوچ رہا تھا۔ میں موقع کے انتظار میں رہنے لگا..... اور۔

☆☆☆

”بھئی اس عورت کو منح کریں۔ یہ مجھے بھائی مت کہا کرے۔“ میں نے جھنجھلا کر تابندہ سے کہا۔

میں اس کی بھائی بھائی کی ترٹ سے تنگ آ گیا تھا۔  
”تو کیا ہوا؟ تابندہ حیران ہوئی۔

تھا۔ میری تو سوچیں کھول رہی تھیں۔

☆☆☆

”تم تھک نہیں جاتیں۔“ میں نے کچن میں برتن دھوتی۔ سویرا سے شہد ٹکاتے لہجے میں پوچھا۔

”نہیں صاحب تھکنا کیسا۔ ہم تو اسی طرح بیٹے ہیں۔ ہاں اگر ہم کام نہیں کریں گے تو تھک جائیں گے۔“ کہتے ہوئی وہ مسکرا دی۔ اس کے گالوں میں پڑنے والے ڈیپل نے اس کو اور حسین بنا دیا۔

اس کی مسکراہٹ عام سی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے اندر کا انسان کہہ رہا تھا۔ یہ عام عورت نہیں ہے۔ بہن ہے۔

کیا میرا دل سچ کہہ رہا تھا۔ جتنا نہیں۔

☆☆☆

یہی تو ہوتے ہیں۔ اگر آپ جیسے ہوں درست خریدار نہ ہوں تو عورت کیوں بازار میں جا بیٹھے لیکن یاد رکھیے۔ بازار میں کھڑی مجبور اور کبھی بے بس عورت اور گھر میں چھپی بیٹھی عورت میں اکثر بہت فرق ہوتا ہے۔

آپ نے کیسے سوچ لیا کہ آپ یہ فرق مناسکتے ہیں؟ ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہونے والے دوسری عورت کو ہوں زدہ نظروں سے دیکھنے والے

کیا مطلب کیا ہوا؟ اب میری یہی تو اوقات رہ گئی ہے۔ ہر کوئی مجھے بھائی۔ دولہا بھائی کہتا پھرے۔ میں ہر ایرے غیر کو اجازت نہیں دے سکتا۔ جس طرح اور ملازمین مجھے صاحب کہتے ہیں۔ یہ بھی صاحب کہے۔“ میں نے غصے میں تابندہ کو جھڑک دیا۔

ایسا تو نہ کہیں۔ ایسے بڑے بڑے بول نہیں بولتے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔ خیر میں اس کو منع کر دوں گی۔ وہ تو آپ اس کا اتنا خیال رکھتے ہیں تو وہ بھی آپ کو بھائی کہنے لگی۔“ تابندہ نے منہ بنا تے ہوئے مجھے ٹوکا۔ دراصل تابندہ بہت ہی سادہ عورت تھی، غرور اور تکبر سے دور۔

یہ خوف، احمق عورت تو کیا میں اس کا خیال اپنی بہن سمجھ کر رکھتا ہوں۔ لاحول و لا قوۃ بہن تو اللہ نے مجھے دی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری نہ میری بہن ہے اور نہ ہی میں سمجھتا ہوں۔

مجھے بھوک مٹانی ہے اور یہ عورت میرے لیے چیخ بیتی جا رہی ہے۔ اتنا نائم تو مجھے کبھی نہیں لگا۔ تابندہ نہ جانے کیا کیا بول رہی تھی۔ میں سن کب رہا

## سچی کہانیاں میں شائع ہونے والا لازوال ناول 'ناشور' کتابی شکل میں دستیاب ہے

قدیم علوم کا سائنٹیفک نظریہ

ان کے ذاتی تحریرات اور اصل حقائق و اثرات  
سجادت و محبت کا حساب، خیرت و تجسس پر مبنی ناول

تحریر: شازی سعید مغل

## ناشور

۲۵۰ صفحات

Postage  
Rs 50

برصغیر میں علم تنجیر کے بانی حضرت کاش الہرنی کی  
عالمیت و کمالیت، روحانیت، محبت، تقویٰ اور دوسری دنیا  
کے تحریرات و مشاہدات پر مبنی اس کتاب کے نئے راز کھول ایک  
عمرانگیر ناول جس کے مرکزی کردار حضرت کاش الہرنی "بنام"

"ناشور" ہیں

ابھی رابطہ کر کے اپنی کاپی بک کرادیں یا اپنے قریبی بکسٹال پر اپنا آرڈر بک کروائیں۔

Auraq Publishers, Ibrahim market, PIB Colony, Karachi 74800





اب مرد بے غیرت اور وحشی ہوتے ہیں۔

دفتر سے گھر چلا آیا۔ اور آتے ہی سویرا کو اسٹڈی میں چائے لانے کو کہا۔ اور پھر۔

میں نے سامنے دیوار پر لگے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔ اور ایک دفعہ پھر چہرے پر پھیلتا تھوک پونچھا۔

اب تو گوشت خور جانور اور جنگلوں میں بسکنے والے تنگ دھڑنگ آدم خوروں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ جن کے پاس نہ تہذیب کی روشنی پہنچی ہے اور نہ ہی دین کی..... اگر میرا شوہر بوڑھا ہے، بیمار ہے، تو یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں آپ کی طرف راغب ہو جاؤں گی۔ زندگی میں جسموں کے تعلق کے علاوہ بھی کوئی تعلق ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کیا جانو۔ آپ نے وہ حدیث نہیں سنی کہ اگر عورت اپنے شوہر کے گھر۔ مال اور شہر کی حفاظت کرتی ہے تو جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ جن سے جا بے اندر داخل ہو جائے۔ آپ کیا جانو یا وفا عورت کتنی قیمتی ہوتی ہے اور اس کا کیا مقام ہوتا ہے۔

”وو کوڑی کی عورت۔ میں نے اپنے اندر کی خجالت کو مٹاتے۔ چھپاتے اور ضمیر کے ہتھوڑوں کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔

”واہ کیا بات ہے۔ کیا کلاس ہے تمہاری۔“ آئینہ ہنسانہ ہی تابندہ بے وقوف عورت ہے اور نہ ہی سویرا دو کوڑی کی ہے۔ دونوں عورتیں عظمتوں کا وہ مینار ہے جہاں تم جیسے دو لگے کے مرد کی نگاہ بھی نہیں جاسکتی۔ لیکن.....

میں عبد اللہ سے محبت کرتی ہوں کیونکہ وہ محبت کے قابل ہے۔ وہ میرا ہے۔ میرے علاوہ کسی اور عورت کو دیکھتا بھی نہیں ہے۔ شام کو سوگی رونی اچار کے ساتھ اگر مجھے کھلاتا ہے تو خود بھی وہی کھاتا ہے۔ پانچ نام سجدے میں گر کر اللہ سے میرے لیے خوشیاں مانگتا ہے۔ میں اس مرد سے بے وفائی کروں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جو عورتیں جیسے مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنتی ہیں۔ میرے نزدیک میک آپ میں لتھڑی خواہشوں کی گند پھیلاتی۔ مکروہ چہرے اور قابل نفرت کردار والی وہ عورتیں قابل رحم ہوتی ہیں۔

ہاں تم ہو۔ تم ہو۔ دو کوڑی کا مرد۔ دو کوڑی کا مرد۔ آئینہ چنچا۔

پھر کمرے میں موجود ہر چیز۔ چیخنے لگی۔ غصہ کرنے لگی، مجھے پتھر مارنے لگی۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں ہلان ہونے لگا۔ سویرا ہرا جا چکی تھی کمرے سے، شاید گھر سے بھی۔ لیکن کمرے میں موجود آئینہ، میز، کرسی، ٹیلی فون، صوفہ، کتابیں سب مجھ پر پتھر برسانے لگے۔ لفظ دو کوڑی سے مجھے سنگسار کرنے لگے۔ میں چیخنے لگا۔ میں رونے لگا۔ سارا کمرہ مجھے باتیں سنا رہا تھا۔ بڑا بھلا کہہ رہا تھا۔ پتھر مار رہا تھا۔ لفظ دو کوڑی میرے آس پاس ناچ رہا تھا۔ ہنس رہا تھا، رو رہا تھا، میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اور پھر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ وہ تو کوئی شہزادی تھی۔ وہ تو ایک دکھتا ستارہ تھی، وہ دو کوڑی کی عورت نہیں ہے۔ وہ دو کوڑی کی عورت نہیں ہے۔ تو پھر۔ تو سمجھ گیا ہو گا دو کوڑی کا کون ہے۔ آئینے میں نظر آتا میرا عکس مجھ پر ہنس رہا تھا۔ کچھ جتا رہا تھا۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں سن رہا تھا۔ لفظ دو کوڑی میرے چاروں طرف ناچنے لگا۔ اور میں زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھ میں بقول آپ کہ دو کوڑی کی معمولی عورت کیسے ایسی باتیں کر رہی ہے۔ تو سن لیں۔ تابندہ باجی کو آپ کے سب کرتوتوں کا پتا ہے اور وہ مجھے کئی ہفتوں سے سمجھا رہی تھیں کہ دراصل آپ ہیں کیا۔ ارے صاحب اگر قسمت سے شریف عورت مل گئی ہے تو اس کی قدر کرو۔ میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر، اس نوکری پر۔

اس نے زمین پر تھوکا۔ اور میں نے غیر ارادی طور پر اپنا چہرہ صاف کیا۔ نہ جانے کیوں اس کا تھوک میرے چہرے پر پھیلتا جا رہا تھا۔

عبد اللہ بیمار تھا اور کوڑا لڑ رہا تھا۔ اور تابندہ سارا دن کے لیے اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ سو میں دوپہر میں

☆☆☆



# ہمارا اپنا قانون ہے بھائی



Downloaded From  
Paksociety.com

دنیا چاہے جتنی بھی ترقی کرے، شعور و آگہی کے ذریعے بھلے  
ہی ہم ناروں پر کند ڈال دیں۔ آج جب جھوٹ بولنے والی  
مشینیں ایجاد ہو چکی ہیں، الیکٹرک جیمر کے ذریعے موت کا  
طریقہ اب عام ہونے لگا ہے مگر ہم ہیں ایشیائی  
باشندے۔ ہمارا اپنا قانون اور اپنی سزائیں ہیں۔ موقع محل  
بھلے کوئی بھی ہو، ہمارا اپنا قانون ہے بھائی۔ زیر نظر تصویر  
اس سرکاری باؤشاہی کی زندہ مثال ہے۔



# ہم شکل

بے ساختہ

محکم دلائل سے مزین و متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

آخری قسط

33

خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرد ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ ان کے قصوں اور ٹوکوں سے ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے ساتھ "ہم شکل" بتائے ہیں۔ ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کر لیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو "عالی" کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے ساتھ ہم شکل والی یعنی کہ ایک اور "ہم شکل" اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ "عالی" جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط

READING  
Section

142 سچی کہانیاں





READING  
Section



سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے مشابہ ہے۔ بہر کیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس کے احسان مند ہو گئے اور شکر یہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے ساتھ ہم شکل ہوتے ہیں بس میز اول چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہم شکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہم شکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہم شکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں۔ شاہ زیب اپنے تیسرے ہم شکل عالی کے بعد وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے۔ اب شاہ زیب کی زندگی میں سیزارو آجاتا ہے۔ وہ برطانیہ کے ایک خفیہ گینگ سے منسلک ہے۔ جس نے سیزارو کو ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ ابھی شاہ زیب سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُسے کورڈی ٹکرا جاتی ہے۔ کچھ بندے اُسے زبردستی اُس جگہ پہنچا دیتے ہیں جہاں پر ڈینیل نے کورڈی کو رکھا ہوا ہے۔

اب آگے ملاحظہ کیجئے

وقت گزرتا رہا اور پھر شام کے سائے بستی میں اتر آئے، بستی میں جگہ جگہ چراغ روشن ہو گئے اور رات کی تاریکی میں وہ بستی بہت عجیب لگنے لگی، تا تو سوں کی آوازیں آرہی تھیں، گویا یہاں عبادت بھی کی جاتی تھی، یہ لوگ وقت کا انتظار کرتے رہے اور اس کے بعد جوشان کے اشارے پر اپنی جگہ سے نکل آئے، اب ان کا رخ اس خانقاہ کی جانب تھا جو دور سے اب بھی سفید نظر آ رہی تھی یہ غالباً سفید پتھروں سے بنائی گئی تھی، پتا نہیں یہاں اور بھی لوگ موجود تھے یا نہیں، دور سے چھوٹی نظر آنے والی خانقاہ اندر سے کافی وسیع تھی اور یہاں سے نیچے جانے کے لیے پتھروں میں سیزھیاں تراشی گئی تھیں جو نیچے گہرائیوں تک لے جاتی تھیں۔ ان لوگوں کی نگاہوں میں بوڑھی جاو و گرنی کی نجانے کیا حیثیت تھی، بہر طور ایک ایک قدم سنسنی خیزی کا حامل تھا، سونا ریا شوراک جانتی تھی کہ اسے بوڑھی کے سامنے جا کر کیا کرنا ہے، اور اس وقت ظاہر ہے شاہ زیب اور جوشان اس کے ساتھ نہ ہوں گے، لیکن اس بات سے جوشان واقف نہیں تھا کہ شوراک وہاں جا کر کیا کرے گی؟

یہ لوگ خانقاہ کے عقبی حصے سے اندر داخل ہو گئے، بہت سکوت چھایا ہوا تھا وہاں، اندر ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی، سامنے ہی ایک لمبی آگ کی لکیر نظر آ رہی تھی جس میں سرخ سرخ انگارے دکھ رہے تھے اور انگاروں کے عقب میں ایک محضی سا وجود نظر آ رہا تھا، یہی بوڑھی جاو و گرنی سارہی تھی، اس کے سامنے کوئی سفید سی چیز رکھی ہوئی تھی جو بیٹنی طور پر لوہان نہیں تھی، وقفے وقفے سے وہ آگ میں یہ تمام چیزیں ڈالتی جا رہی تھی اور آگ سے ہلکا ہلکا دھواں خارج ہو رہا تھا اور یہ بو اسی دھوئیں کی تھی جو بالکل ناگوار نہیں تھی، غالباً کوئی خاص قسم کی پسی ہوئی شے تھی جس سے یہ خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شوراک نے شاہ زیب کی جانب دیکھا پھر جوشان کو دیکھنے لگی اور پھر آہستہ سے بولی۔

”میرا خیال ہے آپ لوگوں کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔“

”قطعاً نہیں، ہم وہاں جانا بھی نہیں چاہتے، دیکھو ہم اس جگہ پوشیدہ ہو جاتے ہیں یہاں سے ہم وہ سب کچھ بھی دیکھ سکیں گے جو تم کردگی اور اس کے بعد تمہاری معاونت بھی کرتے رہیں گے“

جوشان نے جس جگہ کا انتخاب کیا تھا وہ واقعی یہاں سے دور نہیں تھی اور جوشان اور شاہ زیب نہ صرف یہاں سے شوراک کی کاروائی دیکھ سکتے تھے بلکہ اس کی آواز بھی سن سکتے تھے اور یہ جگہ محفوظ بھی تھی چنانچہ دونوں اس جگہ پوشیدہ ہو گئے۔ شوراک دبے قدموں چلتی ہوئی آگ کے پیچھے جا کھڑی ہوئی، یہاں داخل ہونے سے پہلے

READING

144

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اس نے وہ لباس بھی پہن لیا تھا جسے جوشان اپنے ساتھ لایا تھا کیونکہ اسی لباس میں شوراک کو بوڑھی جادوگرنی کے سامنے پیش ہونا تھا اور بلاشبہ اس وقت آگ کے پس منظر میں کھڑی ہوئی شوراک کوئی آسمانی دیوی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ زیب نے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی تمکنت ایک عجیب سا وقار دیکھا تھا اور دل ہی دل میں اس بات کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ شوراک عام لڑکیوں سے مختلف ہے۔ بہر حال ان دونوں کی نگاہیں شوراک ہی پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر دفعتاً بوڑھی ساریہ نے بہت سی خوشبو آگ میں ڈالی اور اس بار بلند ہونے والا دھواں بہت زیادہ تھا، اس کے ساتھ ہی ساریہ نے اپنے سامنے پڑے ہوئے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بجانے شروع کر دیئے۔ وہ بڑی دیوانگی کی کیفیت میں پتھروں کے یہ ٹکڑے بجا رہی تھی اور اس کے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں، شاہ زیب نے ان آوازوں کو سنا تو سہمی لیکن سمجھ نہیں پایا جبکہ جوشان کے انداز میں ایک عجیب سی حیرت پیدا ہو گئی تھی۔ شاہ زیب نے سرگوشی کے انداز میں اس سے اس حیرت کی وجہ پوچھی تو وہ آہستہ سے بولا۔

”جانتے ہو بوڑھی ساریہ کیا کہہ رہی ہے؟“

”جانتا تو تم سے پوچھتا“ شاہ زیب نے کہا۔

”وہ کہہ رہی ہے اے مقدس خوشبو۔۔۔ اے مقدس ہواؤ۔۔۔ اے جلتی ہوئی آگ، اے چمکتے ہوئے تاروں، اے جلمکاتے ہوئے چاند۔ اے پتھر۔۔۔ مجھے بتاؤ۔۔۔ میرا خواب پورا ہو گا یا نہیں جو کچھ میں نے کہا وہ ممکن ہے یا نہیں، ہاں یہ میرے لیے آخری لمحات ہیں میں زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہوں، اگر مقدس ملکہ کو میں اپنے دعوے کی تصدیق پیش نہ کر سکتی تو بدنام ہو جاؤں گی میرا جادو کا کارہ تر ارد یا جائے گا اور مجھے جھوٹا کہا جائے گا، میں چاہتی ہوں کہ میرا سچ ثابت کر دو، مقدس ہواؤ۔۔۔ میرا سچ ثابت کر دو، میں جھوٹی مرنا نہیں چاہتی، اے میرے سامنے سچ دو، مجھے حکم دو مقدس ہواؤ کہ میں اسے کہاں تلاش کروں، آہ یہ لمحات میرے لیے بے حد قیمتی ہیں، اگر میں اسے پاگئی تو زندگی پاؤں گی ورنہ مرنے کے بعد بھی میری روح ان چٹانوں میں جھنکتی پھرے گی۔“

شاہ زیب کو یہ الفاظ بے حد عجیب محسوس ہوئے تھے، اس کا مطلب تھا کہ بوڑھی اس لمحے خاص طور سے اس بات کی توقع کر رہی تھی کہ شوراک اس کے سامنے آجائے گی، بوڑھی نے ایک بار پھر سامنے رکھا خوشبودار اٹھا لیا اور اس میں سے خوشبو انکاروں پر ڈالنے لگی، تب ہی شوراک کے منہ سے ایک آواز نکلی وہ مدہم لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی اور یہ زبان، یقینی طور پر مقامی تھی، اس بار بھی جوشان کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار ابھرے تھے۔

”ارے ارے یہ لڑکی یہ زبان جانتی ہے۔؟“

شاہ زیب جواب دیئے بغیر ادھ دیکھتا رہا، جیسے ہی شوراک کے منہ سے الفاظ نکلے، بوڑھی ساریہ دیوانہ وار کھڑی ہو گئی، اس نے اپنے دونوں ہاتھ سیدھے کئے اور دہکتے ہوئے انکاروں پر رکھ دیئے، اس کے چہرے سے سرت پھوٹ رہی تھی، تب ہی شوراک نے تیزی سے آگے بڑھ کر بوڑھی جادوگرنی کے دونوں ہاتھ انکاروں سے ہٹالے اور بوڑھی کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی، وہ اپنی زبان میں کچھ کہہ رہی تھی۔ شاہ زیب کے پوچھنے پر جوشان نے اسے بتایا۔

”آہ آگئی تو ہواؤں کی بیٹی تو آگئی، ملکہ زاوی مجھے یقین تھا تو آئے گی، آہ وقت نے مجھے سچا ثابت کر دیا، ساریہ کے لیے اس سے حسین موقع زندگی میں کبھی نہیں آیا تو آگئی میری بیٹی، تو نے میری لاج رکھ لی“ اس نے آگے بڑھ کر شوراک کو سینے سے لگا لیا۔ شوراک اس کے جلمے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی بوڑھی نے پھر کچھ کہا اور جوشان نے شاہ زیب کو اپنی زبان میں بتایا



”آہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے جا رہی تھی، میں سوچ رہی تھی کہ جموٹی ہونے کے بجائے میرا مر جانا بہتر ہے، یہ زخم کچھ نہیں ہیں، یہ کچھ بھی نہیں ہیں، تو آگئی مجھے زندگی کی ساری خوشیاں مل گئیں، لوگو شیکال کے لوگو۔۔۔ تمہاری ملکہ تمہارے درمیان آگئی، سارے سچ بولتی ہے اور تم یہی کہنا کہ سارے سچ تھی، میرا سارا جادو اسی وقت کے لیے تھا، آمیری بچی، میں اعلان کرادوں میں بتادوں کہ مقدس ملکہ ہمارے درمیان آگئی ہے، شیکال کے سونے والو، آج کی رات سونے کی نہیں جاگنے کی رات ہے۔ جشن منانے کی رات ہے۔“

بوڑھی سارے دیوانہ دار اچھل رہی تھی، اس کے کمزور بدن میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی وہ شورا ک کا ہاتھ پکڑے ہوئے ایک جانب بھاگی۔ جوشان اور شاہ زیب یہ اندازہ نہیں لگا پائے تھے کہ وہ اسے کہاں لیے جا رہی ہے ویسے یہ باہر جانے کر راستہ نہیں تھا بلکہ کچھ بلندی کچھ میڑھیاں ہی تھیں جسے عبور کرنے کے بعد وہ کسی مخصوص جگہ پہنچ گئی، یہاں سے یہ لوگ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے، جوشان نے شاہ زیب کا بازو دباتے ہوئے کہا۔

”تمہاری دوست نے تو کمال ہی کر دیا، وہ اس سے افریقی زبان میں بات کر رہی تھی، میں اس کے الفاظ تو نہیں سن سکا، لیکن بوڑھی کا انداز یہی بتاتا تھا جیسے اس نے شورا ک کی آمد کا اعلان سنا ہو۔“

شاہ زیب نے خاموشی ہی اختیار کر رکھی تھی، البتہ اب یہ لوگ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے یہ لوگ اس تمام صورت حال کا نظارہ کر سکیں۔ بہر حال یہ لوگ بھی میڑھیاں چڑھنے لگے، میڑھیاں بلندی تک گئی تھیں، لیکن ایک راستہ درمیان سے کٹا تھا اور وہ ایک چٹان پر جا کر ختم ہوتا تھا، ابھی یہ لوگ چٹان تک نہیں پہنچے تھے کہ بوڑھی سارے کی آواز ابھری، جبکہ جوشان شاہ زیب کا مترجم بنا ہوا تھا، بوڑھی کہہ رہی تھی۔

”شیکال کے سونے والو، سب سے ہو، مونا بہتر نہیں ہے جاگو کہ جاگنے والی رات آگئی، آؤ اس خانقاہ کی طرف اور سارے کے سچ کی تصدیق کرو اور سنو تمہاری دیوی تمہارے درمیان آگئی ہے، دیکھو میں تمہارے سامنے اپنا سچ پیش کر رہی ہوں۔“

اس کی کمزور آواز اس قدر نہیں تھی کہ بستی تک پہنچ جاتی، چنانچہ اس نے کچھ اور کارروائی کی اور چند ہی لمحات کے بعد ایک بھیا تک آواز فضا میں گونجنے لگی، یہ زسنگھے کی آواز تھی، غالباً کسی بہت بڑے زسنگھے کو پھونکا جا رہا تھا اور اس آواز کے اثرات بستی والوں پر فوراً ہی ظاہر ہو گئے، بستی کے زیادہ تر لوگ سوچے تھے روشنی بجھ گئی تھیں، لیکن زسنگھے کی مسلسل گونجنے والی آواز سے لوگ جاگنے لگے تھے اور ہر گھر میں روشنی ہوتی جا رہی تھی، لوگ اس زسنگھے کی آواز کو کسی آفت کا پیش خیمہ سمجھے تھے، پھر آہستہ آہستہ لوگوں کو جمو پیڑوں سے نکلنے ہوئے دیکھا گیا، وہ ٹڈی دل کی طرح اپنے اپنے جمو پیڑوں سے باہر نکل کر ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کر رہے تھے، بہر طور یہ لوگ سکتے کی سی کیفیت میں جائزہ لیتے رہے، جوشان بھی بالکل خاموش اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ رہا تھا، جہاں تک نگاہیں کام کر رہی تھیں وہاں تک انسان ہی انسان نظر آ رہے تھے، پھر کچھ مشعلیں تیزی سے خانقاہ کی طرف دوڑتی ہوئی نظر آئیں اور جوشان نے شاہ زیب سے کہا۔

”بہتر ہے کہ تھوڑی سی آڑ میں ہو جاؤ، اس وقت سب کی نگاہیں اسی طرف لگی ہوئی ہیں، ہم سے تھوڑی بلندی پر ہونا ابوڑھی کے ساتھ موجود ہے۔“

شاہ زیب نے جوشان کی بدلتی ہوئی نظر پر عمل کیا آنے والے گھوڑوں پر سوار تھے، ان کی تیز رفتاری سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ وہ بستی کے دوسرے سرے سے آ رہے تھے اور ان کے لیے راستہ چھوڑا جا رہا تھا، جوشان نے آہستہ سے کہا۔

”ہو سکتا ہے ان آنے والوں میں یہی مونا بھی شامل ہو۔“

شاہ زیب اور جوشان ان لوگوں کو دیکھتے رہے، چھ گھوڑے سوار تھے ساتواں سوار ان سے کسی قدر آگے

گھوڑے پر سفر کر رہا تھا، تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے بالآخر اس راستے پر آگئے جہاں سے خانقاہ کی سیڑھیاں آتی تھیں اور پھر شعلوں کی روشنی میں اس قد آور عورت کو دیکھا گیا جو گھوڑے سے اتر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی، بقیہ چھ افراد بھی اس کے عقب میں چلے آ رہے تھے، یہ عورت میسی سوناٹا کے علاوہ بھلا اور کون ہو سکتی تھی، رات کی تاریکی میں اس کے خدو خال تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس کی چال میں بڑی مستعدی تھی اور وہ تیزی سے خانقاہ کی سیڑھیاں عبور کرتی ہوئی اوپر آ رہی تھی۔

اوپر سے بوڑھی چیخ رہی تھی۔ ”شیکال کی ملکہ دیکھ ساریہ نے تیری عزت رکھ لی، دیکھ ساریہ نے اپنا کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا، دیکھ اس کے سچ کی تصویر تیرے سامنے ہے، ساریہ جھوٹ نہیں بولتی، شیکال کی ملکہ مقدس دیوی تیرے سامنے آگئی۔ تیری بیٹی میرے پاس موجود ہے، اپنی رفتار میں تیزی پیدا کر۔“ اور اس کے بعد وہ غالباً اس راستے سے نیچے اترنے لگی جس سے چڑھ کر وہ اوپر پہنچی تھی۔

شاہزیب اور جوشان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ پھر اس جگہ پہنچ جاتے جہاں سے ان واقعات کا نظارہ اور تجزیہ کیا جاسکتا، تاہم انہوں نے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں سے کدی نہ کسی حد تک کچھ نہ کچھ تو نظر آئے۔ پھر میسی سوناٹا سیڑھیاں عبور کر کے خانقاہ کے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ چہرے کا کروفر وقار اور جملکت بالکل جوانوں جیسی تھی اور انداز سے ہی پتا چلتا تھا کہ وہ کسی قبیلے کی ملکہ ہے۔

میسی سوناٹا تیزی سے آگے بڑھی شورا کی طرف کے ساتھ تھی اور اس کے چہرے پر جذبات کے سائے لرز رہے تھے۔ اس کا چہرہ انکارے کی طرح سرخ ہو رہا تھا بہت طویل ترین عرصے کے بعد نجانے کتنے عرصے کے بعد اس نے اپنی ماں کو دیکھا تھا، لیکن اس کے جذبات اس کی محبت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی، میسی سوناٹا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیٹی کو دیکھا وہی چہرہ، وہی سب کچھ اور اس کے بعد اس کے دونوں ہاتھ پھیل گئے اور دوسرے لمحے وہ دونوں ایک دوسرے میں پھوست ہو گئی تھیں۔ ان کے منہ سے طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں اور اس کے بعد وہ منظر بھی دیکھا گیا جس کا مطلب شاہ زیب بخوبی سمجھ گیا تھا لیکن مسٹر جوشان حیرت زدہ تھے۔

میسی سوناٹا نے شورا کی پشت پر ہنہ کر دی اور مشعل لے کر اس پر کچھ دیکھنے لگی، اس کے بعد ایک زبردست چیخ کے ساتھ شورا کو دوبارہ سینے سے لگایا تھا۔ شورا نے ایک مرتبہ شاہ زیب سے تذکرہ کیا تھا کہ اس کی پشت پر ایک نشان ہے جو غالباً اس کا خاندانی نشان ہے، اس نشان نے شورا کی تمام مشکل حل کر دی تھی، میسی سوناٹا بے اختیار اپنی بیٹی کو سینے سے لگائے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ آنے والے مودب نظر آ رہے تھے۔ پھر بوڑھی ساریہ اور میسی سوناٹا کے درمیان کچھ مکالموں کا تبادلہ ہوا اور اس کے بعد میسی سوناٹا شورا کو لے کر واپس پلٹ پڑی۔ بھی شورا کی آواز زور سے ابھری۔

”مخافظ روحو! میرے محسنو۔۔۔ میرا انتظار کرنا اور تم پر لازم ہے کہ تم اپنا تحفظ کرتے رہو، لیکن زیادہ وقت نہیں گزرے گا جب میں تمہاری مشکل آسان کر دوں گی اور یہی بہتر ہے کہ یہ جگہ چھوڑنے کی کوشش نہ کرنا تاکہ میں تمہیں آسانی سے پالوں۔“ یہ الفاظ اس نے انگریزی میں ادا کئے تھے اور جوشان اور شاہ زیب سمجھ رہے تھے کہ یہ الفاظ ان کے لیے ہیں۔

میسی سوناٹا ایک لمحے کے لیے رک کر اسے دیکھنے لگی پھر جب شورا کی خاموش ہو گئی تو میسی سوناٹا نے اسے اپنے سامنے میں لے لیا اور اس کے بعد ساریہ کو بھی اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ یہ بہتر تھا کیونکہ ساریہ کی یہاں موجودگی ان دونوں کے لیے مشکل ثابت ہو سکتی تھی، پھر وہ سب باہر نکل گئے۔

خانقاہ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ لوگ اپنے گھوڑوں کے نزدیک پہنچ گئے سوئی ہوئی آبادی پوری طرح جاگ مئی تھی اور وہ لوگ غالباً یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے کہ زنگھے کی آواز فضا میں کیوں پھیلانی گئی۔



شاہ زیب نے مسز جوشان کی طرف دیکھا جو بہت خوش نظر آ رہے تھے، انہوں نے شاہ زیب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”شاہ زیب میرے دوست ہم نے بلاشبہ بہت بڑا کام انجام دیا ہے اور تمہاری ساتھی لڑکی اداکاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی جو کچھ دیکھا گیا اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عینی طور پر اس عورت کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جائے گی کہ وہی اس کی بیٹی شورا کی ہے اور اگر اسے کامیابی حاصل ہوگی تو پھر تم دیکھ لینا کہ ہماری تقدیریں بدل جائیں گی۔“

شاہ زیب دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا، اس کے باوجود وہ ابھی مسز جوشان کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ درحقیقت وہی لڑکی شورا کی ہے، اصولی طور پر ابھی یہ مناسب نہیں تھا، جب تک کہ کوئی ایسی کارروائی نہ ہو جائے جس سے یہ اندازہ ہو جائے کہ میرا یہ انکشاف کسی طور پر نقصان دہ نہیں ہو سکتا، چند لمحات کے بعد مسز جوشان نے کہا۔

”اور وہ ہمیں ہدایت کر گئی ہے کہ ہم اسی خانقاہ میں رہیں اب دیکھو ہم پر کیا ہمتی ہے یہ لوگ اس بلند جگہ پہنچ گئے جہاں سے تھوڑی دیر قبل زنگٹھا پھونکا گیا تھا۔ یہاں سے بستی کا منظر مزید صاف نظر آ رہا تھا، گھوڑوں کی نظار چلتی جا رہی تھی اور شعلوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اب وہ کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ ویسے پوری بستی روشن ہوتی جا رہی تھی، پتا نہیں دیکھنے والوں نے کیا دیکھا۔ یہ لوگ کافی دیر تک وہاں کھڑے رہے، بستی میں مسلسل چہل پہل نظر آ رہی تھی، پھر مسز جوشان نے کہا۔“

”آؤ یہاں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرتے ہیں۔“

شاہ زیب نے مسز جوشان سے اتفاق کر لیا اور یہ لوگ نیچے اتر آئے پھر انہوں نے خانقاہ کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن کوئی ایسی چیز نہ ملی جسے غذا کے طور پر استعمال کیا جاسکتا، شاہ زیب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”وہ راہبہ کی ظاہر ہے دنیا کے عیش و عشرت سے اسے کوئی لگاؤ نہ ہوگا۔“

”لغت ہے اس پر بغیر کھانے پینے جیٹا بھی کوئی جیٹا ہے، مجھے دیکھو، میں نے کس محنت سے وہ اشیاء جمع کی تھیں، جبکہ میں بھی ایک راہبہ ہی کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا۔“ جوشان کی بات پر شاہ زیب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

”اگر سونا راہبہ میں نظر انداز نہ کرے تو پھر یقیناً بہت جلد ہمارے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔“

”خدا کرے اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔“

دونوں کچھ ٹھکن ہی محسوس کر رہے تھے چنانچہ ایک مناسب جگہ دیکھ کر لیٹ گئے لیکن نیند کا آنکھوں میں شائبہ بھی نہیں تھا ایک ڈیڑھ گھنٹہ اسی طرح گزر گیا، پھر مسز جوشان اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھے۔

”کہاں جا رہے ہیں مسز جوشان؟“

”ذرا دیکھیں باہر کیا حالات ہیں۔“

دونوں اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے باہر کا منظر دیکھا جاسکتا تھا، بستی میں وہی چہل پہل تھی، بستی والوں کو ابھی شاید صورت حال سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا، انداز سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ اصل صورت حال ابھی تک سمجھ نہیں پائے ہیں۔ ظاہر ہے اتنی جلدی شورا کی آمد کا اعلان ہو بھی نہیں سکتا تھا، اب یہ ان کے اپنے معاملات تھے، مسز جوشان تو ابھی اسی امید و بیم کی کیفیت کا شکار تھے کہ سونا راہبہ اپنی میسی سونا نا کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو بھی سکے گی یا نہیں کہ وہ شورا کی ہے۔

اگر ایسا نہ ہو تو پھر مسز جوشان کی تمام محنت اکارت جائے گی، لیکن اس کے برعکس شاہ زیب اس سلسلے میں سو فیصد یقین رکھتا تھا کہ شورا کی اپنی حیثیت منوانے میں کوئی وقت نہیں ہوگی، بلکہ اس نے یہ حیثیت چند لمحات ہی میں منوالی تھی۔ شاہ زیب نے مسز جوشان سے کہا۔

”مسٹر جوشان، اگر آپ ساری رات جاگنا چاہتے ہیں تو جاگتے رہیں، میں سونے جا رہا ہوں“  
 ”جاگنا بے سود ہی ہے، لیکن فیند کیسے آئے گی، تاہم اگر تم سونا چاہو تو سو جاؤ اگر کوئی خاص بات ہوئی تو میں  
 تمہیں جگا دوں گا۔“

شاہ زیب نے اس بات کی حای بھری اور پھر ایک مناسب جگہ دیکھ کر لیٹ گیا، اس نے تمام فکریں بھلا کر  
 آنکھیں بند کر لی تھیں اور ایک بار پھر ذہن سے خیالات کے قافلے گزرنے لگے، بہت سی سوچیں بہت سے  
 احساسات اور اس کے بعد سکون اور یہ سکون فیند آجانے ہی سے پیدا ہوا تھا۔  
 فیند بھی کیا پر لطف چیز ہے، تمام جھگڑوں تمام دوسوں سے بے نیاز کر دیتی ہے، کوئی غم کوئی پریشانی نہیں رہتی،  
 نجانے لوگ موت سے خوفزدہ کیوں ہوتے ہیں، اس ابدی فیند کے بعد تو یہ خطرہ بھی نہیں رہتا کہ صبح ہوگی اور آنکھ  
 کھل جائے گی۔

مسٹر جوشان نے نجانے رات کس طرح گزاری جبکہ شاہ زیب بڑے مزے سے دن چڑھے تک  
 سوتا رہا تھا، جاگا تو سب سے پہلے مسٹر جوشان کی صورت نظر آئی وہ کچھ پریشان سے بیٹھے ہوئے تھے، شاہ زیب  
 کو دیکھ کر چونکے اور ہراساں لہجے میں بولے۔  
 ”اب تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔“

”آپ پریشان کیوں ہیں مسٹر جوشان؟“  
 ”اس خطرے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ہو سکتا ہے تمہاری دوست ناکام ہو جائے“  
 ”آپ اس لیے پریشان ہیں؟“

”پریشانی کی بات نہیں ہے کیا، بہر حال وہ ایک لڑکی ہے بے شک ذہین ہے لیکن اس کی ذہانت ٹھکت  
 بھی کھا سکتی ہے، ایک ماں اور بیٹی کا معاملہ ہے ہو سکتا ہے وہ تجربے کا ریشمی سونا ٹاکے سامنے پہنچ کر اپنی اداکاری  
 برقرار نہ رکھ سکے۔ ایسی صورت میں خود ہمارے لیے بھی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔“ مسٹر جوشان نے پریشان  
 لہجے میں کہا۔

”اگر آپ کے ذہن میں یہ خیال تھا مسٹر جوشان تو پھر آپ کو یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا، اس کا مطلب  
 ہے کہ آپ نے خان بوجھ کر میری ساسھی لڑکی کو مصیبت میں پھینا دیا  
 ”اور نہیں غلط نہیں کا شکار نہ ہوں، بہر حال وہ ایک کوشش تھی اور اس کوشش میں کامیابی ہی ہمیں اپنے مقصد  
 میں کامیابی دلا سکتی تھی۔“  
 ”تو پھر اس کوشش کی کامیابی یا ناکامی کا انتظار کریں۔“ شاہ زیب نے جوشان کی پریشانی سے لطف اندوز  
 ہوتے ہوئے کہا۔

”تم اتنے پریشان نہیں معلوم ہوتے جتنا میں ہوں۔“  
 ”آپ کو اس سلسلے میں الجھنا نہیں چاہیے مسٹر جوشان، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جو کام آپ نے ایک غلط  
 انداز میں کرنے کی کوشش کی وہ اپنی نوعیت میں صحیح حیثیت رکھتا ہے۔“  
 مسٹر جوشان نہ سمجھنے والے انداز میں شاہ زیب کی صورت دیکھنے لگے، پھر انہوں نے آہستہ سے کہا ”میں  
 نہیں سمجھا تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”دلچسپ بات یہ ہے مسٹر جوشان کہ آپ نے جس پریشانی کا اظہار کیا وہ بے معنی ہے، چونکہ جس لڑکی کو آپ  
 نے شورا کی حیثیت سے میسی سونا ٹاکہ پہنچایا ہے اصل میں وہی شورا کی ہے۔“  
 مسٹر جوشان کچھ دیر تک شاہ زیب کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے رہے پھر انہوں نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا  
 ”تم کہنا کیا چاہتے ہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا؟“



”اگر میں آپ سے کہوں کہ جو لڑکی سونارا کے نام سے میرے پاس تھی، وہ اصل شوراک تھی اور میرا مشن بھی یہی تھا کہ اصل شوراک کو اس کی ماں کے پاس پہنچا دوں تو کیا آپ میری بات پر یقین کریں گے؟“

”تم شاید اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو، ایسا لگتا ہے جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا اس پر تم نے خود بھی غور کیا؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، اب اس کے بدلے میں آپ کو اگر میں ایک کہانی سناؤں تو آپ اس وقت بھی یہی سوچیں گے کہ میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہوں۔“

”مجھے کہانیاں سننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نجانے کیوں مجھ پر ایک بے چینی سے سوار ہو رہی ہے۔“

”آپ اس بے چینی کو رفع کریں مسٹر جوشان، حقیقت یہی ہے کہ وہ لڑکی شوراک ہی ہے اور اس کا پس منظر کچھ یوں ہے۔“

شاہ زیب نے شروع سے لے کر آخر تک جوشان کو سونارا کی کہانی سنانا شروع کر دی، وہ بے زاری کے عالم میں منہ بنائے بیٹھے ہوئے تھے اور صاف لگ رہا تھا جیسے انہیں اس کہانی پر ذرا برابر یقین نہ آیا ہو، شاہ زیب نے انہیں پوری تفصیل سنا دی تو وہ آہستہ سے بولے۔

”اچھی کہانی گھڑی ہے تم نے ویسے تمہارا کیا خیال ہے کیا میں اس پر یقین کر سکتا ہوں۔؟“

”یہ آپ کی مرضی سے مسٹر جوشان، یقین نہیں کر سکتے تو آپ پریشان ہوتے رہیں، میرے اوپر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“ شاہ زیب نے کسی قدر ناخوشگوار سی سے کہا مسٹر جوشان خاموش ہو گئے تھے اور شاہ زیب کو ان کی اس الجھن پر ہنسی آرہی تھی۔

پھر اس نے سوچا کہ ذرا باہر کا نظارہ کیا جائے کہ باہر کی کیفیت کیا ہے، ویسے شاہ زیب کا خیال یہ تھا کہ شوراک کے مل جانے کی خوشی میں قبیلے میں جشن برپا ہو جائے گا اور یقینی طور پر اس سلسلے میں خوب ہنگامے ہوں گے، بلاشبہ ایسا نہیں ہو سکا تھا اور اس کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی تھی۔

اس وقت بھی قبیلے کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ کاروبار زندگی جاری تھے۔ سب سے بڑی پریشانی کھانے پینے کی تھی، اس خانقاہ میں کچھ کھانے پینے کو نہیں ملا تھا اور ابھی تک شوراک نے بھی کوئی خبر نہیں لی تھی، ویسے اس کی اس کیفیت پر شاہ زیب کو کوفت ضرور ہوتی تھی۔

کم از کم اسے ان لوگوں کی خبر گیری تو کرنی چاہیے تھی، وہ جانتی تھی کہ شاہ زیب اور مسٹر جوشان یہاں موجود ہیں اور اسی کے رحم و کرم پر ہیں، پھر نجانے کیوں شاہ زیب کو بھی مسٹر جوشان کی پریشانی صحیح محسوس ہونے لگی، کچھ عجیب سی بات نہیں تھی، مکمل خاموشی چھائی ہوئی ہے اور کچھ ہنگامہ خیزی نہیں ہو رہی، اس کی وجہ کیا ہے۔

شاہ زیب بہت دیر تک اپنی جگہ رک کر اس صورت حال کا جائزہ لیتا رہا اور پھر ایک گہری سانس لے کر واپس پلٹ پڑا، اب وہ مسٹر جوشان سے گفتگو کرنا چاہتا تھا کہ کھانے پینے کے لیے کیا کارروائی کرنی چاہیے، ورنہ یہاں تو بھوکے ہی مر جائیں گے۔

شاہ زیب اس جگہ پہنچ گیا جہاں مسٹر جوشان کو چھوڑ کر گیا تھا، لیکن مسٹر جوشان وہاں موجود نہیں تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ بھی کہیں اندرونی حصے میں نہ گئے ہوں اور اسی خیال کے تحت اس نے مسٹر جوشان کو پکارا۔

”مسٹر جوشان، مسٹر جوشان کہاں ہیں آپ؟“ لیکن ان آوازوں کو کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔

دفعاً ہی شاہ زیب کا دل دھک سے ہو گیا، کیا مسٹر جوشان اپنی الجھنوں کا شکار ہو کر یہاں سے کہیں اور چلے گئے اگر ایسا ہوا ہے تو بہت برا ہوا، شاہ زیب پوری خانقاہ کا جائزہ لیتا رہا، لیکن مسٹر جوشان کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

البتہ اس تلاش میں شاہ زیب کو ایک ایسی جگہ دریافت ہوگئی جہاں کھانے پینے کی معمولی سی اشیاء اور پانی وغیرہ موجود تھا۔ ابھی کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ تصور بڑا جان لیوا تھا کہ مسٹر جوشان یہاں سے فرار ہو گئے ہیں۔ کہیں یہ بیوقوف آدمی کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کر دے، آخر وہ کیا کر لے گا، کہاں جائے گا، بہت دیر تک وہ مسٹر جوشان کو تلاش میں سرگرداں رہا۔

خانقاہ سے باہر آ کر بھی چاروں طرف دیکھا، لیکن مسٹر جوشان یہاں سے فرار ہو گئے تھے، شاہ زیب مجبور ہو کر واپس آ گیا اور اس کے بعد جو کچھ روکھا پھینکا وہاں موجود تھا اس سے پیٹ کی آگ بجھائی۔ پہلے مسٹر جوشان پریشان تھے اور شاہ زیب مطمئن تھا، لیکن اب شاہ زیب کی پریشانیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ دونوں ہی باتیں سوچنے کے قابل تھیں۔

یہ خاموشی کیا معنی رکھتی ہے اور اس کی وجہ کیا ہے، دوسری بات یہ کہ مسٹر جوشان کہاں گم ہو گئے، شام ہوگئی، لیکن دونوں ہی باتوں میں سے کچھ نہ ہوا، نہ ہی مسٹر جوشان واپس آئے اور نہ شورا ک کا کوئی ہنگامہ ہوا۔ رات بھی اسی خاموشی سے گزر گئی اور دوسری صبح جب وہ ٹھنڈی زمین پر گہری نیند سورا تھا دفعتاً ہی ہنگامے شروع ہو گئے۔

چاروں طرف سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں آرہی تھیں، کہیں ڈھول پیٹا جا رہا تھا اور کہیں غریبے لگائے جا رہے تھے، شاہ زیب اپنی جگہ سے اٹھا اور دوڑتا ہوا اس سوراخ پر آ گیا جہاں سے باہر کا جائزہ لیا جاسکتا تھا اور پھر شاہ زیب نے گہری سانس لی۔

یہ شور و غل خوشیاں منانے ہی کا تھا، لیکن اس کے لیے انہوں نے بڑی ہاتھ کی، شاہ زیب یہاں سے ان لوگوں کا جائزہ لیتا رہا، تمام لوگ ادھر سے ادھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور ان کے چہروں سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا، پتا نہیں یہ اتنی طویل خاموشی کیا معنی رکھتی تھی، ہو سکتا ہے یہی سونا نا قبیلوں کے امراء کو طلب کر کے صلاح مشورے کر رہے ہو، ہو سکتا ہے ابتداء میں کچھ لوگوں نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہو کہ وہ لڑکی ہی اصل شورا ک ہے اور واپس آگئی ہے اور اس کے بعد جب یہی سونا نا نے ان حالات پر قابو پالیا تو خوشیوں کا اعلان ہوا یقیناً ایسا ہی ہو سکتا ہے۔

شاہ زیب کو اب غصہ آنے لگا تھا، عجیب آدی تھا، اگر تھوڑا سا انتظار کر لیتا تو کیا حرج تھا، طویل عرصے سے تو وہ انتظار میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنے آپ کو ان لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ کر رکھا تھا اس نے، لیکن اب چند گھنٹے صبر نہ کر سکا، بہر طور اس کا مسئلہ تھا اب جو کچھ بھی اس پر بیٹے گی وہ اس کی اپنی ذمے داری ہوگی۔

وقت گزرتا رہا، ہنگامے عروج پر تھے پھر شاہ زیب نے لوگوں کو اپنے اپنے مکانات سجاتے ہوئے دیکھا، درختوں کی پتیاں چھالوں میں باندھ کر وہ گلی کوچوں میں لٹکا رہے تھے، یہ یقیناً خوشی کا اظہار تھا، وہ جشن منا رہے تھے، شاہ زیب ان کی یہ خوشیاں دیکھتا رہا اور اب اس بات پر اسے کوئی شبہ نہیں رہا کہ ان سب کو شورا ک کی آمد کی اطلاع مل گئی ہے لیکن شورا ک کی خاموشی تکلیف دہ تھی۔

پھر اس وقت شام کے ساڑھے چار بجے تھے کہ خانقاہ کے سامنے والے حصے کی میزبوں کے اوپر چند افراد آتے نظر آئے، وہ اپنے ہاتھوں میں بہت سی چیزیں اٹھائے ہوئے تھے۔

شاہ زیب نے گہری سانس لی، گویا اب شورا ک کو یہ خیال آیا کہ اس کے ساتھی اسی خانقاہ میں ہیں، آنے والوں نے اندر آنے کے بعد وہ اشیاء ایک جگہ رکھ دیں اور پھر اپنی زبان میں شاہ زیب کو آوازیں دینے لگے، شاہ زیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کے سامنے جائے یا نہ جائے۔

بہر طور تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی جگہ سے نکل آیا وہ کھانے پینے کی اشیاء کی طرف اشارہ کر کے شاہ زیب سے کچھ کہہ رہے تھے، شاہ زیب نے مسٹر جوشان کی ہدایت کے مطابق خود کو گونگا ظاہر کرتے ہوئے اشارے



سے گردن ہلا دی تھی۔

وہ لوگ خاموشی سے واپس چلے گئے، تب شاہ زیب نے کھانے پینے کی اشیاء کی طرف دیکھا، لیکن یہ سب کچھ شاہ زیب کو اچھا نہیں لگ رہا تھا، اصولاً شاہ زیب کو فوراً ہی وہاں طلب کر لیا جانا چاہیے تھا جہاں شوراک موجود تھی لیکن اس سلسلے میں اجتناب برتنا گیا تھا اور وہ رویہ نہیں رکھا گیا تھا جو ہونا چاہیے تھا۔

شوراک سے بات کھٹی ہوئی، لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں تھی، ساری دنیا ہی اپنے مقصد کے لیے جی رہی تھی اس نے اپنی حیثیت حاصل کرنے کے بعد شاہ زیب کو اگر نظر انداز کر دیا تو یہ کوئی ایسی بات تو نہیں تھی جو بہت ہی حیرت انگیز ہو، ٹھیک ہے ایسا ہی سہی، اس نے سوچا تھا۔

اس کے بعد چھ دن اس نے اسی خانقاہ میں گزاری تھی، پھر ساتویں رات اس سارے مرحلے کے لیے فیصلہ کن بن گئی، شاہ زیب کو میسی سوناٹا کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

”مسز شاہ زیب، بیرونی دنیا سے آنے والے مردوں کو یہاں آنے کے بعد قتل کر دیا جاتا ہے اور بہت عرصے کے بعد میں اپنے ہی احکامات سے انحراف کر رہی ہوں، صرف اس بنیاد پر کہ تم نے میری بیٹی کو یہاں تک پہنچانے کے لیے بڑی محنت کی ہے، لیکن رات کی تاریکیوں میں تمہارا یہاں سے نکل جانا ضروری ہے، ورنہ دن کی روشنی میں اگر قبیلے والے تم تک پہنچ گئے تو تمہارا پچھتاوا مشکل ہو جائے گا۔ اور ہاں ایک بات اور سنو اگر تم کسی خزانے کے حصول کی خواہش مند ہو تو اس علاقے میں ایسا کوئی خزانہ نہیں ہے، یہ صرف روایتی باتیں ہیں۔

ہاں تمہاری خدمات کے اعتراف میں یہ چھوٹا سا نذرانہ دے رہی ہوں جو تمہاری دنیا کے لیے بہت قیمتی ہوگا۔“

شوراک نے اپنے لباس سے ایک بری کی تھیلی نکالی اور اس کا مٹہ کھول کر شاہ زیب کے سامنے الٹ دیا، آٹھ قیمتی ہیرے تھے اور اس کے ساتھ ہی کچھ سونے کے بہت سے ٹکڑے تھے جن کا مجموعی وزن کافی بن جاتا تھا، میسی سوناٹا نے پروقار لہجے میں کہا۔

”نوجوان میرے تجربات بہت تلخ رہے ہیں اس لیے تم اب زندگی بھر شوراک سے نہیں مل سکتے، ہیرے یہ دو آدی تمہیں بتائیں گے کہ تمہارا آگے کا سفر کس انداز میں ہوگا۔“

دنیا کے رنگ ڈھنگ ہر جگہ نمایاں ہیں چاہے وہ صحرائے اعظم افریقہ کا کوئی حصہ ہو یا پھر نیویارک سٹی، انسانی سوچ پر جگہ یکساں ہے، اپنے بارے میں نہ سوچو تو حالات کے دھارے کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے اور انسان خود اپنا نہیں رہتا۔

شاہ زیب کی جیسی یہی کیفیت تھی، اس کی اپنی جستجو نہیں تھی، بس وقت کے دھارے میں بہتا کہیں سے کہیں نکل آیا تھا کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا، لیکن کبھی کبھی زندگی کا رخ بدلنے کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے اور وہ رات ایک نئے فیصلے کی حامل تھی، اس نے مہذب افریقہ کے ایک ہوٹل کے کمرے میں دادی اماں کو خواب میں دیکھا خاموش کھڑی تھیں چہرے پر اداسی رقصاں تھی،

”کیا بات ہے دادی اماں۔“ اس نے پوچھا۔  
”واپس آ جا شاہو بس بہت ہو گئی واپس آ جا۔“

اور وہ جاگ گیا، اچانک جیسے ذہن کے بہت سے پردے کھل گئے، ان کے پیچھے ماضی سجا ہوا تھا، گھر بھائی بھابھیاں اور جان دینے والی دادی اماں، میں ان کے دور کیوں ہوں کیا مشن ہے میری زندگی کا، یہ در بدری کیوں ہے، کیا کرنا ہے مجھے، کیوں کرنا ہے میرا گھر سے ایک اطمینان بخش زندگی ہے اس گھر کی، پھر سوال سوال سوال۔۔۔

بہیں سے ذہنی رد بھنگ گئی، اسٹیئرنگ گھوم گیا، رخ بدل گیا ذہن تھا اعلیٰ کارکردگی کا مالک تھا، کس کس کے لیے کیا کیا کرتا رہا تھا، اب اپنے لیے کچھ کرنا تھا اور کامیابی سے کرنا تھا، اب اس کا رخ اپنے وطن کی طرف تھا، بہت سی یادیں تھیں اور ان یادوں میں ایک خوبصورت چہرہ بھی تھا۔

کجری۔۔۔ جس نے اس سے وعدہ کیا تھا اور جب پرندے دن بھر کے بعد اپنے گھونسلوں کا رخ کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں پیار کے خزانے ہوتے ہیں اور وہ اپنے مسکن کے لیے دھکتے ہیں وہاں ایک چہرہ ہے دو آنکھیں ہیں جو ملن کی آس میں کھلی ہوئی ہیں۔

کجری اس کے ذہن میں آئی تو اس نے تھوڑا سا رخ بدل لیا کجری کا گاؤں جوں کا توں تھا ماسٹر صاحب نے اسے پہچان کر ہکا بکارہ گئے۔

”تم آگئے۔“

”ہاں یہاں میں ایک قیمتی خزانہ چھوڑ گیا تھا۔“

”کونسا خزانہ؟“

”کجری۔“

”وہ بڑی مسجد کے حجرے میں رہتی ہے اللہ والی بن گئی ہے، ہر مرض کی دوا ہے اس کے پاس اور وہ تمہارے بارے میں بتاتی رہتی ہے۔“

”میرے بارے میں۔“ شاہ زیب حیرت سے بولا۔

”ہاں اس نے بتایا تھا کہ رجب کا مہینہ ہوگا جب تم آؤ گے اور یہ رجب کا مہینہ ہے اور میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“

”میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

”بس بڑی مسجد کے حجرے میں چلے جاؤ۔“

”آج تو رجب ہے میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ اس نے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور قدرت کی

عطا کا ایک دروازہ کھلا، رب العزت نے اپنے محبوب کے لیے کائنات بنا دی تو محبت کو جذب کا مقام کیوں نہ حاصل ہوتا شاہ زیب بڑے بڑے خطرناک حالات سے گزرا، لیکن اس نے اس پر چھائیں پر کبھی غور بھی نہ کیا ہوگا جو کجری کے سچے پیار کا محافظ سایہ تھا اور جس نے اس کے خلاف ہر دشمن کو ناکام کیا۔

”میں جانتی تھی کہ تم آ جاؤ گے۔“

”تیار ہو جاؤ، ہمیں گھر چلنا ہے۔“ شاہ زیب نے کہا۔

یہ دن اس گھر کی امید تھا جب شاہ زیب اور کجری وہاں داخل ہوئے تھے۔

دادی اماں نے اسے گلے لگا کر کہا ”دعا مانگی تھی میں نے تیرے لیے اور میرے دل نے مجھے تسلی دے کر

بتایا تھا کہ میری دعا بارگاہ ایزدی میں قبول ہوگی۔“

اللہ نے ایک کائنات اپنے محبوب کے لیے بنائی اور دوسری کائنات اپنے بندوں کے دل میں آباد کی جس

میں وہ خود رہتا ہے، میں نے اس سے تیری سلامتی مانگی اور میرے دل میں بیٹھے خدا نے مجھے سکون دے کر بتایا کہ اس نے میری دعا قبول کر لی ہے۔

”مجھے کینئر نہیں ہے دادی اماں۔“

”ہو بھی نہیں سکتا تھا۔“

”مگر ایک مشکل ہے۔“

”کیا؟“

”مجھے میرے چہرہ ہم شکل مل گئے، ساتواں نہیں ملا۔“

دادی اماں پوری کہانی سن کر خوب ہنسیں اور بولیں ”یہ قوف ساتوں ہم شکل تو خود ہے“

”ایں۔“ شاہ زیب حیران رہ گیا۔

(ختم شد)



ہم شکل جیسے عظیم ناول کے بعد

ایم اے راحت کا ایک اور معرکہ آراء شاہ کار

## ”زرک لومڑی“

دہکتے ہوئے رخسار، چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں،

دلکش تراش کے بولتے ہوئے خاموش ہونٹ کچھ کہتے ہوئے،

شاخ نازک جیسے لچکتے ہوئے بدن والی حسینہ لیکن لومڑی سے زیادہ چالاک

جس کے نشانے پر آئے ہوئے دشمن اپنی موت یقین کر لیتے تھے

## ”زرک لومڑی“

جس کے نام سے بڑے بڑے جیالے کانپ اٹھتے تھے

ایک انوکھے انتقام کی کہانی جو کسی ایک انسان سے نہیں لیا گیا

انتقام کی ایک ایسی لازوال داستان جسے قارئین کبھی نہ بھلا پائیں گے

ماہ مئی سے ”سچی کہانیاں“ کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیے

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

## تین گاہیاں

نزہت جبین ضیاء

اس مرد کا قصہ عبرت، جو بیٹوں کو مستقبل کی پونجی سمجھتا تھا

خالدہ خاتون بھی بڑی سمجھدار اور خاصی تیز قسم کی عورت تھیں۔ انھوں نے بہتر طریقے سے گھر کا نظام سنبھال لیا۔

صائمہ نے اثر پاس کیا اور ثمنینہ نے میسرک کر لیا تو صائمہ کے لیے رشتہ آ گیا۔ خالده خاتون نے مناسب دیکھ رکھے کے بعد رشتہ طے کر دیا۔ ثمنینہ بھی اچھی صورت اور اچھی سیرت کی لڑکی تھی اس کے لیے بھی اس کی دوست نے اپنے بھائی کا رشتہ دے دیا۔ لڑکا سعودی عرب میں جاب کرتا تھا۔ لڑکا اچھا تھا خاندان بھی بڑا نہ تھا اس لیے خالده خاتون نے اس کا رشتہ بھی طے کر دیا۔ اور اس کی شادی کر دی ثمنینہ سعودی عرب چلی گئی۔ عظیم نے اپنے دوست کے توسط سے کسی کمپنی میں جاب کر لی کیوں کہ دونوں بیٹیوں کی شادی کے بعد پیچھے کچھ نہ بچا تھا۔

دن ماہ و سال میں بدلتے چلے گئے۔ اس عرصے میں صائمہ کے چار بچے ہو گئے۔ اس کے شوہر نے اپنا بزنس کر لیا۔

عظیم کی شادی صاعقہ بیگم سے ہو گئی۔ صاعقہ بیگم کی ایک بیٹی ہو گئی۔ عزیز کی شادی حمیرا سے اماں نے خالص اپنی پسند سے اپنی پرانی سہیلی کی بیٹی سے کر دی اور اماں

اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مارے خوشی کے سارے ہاسپٹل کو سر پر اٹھالیں۔ بات بھی کچھ ایسی تھی ان کی منجھلی بھونے اس بار بھی مینا پیدا کر کے ہیٹ ٹرک مکمل کر دی تھی۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی بڑی بھونے صاعقہ اور چھوٹی بھونے دونوں کے یہاں بیٹیاں ہی تھیں بڑی بھونے دو اور چھوٹی بھونے ایک بیٹی تھی۔ جبکہ منجھلی بھونے کو تیسری بار بھی بقول اماں کے شیر کے جیسا صحبت مند بیٹا پیدا ہوا تھا۔ صاعقہ اور عزیز کے ساتھ تو دونوں کے شوہر عظیم اور عزیز بھی خوش تھے جبکہ عزیز میاں کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

اماں جوانی میں بھونے ہو چکی تھیں۔ شوہر کا انتقال ہوا تو بچے چھوٹے چھوٹے تھے۔ دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔ میاں سرکاری آفس میں معقول ملازمت کرتے تھے اس لیے انھیں اچھا خاصا پیسہ ملا تھا۔ سب سے بڑی بیٹی صائمہ جو اس وقت میسرک سے فارغ ہو کر کالج جانے والی تھیں۔ خدانے اسے بہت عقل اور سمجھ دی تھی اس نے اپنے ابا کے دوستوں کے ساتھ مل کر ملنے والے پیسے کو فکس ڈیپازٹ کر دیا۔ گھر اپنا تھا اس لیے کرائے کی فکر بھی نہیں تھی۔ صائمہ کے بعد ثمنینہ تھی پھر عظیم، عزیز اور سب سے چھوٹا عزیز جو اس وقت صرف چار سال کا تھا۔



کی خاص نظر عنایت اس بہو کی اوپر ہوتی تھی۔ عذیر کی شادی ہو گئی تیز سے تیز عذیر کی ذاتی پسند تھی جو ناماں تھی۔ اور پھر خدا کی قدرت کہ صاعقہ کو بھی پہلی بیٹی کے بعد حامی بھری



Section



ہوئی۔ جبکہ حمیرا کو بیٹا اور تیزین کو بھی بیٹی ہی ہوئی۔

اماں جو پہلے ہی حمیرا کو دل سے چاہتی تھیں۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد تو اور زیادہ جانے لگیں۔ یہ بات عظیم اور عزیز کو بھی محسوس ہوئی لیکن وہ چپ رہتے۔ جبکہ صاعقہ اور تیزین کو اماں کی دو نظری بری طرح کھلتی۔

ایک بار پھر صاعقہ امید سے ہوئی تو اماں نے نمازین طویل کر لیں۔ دعاؤں میں بیٹے کو مانگنا شروع کر دیا۔ لیکن اس بار بھی صاعقہ نے بیٹی پیدا کی اور اماں نے ناک چڑھائی۔ کیوں کہ دو ماہ بعد ہی حمیرا نے اماں کے ہاتھوں میں دوسرا ہنسا کھیلنا اور صحت مند ہوتا ڈال دیا تھا۔

اب تو اماں نے حمیرا کے ساتھ اور زیادہ محبتیں کرنا شروع کر دیں۔ حمیرا کے لیے گھر کے کاموں میں خاص رعایت ہوئی۔ مہمان آجاتے تو حمیرا اپنے بچوں میں مصروف ہو کر کمرے سے باہر نہ نکلتیں۔ صاعقہ اور تیزین سارے کام پھرتیں۔ ساتھ ساتھ حمیرا بیگم کے نخرے بھی اٹھاتیں۔ اس کے بچوں کو بھی سنبھالتیں۔ ان دونوں کی بیٹیاں نہ زیادہ تنگ کرتیں نہ روتیں جبکہ حمیرا کے دونوں بیٹے حد درجہ تنگ کرتے۔ اماں کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ صدقے دیے جاتے، خیرات دی جاتی، نظریں اتاری جاتی اور صاعقہ اور تیزین منہ پھاڑے دیکھتی رہ جاتیں۔

کیا یہ ان کی پوتیاں نہیں ہیں؟ ایک دوسرے سے سوال کر کے خاموش ہو جاتیں کیوں کہ اماں کے سامنے کسی کو بولنے کی اجازت کب تھی۔ اور پھر جب صاعقہ کو تیسری بیٹی ہوئی تو اس سے پہلے ہی حمیرا کو تیسرا بیٹا بھی ہو چکا تھا۔ اماں کی دعائیں تو کانوں سے ہٹ کر ہی نہیں دے رہی تھیں۔

”ہائے میرا بچہ جیسا کہ ایک تو ہے جو اپنے باپ کی نسل کو آگے بڑھا رہا ہے۔ جگ جگ جیے۔“ انھوں نے عزیز کو سینے سے لگا کر جذبات سے چور لہجے میں کہا اور صاعقہ اور تیزین کے ساتھ ساتھ عظیم اور عزیز کو بھی یہ بات اچھی نہیں لگی۔

☆☆☆

دن گزرتے رہے اماں کی دو نظری اسی طرح تھی۔ صاعقہ کو چار بیٹیاں ہو گئیں جبکہ تیزین کو دو بیٹیوں کے بعد

ایک بیٹا بھی ہو گیا۔ لیکن اماں کی محبت صرف ان تین بیٹیوں اشعر، اظفر اور منظر کے لیے وقف ہو چکی تھیں۔ وہ بچوں کو چھپا چھپا کر چیزیں کھلاتیں۔ صاعقہ کی چاروں بیٹیاں اور تیزین کے تینوں بچے حیرت سے اپنی داوی کو دیکھتے کبھی کبھار تو بچے کوئی ایسا سوال کرتے کہ اماں لاجواب ہو جاتیں اور صاعقہ اور تیزین بچوں کو ڈانٹ کر چپ کر دیتیں۔

دن مہینوں کو سالوں میں بدلتے چلے گئے اور ان سالوں میں عزیز میاں کے چار شیر بیٹے ہو گئے۔ عظیم کی چار بیٹیاں اور عزیز کے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہو گئے۔ تینوں بھائیوں کی تعلیم کوئی بہت زیادہ نہ تھی۔

اس لیے نوکریاں بھی اعلیٰ درجے کی نہیں تھیں۔ بچے بڑے ہونے لگے تو اماں کو فکر ہوئی تو عزیز کے بیٹیوں کی کہ لڑکے لڑکے ہیں اچھا پڑھ لکھ لیں گے تو آگے کے لیے بہتری ہوگی۔ عزیز کی اتنی آمدنی نہ تھی کہ بچوں کو

اچھا پڑھا سکے اور خواب تو دونوں میاں بیوی نے بیٹیوں کے حوالے ہے۔ بے تماشادیکھ رکھے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے بیٹیوں پر بہت زعم تھا۔ انھیں بیٹیوں کے ڈکھ اور مسائل سے کوئی سروکار تھا نہ دل چسپی انھیں تو بس یہ

غرور تھا کہ میرے چار چار بیٹے ہیں۔ تب اماں نے اپنے رشتے داروں میں جو جو خیر لوگ تھے چپکے چپکے ان سے عزیز کے بیٹیوں کی پڑھائی کے لئے خاموشی سے

پیسے اکٹھے کرنے شروع کیے۔ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے لگیں اور ساتھ ساتھ عزیز نے بھی لوگوں سے بیٹیوں کے حوالے سے امداد یعنی شروع کر دی۔ جبکہ عظیم اور عزیز اپنے بچوں کو پڑھا بھی رہے تھے وہ بچے اپنے

باپوں کی آمدنیوں سے خوش اور مطمئن تھے۔ ان لوگوں کو خوب سے خوب تر کی خواہش نہیں تھی۔ حالانکہ عزیز کا ایک ہی بیٹا تھا مگر کبھی بھی عزیز یا تیزین نے بیٹے کے حوالے سے کوئی بڑی بات نہ کی تھی۔ وہ لوگ شکر ادا

کرتے کہ اللہ پاک نے ایک ہی سہمی بیٹا تو دیا ہے۔ عائش بھی سمجھدار اور اچھا بچہ تھا۔ آخر کار اماں کی دعائیں بھاگ دوڑ کام آئی اور اماں کی مسکے کی رشتہ دار خاتون نے جو مالی لحاظ سے بہت مستحکم تھیں۔ ان کے شوہر بزنس میں تھے۔ انھوں نے عزیز کے چاروں بیٹیوں کی

تھا۔ ادھر عذیر کی دوسری بیٹی کی بھی شادی ہو گئی اور وہ بیاہ کر سسرال چلی گئی اور کچھ دن بعد شوہر کے ساتھ امریکہ شفٹ ہو گئی۔ اماں کا انتقال ہو گیا اور ساتھ ہی عزیز اور حمیرا نے یہ گھر چھوڑ کر پوش علاقے میں گھر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اب تو ان کے اسٹائل ہی بدل گئے تھے۔ کیونکہ منظر اور فخر نے بھی یہیں جا ب کرئی بھی پھر وہ لوگ دوسرے گھر میں شفٹ ہو گئے۔

اگلے سال اظفر شادی کے لیے آیا تو ساتھ اشعر بھی آیا کیونکہ اسے سائرہ کو اپنے ساتھ لے کر جانا تھا۔ اظفر کا پہلے سے ہی پر دگرم تھا کہ شادی کے بعد جاتے جاتے اپنی بیوی ریشم کو بھی ساتھ گھر لے جائے گا۔

عرصے تک گھر میں خوب شور ہنگامہ اور شادی کی مصروفیت رہی پھر مہینہ بعد ہی اظفر ریشم اور سائرہ گھر کو ویران کر کے چلے گئے۔

عزیز اور حمیرا کو گھر کاٹنے کو دوزخا۔ پیسے کی کمی نہ تھی۔ گھر میں نوکر بھی تھے مگر تنہائی تھی منظر اور فخر اپنی جا ب پر ہوتے یا دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا اور مصروفیت ہوتی۔

☆☆☆

اشعر کا بیٹا ہوا تھا۔ اس نے فون کر کے بتایا تو حمیرا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے کتنی خواہش تھی پوتی کی اور آج جب وہ دادی بنی تو بچے پاس نہ تھے۔ ان لوگوں نے سوچا کہ منظر کی شادی کر دیں اور پھر منظر کے لیے لڑکی دیکھ کر اس کی شادی کر دی گئی۔ ثوبیہ امیر فیملی سے تھی اور اکلوتی تھی۔ منظر کی شادی کے بعد گھر میں کچھ چہل پہل ہوئی۔ اس عرصے میں اشعر کے ہاں بیٹی اور اظفر کے ہاں جڑواں بیٹے بھی ہو گئے۔ تصویریں دیکھ کر حمیرا بہت روئی دل تڑپ رہا تھا کہ اپنی بانہوں میں ان ننھے منوں کو بھی لیں لیکن وہ کوسوں دور تھے۔ کتنی بار ان لوگوں نے آنے کے لیے کہا لیکن ہر بار اظفر اور اشعر نے صاف کہا کہ بار بار آنا آسان نہیں۔ اب اخراجات بڑھ گئے ہیں اور آپ لوگوں کو بھی تو ٹھٹھاٹ سے زندگی گزارنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اس لیے ہمیں زیادہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ حمیرا اور عزیز آنکھیں صاف کر کے خاموش ہو جاتے۔ ثوبیہ کی والدہ کی طبیعت خراب ہوئی

پڑھائی کی ذمہ داری اپنے ذمے لے لی اور عذیر کے بچے اشعر، اظفر اور فخر کی پڑھائی کی ذمہ داری کی طرف سے عزیز اور حمیرا زیادہ اماں مطمئن ہو گئی تھیں۔ بچے پڑھائی میں کچھ خاص اچھے نہ تھے۔ مگر پرائیویٹ پڑھائی کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ عزیز کی بھاگ دوڑ اور تنگ و دو بھی چل رہی تھی۔ جس سے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی اچھی جگہ نوکریوں کی فکر بھی شامل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اشعر اور اظفر نے اپنا ایم بی اے مکمل کر لیا تو ان لوگوں نے سعودی عرب جانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ عزیز میاں اور حمیرا تو شروع سے ہی اس دن کے انتظار میں تھے۔ ان لوگوں نے بیٹوں کے حوالے سے یہی خواب دیکھ رکھا تھا کہ کسی طرح ان کے بیٹے باہر سیٹل ہو جائیں۔ عزیز میاں نے سر پیر کی بازی لگادی۔ جو جہاں سے بھی باہر جانے کا ذرا سنا بھی اشارہ کرتا عزیز میاں اور حمیرا ان کے آگے پیچھے گھومتے رہتے اور اس وقت عزیز میاں کو یہ بھی احساس نہ ہوتا کہ سامنے والا بڑا ہے یا چھوٹا وہ چھوٹے کے لیے بھی اٹھ کر اس کو اپنی جگہ پر بٹھا دیتے۔ اس روز ان لوگوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اشعر اور اظفر سعودی عرب چلے گئے۔ اماں اپنے لاڈلے پوتوں کی دوری کے خیال سے جتنی آزرہ تھیں اس سے زیادہ اپنے چہیتے بیٹے اور بیوٹی اچھی اور بہترین زندگی کا سوچ کر خوش بھی تھیں۔ اشعر اور اظفر سعودیہ چلے گئے۔ ادھر عظیم اور عذیر کی بیٹیاں اور بیٹا عائش پڑھائی سے فارغ ہو کر عذیر کے چھوٹے سے بزنس میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ ایک سال بعد اشعر تو ملنے آ گیا لیکن اظفر نے اس سال آنے سے منع کر دیا تھا۔ عذیر اور حمیرا نے اس کے لیے لڑکی دیکھ رکھی تھی اور شادی کرنے کا ارادہ تھا۔ اشعر آیا تو خوب دھام سے اس کی شادی کر دی گئی۔

اشعر کی بیوی سائرہ اچھی لڑکی تھی۔ اشعر شادی کے دس دن بعد واپس چلا گیا۔ اگلے سال اظفر کے آنے کا پر دگرم تھا۔ تب اس کی شادی کا فیصلہ کیا گیا

READING  
Section



ان کو ہسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا تو اس کے ابو گھر میں اکیلے ہو گئے۔ ہسپتال میں والدہ کے ساتھ ان کی بہن رہتی تھیں۔ اس روز منظر آفس سے آیا تو اپنے کمرے میں جا کر بیگ میں کچھ سامان رکھنے لگا۔ حمیرا بیگم بھی پہنچ گئیں۔ پوچھنے پر منظر نے کہا کہ تو بیہ کچھ عرصہ اپنے مکے میں رہے گی۔ کیوں کہ اس کی اماں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔ اچھا! حمیرا نے دھیسے سے کہا اور یہ کچھ عرصہ دو ماہ پر محیط ہو گیا۔ حمیرا بیگم جب یوتیس کے آگے آئے منظر ٹال جاتا اور پھر ایک روز منظر نے دھماکہ کر دیا کہ تو بیہ کے پاپا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ اس لیے وہ اپنا سارا کاروبار میرے حوالے کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے مجھے ان کے یہاں شفٹ ہونا پڑے گا۔ ہائیں! عزیز نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہم لوگ یہاں پر اکیلے.....“

اکیلے کہاں ابا.....؟ آپ کے ساتھ فخر ہے ناں۔ اس کی سادیں بردیں آپ لوگوں کا دل بھی لگ جائے گا ویسے بھی کچھ دنوں بعد اشعر بھائی اور اظفر بھائی بھی آنے والے ہیں بچوں کے ساتھ آپ لوگ مصروف ہو جائیں گے۔ منظر نے سیاٹ لہجے میں کہا۔

”مگر وہاں تو بیہ کے پاپا کا تو کوئی اور ہے بھی نہیں سوائے ہمارے۔ اس لیے ان لوگوں کو ہماری زیادہ ضرورت ہے۔“ نکا سا جواب دے کر منظر سامان سینٹنے لگا اور عزیز کے ساتھ ساتھ حمیرا غم غم آنکھوں سے اپنے پیارے بیٹے کو دکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

اشعر اور اظفر آگئے۔ ان کے بچوں کو سینے سے لگا کر حمیرا دیر تک روتی رہیں۔ کب سے تڑپ رہی تھیں۔ اپنے پیاروں کے بچوں کو سینے سے لگانے کے لیے ساتھ ہی فخر نے اپنے ساتھ کام کرنے والی لڑکی عمیمہ کے بارے میں اماں کو بتایا کہ آپ لوگوں کو وہاں میرا رشتہ لے کر جانا ہے اور حمیرا سرجھکا کر رہ گئیں۔

عمیمہ خاصی ماڈرن اور امیر فیملی سے تھی۔ اس کے بے ہودہ لباس اور باتوں کو سن کر حمیرا بیگم کو وہ ایک آنکھ نہ بھائی۔ مگر بیٹے کی خواہش اور پسند زیادہ مقدم تھی۔ ایک ہی بیٹا تھا جو ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ بگاڑ پیدا کر کے اس

سے بھی دور ہونا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے فخر کی شادی کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ اور چونگی اور آخری لاڈلی نبو عمیمہ بھی گھر آ گئی۔ اشعر اور اظفر فیملیوں سمیت واپس چلے گئے تھے۔

عمیمہ تیز طرار، اور کسی حد تک بدتمیز لڑکی تھی۔ اسے ساس سسر سے کوئی لگاؤ تھا نہ دل چسپی اسے تو صرف فخر سے غرض تھی۔ جس کو وہ بہت پیار کرتی تھی۔ وہ صبح تیار ہو کر فخر کے ساتھ آفس چلی جاتی۔ چھپے سارا دن بھائیں بھائیں کرتے گھر میں کھانستا ہوا عزیز اور حمیرا انوکروں کے رحم و کرم بر رہ جاتے۔ آفس سے آ کر بھی فخر اور عمیمہ کبھی ڈنر پر تو کبھی پارٹیز میں چلے جاتے۔ دونوں میاں بیوی تہا رہ جاتے۔ کچھ دن تو حمیرا نے برداشت کیا اور پھر ایک دن فخر سے کہہ دیا کہ بیٹا ہمیں کون سا پیسوں کی ضرورت ہے۔ عمیمہ سے کہو نوکری چھوڑ کر گھر میں رہے۔ ذرا گھر میں رونق ہو جائے گی۔

اماں یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ عمیمہ کوئی جاہل لڑکی نہیں ہے۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ بہترین جاب کرتی ہے۔ وہ گھر میں رہنے یا آپ لوگوں کو کمپنی دینے کے لیے نہیں آئی۔ ہم دونوں نے مل کر اپنے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس لیے آپ لوگ اگر اکیلا بن محسوس کرتے ہیں تو اشعر بھائی یا اظفر بھائی کے پاس چلے جائیں۔

حمیرا ایسا منہ لے کر رہ گئیں۔ اب دونوں کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ اچھے اچھے ڈاکٹرز کو دکھاتے کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ لیکن تہائی سب سے بڑی بیماری تھی۔ جو کھن کی طرح انھیں کھانے چلی جا رہی تھی۔ عزیز کو ان تمام تر مراعات کے باوجود بی ہو گیا تھا۔ حمیرا بی بی اور شوگر کی مرینہ تھیں۔

اب عمیمہ امید سے ہوئی تو دونوں بہت خوش ہوئے کہ گھر میں بچے کی آمد متوقع تھی۔

اور پھر اللہ اللہ کر کے دن پورے ہوئے اور عمیمہ نے پیارے سے بیٹے کو جنم دیا۔ فخر کے ساتھ ساتھ عزیز اور حمیرا بھی خوشی سے بھولے نہیں سارے تھے۔ صدقے خیرات دیے اور مٹھائی بھی تقسیم کی۔ عمیمہ گھر آ گئی۔ حمیرا عمیمہ کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ بچے کو سنبھالتیں، مالش کرتیں لیکن عمیمہ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ خاص طور پر

جب کھانتے کھانتے عزیز بچے کے قریب آتا تو اس سے برداشت نہ ہوتا۔ اور پھر کچھ دن بعد ہی فخر نے بھی اپنا فرض پورا کر دیا۔

”ابا پلیز آپ منے کو بیمار مت کیا کریں۔“

ہائیں کیا ہو گیا.....؟“ عزیز نے جھٹکے سے سر اٹھا کر حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”جی آپ کو خود احساس ہونا چاہیے تھا کہ آپ کو موزی مرض ہے اور منا ابھی کتنا چھوٹا اور نازک ہے خدا نخواستہ جراثیم لگ جائیں تو..... اور اماں آپ..... ابھی ابا کو منع نہیں کرتیں مجھے معلوم ہی کہ ساتھ رہیں گے تو آپ لوگوں سے برداشت ہو گا نہیں اور آپ لوگ لازمی منے کو بیمار کریں گے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ لوگوں کو ایڈمی سینٹر میں شفٹ کروادیں۔ میں ملنے آتا رہوں گا کیوں کہ خود پر تو انسان برداشت کر لیتا ہے لیکن..... اولاد کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ ویسے تو آپ لوگوں کو اوپر کے پورشن میں بھی شفٹ کر سکتا ہوں۔ مگر آپ لوگ پھر وہی تنہائی کا رونا روکیں گے اس لیے وہاں جانے سے آپ لوگوں کو تنہائی کا احساس نہیں ہو گا۔ بہت سارے لوگ آپ لوگوں کے ساتھ ہوں گے اور آپ لوگوں کا ٹائم بھی پاس ہو جائے گا۔

ہائیں یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ ہمارا اپنا گھر ہے۔ چار چار بیٹے ہیں اور ہم..... ہم..... خیراتی ادارے میں جائیں؟“

عزیز جو خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے تڑپ کر سوال کیا۔

سچ کہہ رہے ہو تم۔ اولاد کے لیے رسک نہیں لے سکتے۔ ہم نے بھی تم لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا۔ اپنی عزت منی میں ملا کر تمہارے بہتر مستقبل کے لیے لوگوں سے امداد لی تمہارے بہتر کیریئر کے لیے کہاں کہاں نہ بھاگ دوڑ کی۔ اور آج..... تم بھی۔“

”بس ابا..... آپ لوگوں نے بھی اولاد کے لیے کیا اور ہم بھی اولاد کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ اب تو وہ زمانہ بھی نہیں رہا۔ اب ضرورتیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ اگر اشعر بھائی، اظفر بھائی اور منظر بھائی بھی اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے دور ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ اس لیے

آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اور اصل بات یہ ہے کہ عمیرہ نہیں چاہتی کہ دو بیمار لوگوں کے ساتھ وہ اپنے بچے کی پرورش کرے اس لیے آپ لوگ تیاری کر لیں۔ میں نے وہاں جا کر بات کرنی ہے۔ میں ملنے آتا رہوں گا آپ لوگوں سے۔“ فخر نے حتمی فیصلہ سنایا۔ حمیرا تو من تقبیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے اور کیا ہو رہا ہے؟ فخر کمرے سے جا چکا تھا دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے رورہے تھے۔ بچوں اولاد کی خاطر دونوں نے خاندان سے کٹ کر غرور اور فخر کے ساتھ زندگی گزارنی تھی۔ اپنے بھائیوں کے سامنے خود کو ہمیشہ اٹلی سمجھا۔ امارت اور بیٹوں کے زعم میں زندگی گزارنی۔ ایک ایک کر کے چاروں بیٹوں نے کس طرح ان دونوں کو تنہا کر دیا تھا۔ نہ جانے کتنا وقت ہو گیا تھا۔ دونوں یونہی گم سم بیٹھے تھے۔ تب ہی کمرے کی لائٹ جلی اور دونوں خیالات سے چونکے۔ سامنے عظیم، عذیر اور عائش کھڑے تھے۔

”اشعر عزیز ہم لوگ تمہیں لینے آئے ہیں۔“ عظیم اور عذیر نے آگے بڑھ کر عزیز کو کندھوں سے تھاما اور عظیم نے کہا۔ عزیز نے تڑپ کر نگاہ اٹھائی۔

”بھائی..... وہ اٹھ کر عظیم سے لیٹ کر رو پڑا۔“

”بس کریں عزیز بھائی ابھی آپ کے بھائیوں کا گھر آپ کے لیے کھلا ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ لوگ کسی خیراتی ادارے میں نہیں جا سکتے۔“

عذیر اور پھر عائش نے آگے بڑھ کر عزیز کو مخاطب کیا۔ عزیز نے حذر مندہ تھا۔ مگر کبھی کیا سکتا تھا۔ جن بیٹوں کے زعم میں اس نے بھائیوں، بھاد جوں اور ان کے بچوں کو حقیر جانا تھا آج ان لوگوں نے ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا سب کو اپنی اپنی فیملیاں اور مستقبل عزیز تھے۔ سچ ہے اولاد پیدا کرنا آسان ہے مگر ان کی تربیت کرنا بہت مشکل ہے۔ جو سوچ اور ذہنیت عزیز کی تھی وہی اس کے بیٹوں میں منتقل ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی عزیز اور حمیرا عائش کی لمبی سی گاڑی میں اس گھر کی جانب جا رہے تھے جسے وہ چھوٹا، پرانا اور قدیم کہہ کر کب کا چھوڑ چکے تھے۔

☆☆☆

READING  
Section

سچی کہانیاں 161

WWW.PAKSOCIETY.COM  
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY  
FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY



# باب اول

## منزل خان

ان مردوں کے لیے آئینہ تحریر، جو بیٹی کو زحمت تصور کرتے ہیں

دو۔ جب تک اس کو دیکھ نہ لوں دل کو سکون ہی نہیں ملتا ہے۔ تمہاری سوچ، تمہارا کردار اور تمہاری کوکھ ہی منحوس ہے۔ ورنہ آج پانچ بیٹیوں کی جگہ میرے پانچ بیٹے ہوتے اور میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا تھا۔ یہ باتیں سن کر رخسانہ کا کلیجہ منہ کو آ گیا تھا، اور کچھ سینے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وقتاً فوقتاً طعنے دینا اور طنز کے تیر چلانا اس کی عادت میں شامل ہو چکا تھا۔

بیوی اور بیٹیوں کی تو اس کی نظر میں کوئی اوقات ہی نہیں تھی۔ مگر شادی کے شروع میں سب کچھ بہت حسین تھا۔ میرا ہم سفر، میرے ذکھ سکھ کا ساگی یوں بدل جائے گا۔ میری ذرا سی تکلیف پر بے تاب ہونے والوں کی بیٹی کی پیدائش پہ پتھر دل ہو جائے گا۔ اب میں اور میری بیٹیاں جیسی یا مریں اس سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس نے تو جیسے اپنے کانوں اور آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔

میری بیٹیاں باپ کے ہوتے ہوئے بھی بنا باپ کے پل رہی تھی۔ باپ کی شفقت اور محبت سے نا آشنا میری بیٹیاں باپ کو جلا تصور کرنے لگی تھیں۔ باپ کے گھر میں داخل ہوتے ہی سب دیک کر ایک کونے میں بیٹھ جاتی تھیں۔ جیسے ان کا اپنا باپ نہیں بلکہ کوئی قصائی چھری لے کر بکریوں کے ریوڑ کے درمیان آ گیا ہو۔ بچیوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

”میں نے جب کہہ دیا تھا کہ گھر آئے پر ان میں سے کوئی میرے سامنے نہ آیا کرنے تو پھر کیوں آئیں میرے آفس سے واپس آنے کا نام نہیں معلوم ہے۔“ عمران گھر میں داخل ہوتے ہی چلا یا تھا۔

”آپ کو ان معصوموں نے کیا کہہ دیا ہے جو آپ ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر ہی پڑ گئے ہیں۔“ رخسانہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا تھا۔

”بس میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ میرا بس نہیں چلتا کہ میں ان کا گلا دبا دوں۔“ عمران نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”بیٹیاں تو خدا کی رحمت ہوتی ہیں اور نبی کا ارشاد ہے کہ جس نے دو بیٹیوں کی پرورش اچھے طریقے سے کی، وہ جنت میں میرے ساتھ ایسے ہوگا جیسے شہادت اور درمیان والی انگلی۔“ رخسانہ بجاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”ٹھیک سے دو بیٹیوں کی پرورش میں کر لیتا ہوں، باقیوں کو تم اپنے میکے بھجوادو۔ آخر ان کو بھی جنت میں جانا چاہیے۔“ عمران طنز سے لہجے میں بولا تھا۔

”ان کو سمجھانا تو بھینس کے آگے بین بجانے جیسا ہے۔“ رخسانہ نے دل میں سوچا اور کمرے سے باہر جانے لگی تھی کہ عمران کی آواز پر رک گئی۔

”سنو میرے اکلوتے چشم و چراغ کو میرے پاس بھیج

”رخسانہ کہاں رہ گئی ہو۔ لے بھی آؤ میرے پیارے بیٹے حارث کو۔ اس کو آج میں نے اسکول میں داخل کروانا ہے۔“ عمران نے ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

”حارث اسکول نہیں جانا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جاؤں گا تو جیلہ کے ساتھ جاؤں گا ورنہ اسکول نہیں جاؤں گا۔“ رخسانہ نے کمرے سے نکلنے ہوئے پریشانی کے عالم میں کہا تھا۔

”چلو آ جاؤ میرے بیٹے۔“ عمران نے حارث سے کہا۔  
 ”نہیں ابو میں تو جیلہ کے ساتھ ہی جاؤں گا، ورنہ نہیں جاؤں گا۔“ حارث اپنی توپلی زبان میں بولا تھا۔  
 ”اچھا لے آؤ جیلہ کو۔“ عمران اپنے تین سالہ بیٹے سے شکست کھاتے ہوئے مایوس لہجے میں بولا تھا۔

☆☆☆

”جیلہ کیا تم نے اپنے بھائی کو کام کر کے دیا ہے۔“  
 کلاس ٹیچر نے جیلہ کو کھڑا کر کے پوچھا تھا۔  
 ”بس ورنہ یہ میری شکایت ابو کو لگا دے گا اس لیے میں اس کو بھی کام کر کے دے دیتی ہوں۔“

”تم لوگ کتنے بہن بھائی ہو اور تمہارے ابو تمہیں کیوں ڈانٹیں گے۔“ ٹیچر نے جیلہ سے پیار سے پوچھا تھا۔  
 ”بس ہم پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ میرے ابو صرف بھائی سے پیار کرتے ہیں۔ اگر بھائی روئے گا تو ابو ہمیں ماریں گے۔“ جیلہ نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا تھا۔

”تمہاری اور بہنیں بھی کیا اس اسکول میں پڑھتی ہیں۔“ ٹیچر نے دوبارہ جیلہ سے پوچھا تھا۔  
 ”میری کوئی بہن اسکول میں نہیں پڑھتی ہے۔“  
 جیلہ نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔

”اچھا تو تم نے ضد کر کے اسکول میں ایڈمیشن لیا تھا کیا؟“ ٹیچر تو تم نے ضد کر کے اسکول میں ایڈمیشن لیا تھا کیا؟“ ٹیچر نے پیار کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

”نہیں مس! ابو نے ہماری بھی کوئی فرمائش پوری نہیں کی ہے۔ وہ ہم بہنوں کا اپنے سامنے آنا پسند نہیں کرتے ہیں۔ یہ تو ہم دونوں بہن بھائی جڑواں ہیں۔ ایک ساتھ کھیلتے، کھاتے اور بیٹے ہیں۔ بھائی میرے بغیر اسکول نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے مجبوراً ابو نے مجھے بھی اس

کے ساتھ داخل کروا دیا تھا۔ اور ساتھ میں سخی سے تاکید کی تھی کہ بھائی کو کوئی تکلیف نہ ہو پائے۔“ جیلہ نے روہا سی صورت بناتے ہوئے کہا تھا۔

”ابے بھی تم نے اتنی سی عمر میں اتنی بڑی باتیں کہاں سے سیکھی ہیں۔“ ٹیچر نے پیار سے پوچھا تھا۔

☆☆☆

”حارث میرے بال چھوڑو۔“ جیلہ چلائی تھی۔



کر سکتی تھیں۔ "عمران نے اپنی بھڑاس جمیلہ پر نکالتے ہوئے کہا تھا۔

"ابو میں نے اس کو منع کیا تھا مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔" جمیلہ نے ڈرتے ڈرتے ہوئے کہا تھا۔

"ابو یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اسی نے مجھے پھول توڑنے کو کہا تھا۔" حارث نے اپنی غلطی جمیلہ کے سر پر ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"ابو یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" جمیلہ نے اپنا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا۔

"بس بہت ہو گیا آئندہ تم اس کے ساتھ کھیلنے نہیں جاؤ گی۔ اب جاؤ میرے سامنے سے۔" عمران چیختے ہوئے بولا تھا۔

☆☆☆

"کیا ہوا تم فون کیوں نہیں رکھ رہی ہو۔ سب خیریت تو ہے ناں! "فیضان کے اچانک مخاطب کرنے پر میں یوں چونکی جیسے کوئی مجھے ماضی کے بظہروں سے کھول لایا ہو۔ میں نے فیضان کی طرف جھکتے ہوئے دیکھا اور کہا تھا۔

"ابو کا فون تھا بیٹی کی پیدائش کا سن کر کہہ رہے تھے اس کا گلہ بادو۔"

"ان کے گھر کی بیٹی نہیں ہے جو گلہ و بادوں۔ یہ تو میرے آنگن کا پھول ہے جس نے بہار بن کر آتے ہی میرے بچر اور بیابان آنگن کو خوشیوں سے بھر دیا ہے۔ میری بیٹی میرے گھر کی رونق ہے اور ویسے بھی بیٹا ہو یا بیٹی دونوں خدا کی رحمت ہیں۔ بیٹیوں کی قدر ان سے پوچھو جن کی جھولیاں ابھی تک خالی ہے۔" فیضان نے پڑ سکون لہجے میں جواب دیا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ آپ خفا تو نہیں ہیں کہ میں نے ایک بیٹی کو جنم دیا ہے۔" میں نے بھگتی آنکھوں سے پوچھا تھا۔

"جمیلہ! یہ تم سے کس نے کہہ دیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ خدا نے تمہیں پہلی بیٹی سے نوازا ہے۔ میں تمہارے والد کی طرح بیٹیوں کا دشمن نہیں ہوں۔" فیضان نے پیار سے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ میں نے فیضان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا نے میری بیٹی کو نہایت ہی شفقت اور محبت کرنے والے بائبل سے نوازا ہے۔

☆☆☆

"نہیں۔ مس! میں حارث ہوم ورک کر کے دیتی ہوں۔" حارث نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا تھا۔

"تو کیا جھوٹ بولا تھا۔ ابھی تو میں نے یہ نہیں بتایا کہ اس بار ٹیسٹ پیر بھی میں نے ہی تمہیں کر کے دیا تھا۔" جمیلہ اپنے بالوں کو حارث کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔

"اچھا یہ بات ہے تو تم گھر چلو ذرا ابو کو تمہاری شکایت نہ لگائی تو پھر بولنا۔" حارث نے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"وعدہ کرتی ہوں تمہارا سارا ہوم ورک میں کروں گی اور ٹیچر کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔" جمیلہ نے منت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں اب صرف اس سے کام نہیں چلے گا اگلے مہینے جو ہمارے پیر ہوں گے وہ بھی تم ہی کرو گی اور راستے میں انکل فریاز کے صحن سے امرود بھی توڑ کے دو گی۔ ورنہ میں ابو سے تمہیں ڈانٹ پلاؤں گا۔" حارث بولا تھا۔

☆☆☆

"ارے حارث پھول کیوں توڑ رہے ہو؟ مانی تمہیں دیکھ نہ لے۔" جمیلہ بولی تھی۔

"ڈر لوگ کچھ نہیں ہوتا ہے۔" حارث بولا تھا۔

"اب پکڑا گیا نا اسی لیے میں کہوں پھول روز کیوں کم ہو جاتے ہیں۔" مانی نے حارث کو ہاتھ سے پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

"انکل پلیز میرے بھائی کو چھوڑ دو۔ آئندہ یہ ایسا نہیں کرے گا۔" جمیلہ نے التجا کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ایسے ہی چھوڑ دوں۔ اب میں تمہارے والد کو شکایت لگاؤں گا کہ کیا کرتا پھرتا ہے اس کا بیٹا۔ بڑا غرور تھا نہ اسے اپنے بیٹے پر۔" مانی نے انتقامیہ لہجے میں کہا تھا۔

"عمران صاحب باہر آئیے۔" مانی گھر کے باہر سے چیخا تھا۔

"کیوں چلا رہے ہو۔" عمران دروازہ کھولتے ہوئے بولا تھا۔

"یہ لیجیے سنبھالیے اپنے بیٹے کو۔ باغ سے پھول توڑتے ہوئے پکڑا ہے اسے میں نے۔" مانی خریہ لہجے میں بولا تھا۔

"تم دونوں اندر چلو۔ میں آپ سے بہت معذرت چاہتا ہوں۔ آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔" عمران نے بات کو دفع دفع کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جمیلہ کیا تم اپنے بھائی کو پھول توڑنے سے منع نہیں

تیسری مرد کہانی

# اپنا خون



شعبان کھوسہ

اُس شخص کا قصہ جسے اپنے خون پر بھروسہ نہ تھا

ریشم جیسی نازک اس کی بیٹی صغریٰ، تیس کوئی کالی سیاہ،  
ناگن پھن پھیلائے کھڑی تھی۔ تاجے نے صغریٰ کے  
منہ پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھا اور بولا۔  
”صغریٰ! اس نے سوہنی تجھے نہیں کہا۔ اس نے

تاجا اس وقت بہت ہی غصے میں تھا۔ اس کی  
پیشانی سے ہی تیس اس کے انگ انگ سے پسینہ بہہ  
رہا تھا۔ غصے سے اس کی آنکھیں باہر کو آ رہی تھیں۔  
اس کے سامنے ہر ذرے جیسے قد، ہر نی جیسی آنکھوں اور

Downloaded From  
Paksociety.com

READING  
Section



تاجے کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ اور غصے سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے پوری قوت سے پھلاں کو دھکا دے کر پرے کر دیا اور تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔

پھلاں کا سرد روزے سے نکل آیا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ نکلا وہ پوری قوت سے چیخنے لگی۔ اس کی چیخ و پکار سن کر پڑوس کی عورتیں آگئیں اور پوچھنے لگیں۔

”اری پھلاں۔ تمہارے ماتھے سے تو خون کا دریا بہ رہا ہے۔“

”ہائے ری..... یہ دریا کیا ہے۔ کوئی وہاں جا کر دیکھے جہاں آج خون کی ہولی کھیلی جائے گی۔ جہاں آج لاشے تڑپیں گے۔“ پھلاں لہک لہک کر مین ڈال رہی تھی۔

”اری بہن۔ بات کیا ہوئی۔ کچھ تو بتا۔“ ایک ہمسائی نے پوچھا۔

پھلاں مین ڈالتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ”اری کسی بد بخت نے صفری سے چھینٹ خانی کی ہے۔ ہائے آج پہلی بار گھر سے اکیلی نکلی تھی۔ وہ بھی سدرہ کے پاس کڑھائی کا نمونہ لینے گئی تھی۔ اری بہن میری قسمت پھوٹی تھی۔ میزنی تقدیر چلی گئی۔ میرے نصیب بڑے تھے کہ میں نے اسے بیچ دیا۔ خود کیوں نہ چلی گئی۔ ہائے اب کیا ہوگا؟ صفری کا باپ پہلے ہی بڑا غصیلہ ہے۔ وہ جان دے کر بھی شکست تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ تو کسی بہو بیٹی کے متعلق ایسی ویسی بات سنا ہے تو جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ وہ تو کہتا ہی اس جینے سے تو مرنا بہتر ہے۔ ہائے اللہ۔ اب کیا ہوگا؟“

☆☆☆

کچھ ہی دیر بعد تاجے کو سر جھکائے دے پاؤں اندر آتے دیکھ کر سب عورتیں پھلاں کے ارد گرد سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ پھلاں دوڑ کر تاجے کے پاؤں میں گر پڑی اور پوچھا۔

”کیا ہوا۔ کون تھا وہ کم بخت۔“

”ہش“ تاجے نے انگلی پھلاں کے ہونٹوں پر رکھ کر اسے چپ رہنے کو کہا۔ جیسے کسی بہت بڑے راز

مجھے بے غیرت کہا ہے۔ اس نے میلی آنکھوں سے تجھے نہیں دیکھا۔ کڑوی نگاہوں سے مجھے گھورا ہے۔ صفری! اس نے تجھے نہیں اپنی موت کو آواز دی ہے۔“

”لیکن میری بھی تو سنو۔ خدا کے لیے اتنے غصے میں مت آؤ۔“ تاجے کے قریب کھڑی اس کی بیوی پھلاں نے کہا۔ ”ماتھے سے پسینہ تو پونچھ لو۔“

”اب تو تم خون ہی پونچھو گی۔“ تاجا سا دن کے باؤل کی طرح گر جا۔

”خدا نہ کرے میں تمہارا خون پونچھوں۔“ تم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو نا۔

”میریا ندر الاؤ پک رہا ہے اور تو کہتی ہے میں ٹھنڈے دل سے سوچوں۔“ تاجا پھر گر جا۔

”ہائے اللہ۔ اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔ میں خود جا کر اسے دلا سو دے آتی ہوں۔“ پھلاں بولی۔

”دلا سو..... دلا سے تو وہ دیتے ہیں۔ پچاس تیس تو وہ بٹھاتے ہیں۔ جو ہاتھ سے کچھ نہ کر سکیں آج میں اس کو اس پڑی پر چڑھا دوں گا۔ جہاں سے وہ اتر گیا ہے تو ایک بار میری شام چڑھی ڈانگ تو پکڑا۔ سونہہ رب دی۔ اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسے پتہ لگ جائے گا۔ یہ تاجے کی بیٹی ہے کسی چوراہے کی میری نہیں۔“

”اف میرے اللہ۔ تم تو میری سنتے ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں۔ بات کا بنگلہ بناؤ۔ اتنا شور مچا اچھا نہیں۔ بیٹی کی بات ہے۔ چار لوگ سیں گے تو کیا کہیں گے۔“

”تو چاند کو سنانے کا کہہ رہی ہے۔ میں آج سب کو دکھا دوں گا پھلاں بیگم۔ یہ ہیر کا گاؤں نہیں یہ سوہنی کی بستی ہے نہ صاحبان کی بھوک..... یہاں کوئی رانجھا..... کوئی مہینوال اور کوئی مرزا نہیں آسکتا۔“

”کچھ بھی ہو۔ لیکن میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔“ پھلاں بولی۔

”میں نے کہہ دیا تاں کہ میزے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ تاجا دھاڑا۔

”نہیں ہٹوں گی۔“ پھلاں نے تاجے کے گرتے کا پلو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ لیکن اس وقت

## میری پکار سنو

اذانِ فجر سے پہلے مجھے بابا جگاتے تھے  
 ولتئیں انداز میں قرآن پڑھاتے تھے  
 اسکول کے لیے جب پوائنٹ آتی تھی  
 ماں چوم کے ماتھا مجھے بس میں بٹھاتی تھی  
 سو جتی تھی ماں، مجھے فوجی بنانا ہے  
 دشمن سے لڑنے کے لیے سرحد پہ جانا ہے  
 اس دن بھی صبح جب ہم اسکول آئے تھے  
 اپنی نیچروں کے واسطے کچھ پھول لائے تھے  
 کتابیں ہاتھ میں تھیں، شور اٹھا تھا کہ اب بھاگو  
 قیامت کی گھڑی آئی پھوٹا تم بھی زرا جاگو  
 بھیڑیوں نے ہم پہ اچانک فائر کھولے تھے  
 دم سادھے ہوئے تھے ان کو کچھ بولے تھے  
 اف خدایا! ہر طرف یہ خون پھیلا ہے  
 کتب ہے کہ مقتل ہے کہ خون پھیلا ہے  
 خدایا، ان درندوں کا ہم نے کیا بگاڑا ہے  
 ہمارے علم کا گلشن اس نے کیوں اجاڑا ہے  
 جی چاہتا ہے ناں، تیری آغوش میں آؤں  
 سچ کر ان درندوں سے میں چھپ جاؤں  
 میرے بابا چلے آؤ یہ دیکھو خون بہتا ہے  
 ارے اتنی اذیت یہاں پر کون سہتا ہے  
 اسکول میں موجود یہاں جتنے بچے ہیں  
 ان سب کے بستوں پہ خون کے دھبے ہیں  
 قلم روتا ہے اور کاپیاں فریاد کرتی ہیں  
 کہ مائیں ایسی پیدا کس لیے اولاد کرتی ہیں  
 میرے بابا نے مجھ کو کلد میں جب اتارا تھا  
 بے ساختہ مرے بھیا نے پھر مجھ کو پکارا تھا  
 ماں نہ گھبراؤ کھ سے تیری میں پھر جنم لوں گا  
 نہ ایسا پھر لگے مقتل، خدا سے میں قسم لوں گا  
 کہاں ہو حکمرانو تم؟ میرا خون بہا مانگو  
 ارے اے منصفو! ان کو اب دار پر مانگو  
 (سانحہ لے پی ایس پشاور کے شہید بچوں کی پکار)  
 (شاعرہ: صفیہ سلطانہ مغل۔ جیکب آباد)

کے فاش ہونے کا خطرہ ہو۔ اس نے پھلاں کو  
 بازوؤں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

”کیا بات ہے؟“ پھلاں حیران ہو گئی۔

تاجے نے اس کے کان میں آہستہ سے کہا۔  
 ”پہلے ان عورتوں کو تو باہر نکالو۔ کئی باتیں راز کی ہوتی  
 ہیں۔“

یہ سن کر پھلاں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”جاؤ بہنوں  
 اپنے اپنے گھر۔ یہاں کوئی کھیل تماشا تو نہیں ہو رہا۔  
 جو سب نے یہاں بھیڑ لگا رکھی ہے۔“ سب عورتیں  
 شرمندہ ہو کر ادھر ادھر بکھر گئیں۔

عورتوں کے چلے جانے کے بعد پھلاں نے  
 رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔ ”کون تھا وہ؟ اور کیا تم نے  
 اسے واقعی قتل کر دیا ہے؟“

”چھوڑو ان باتوں کو۔ قتل تو میں نے اسے کر ہی  
 دینا تھا۔ لیکن۔“

”لیکن کیا؟“

”وہ تو لڑکا ہی بہت بھلا مانس ہے۔“

”کون ہے وہ اتنا بھلا مانس جس نے تم جیسی  
 آگ کو پانی کر دیا۔“

”اپنے گاؤں کے سردار فضل دین کا بھتیجا، جو شہر  
 سے یہاں مہمان آیا ہوا ہے۔ تو بھی تو سوچو وہ بڑے  
 لوگ ہم چھوٹوں سے کیسے چھینز خانی کر سکتے ہیں۔  
 ضرور اس حرام زادی کی شرارت ہوگی۔“

”شک تو مجھے بھی ہو رہا تھا۔ یہ ادھر سے گزری  
 کیوں تھی؟“ پھلاں نے اپنی آنکھیں تاجے کی  
 آنکھوں میں ڈال دیں۔ یہاں سوچ کے کئی سمندر  
 پھرے ہوئے تھے اور آنسو دھاروں کی صورت  
 کنارے پر چھلکے پڑتے تھے۔

”چل آگے سے ہٹ اور دروازہ بند کر کے بیٹھ۔  
 ہر آنے جانے والے کی نظر پڑتی ہے۔“

یہ کہہ کر تاجا لڑکھڑاتا ہوا دروازہ بند کرنے چل  
 پڑا اور دروازہ بند کرنے کے ساتھ ہی اس طرح گر  
 پڑا۔ جیسے وہ گوشت پوست کا آدمی نہیں دیکھ زدہ  
 لکڑی کا پتلا ہو۔

☆☆☆

READING  
Section



## بھارت میں ہلکے سڑک



محمد شام

جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا اصل چہرہ ہے نقابت کرنا  
نامور صحافی محمود شام کے بے باک قلم سے، سفر نامہ بھارت

## چوتھا حصہ

تھے۔ اب تو کوئی ثالث نہیں ہے۔ خود ہی دیزا حاصل کرنا ہے۔ فارم بھر کے پاسپورٹ اسے ایک دوست کو اسلام آباد بھیج دیا ہے اور بھارتی پائی گمشدگی میں کمال پرویز صاحب سے بات کر لی ہے۔ انہیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ گزشتہ سال دہلی ایئر پورٹ پر دیزے کے باوجود بھارت میں داخلے میں مشکل آئی تھی اور امیگریشن کے حکام نے کہا تھا کہ مجھے دیزے کے ساتھ ساتھ کسی خصوصی اجازت کی ضرورت ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ ایسی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے پاس ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ آپ تو ۱۹۷۲ء سے بھارت جا رہے ہیں۔ آپ کے لیے کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہوگا۔

لاہور سے دہلی روانگی ہے۔ پی آئی اے کی پرداز پی کے ۲۷۰ ہماری مختصر ہے۔ اظہر جادید ہم سفر ہیں۔ میں نے ان کو خبردار کیا ہے کہ دہلی ایئر پورٹ پر گزشتہ سال کی طرح مجھے اس بار بھی رد کا جاسکتا ہے۔ آپ ذرا خیال رکھیے گا۔

پرداز چار بجے پہنچ گئی ہے۔ امیگریشن کے لیے عام طور پر تو ایک کارڈ ہی کافی ہوتا ہے۔ لیکن پاکستان اور بھارت کے خصوصی تعلقات کے پیش نظر پاکستانی مسافروں کو الگ سے فارم بھرنے پڑتے ہیں۔ فارم،

دہلی ایئر پورٹ ٹرانزٹ سیل میں کیا گزری؟  
ہریانہ اردو اکیڈمی کی طرف سے دعوت نامہ ہے۔ ۱۲۲ اپریل ۱۹۹۸ء کو چنڈی گڑھ میں غالب کی دودھ سالہ برسی کی تقریبات کے حوالے سے مشاعرہ ہے۔ چنڈی گڑھ گئی سال پہلے ۱۹۷۲ء میں دیکھا تھا جب شملہ معاہدے کے لیے صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ جا رہے تھے۔ جہاز نے چنڈی گڑھ ایئر پورٹ پر اتار اٹھا۔ یہاں سے ہم گاڑیوں کے ذریعے شملہ گئے تھے۔ سوچا کہ چنڈی گڑھ دوبارہ دیکھ لیں۔

ہریانہ اردو اکیڈمی کے سیکریٹری جنرل کشمیر لال ڈاکر کا دعوت نامہ ماہنامہ تخلیق کے مدیر جناب اظہر جادید کے ذریعے ملا ہے۔ اس سے پہلے قتل شغالی صاحب مارچ میں اٹالہ اور کرنال کے مشاعروں میں چلنے کی دعوت دے چکے ہیں۔ لیکن صحافتی مصروفیات کے باعث جانا نہیں ہو سکا ہے۔

پہلا مرحلہ ہے دیزے کا۔ جو اسلام آباد سے ملتا ہے۔ گزشتہ سال امریکی اطلاعات کے زیر اہتمام ایک ”ٹریولنگ سیمینار“ (سفری مذاکرہ) کے لیے بھارت جانا تھا تو دیزے کے مراحل امریکیوں نے خود طے کر لیے

پاسپورٹ، ویزا، میں نے امیگریشن آفیسر کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کی انگلیاں کی بورڈ پر رواں ہو گئی ہیں۔ مانیٹر کی اسکرین نے اسے کچھ کہا ہے۔ جس سے اسے ایک جھٹکا لگا ہے اور اس نے مجھے کہا ہے کہ آئیے اور ایک کیمین میں مجھے بٹھا دیا ہے۔ میرے کاغذات اور پاسپورٹ لے کر وہ کیمین چلا گیا ہے۔ کیمین میں بیٹھے نوجوان امیگریشن آفیسر نے فائل سے نظریں ہٹا کر مجھے دیکھا ہے اور کہہ رہا ہے۔ آپ تو پریس رپورٹر ہیں۔ پچھلے سال بھی آپ کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے بھی یاد آ رہا ہے کہ یہ وہی شفٹ ہے۔ جس سے فروری ۱۹۹۷ء میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت تو مجھے ۳ گھنٹے تک حراست میں رہنا پڑا تھا۔ آج دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ شفٹ امپجارج کہہ رہے ہیں کہ آپ کا تو اوپر سے ہی Clear ہوتا ہے۔ آپ بیٹھیں وہی جائے گا۔

پی آئی اے والے آئے ہیں، پوچھ رہے ہیں جہاز تو نہیں روکنا۔ اگر کوئی مسافر واپس لاہور بھیجتا ہے۔ تو جہاز روکا جائے۔

جہاز کو تو واپس بھیج دیا گیا ہے۔ اب مجھے کیمین بیٹھے تین گھنٹے ہو رہے ہیں۔ کچھ فیصلہ نہیں ہو پارہا ہے۔ میں امیگریشن حکام سے یہ اجازت لیتا ہوں کہ باہر مشاعرے کے منتظمین میرے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں انہیں اطلاع دے دوں۔ وہ مہربانی کرتے ہیں اور ایک باوروی کانسٹیبل کو میرے ساتھ بھیج دیتے ہیں۔ میں اظہر جاوید صاحب کو تلاش کرتا ہوں اور انہیں صورت حال بتاتا ہوں۔ نارنگ ساتی جو وہلی میں ہمارے میزبان ہیں۔ ان کا موبائل فون نمبر اور گھر کا فون نمبر لے لیتا ہوں کہ جب مجھے ایئر پورٹ چھوڑنے کی اجازت ملے گی۔ آپ کو فون کر دوں گا۔ پھر آپ یہاں سے لے جانے کا انتظام کر لیجئے گا۔

پھر میں آ کر اسی کیمین میں بیٹھ جاتا ہوں۔ پروازیں آرہی ہیں۔ مسافر امیگریشن کاؤنٹرز سے کلیئر ہو رہے ہیں، جارہے ہیں۔ ایک سال پہلے تو امریکن ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے شور مچایا مین گھنٹے بعد

کلیئر نسل گئی تھی۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ کیوں روکا اور پھر کیوں چھوڑ دیا۔ آج بھی وہ کچھ پوچھ رہے ہیں۔ میں ان سے کہہ بھی رہا ہوں کہ آپ کے ہائی کمیشن والوں کو ویزا ہی نہیں جاری کرنا چاہیے اگر کوئی مسئلہ ہے۔

اب یہ شفٹ جارہی ہے۔ اس لیے انہیں اپنے جانے کی جلدی ہے۔ ادھر ادھر فون ہو رہے ہیں۔ میرا سامان بھی کیمین لاکر دے دیا گیا ہے۔ فیصلہ ہو گیا ہے۔ انٹری ریوزل ڈال کر مجھے ٹرانزٹ سیل میں ڈالا جا رہا ہے۔ میں اپنے وطن میں کچھ بھی ہوں۔ جانا پچھانا۔ اردو کے سب سے بڑے اخبار کا ایڈیٹر۔ کئی بار بھارت یا ترا کر چکا ہوں۔ شاعروں کا حلقہ بھی جانتا ہے، صحافیوں کا بھی۔ لیکن امیگریشن کے ریکارڈ میں میں بلیک لسٹ ہوں۔ کیوں۔ کیا وجوہ ہیں۔ کیا پس منظر ہے۔ یہ نہ مجھے بتایا جا رہا ہے۔ نہ پوچھا جا رہا ہے۔

اب مجھے بھی احساس ہو رہا ہے کہ میں ایک ضمن ملک میں ہوں۔ ایک کشیدگی والی فضا میں ہوں۔ مجھے یقیناً کسی خاص جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ امیگریشن آفیسر میرے کاغذات کے ساتھ مجھے لفٹ سے اوپر کی منزل پر لے آئے ہیں۔ ڈیوٹی فری شاپس کے درمیان سے ہوتے ہم ایک ڈربے میں پہنچ چکے ہیں۔ وہاں مجھے ایک اور آفیسر کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ کہ آپ کو اب کیمین رہنا ہے۔

میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ آپ مجھے واپس پاکستان جانے دیں۔ کوئی بھی پرواز ہو۔ میں خود اس کا ٹکٹ خریدنے کو تیار ہوں۔ آپ کو مجھے اجازت نہیں دینی تھی۔ تو اسی جہاز سے واپس بھیج دیتے جس سے میں آیا تھا۔

ان کا لہجہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کوئی پرواز پاکستان جانے والی نہیں ہے۔ آپ دو راتیں کیمین گزاریں گے۔ پرسوں پی آئی اے کی پرواز آئے گی۔ اس پر آپ کو چڑھا دیں گے۔

آپ کو کیمین فون کرنا ہو۔ تو یہاں سے سپاہی ساتھ جائے گا۔ فون کر دے گا۔ وہ صاحب یہ کہہ کر چلے گئے ہیں۔ اب میں جن کی تحویل میں ہوں۔ ان سے کہتا



ہوں کہ فون کروادیں۔ تو وہ کہتے ہیں ابھی آپ  
 بیٹھیں۔ دوسری شفٹ آئے گی۔ وہ فون کروائیں  
 گے۔ یہ سامنے بیٹھ پڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک  
 سنبھال لیں۔

اب میں سوچ رہا ہوں کہ میں اب بھارت کی قید  
 میں ہوں۔ یہ اپنے خرچ پر ذلیل ہونے والی کیفیت  
 ہے۔ خود ہی ٹکٹ خرید کر یہاں پہنچے ہیں۔ تاکہ اس  
 سلوک سے لطف اندوز ہو سکیں۔ میں اپنے آپ کو دو  
 روزہ قید گزارنے کے لیے تیار کر رہا ہوں۔ اس ڈر بے  
 میں کچھ اور بھی قیدی ہیں۔ دو ایک تو بھارت کے  
 مسلمان ہی ہیں۔ جو سعودی عرب سے واپس بھیج دیے  
 گئے ہیں۔ اب ان کے بارے میں یہ تصدیق کی جا رہی  
 ہے کہ وہ واقعی بھارتی شہری ہیں یا نہیں یا انہیں آئی ایس  
 آئی نے یہاں بھجوادیا ہے۔ ایک نپال کے شہری ہیں۔  
 یہیں بیٹھ پر سونا ہے اور ساتھ ہی ایک لیٹرین ہے جسے  
 ہاتھ روم کا نام دیا گیا ہے اور قیدیوں کو بتایا گیا ہے کہ یہ  
 آپ کے استعمال کے لیے ہے۔

اجنبی لوگ۔ غیر ملکی بلکہ دشمن سرزمین، مستقبل  
 نامعلوم، ایسے میں صرف کتاب ساتھ دے سکتی ہے۔  
 شاعری کی فائل میرے ساتھ ہے۔ اسی کو نکال لیتا  
 ہوں۔ فرصت ہی فرصت ہے۔ اتنا وقت پہلے کہاں ملا  
 تھا۔ کسی فون کی گھنٹی بجنے کا خطرہ نہیں ہے۔ کوئی ملنے والا  
 بھی نہیں آئے گا، کہیں باہر بھی نہیں جاسکتے۔ اس لیے  
 پورے انتہاک سے اپنی شاعری پر توجہ دی جاسکتی  
 ہے۔ غیر کھل غزلوں میں نئے شعر کہے جاسکتے ہیں۔  
 نظموں کی کانٹ چھانٹ کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ بھی  
 خیال کی صرف ایک رو ہے۔ پھر ایک وحشت غالب  
 آجاتی ہے۔ یہ میں کہاں پھنس گیا ہوں۔ اس طرح  
 خاموشی سے سب کچھ برواشت کر لینا درست نہیں ہے  
 کچھ شور مچانا چاہیے۔ احتجاج کرنا چاہیے۔

میں اپنے فون کے لیے اصرار کرتا ہوں۔ ڈیوٹی پر  
 موجود سپاہی کہتا ہے کہ نئی شفٹ آنے والی ہے۔ وہ فون  
 کروادیں گے۔ نئی شفٹ والے کچھ انسان دوست  
 لگتے ہیں۔ وہ ساتھ لے کر چل پڑتے ہیں۔ میں جنگ  
 کے وہی ہیرو میں فون کرتا ہوں۔ انہیں صورت حال

سے آگاہ کرتا ہوں۔ ان سے پاکستان ہائی کمیشن کا نمبر  
 لیتا ہوں۔ مفتی جمیل الدین فٹن انفرمیشن پاکستان ہائی  
 کمیشن کو بتاتا ہوں کہ میں بھارت سرکار کا مہمان بن گیا  
 ہوں۔ مفتی صاحب کو بھی پچھلا سال یاد آ جاتا ہے کہ  
 اچھا پھر وہی ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رات بہت ہو گئی  
 ہے۔ پھر بھی ہم کچھ کوشش کرتے ہیں۔

میں پھر واپس آ کر اسی ڈر بے میں بیٹھ گیا ہوں۔  
 نپال کا ایک شہری یہاں کئی دن سے پڑا ہے میں بھی  
 سوچ رہا ہوں کہ نہ جانے کتنے دن یہاں رہتا ہے۔ روز  
 مرہ کے معمولات کا کیا ہوگا۔ کیسے گزرے گی۔ عام طور  
 پر قیدی ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔ محل  
 مل جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک استخبارات خوف ہے۔ میں  
 بھی کسی سے مخاطب نہیں ہو رہا ہوں۔ مجھ سے بھی کوئی  
 مخاطب نہیں ہو رہا ہے۔ راز والے نہ جانے کیا سمجھیں۔  
 انڈین سی آئی اے کیا سوچتے۔

پینے کا پانی بھی ہاتھ روم سے مل رہا ہے۔ میں نے  
 ٹکرانوں سے کہا ہے کہ ایک منزل وائر کی بوتل  
 منگوا دیں۔ انہوں نے پوچھا کہ اور بھی کچھ منگوانا ہوتا  
 ہے۔ میں نے پانی کی ایک بوتل اور ایک سینڈ وچ  
 لانے کو کہہ دیا ہے۔

آپ کا فون ہے۔ چلیں۔ مختلف راستوں سے  
 ایک سپاہی مجھے لے جا رہا ہے۔ میرا سامان وہیں سل  
 میں ہے۔ میں گھبرا رہا ہوں کہ شاید یہ کہیں اور بند  
 کر دیں۔ ایک اسٹنٹ ڈائریکٹر کے کمرے کے باہر  
 لے جا کر مجھے روک دیا گیا۔

آپ یہاں کیوں گھڑے ہیں۔ کون ہیں۔  
 مجھے ٹرانزٹ سل سے لایا گیا ہے۔ میں پاکستانی  
 ہوں۔ کوئی فون آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نہیں کوئی فون  
 نہیں آیا واپس چلیں۔ پھر بھول بھلیوں سے ہوتے  
 ہوئے واپس سل میں۔ رات کے دس بج رہے ہیں۔

منزل وائر کی بوتل آگئی ہے۔ سینڈ وچ بھی۔ میں  
 اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہوں۔ اور اپنا ڈنر کر رہا ہوں  
 اور سوچ رہا ہوں کہ اب سونے کا مرحلہ آ رہا ہے۔ معلوم  
 نہیں نیند آئے گی یا نہیں۔

پھر اپنی شاعری نکال رہا ہوں۔ کچھ لکھنے کی کوشش

کر رہا ہوں۔ الفاظ ہاتھ نہیں لگ رہے، خیالات کترا کر گزر رہے ہیں۔

دوسرے قیدی سوچکے ہیں۔ خزانے لے رہے ہیں۔

’آپ بھی سو جاؤ جی..... اب کچھ نہیں ہونے والا۔‘

’نیند آئے گی تو سو جاؤں گا۔‘

’جو آپ کی مرضی۔ فلائٹ تو اب دو روز بعد آئے گی۔‘

نیند تو کہیں دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ اب مجھے کبھی بھارت نہیں آنا چاہیے۔ باقاعدہ ویزے کے بعد بھی یہ حال ہے۔ یہ تو کوئی خاص دشمنی والی بات ہے۔ یہ بھی نہیں بتاتے کہ ان کے پاس ہمارے خلاف ہے کیا۔ ہم نے ان کا کیا چرایا ہے۔

’آئیے جی۔ آپ کا فون آیا ہے۔‘

’پہلے جی ایسے ہی چکر لگوادیا تھا۔‘

’آپ کے ہائی کمیشن سے فون ہے۔‘

اب ان کا رویہ کچھ مختلف ہے۔ اسی اسٹنٹ ڈائریکٹر امیگریشن کے کمرے میں پہنچتے ہیں۔ مفتی جمیل الدین صاحب کا فون ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ وزارت خارجہ کے کسی جوائنٹ سیکریٹری سے ہائی کمیشن کی بات ہوگئی ہے۔ بھارتی حکومت شرط طور پر ۲۴ گھنٹے قیام کی اجازت دے رہی ہے۔ آپ اتنے میں فارم وغیرہ بھر دیں۔ ہم آپ کو لینے آ رہے ہیں۔ فارم پر لکھا ہوا ہے کہ ہم صرف ۲۴ گھنٹے بھارت میں رہ سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں ڈائریکٹر وزارت داخلہ کے سامنے حاضر ہونا ہوگا۔

مفتی جمیل الدین اور پاکستانی ہائی کمیشن کے کچھ حکام آئے ہوئے ہیں۔ فضا میں کشیدگی ہے۔ چہروں پر تناؤ ہے۔

کتنی مشکل اور کٹھن زندگی ہے۔ ہمارے ہائی کمیشن والوں کی اس مستقل تناؤ میں زندگی گزرتی ہے۔ ہم ایئر پورٹ سے روانہ ہو گئے ہیں۔ دہلی ایئر پورٹ سے شہر تک کا راستہ پچھلی بار کتنا خوب صورت اور رومان پرور لگ رہا تھا۔ اب تو میرا باہر

READING  
Section

دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا۔ کاش کوئی پرواز آج ہی مجھے واپس پاکستان لے جاتی۔

مفتی جمیل الدین سے ہماری یاد اللہ بہت پرانی ہے۔ وہ پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ (پی آئی ڈی) کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کراچی میں کئی سال رہے ہیں۔ پھر مختلف ادوار میں مختلف عہدوں پر ان سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ ہوٹل کی بجائے ان کے ہاں ہی ٹھہرنے کا پروگرام بنا ہے۔ ہوٹل میں قیام اور پریشان کن ہو سکتا ہے۔ رات گزر گئی ہے۔ ٹرانزٹ سیل خوابوں پر چھایا رہا ہے۔

مفتی صاحب کے ساتھ پاکستان ہائی کمیشن پہنچے ہیں۔ اس کی حدود میں پہنچ کر کتنی اپنا بیت، کتنی تسکین ہو رہی ہے۔ ہائی کمیشن کے ایک آفیسر کو ساتھ لے کر ڈائریکٹر ہوم اے این شرمہ سے ملنے جا رہے ہیں۔

استقبالیہ، سیکورٹی، قطار، داخلہ پاس کے مراحل سے گزرتے ہوئے ڈائریکٹر صاحب کے کمرے کے باہر کھڑے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب ہاٹ لائن پر بات کر رہے ہیں۔ اسی لیے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

باریابی ہوتی ہے۔ حال احوال سننے کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایکسٹرنل منسٹری سے بھی فون آیا تھا۔ میں فائل منگواتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو کیوں روکا گیا ہے۔ اتنے عرصے سے مشاعرے سے دستبردار کی طرف سے کرتار سنگھ دگل بھی پہنچ گئے ہیں۔

خاصے بزرگ ہیں۔ معلوم نہیں انھیں کیوں زحمت دی گئی ہے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ چند ہی گڑھ جانے کے لیے وہ مجھے بس پر سوار کروادیں گے۔ ٹرین تو نکل گئی ہے۔ ڈائریکٹر صاحب بھی مجھے مشاعرے میں جانے کی عارضی اجازت دے رہے ہیں۔ لیکن میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ اب میرا مشاعرے یا کسی بھی تقریب میں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ مجھے صرف یہ بتا دیا جائے کہ اس سلوک کی کیا وجوہ ہیں۔ اگر میرے خلاف کوئی الزامات ہیں تو ظاہر کیے جائیں اور اگر کوئی ٹھوس معاملات ہیں تو اسلام آباد میں انڈین ہائی کمیشن کو کیوں نہیں مطلع کیا گیا۔ وہ مجھے ویزا ہی جاری نہ کریں۔



ڈائریکٹر صاحب غور سے سن رہے ہیں۔ لیکن جواب وہی ہے کہ فائل آجائے تو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ اسی روز سہ پہر کو دوبارہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کا چکر لگتا ہے۔ فائل ابھی تک نہیں آئی ہے۔ اگلی صبح 11 بجے کا وقت طے ہوا ہے۔ دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ جو بھی اگلی پرواز ملے اس سے روانگی ہو جائے۔ اس ملک کو جتنی جلد چھوڑ دیا جائے اچھا ہے۔

کرن سائمنی Peace Initiative نکالتے ہیں۔ ٹریولنگ سیمینار میں امریکہ کے ساتھ شریک میزبان بھی رہے ہیں۔ پچھلے برس ان سے کافی ملاقات رہی تھی انہیں معلوم ہوا ہے تو فون کیا ہے کہ شام کو وہی جیم خانے میں ملوں۔ کچھ احباب سے ملاقاتیں ہوں گی۔ ذہنی کیفیت ملنے لانے کی تو نہیں۔ لیکن یہ سوچتا ہوں کہ بھارتی حکومت کی میزبانی اور حسن سلوک کا احوال تو بھارت کے صحافیوں، دانشوروں اور پبلشروں تک پہنچ سکے گا۔

ریٹائرڈ فوجیوں، ہیرو ڈگریوں، دانشوروں، سینئر صحافیوں کی گپ شب سے جیم خانہ گونج رہا ہے۔ کرن ساہنی جس جس کو بتاتے ہیں۔ سب اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں، کالم نویس کالم لکھنے کا اظہار کرتے ہیں۔ کچھ متعلقہ حکام سے بات کرنے کا عزم ظاہر کرتے ہیں اور پھر اپنی گپ شب میں مست ہو جاتے ہیں۔

اگلی صبح پھر ڈائریکٹر ہوم کے دفتر میں پہنچتے ہیں۔ اردو اخبارات میں خبر آ چکی ہے کسی انگریزی اخبار میں نہیں آئی ہے۔ حالانکہ کچھ کو بتایا بھی گیا ہے۔ ڈائریکٹر ہوم پھر فائل نہ آنے کا عذر ظاہر کرتے ہیں۔ ایک بار پھر سہ پہر کو آنے کا کہتے ہیں۔ میں پاکستان ہائی کمیشن واپس جاتے وقت پی آئی اے سے اگلے روز کی سیٹ بک کروا لیتا ہوں۔ اب اس سلوک کے بعد میرا اس ملک میں ٹھہرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور جو بھی اگلی پرواز دستیاب ہو اس سے جانا چاہتا ہوں۔ سہ پہر میں آتے ہیں۔ تو ہماری فائل شرماد صاحب کی میز پر موجود ہے۔ فائل بہت ضخیم ہو چکی ہے۔ کئی فائلیں تیار ہیں۔ لیکن اس میں کیا ہے یہ شرماد صاحب نہیں بتا رہے۔ وہ

اپنے اعلیٰ افسروں کو بتائیں گے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ میں اس پر رپورٹ تیار کر رہا ہوں۔ آپ کچھ دن ٹھہرنا چاہیں۔ ٹھہریں۔ جن سے ملنا چاہیں۔ ملیں۔ فائل کو نمٹانے میں کچھ دن لگ سکتے ہیں۔

میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ میرے پاسپورٹ پر Exit جانے کی مہر لگا دیں میں تو واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی سیٹ بک کروا چکا ہوں۔ میں کسی کو بھی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا، کیونکہ یہاں جس سے بھی ملوں گا۔ بعد میں سی آئی ڈی اور رازدالے اس کو تنگ کرتے رہیں گے۔

شرما کا کہنا ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں آپ کو خط دے دوں گا۔ کمرے سے اٹھ کر ہم انتظار گاہ میں جائیں گے۔ کیونکہ شرماد صاحب کو کسی میٹنگ کے لیے جانا ہے۔ انتظار گاہ غیر ملکیوں سے بھری ہوئی ہے۔ کسی کا مسئلہ زیادہ ٹھہر جانے کا ہے۔ کسی کے پاسپورٹ میں کوئی غلطی ہے۔ ایک ہنگامہ ہے۔ شور ہے۔ گوریے تو انڈین افسروں کو خوب بے لفظ سناتے ہیں۔ یہ افسر نسلی سے سنتے ہیں۔ پاکستانی، نیپالی، بنگلہ دیشی، سری لنکن، دب کے بات کرتے ہیں۔ ہے جرم بعض کی سزا مرگ مفاجات۔

جس کلرک نے یہ خط ہمیں دینا ہے۔ وہ نظر تو آ رہا ہے۔ وہ کبھی کسی کمرے میں جا رہا ہے کبھی نہیں۔ اسے کسی ڈائریکٹر سے دستخط کروانے ہیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ ہمیں ایک خط دیتا ہے۔ جو ایک ڈی آئی جی پولیس کے نام ہے۔ ہم اس سے کہتے ہیں کہ ہمارا ویزا تو پولیس حاضری سے مستثنیٰ ہے۔ ہم پولیس کے پاس کیوں جائیں۔ اس کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ ہمیں پھر یہیں بھیجے گا۔ کیونکہ اس کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں بنا۔

دو روز سے ہم اس دفتر میں بار بار آ رہے ہیں۔ بھارت آنا میری کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ سب قریبی رشتے دار یہیں تھے۔ لیکن سب اب یادوں میں ڈھل چکے ہیں۔ کچھ کے تو پاکستان بننے وقت شہید ہونے کی تصدیق ہو گئی تھی۔ کچھ کا پتا ہی نہیں چلا کہ کہاں گئے۔ میرے والدین اور ایک بھائی۔ اس وقت انبالے میں



تھے۔ اس لیے ہم زندہ بچ گئے تھے۔ خاندان ہمارا منقسم تو ہے۔ لیکن ایک طرف صرف یادیں ہیں۔ کوئی زندگی نہیں جس سے ملنے آنا پڑے۔

یہاں موجود پریشان حال پاکستانی تو سیکڑوں وہ ہیں جن کے عزیز واقارب یہاں ہیں۔ سگے پیارے یہاں ہیں۔ ان کی تو مجبوری ہے۔ انہیں تو یہاں آنا پڑتا ہے اور یہاں والوں کو وہاں جانا پڑتا ہے۔ ان کو دونوں طرف کے ڈائریکٹر، افسر، کلرک، تنگ کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اس وقت رشتہ انسانیت کا نہیں رہتا۔ غیر ملکی کا ہو جاتا ہے۔ قانون خود تو کچھ نہیں کہتا۔ قانون کا استعمال اپنی مرضی سے کیا جاتا ہے۔ پولیس کے نام خط تو ہم اس کلرک کو واپس کر دیتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ ہمیں تو پاسپورٹ پر Exit لگا دیں۔ تاکہ ہم یہاں سے اپنے وطن واپس چلے جائیں۔ اگر Exit نہیں لکھا ہوگا تو ایئر پورٹ والے پھر روکیں گے۔

دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے اب پاسپورٹ پر کوئی Exit لگانے والا نہیں ہے۔ ایک دن اور یہاں گزارنا ہوگا۔

بی آئی اے کی پرواز شام کو ہے۔ ہم صبح اٹھے پھر ہوم آفس پہنچ گئے ہیں جہاں اسی طرح ہنگامہ ہے۔ ہجوم ہے۔

ڈائریکٹر صاحب خوش قسمتی سے مل گئے ہیں۔ انہوں نے متعلقہ کلرک سے کہہ بھی دیا ہے کہ پاسپورٹ پر Exit لکھ دے۔ انہیں فوراً ہی کسی مینٹگ میں جانا ہے وہ جلد آنے کا کہہ کر نکل گئے ہیں۔ ہم پھر انتظار گاہ میں بیٹھے ہیں۔ کلرک نے پاسپورٹ پر لکھ دیا ہے۔ لیکن اب دستخط اور مہر کا انتظار ہے۔ ڈائریکٹر صاحب کا کچھ پتا نہیں ہے۔ ان کا اسٹاف کہتا ہے انتظار کریں۔ ان کے پڑوس میں ایک دوسرے ڈائریکٹرز ہیں ان سے درخواست کی ہے کہ آپ دستخط کر دیں۔ میں تو یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا سنگین مسئلہ تو نہیں ہے۔

وہ صاف انکار کر دیتے ہیں کہ پاکستانی شہریوں کا شعبہ میرا نہیں ہے ہم برآمدوں میں چکر لگا رہے ہیں۔ کسی ڈائریکٹر کی تلاش ہے۔

اجتلاف میں سے ہی کسی نے مشورہ دیا ہے کہ

READING  
Section

یہاں کے جوائنٹ سیکریٹری بہت اچھے افسر ہیں ان سے مل لیں۔ ان کا اسٹاف حیل و حجت کرتا ہے کہ صاحب مصروف ہیں۔ ابھی تو ملنا مشکل ہے۔ اب میرا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اس لیے میں جوائنٹ سیکریٹری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاتا ہوں۔ انہیں اپنا تعارف کرواتا ہوں۔ وہ سردار جی ہیں۔ ان کی پیشانی پر تل نہیں آتا۔ اطمینان سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ میرے ساتھ پاکستان ہائی کمیشن کے افسر ہیں۔ وہ اپنا تعارف کرواتے ہیں۔ تب جوائنٹ سیکریٹری کا چہرہ کچھ کرخت ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ میرا مسئلہ سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ جانا چاہتے ہیں تو ہم مہر لگا دیتے ہیں۔ لیکن آپ کے معاملے پر اعلیٰ سطح پر بات بھی ہو رہی ہے۔ میں نے فائل وزارت خارجہ کو بھیجا دی ہے۔ آگ آپ کلیئرنس کا انتظار کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ میں اب ذہنی طور پر اس کیفیت میں نہیں ہوں کہ ایسے ماحول میں رہ سکوں۔ اس لیے میں واپس ہی جانا چاہتا ہوں اور مجھے آج ہی جانا ہے۔

وہ کسی سے فون پر بات کرتے ہیں اور اپنا ایک اسٹاف ممبر ساتھ بھیجتے ہیں اور ہم اسی ڈائریکٹر کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں جو کچھ دیر قبل صاف انکار کر چکے تھے کہ پاکستانی شہری ان کا شعبہ نہیں ہیں ہمیں شاک سے سیٹ پر بٹھاتے ہیں اور متعلقہ کلرک کو بلا کر فائل دیکھتے ہیں۔ پاسپورٹ پر اپنے آٹو گراف عنایت کرتے ہیں۔ چیرا سی کو کہتے ہیں کہ مہر لگالائے پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیتے ہیں۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

بی آئی اے کی پرواز میں اب دو گھنٹے باقی ہیں۔ مفتی جمیل الدین سے میں درخواست کرتا ہوں کہ ایئر پورٹ جانے سے پہلے ہستی نظام الدین میں حاضری دینا ہے۔ کچھ دعائیں مانگ لیں۔ کچھ گلے کر لیں۔

اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جب بھی دہلی آنا ہو۔ تو ہستی نظام الدین اولیا جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ مزاروں پر حاضری۔ گدی نشینوں سے گفتگو پاک بھارت



تعلقات میں بہتری کی دعائیں۔

وہی ہجوم زائرین۔ عشق کا اظہار۔ فریادیں۔

الہجائیں۔

اب ایئرپورٹ روانگی ہے۔ دلی پہلے بھی آئے ہیں۔ یہ سفر عجیب ہو رہا ہے۔ پہلے دوسروں کے خرچ پر آتے رہے ہیں۔ کبھی بھارتی حکومت کی دعوت پر، کبھی امریکی محکمہ اطلاعات، ایک بار افغانستان حکومت کی دعوت پر کابل جانا تھا تو یہاں سے ہی گزرنا پڑا تھا۔ جاتے وقت بھی اور آتے وقت بھی۔ افغانستان کی سرحد پاکستان سے ملتی ہے۔ کابل بھی پاکستان سے نزدیک ہے۔ لیکن اس وقت نجیب اللہ کی حکومت تھی۔ پاکستان سے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس لیے پشاور سے بھی کسی کو کابل جانا ہوتا تھا۔ وہاں سے آریانہ ایئر لائن پکڑ کر کابل جاتا تھا۔ یہ تاریخ کے جبر کے مظاہر ہیں۔ ان سے بچاؤ نہیں ہے۔ دلی میں یہ تین راتیں غضب رہی ہیں۔ دلی نے کیا رنگ دکھائے ہیں۔ اب کے اپنے خرچ پر آئے ہیں تو یہ سلوک ہوا ہے۔ مشاعرے والوں کو ٹکٹ کے پیسے اور شاعری کا معاوضہ دینا تھا۔ وہ تو گیا کیونکہ مشاعرے میں پہنچتے تو پیسہ ملتا۔ اپنے خرچے پر یہاں آ کر۔ ذہنی کلفت اور ذلت برداشت کی ہے۔

میں نے اس سرزمین پر ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ ٹرانزٹ سیل میں سینڈویچ اور منزل واپس پر جو ۵ روپے خرچ ہوئے۔ اس کے بعد میں نے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔ خریداری بالکل نہیں کی۔ پہلے ساڑھیاں، کاجو، الایچی وغیرہ خریدنا ایک معمول تھا۔ فرمائشیں بھی ہوتی تھیں۔ اب کے بھی تھیں۔ لیکن احتجاجاً میں نے بھارت کے زر مبادلہ کے ذمہ دار میں ایک ڈالر کا بھی اضافہ نہیں کیا ہے۔

امیگریشن کے کاؤنٹر پر کچھ حیرتوں کا اظہار ہے۔ لیکن روکا نہیں جا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی دھڑکا لگا ہوا ہے۔ جب تک ٹرانزٹ میں جا کر نہیں بیٹھ گیا ہوں اس وقت تک خدشہ ہی رہا کہ کہیں روک لیا جاؤں۔

لی آئی اے کے جہاز کی کھڑکی سے میں دہلی

ایئرپورٹ پر الوداعی نظر ڈال رہا ہوں۔ اب بھی ڈر رہا ہوں کہ کوئی جہاز نہ آ جائے۔

پرواز ٹیک آف کر رہی ہے۔ دہلی ایئرپورٹ نظروں سے اوجھل ہو رہی ہے۔ میں اپنے آپ میں بحال ہو رہا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجالا رہا ہوں کہ اس اذیت گاہ سے نجات ملی ہے۔

میں راستے میں سوچ رہا ہوں کہ اب مجھے اپنے اس مسئلے پر بھرپور احتجاج کرنا ہے۔ دنیا کو بتانا ہے کہ دہلی ایئرپورٹ پر پاکستان کے سب سے بڑے اخبار کے ایڈیٹر کے ساتھ کیا ہوتا رہا۔

دہلی سے لاہور پہنچ گئے ہیں۔ لاہور میں کسی سے ملنے کا جی نہیں ہے۔ ایئرپورٹ سے ہی کراچی کی اگلی پرواز میں بیٹھنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ سیٹ مل گئی ہے۔ ایک اذیت بھرا سفر ختم ہو گیا ہے۔ اب اپنے وطن میں ہیں۔ ایک عذاب سے نکل آئے کی خوشی۔ ایک کرب سے نجات کی تسکین۔

کراچی پہنچ کر میں نے اپنا احتجاجی سفر شروع کر دیا ہے۔ بھارتی اخبارات کے ٹیکس نمبر اور ای میل ایڈریس لے کر آیا ہوں۔ انھیں اپنی روداد بھیج رہا ہوں۔ ہندوستان ٹائمز، ٹائمز آف انڈیا نے یہ روداد چھاپ دی ہے۔ ٹائمز آف انڈیا میں خطوط کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ حقوق انسانی کی تنظیمیں۔ صحافیوں کی انجمنیں احتجاج کر رہی ہیں۔ بھارتی حکومت کے رویے کی مذمت کر رہی ہیں۔ ڈائریکٹر ہوم شرمانے بیان دیا ہے۔ صحافی قدرے نازک مزاج ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ محمود شام سے متعلق کچھ انکوائریز انھیں ان کا جواب ضروری تھا۔

کوئی سوال پوچھا جائے تو جواب ملتا ہے۔ مجھ سے تو کبھی کچھ نہیں پوچھا گیا۔ میں نے گزشتہ بار بھی بھارت کے ہائی کمشنر کو خط لکھا تھا۔ اس کا جواب بھی نہیں آیا تھا۔ اس بار بھی خط لکھا۔ کوئی جواب نہیں۔

اب پارٹھا سارثی ہائی کمشنر بن کر آئے ہیں۔ وہ کراچی کے ایک طویل عرصے تک تو نصل جنرل رہے ہیں۔ ان سے یہاں اچھی ملاقات رہی ہے۔ انھیں بھی باضابطہ خط لکھا ہے۔ جواب تحریری طور پر انھوں نے

بھی نہیں دیا ہے۔ زبانی کہا ہے کہ اب آپ جائیں گے۔ تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی لیکن میں تو اب اس طرح جانا ہی نہیں چاہتا۔

ہم نے ایک خط سیکریٹری وزارت خارجہ پاکستان کو بھی لکھا ہے۔ جس کے جواب میں انڈیا ڈپٹی سیکریٹری جیل احمد نے ۵ جون ۱۹۹۸ء کو لکھا کہ ہم نے اسلام آباد میں بھارتی ہائی کمشنر سے بھی اس معاملے پر رابطہ کیا ہے اور نئی دہلی میں اپنے ہائی کمیشن سے کہا ہے کہ وہ بھارتی حکام سے اس مسئلے پر بات کریں۔

نئی دہلی کے سابق چیف جسٹس راجندر پچرنے مجھے بھی خط بھیجا۔ جو بھارتی اخبارات میں بھی شائع ہوا۔ وہ اقوام متحدہ کی مختلف کمیٹیوں کے رکن بھی رہے ہیں اور اب وہ شہری آزادیوں کی غوامی یونین کے صدر بھی ہیں۔ انھوں نے بھارتی حکام کے رویے کی سخت مذمت کی اور مجھے لکھا کہ وہ یا کہ بھارت گہرے دوستانہ تعلقات کی خواہش اور یقین رکھتے ہیں اس لیے وہ یہ اپیل کریں گے کہ میں بھارت بھی نہ آنے کے فیصلے پر نظر ثانی کروں۔ ریڈیکل ہیومنسٹ ایسوسی ایشن نئی دہلی کے سیکریٹری این ڈی سینولی نے بھی ذاتی طور پر خط لکھ کر مجھ سے ہمدردی ظاہر کی اور کہا کہ وہ بھارتی حکومت سے اس مسئلے پر احتجاج بھی کر رہے ہیں۔ انڈین جرنلس یونین کے سیکریٹری جنرل سری نواس ریڈی، انڈیا پاک جوہلی پچر ساہارو کے کنوینر کے لی تلک نے اس سلسلے میں وزیراعظم کو خطوط اور امیگریشن حکام کے اس رویے پر احتجاج کیا۔ انھوں نے اذرا و کرم مجھے بھی ان خطوط کی نقول بھیجیں۔

بھارت میں بے شمار انجمنوں نے اس مسئلے پر احتجاج کیا اور مجھے بھی ہمدردی کے خطوط لکھے اور مسئلہ حل ہونے تک احتجاج جاری رکھنے کی یقین دہانی کروائی لیکن ہریانہ اردو اکادمی نے ہمیں کوئی خط نہ لکھا۔ نہ حکومت سے کوئی بات کی۔ اس تنظیم نے ہمیں دعوت دی تھی اور اس قابل سمجھا تھا کہ کل ہند غالب سیمینار و انڈیا پاک مشاعرے میں شرکت کر سکیں۔ ان کی طرف سے آج تک کوئی خط موصول نہیں ہوا۔

ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ ان کو علم ہی نہ ہوا ہو کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے۔

### مسائل ہمارے..... ظلم امریکہ کو

امریکی محکمہ اطلاعات کے زیر اہتمام پاک بھارت سفیری سیمینار پہلے تو مجھے حیرت ہوئی۔ پھر پریشانی کہ جھگڑا تو یہ دو قریبی دیوار بہ دیوار ہمسایوں کا ہے۔ اس میں ہزاروں میل دور..... بلکہ زمین کی دوسری سمت واقع امریکہ کو فکر کیوں ہو رہی ہے کہ ہمارے تعلقات بہتر کروائے۔ ہم تو بچپن سے سنتے آ رہے ہیں کہ دونوں ملکوں کے تعلقات خراب کروانے والا ہے ہی امریکہ۔ پھر قدرے اطمینان اور خوشی بھی ہوئی کہ جب امریکہ نے بھارت پاکستان کو قریب لانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ تو دونوں ملک شاید نزدیک بھی آجائیں۔

تمہیں نے درد دیا ہے۔ تمہی دوادینا۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ دونوں کو یہ احساس تو ہو جائے کہ انہیں ٹھوڑا یا جا رہا ہے۔ دونوں تو بڑے خلوص اور جوش جذبے سے لڑ رہے ہیں۔

امریکی محکمہ اطلاعات نے پاکستان اور بھارت کے صحافیوں، ایڈیٹروں پر مشتمل ایک 'سفیری سیمینار' کا اہتمام کیا ہے، جس کا موضوع ہے۔ "تنازع طے کرنے میں میڈیا کا کردار" کچھ ایڈیٹر۔ سینئر صحافی اور کالم نویس بھارت سے پہلے پاکستان آئیں گے۔ پھر ان کے ساتھ ہی پاکستان کے ایڈیٹر۔ سینئر صحافی اور کالم نویس بھارت جائیں گے۔ ادھر لاہور، اسلام آباد، کراچی میں سیمینار ہو رہے ہیں۔ ادھر نئی دہلی اور ممبئی میں سیمینار منعقد ہوں گے۔

۲۴ فروری ۱۹۹۷ء

لاہور۔ پریل کانٹی نینٹل کے ایک کمرے میں سیمینار کے شرکاء کی تعارفی ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ پاکستان کے مختلف علاقوں سے بچپنے والے اور ادھر بھارت سے آنے والے۔ امریکیوں کے ذریعے ایک دوسرے سے متعارف ہو رہے ہیں۔ صدیوں سے اکٹھے رہنے والے۔ نصف صدی سے الگ ہوئے تو انہیں ملنے کے لیے ایک ثالث کی ضرورت پڑی ہے۔



وقت شاید ہے کہ مسائل ٹائٹون کے ذریعے ہی حل ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایک دوسرے کو پہلے سے بھی جانتے ہیں۔

ہوئے سفید قام، سیاہ قام آفیسرز پاکستان اور بھارت دو ہمسایوں کے ایڈیٹرز کے درمیان رابطہ بن رہے ہیں۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان قربتوں کا آغاز شہر ستمبر لاہور سے ہو رہا ہے۔ جو ۱۹۶۵ء میں بھارتی جارحیت کا نشانہ بنا تھا۔ جس جیم خانہ میں جنرل چوہدری نے جام نوش کرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ پرل کائی نیشنل ہوٹل سے بہت نزدیک ہے۔ جنرل چوہدری کو اس وقت حسرت ہی رہ گئی۔ لیکن اب بھارت کے کئی ریٹائرڈ جنرل ٹریک ٹو ڈیپلومیسی کے سلسلے میں پاکستان آرہے ہیں۔ تو وہ جام نوش کرنے کی حسرت پوری کر لیتے ہیں۔ یہ جنرل، بیورو کریٹ جب حاضر سروس ہوتے ہیں۔ تو پاکستان کے خلاف جارحیت کو فرض اولین سمجھتے ہیں۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کے چیمپئن بن جاتے ہیں۔

میں پہلی بار کسی ایسی کوشش میں شامل ہو رہا ہوں۔ پہلے بھی ایسے سیمینار ہو چکے ہیں۔ ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ماضی میں ان میں شرکت کرنے والے کچھ نہیں بتا رہے ہیں۔ یہی احساس ہو رہا ہے کہ فالو اپ کا سلسلہ کمزور ہے۔ اسلام آباد امریکی سینٹر کے فرسٹ سیکریٹری کلچرل آفیسرز۔ جناب تھیوڈور ایچ۔ جیوں کی طرف سے سیمینار سے متعلقہ خط میں یہ سوالات کیے گئے ہیں۔

۱۔ آپ کے ادارے نے بھارت اور پاکستان کے لوگوں کے درمیان حالات کی بہتری کے لیے پہلے کیا کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلے میں کسی دوسرے کی ایسی کوششیں جو آپ کے نزدیک قابل حسیں رہی ہو۔

۲۔ کیا پاکستانیوں اور بھارتیوں کے ذرائع ابلاغ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات بہتر کرنے میں تعاون کر رہے ہیں۔ کیسے اور کیوں؟

۳۔ پاکستانیوں اور بھارتیوں کے درمیان اختلافات طے نہ کر سکنے میں بنیادی رکاوٹ آپ کے خیال میں کیا ہے۔

۴۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کم کرنے کے لیے آپ کے اخبار کے قارئین کیا کر سکتے

بھارت سے آنے والوں میں سرش بانا۔ ایگزیکٹو ڈائریکٹر۔ بلنز ویلی ڈاکٹر اردن کمار بینر جی۔ ڈائریکٹر اسٹریٹجک اسٹڈیز۔ کلکتہ۔

سمن چیٹو پادھیال۔ ایگزیکٹو ایڈیٹر۔ آئند بازار پتھریکا۔ کلکتہ۔

کے این ہری کمار۔ چیف ایڈیٹر۔ دکن ہیرالڈ۔ بنگلور۔

ریٹائرمنٹ۔ فری لانس جرنلسٹ۔ نئی دہلی۔ ڈاکٹر عبدالرحیم، چیئر مین۔ شعبہ صحافت۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔

کرن رنبیر ساہنی۔ ڈائریکٹر انٹرنیشنل سینٹر فار پیس اینی شیتھ۔ نئی دہلی۔

ٹیسٹاسٹیا ٹوڈ۔ ایڈیٹر کیوٹلزم کمبیٹ۔ ممبئی۔ شاہد صدیقی۔ ایڈیٹر۔ نئی دنیا۔ نئی زمین۔ عوام۔ نئی دہلی شامل ہیں۔

پاکستان سے شرکت کرنے والوں کے نام یہ ہیں۔ راقم الحروف، طارق محمود شام۔ ایڈیٹر روزنامہ جنگ کراچی۔

سید جاوید اقبال۔ ایڈیٹر سائڈ لائن ایشیا۔ تھرڈ ورلڈ۔ کراچی۔

انجم ابراہیم۔ ریڈیڈنٹ ایڈیٹر بزنس ریکارڈر۔ کراچی۔

ریحانہ حکیم۔ ایڈیٹر ماہنامہ نیوز لائن کراچی۔ خالد احمد۔ ایڈیٹر۔ آج کل۔ فرائینڈس ٹائمز۔

لاہور۔

قدرت اللہ چوہدری۔ ایڈیٹر پاکستان لاہور۔ پہلی شام تو ملنے ملانے میں گزر رہی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان دوریاں ختم کرنے کی کوششیں کرنے والے پہلے اپنے درمیان دوریاں کم کر رہے

ہیں۔ امریکی محکمہ اطلاعات کراچی، لاہور، اسلام آباد کے کلچرل آفیسرز۔ پبلک آفیسرز کے امریکہ سے آئے

ہیں۔ وہ کون سے عناصر ہیں۔ جو بھارتیوں اور پاکستانیوں میں سے مضبوطی سے اپنے اختلافات دور کرنا چاہتے ہیں اور کون سے عناصر ایسا نہیں چاہتے۔

سوالات بنیادی ہیں۔ ہم تو اس سلسلے میں برسوں سے کوششیں کر رہے ہیں۔ میں تو اس وقت بھارت گیا تھا۔ جب دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات بھی نہیں تھے۔ سوئس سفارت خانہ پاکستان میں بھارت کے مفادات کی اور بھارت میں پاکستان کے مفادات کی نگرانی کرتا تھا۔ کتنے لوگوں سے ملے۔ کتنے ہفتوں تک ان موضوعات پر لکھا۔ یہ سفر نامہ بہت مقبول ہوا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پاکستان بھارت دونوں کے شہری آپس میں قریبی تعلقات چاہتے ہیں۔

امریکہ سے ایک نامور صحافی آر تھر چیرٹی خاص طور پر ان سیمینار میں ماڈریٹ کا کردار ادا کرنے آئے ہیں۔ وہ پبلک جرنلزم (عوامی صحافت) کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کتابیں بھی لکھ چکے ہیں۔ کئی ممالک میں تنازعات کے تصفیے کے لیے صحافیوں کی تربیت کرتے رہے ہیں۔ اڈناہ سٹیزن میں بین الاقوامی امور پر ادارہ نگار رہے ہیں۔ نیویارک یونیورسٹی میں پبلک لائف اینڈ دی پریس (عوامی زندگی اور صحافت) کے منصوبے سے وابستہ ہیں۔

۲۵ فروری ۱۹۹۷ء

آر تھر چیرٹی پبلک جرنلزم کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کر رہے ہیں۔ پہلی نشست کا موضوع ہے۔ میڈیا کے مطابق بھارتیوں اور پاکستانیوں کے راستے میں آخر کیا رکاوٹ ہے جو ایک مشترکہ مقصد کا احساس نہیں ہونے دیتی پاکستانی اور بھارتی صحافی اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اپنے نکات پر زور دے رہے ہیں۔ اصل مقررین پاکستان سے سید جاوید اقبال اور بھارت سے شاہد صدیقی ہیں۔ سب نے حصہ لیا ہے اور بڑے کام کی باتیں کی ہیں۔

دوسری نشست میں موضوع سخن ہے۔ ادارے اور افراد (سیاسی جماعتیں تجارتی صنعتی تنظیمیں۔ مذہبی رہنما۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات بہتر بنانے کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟

اصل مقررین پاکستان سے انجم ابراہیم۔ بھارت سے ٹیسا سٹیل واڈمیں۔ دونوں خواتین نے بڑے موثر پیرائے میں اس انتہائی اہم موضوع پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس امر پر دونوں متفق ہیں کہ دونوں ملکوں کی سیاسی جماعتیں اور مذہبی رہنما تو تعلقات خراب کرنے میں پیش پیش ہیں۔ ان سے کوئی امید رکھنا عبث ہے۔

تیسری نشست میں موضوع یہ ہے۔ ایسے کون سے مخصوص کام ہیں جو بھارتی یا پاکستانی مذاکرات میں حائل مخصوص رکاوٹوں کو دور کر سکتے ہیں۔ یا افراد اور اردوں کو تعمیری رویدہ رکھنے میں آسانی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس نشست کے اصل مقررین ہیں خالد احمد پاکستان سے اور سمن چھانٹو یادھیا بھارت سے۔۔۔۔۔

موضوع انتہائی حساس ہے۔ دلچسپ ہے۔ بہت بھرپور مباحثہ رہا ہے۔ میں تو پہلی بار کسی ایسے سیمینار میں شرکت کر رہا ہوں۔ اس لیے اب جا کر کچھ سمجھنے لگا ہوں کیا ہوتے ہیں۔ بات کرنے کی ادا کیا ہے۔

بات کرنے کی ادا ہوتی ہے  
تکھت گل بھی صدا ہوتی ہے

کھلی بحث میں سب شرکت کرتے ہیں۔ آر تھر چیرٹی دن بھر کی بحث کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔ امریکی تو نصل خانے کی طرف سے رات کو استقبال دیا گیا ہے۔ جہاں لاہور کے نامور سیاست دانوں، ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں سے ملاقاتیں رہتی ہیں۔

پہلے دن کی نشستوں میں اکثر شرکاء ان امور پر ایک دوسرے کے قریب نظر آ رہے ہیں۔

۱۔ دونوں ملکوں میں اخبارات و رسائل آسانی سے دستیاب ہونے چاہئیں۔ ان کا روزانہ مطالعہ عام شہریوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لاسکتا ہے۔ سمجھنے میں مدد کر سکتا ہے۔

۲۔ اس وقت دونوں ملکوں کے عام لوگوں کے درمیان رد وابط کانی نہیں ہیں۔

۳۔ یہ بھی شکایات سامنے آئیں دونوں طرف میڈیا اشتعال انگیز بیانات شائع کرتا ہے۔

۴۔ پاکستانیوں، بھارتیوں، ہندوؤں اور



جائیں جو پاکستانیوں اور بھارتیوں کو قریب لانے کے لیے غیر معمولی کردار ادا کریں۔  
یہ بھی زیر بحث آیا کہ نیلی ویژن چینل اور انٹرنیٹ اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

۲۶ فروری ۱۹۹۷ء

اب ہم آباد میں ہیں۔

سفری سیمینار کا یہ دوسرا باقاعدہ دن ہے۔ لاہور سے صبح ہی ہم اسلام آباد پہنچے ہیں۔ امریکن سینٹر میں کچھ وقت سے پہلے ہی ظہرانہ ہو رہا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد انسٹیٹیوٹ آف اسٹریٹیجک اسٹڈیز میں سیمینار کے سلسلے میں نشست ہے۔ جسے تنازع کے تھیفے کے لیے ٹاؤن میٹنگ کا نام دیا گیا ہے۔ سیمینار کے مسافر تو وہی ہیں مقامی طور پر اہم شخصیتیں شرکت کر رہی ہیں۔ انسٹیٹیوٹ کے چیئرمین آغا عمر تقضی پو یا شرکا کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں اور امید ظاہر کر رہی ہیں کہ اس سفری سیمینار سے مسائل کے حل میں یقینا مدد ملے گی۔

سفری سیمینار کے سلسلے میں امریکی محکمہ اطلاعات کے کنٹری پبلک افیئر آفیسر بیوری واکے اچھائی تفصیل سے بتا رہے ہیں کہ یہ ساتواں ٹریولنگ سیمینار ہے۔ لیکن پہلی بار یہ زیادہ موثر اور نتیجہ خیز طریق کار کے تحت ہو رہا ہے۔ پہلے سیمینار میں مختلف پیشوں اور حلقوں سے وابستہ لوگ آئے رہے ہیں۔ اس بار یو ایس آئی ایس اسلام آباد میں ٹریک ٹواڈ پلومیسی کی ان کوششوں میں عام نشستیں اور ٹاؤن میٹنگیں بھی رکھی گئی ہیں جن میں ماہرین۔ ریٹائرڈ سفارت کار۔ جنرل بھی شرکت کر رہے ہیں۔ اس لیے اب یہ دائرہ کار پہلے سے زیادہ وسیع اور بامعنی ہو چکا ہے۔ آج بھی مختلف شعبوں سے وابستہ خواتین و حضرات کو دعوت دی گئی ہے۔ پہلے چھ سیمیناروں میں تجارت، معیشت، سیاحت، خاندانوں کا ملن، سیکورٹی دفاع، ایٹمی اسلحے کی تخفیف کے موضوعات کا سنجیدگی سے احاطہ کیا گیا ہے۔

آرتھر چیرٹی نے پبلک جرنلزم کے حوالے سے اس سیمینار کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر انہوں نے بحث کا سلسلہ شروع کروا دیا ہے۔ پاکستانی اور بھارتی شرکاء نے پاکستان اور بھارت کے درمیان موجود تمام

مسلمانوں میں گھسی پٹی فکر والے حلقے موجود ہیں۔ جو ۱۹۴۷ء کی حقیر سوچ سے باہر نہیں نکلے ہیں۔

۵۔ پاکستانیوں، بھارتیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو مشترکہ اقدار یا دلچسپیاں ہیں۔ وہ نمایاں نہیں کی جاتی ہیں۔

۶۔ دونوں طرف اگر بعض تنظیموں کی طرف سے کوئی تعمیری کام ہو بھی رہا ہے تو اس کی تشہیر نہیں کی جاتی۔

۷۔ تاریخ کا مطالعہ آزادانہ نہیں کیا جاتا۔  
۸۔ سول سوسائٹی کے ادارے (بمسابہ کیشیاں وغیرہ) تباہ کیے جا چکے ہیں۔

۹۔ ایک دوسرے کے محسوسات کا پاس نہیں رکھا جاتا۔

۱۰۔ مقبول عوام اخبارات و رسائل (ہندی۔ اردو۔ سندھی۔ انگریزی) ایک دوسرے تک اپنے خیالات نہیں پہنچاتے۔

۱۱۔ دونوں ملکوں کے درمیان تجارت جتنی ہو سکتی ہے۔ نہیں ہو رہی ہے۔

۱۲۔ انتہا پسندوں کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اعتدال پسندوں کو اہمیت نہیں دی جاتی۔

۱۳۔ بحران کا مقابلہ کرنے میں میڈیا بہت ست رفتاری کا مظاہرہ کرتا ہے۔

۱۴۔ دونوں ملکوں میں سول سوسائٹی کے گروپ ایک دوسرے کے وجود سے ناواقف ہیں اور آپس میں رابطے بھی نہیں ہیں۔

۱۵۔ ایک دوسرے کو درپیش مسائل اور تنازعات پر ہم خوش ہوتے ہیں ان کو مشترکہ مسائل اور تنازعات نہیں سمجھتے۔

کشمیر کے مسئلے پر بھی بار بار بات ہوتی ہے۔ اس پر دونوں طرف کے نمائندوں کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے۔ اس لیے اسے اگلے دن کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے۔

اس سے سب نے اتفاق کیا کہ اخبارات کو چاہیے کہ دونوں ملکوں کے عوام کو اس اور دوستی کے لیے تیار کریں۔ تربیت دیں۔

یہ بھی تجویز آئی کہ ایسے صحافیوں کو ایوارڈ دیئے

دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے اخبارات و رسائل دستیاب ہونے چاہئیں۔

۶۔ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان کافی معقول رابطہ نہیں ہے۔

۷۔ تجارت میں اضافے کے لیے بھی تجاویز آئیں۔

۸۔ سفری سیمیناروں میں پبلک کی شرکت یقینی بنانے سے دونوں طرف کے دانشوروں اور صحافیوں کی سوچ عام لوگوں تک پہنچ سکے گی۔ اس لیے ان سیمیناروں کی کارروائی کو خفیہ نہ رکھا جائے۔

۹۔ تعمیر قوم کے نام پر تاریخ کو مسخ نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں طرف ایسا ہو رہا ہے۔

۱۰۔ اخبارات جب تک دونوں ملکوں میں دستیاب نہیں ہیں۔ یو این آئی ایسا انتظام کرے کہ ایڈیٹرز کالم نویس ایک دوسرے کے کالم۔ ادارے روزانہ پڑھ سکیں۔ اس سے ان کی اپنی تحریر میں معروضیت پیدا ہوگی۔

۱۱۔ حکومتوں اور عوام کی سوچ اور نقطہ نظر میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے میڈیا کو چاہیے کہ وہ اس فرق کو واضح کرے۔

شام کا استقبال بیزی واگلے کی رہائش گاہ پر ہے۔ بہت سے پرانے رفقاء سے ملاقات رہتی ہے۔ دانشور، ادیب، صحافی، سیاسی، اقتصادی ماہرین سب ہی موجود ہیں۔ رہائش گاہ میں پینٹنگز کا انتخاب بہت متاثر کر رہا ہے۔

آج کی بحث نے معاملات کو اور واضح کیا ہے۔ کل کراچی روانگی ہے۔ جہاں جنگ فورم میں تنازعے کا تصفیہ کیے پر کھل کر بحث ہوگی۔

۲۷ فروری ۱۹۹۷ء

اپنے شہر میں ایک مسافر کی حیثیت سے واپسی ہے۔ ہوٹل میں بھی کمرہ ہے۔ لیکن گھر پیارا گھر۔ جنگ فورم۔ موضوع تنازع کے تعینے میں میڈیا کا کردار ہے۔ ایک دور درتہ بتا رہا ہیں۔ جسے ٹی وی چینلوں نے سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ روزانہ ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو جان رہے

تنازعات پر اپنے اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ سامعین نے بھی پھر مقررین سے۔ سیمینار کے شرکاء سے سوالات کیے ہیں۔ جن میں زیادہ تر کشمیر کے تنازعے سے متعلق ہیں۔ بعض سامعین اپنا تعارف بہت طویل کر دیتے ہیں۔ سوال کی بجائے تقریر کر ڈالتے ہیں۔ امریکی سفارت خانے کے انفارمیشن آفیسر پیٹر کلابن نے سفری سیمینار کے اغراض و مقاصد اور نواکب بیان کیے ہیں۔ آر تھر چیرٹی آج کی بحث کو سمیٹ رہے ہیں۔ آج کی بحث مختلف سمتوں میں رواں رہی ہے۔ یہ رجحانات اور اندازے سامنے آئے ہیں۔

۱۔ سیمینار کے ذریعے جس مکالمے اور رابطے کا آغاز ہوا ہے۔ اس کو جاری رکھنے کے کیا منصوبے ہیں۔ اس کے نتائج اور ثمرات عام لوگوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

۲۔ پاکستان اور بھارت کے بعض کالم نویس۔ ادارے نگار مسائل کے حل کی نشاندہی سے پہلو تھپی کے لیے ایسے لکھتے ہیں۔ جیسے ان کا ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جیسے وہ پاکستانی یا بھارتی قارئین کے لیے نہیں کسی اور ملک کے قارئین کے لیے لکھ رہے ہیں۔

۳۔ صحافیوں سے یہ توقع درست نہیں ہے کہ وہ صرف واقعات کی معروضی رپورٹنگ کریں۔ وہ نظریہ ساز بھی ہیں۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ پاکستان اور بھارت کے صحافیوں کے لیے تو یہ دلیل اور بھی وزنی ہے کیوں کہ یہاں کی مخصوص نضا میں کوئی صحافی بھی صرف معروضی رپورٹنگ نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کا تعلق پاکستان سے ہو یا بھارت سے۔

۴۔ سامعین اور شرکاء دونوں کے درمیان بحث سے یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ جنوبی ایشیا کو درپیش کشمیر جیسے دیرینہ اہم اور حساس مسائل پر زیادہ تر سوچنے کا اندازہ قدیم سے گھسا پٹا ہے۔ جب کہ بدلتی ہوئی عالمی نضا میں ان مسائل کے حل کے لیے اب نئے خیالات درکار ہیں مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نئے خیالات اور نئی طرز فکر کہاں سے آئے گی۔

۵۔ یہاں بھی بار بار یہ نکتہ زیر بحث آتا رہا کہ

۱۔ سیمینار کے ذریعے جس مکالمے اور رابطے کا آغاز ہوا ہے۔ اس کو جاری رکھنے کے کیا منصوبے ہیں۔ اس کے نتائج اور ثمرات عام لوگوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

۲۔ پاکستان اور بھارت کے بعض کالم نویس۔ ادارے نگار مسائل کے حل کی نشاندہی سے پہلو تھپی کے لیے ایسے لکھتے ہیں۔ جیسے ان کا ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جیسے وہ پاکستانی یا بھارتی قارئین کے لیے نہیں کسی اور ملک کے قارئین کے لیے لکھ رہے ہیں۔

۳۔ صحافیوں سے یہ توقع درست نہیں ہے کہ وہ صرف واقعات کی معروضی رپورٹنگ کریں۔ وہ نظریہ ساز بھی ہیں۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ پاکستان اور بھارت کے صحافیوں کے لیے تو یہ دلیل اور بھی وزنی ہے کیوں کہ یہاں کی مخصوص نضا میں کوئی صحافی بھی صرف معروضی رپورٹنگ نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کا تعلق پاکستان سے ہو یا بھارت سے۔

۴۔ سامعین اور شرکاء دونوں کے درمیان بحث سے یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ جنوبی ایشیا کو درپیش کشمیر جیسے دیرینہ اہم اور حساس مسائل پر زیادہ تر سوچنے کا اندازہ قدیم سے گھسا پٹا ہے۔ جب کہ بدلتی ہوئی عالمی نضا میں ان مسائل کے حل کے لیے اب نئے خیالات درکار ہیں مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نئے خیالات اور نئی طرز فکر کہاں سے آئے گی۔

۵۔ یہاں بھی بار بار یہ نکتہ زیر بحث آتا رہا کہ

۱۔ سیمینار کے ذریعے جس مکالمے اور رابطے کا آغاز ہوا ہے۔ اس کو جاری رکھنے کے کیا منصوبے ہیں۔ اس کے نتائج اور ثمرات عام لوگوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

۲۔ پاکستان اور بھارت کے بعض کالم نویس۔ ادارے نگار مسائل کے حل کی نشاندہی سے پہلو تھپی کے لیے ایسے لکھتے ہیں۔ جیسے ان کا ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جیسے وہ پاکستانی یا بھارتی قارئین کے لیے نہیں کسی اور ملک کے قارئین کے لیے لکھ رہے ہیں۔

۳۔ صحافیوں سے یہ توقع درست نہیں ہے کہ وہ صرف واقعات کی معروضی رپورٹنگ کریں۔ وہ نظریہ ساز بھی ہیں۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ پاکستان اور بھارت کے صحافیوں کے لیے تو یہ دلیل اور بھی وزنی ہے کیوں کہ یہاں کی مخصوص نضا میں کوئی صحافی بھی صرف معروضی رپورٹنگ نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کا تعلق پاکستان سے ہو یا بھارت سے۔

۴۔ سامعین اور شرکاء دونوں کے درمیان بحث سے یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ جنوبی ایشیا کو درپیش کشمیر جیسے دیرینہ اہم اور حساس مسائل پر زیادہ تر سوچنے کا اندازہ قدیم سے گھسا پٹا ہے۔ جب کہ بدلتی ہوئی عالمی نضا میں ان مسائل کے حل کے لیے اب نئے خیالات درکار ہیں مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نئے خیالات اور نئی طرز فکر کہاں سے آئے گی۔

۵۔ یہاں بھی بار بار یہ نکتہ زیر بحث آتا رہا کہ

۱۔ سیمینار کے ذریعے جس مکالمے اور رابطے کا آغاز ہوا ہے۔ اس کو جاری رکھنے کے کیا منصوبے ہیں۔ اس کے نتائج اور ثمرات عام لوگوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

۲۔ پاکستان اور بھارت کے بعض کالم نویس۔ ادارے نگار مسائل کے حل کی نشاندہی سے پہلو تھپی کے لیے ایسے لکھتے ہیں۔ جیسے ان کا ان مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جیسے وہ پاکستانی یا بھارتی قارئین کے لیے نہیں کسی اور ملک کے قارئین کے لیے لکھ رہے ہیں۔

۳۔ صحافیوں سے یہ توقع درست نہیں ہے کہ وہ صرف واقعات کی معروضی رپورٹنگ کریں۔ وہ نظریہ ساز بھی ہیں۔ چاہے آپ مانیں یا نہ مانیں۔ پاکستان اور بھارت کے صحافیوں کے لیے تو یہ دلیل اور بھی وزنی ہے کیوں کہ یہاں کی مخصوص نضا میں کوئی صحافی بھی صرف معروضی رپورٹنگ نہیں کر سکتا۔ چاہے اس کا تعلق پاکستان سے ہو یا بھارت سے۔

۴۔ سامعین اور شرکاء دونوں کے درمیان بحث سے یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ جنوبی ایشیا کو درپیش کشمیر جیسے دیرینہ اہم اور حساس مسائل پر زیادہ تر سوچنے کا اندازہ قدیم سے گھسا پٹا ہے۔ جب کہ بدلتی ہوئی عالمی نضا میں ان مسائل کے حل کے لیے اب نئے خیالات درکار ہیں مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نئے خیالات اور نئی طرز فکر کہاں سے آئے گی۔

۵۔ یہاں بھی بار بار یہ نکتہ زیر بحث آتا رہا کہ



ہیں۔ یہ رابطے سرکاری تعلقات اور ڈپلومیسی سے زیادہ موثر ہو رہے ہیں۔ اس لیے ٹریک نو ڈپلومیسی زیادہ کارگر ہو رہی ہے۔ امریکی محکمہ اطلاعات کے زیر اہتمام پاکستان اور بھارت میں ٹریولنگ سیمینار اس سلسلے کی کڑی ہے۔ یہ پروگرام ۱۹۹۲ء میں شروع کیا گیا تھا اور اس نے مختلف موضوعات پر دونوں متحارب ملکوں کے مختلف شعبوں سے وابستہ افراد اور حلقوں کو قریب تر لانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

آج مجھے دس منٹ تک اظہار خیال کرنا ہے۔ ہوم گراؤنڈ پر کھیلنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اسلام آباد سے کراچی سفر کے دوران میں نے گزشتہ دونوں کی بحث کی روشنی میں کچھ خیالات ترتیب دے لیے ہیں۔ لیکن جہاز سے اترتے وقت وہ اسی میں بھول گیا ہوں۔ اب پریشانی ہے۔ پی آئی اے کے شعبہ تعلقات عامہ کے چوہدری بشیر احمد یاد آرہے ہیں۔ انھیں فون پر زحمت دی ہے ہمیشہ کی طرح انھوں نے مشکل آسان کر دی ہے۔ کاغذات مجھے فورم کے آغاز سے پہلے ہی مل گئے ہیں۔

شہر کی مختلف شخصیتیں موجود ہیں۔ کچھ یو ایس آئی ایس اور کچھ جنگ کے حوالے سے مدعو کی گئی ہیں۔ ان میں وکلا بھی ہیں۔ سیاست دان بھی۔ اساتذہ بھی۔ دانشور بھی سب وطن کا درد رکھتے ہیں۔

سیمینار کے شرکا اب چند روز کی بحث کے بعد اگرچہ ایک ٹیم بن چکے ہیں۔ لیکن اپنے اپنے تعصبات میں کوئی زیادہ کی نہیں آئی ہے۔ کشمیر کے مسئلے پر بھارتی مندوبین کچھ زیادہ لچک کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ واپس اپنے انہی لوگوں میں جانا ہے۔ وہاں کیا جواب دیں گے، اس کے لیے بڑی ہمت چاہیے۔ اسی ڈر اور سمجھوتے میں پورے ۵۰ سال گزر رہے ہیں۔

زیادہ تر شرکا اور سامعین کا زور اس پر ہے کہ تاریخ کو سچ نہ کیا جائے۔ اخبارات و رسائل کا آپس میں تبادلہ ہونا چاہیے۔ ویزے کی شرائط کم سے کم کی جائیں۔ جنوبی ایشیا کے مسائل پر لکھتے ہوئے دونوں طرف کے اخبار نویس، کالم نگار، ایڈیٹوریل رائٹرز، خود ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کریں۔

کراچی جنوبی ایشیا میں صنعت و تجارت کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اس لیے یہاں یہ بھی بار بار کہا جا رہا ہے کہ دونوں ملکوں کے تاجروں صنعت کاروں کے درمیان روابط بڑھنے چاہئیں۔ ٹی وی چینلوں پر بزنس حلقوں کے درمیان مذاکرات ہوتے چاہئیں۔

یہ بھی تجویز پیش کی گئی ہے کہ سیمینار کے فالو اپ کے لیے دونوں ملکوں میں 'رابطہ کمیٹیاں' تشکیل دی جائیں۔ جن کے مراکز ایک طرف لاہور، کراچی، اسلام آباد، پشاور، کوئٹہ میں دوسری طرف دہلی، بمبئی، کلکتہ، چندی گڑھ، مدارس اور کالجوں میں قائم ہوں۔ سیمینار کی معاملات کو زیادہ باقاعدہ شکل دینے کے لیے کمیٹی کے ارکان دونوں ملکوں میں ناٹک ان اخبارات و رسائل کی نمائندہ، ایجنٹس اور اسی طرح دونوں طرف کی صحافیوں کی ایجنٹس نامزد کریں۔ اور موجودہ سابقہ سیمیناروں کی رپورٹیں کتابی شکل میں تیار کی جائیں اور دونوں ملکوں کے بڑے اخباروں، رسالوں اور چینلوں کے ایڈیٹرز، نیوز ایڈیٹرز، ایہم کالم نویسوں کو فراہم کی جائیں۔ یہ رابطہ کمیٹیاں سال بھر دونوں ملکوں کے میڈیا کے درمیان فعال واسطہ رکھیں۔ مختلف اخبارات اور چینلوں کے مذاکروں، خبروں، اداروں سے متعلقہ تراشے ایہم اخبارات کو فراہم کرتے رہیں۔

یو ایس آئی ایس نے جس طرح یہ پہل کی ہے۔ وہ اس طرح ایک بل کا کردار ادا کرتی رہے۔

شام کا استقبال امریکی محکمہ اطلاعات کی ڈائریکٹر پیٹریشا شارپ کی رہائش گاہ پر ہے۔ اس کے بعد عشائیہ سندھ اسمبلی کے ارکان غلام قادر پلیجو اور اقلیتی ممبر و مہر دل جاگوانی کی طرف سے ہے۔ جہاں محفل رقص و نغمہ بھی ہے۔ رقص اس قدر دلربا ہیں کہ ہمارے کچھ سیمیناری شرکا بھی محو رقص ہو گئے ہیں۔ سید جاوید اقبال اسے ٹریک تھری ڈپلومیسی کہہ رہے ہیں۔ خاتون شرکا بھی لطف اندوز ہو رہی ہیں۔ اگلی صبح روانگی ہے۔ پاکستان کے حصے کا سفری سیمینار انجام کو پہنچ رہا ہے۔

اس دلچسپ سفر نامے کی سنسنی خیز روداد گلے ماہ انہی صفحات پر ملاحظہ فرمائیے۔

# حسرت ناتمام!

ممتاز احمد



اُس دو شیزہ کی زندگی، ایک حسرت ناتمام بن کر رہ گئی تھی

وہ آج بھی ایک اسپتال میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے جی رہی ہے

کے حسن اور جوانی کا بھی خوب چرچا پورے گاؤں میں تھا۔ چوہدری نواز ش بھی نیزہ بازی اور گھڑ دوڑ کے بہت دلدادہ تھے۔ تو یہی وجہ تھی کہ ابو کی دوستی چوہدری نواز ش سے ہو گئی۔ حالانکہ اس وقت چوہدری نواز ش کی عمر پچاس سال تھی اور ابو صرف بائیس سال کے تھے۔ ابو کا اُن کے ہاں بہت آنا جانا تھا۔ پھر پتا ہی نہ چلا اب تک ای کی زلف کے اسیر ہو گئے۔ امی نے بھی جب ابو کو دیکھا تو پہلی نظر میں اپنا دل ہار بیٹھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں مبتلا ہو گئے۔

نانا جان ایک جہاندیدہ انسان تھے تو اُن کی نظر سے امی ابو کی محبت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ بہت جلد دونوں خاندانوں کی باہمی رضامندی اور مشاورت سے ابو کو چوہدری نواز ش کے داماد کا مقام مل گیا۔ امی ابو کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی، پانچ روز تک شادی کی تقریبات چلتی ہیں۔

شادی کے امی ابو کی محبت اور بڑھ گئی اور عشق میں بدل گئی دونوں یک جان دو قالب تھے۔ پورے گاؤں میں لیلیٰ مجنوں کے نام سے مشہور تھے۔ پورے گاؤں میں اُن کی محبت کے چرچے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اُن کا پیار مثالی تھا۔

شادی کے ایک سال بعد دلاور بھائی پیدا ہوئے اور

میرے والدین کی دو اولادیں ہیں ایک میں یعنی مسرت اور مجھ سے بڑا بھائی دلاور۔ ہماری رہائش عنایت پور گاؤں میں تھی۔ میرے ابو اپنے والدین (میرے دادا، دادی) کی اکلوتی اولاد تھے۔ تو اسی وجہ سے دادا کو میرے ابو سے بہت پیار تھا۔ گاؤں میں دو مربے زمین تھی اور کاشتکاری کے لیے اور زمینوں پر کام کے لیے مزارعے رکھے ہوئے تھے۔ زندگی بہت خوش حالی سے گزر رہی تھی۔ بڑا سا گھر تھا اور گھر میں بھی کام کاج کے لیے نوکرانیاں تھیں۔ میرے ابو کو گھڑ سواری کا جنون کی حد تک شوق تھا۔

وہ نیزہ بازی اور گھڑ سواری میں بہت مشتاق تھے۔ انھوں نے نئی قسم کے گھوڑے پال رکھے تھے۔ ہر سال نیزہ بازی اور گھڑ دوڑ میں باقاعدگی سے حصہ لیتے اور انعام جیت کر آتے۔ میرے ابو انتہائی خوب صورت گورے جے لے قد کے ساتھ وچیرہ جوان تھے۔ انتہائی رعب دار شخصیت کے مالک تھے وہ ہمیشہ بوٹوں کی میٹھی اور لٹھے کی شلوار پہنتے۔ مجموعی طور پر وہ مردانہ وجاہت کا عملی نمونہ تھے۔ گاؤں کی لڑکیاں ابو کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتیں اور ٹھنڈی آہیں بھرتی تھیں۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ ابو کی دلہن بنے۔ مگر ابو کسی کو بھی گھاس نہ ڈالتے تھے۔ میری امی ساتھ والے گاؤں مٹھ پنڈ کے چوہدری نواز ش کی بیٹی تھیں۔ امی



گر پڑے اور پیچھے سے آنے والے تیز رفتار گھوڑوں نے انھیں روند ڈالا۔ آٹا خانہ ابو کی موت واقع ہو گئی۔

ابو کی جب خون میں لت پت رندھی ہوئی لاش گھر میں آئی تو ان کی سیت کو دیکھتے ہی ای کو شدید ہارٹ اٹیک ہوا اور اگلے ہی لمحہ وہ چکر اکر زمین پر گر گئیں۔ اور گرتے ہی ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

جب دو جنازے اکٹھے اٹھائے گئے تو پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہمارے دادا، دادی اس

تین سال بعد میری پیدائش ہوئی۔ میرے ای ابو کے ہاں اور کوئی اولاد نہ ہوئی۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا ای ابو کی محبت میں دین بدن اضافہ ہوتا گیا۔ شہر میں ہر سال میلہ منڈی لگتی تھی جس میں دیگر رنگارنگ پروگراموں کے ساتھ نیزہ بازی اور گھڑ دوڑ کے مقابلے ہوتے تھے تو ابو ہر سال باقاعدگی سے ان مقابلوں میں حصہ لیتے تھے اور شرکت کے لیے دو ماہ پہلے بھرپور تیاری شروع کر دیتے۔ چنانچہ

Downloaded From  
Paksociety.com

صدے سے نڈھال ہو گئے تھے اُن کی کمرٹھ گئی تھی۔ اس وقت دلاور کی عمر پندرہ سال اور میری بارہ سال تھی۔ اب دادا دادی نے ہماری پرورش شروع کر دی۔

کہتے ہیں اولاد کی اولاد بہت پیاری اور محبوب ہوتی ہے تو یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں بہن بھائی دادا دادی کی آنکھوں کے تارے بن گئے۔ دوسرا یہ کہ ہم بچپن میں یتیم ہو گئے تھے تو ہمارا بہت خیال رکھا جاتا، ناز نخرے اٹھائے جاتے کہ ہمیں ماں باپ کی محسوس نہ ہو۔

اس سال بھی ماہ اپریل میں میلہ منڈی کا انعقاد ہوا تو ابو مقابلے میں حصہ لینے کے لیے اپنے ملازموں اور گھوڑوں کے ساتھ شہر گئے مگر یہ مقابلہ ان کی زندگی کا آخری مقابلہ ثابت ہوا تھا۔ ہوا یہ کہ ابو کا گھوڑا میدان میں سر پٹ بھاگ رہا تھا اور انتہائی تیز رفتاری سے دوڑتے دوڑتے سب سے آگے جا رہا تھا کہ اچانک اُن کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا۔ جس کے نتیجے میں گھوڑے کے ساتھ ہی ابو بھی بُری طرح زمین پر

جب میں پندرہ سال کی ہوئی تو ایک دن داوی بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئیں۔ اس وقت میں نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی، گوکہ گھر میں کام کاج کے لیے نوکریاں موجود تھیں۔ مگر اب گھر کو میں نے سنبھالنا تھا۔ چنانچہ میں نے گھر داری کی ذمہ داری سنبھالنے شروع کر دیں۔ اسکول بھی باقاعدگی کے ساتھ جاتی اور گھر کے کام کاج میں بھی حصہ لیتی اور اس طرح گرتے پڑتے میں نے میٹرک کر لیا۔ دلاور تو ڈل کے بعد ہی اسکول کو خیر آباد کہہ چکا تھا۔ اس کا زیادہ وقت آوارہ گردی میں گزرتا۔ دراصل دادا، داوی کے لاڈیلار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔

اب وہ اٹھارہ سال کا جوان تھا، کسی کو خاطر میں نہ لاتا، بڑے دوستوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا، جس کی وجہ سے اس کی عادتیں بہت خراب ہو گئی تھیں۔ کام کاج کرنے کی بجائے اس نے بڑے مشاغل اختیار کر لیے تھے۔

اس نے دادا کی زندگی میں ہی کسی نہ کسی طریقے سے ساری زمین اپنے نام کروائی تھی اور رفتہ رفتہ آدھی سے زیادہ زمین بیچ دی اور رقم اپنی عیاشیوں کی نظر کر دی۔ دادا جان بہت پریشان رہنے لگے۔ انھوں نے بہت کوشش کی کہ دلاور سدھر جائے مگر وہ سدھرنے کی بجائے دن بدن بگڑتا گیا۔ ایک تو دادا جان بہت بوڑھے ہو گئے تھے، دوسرا جوان سال سے اور بھوکے اچانک موت سے ان کو بہت صدمہ ہوا تھا، تیسرا دادا جان بھی ان کو چھوڑ گئی تھیں اور چوتھا دلاور کی بے راہ زوی اور زمین کے بک جانے کا ان کو بہت غم تھا تو وہ بے چارے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے اور بیمار رہنے لگے۔

دلاور کو کئی دن گھر نہیں آتا تھا، ہم اس کی راہ دیکھتے رہتے۔ میٹرک کے بعد میں نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب کچھ دنوں سے مجھے بخار رہنے لگا تھا۔ پہلے تو گاؤں کے حکیم سے علاج ہوتا رہا مگر آرام نہ آیا۔ پھر گاؤں کے ڈسپنسر (کیپور ڈاکٹر) کا علاج شروع ہوا۔ اس کی دوا سے وقتی طور پر بخار اتر جاتا مگر پھر بخار شدت اختیار کر جاتا۔ جب کوئی افاقہ نہ ہوا اور بخار کے ساتھ اب میرے جوڑوں میں بھی درد شروع ہو گیا۔ جسم بہت کمزور ہو گیا تو ڈسپنسر نے مشورہ دیا کہ مریض کو شہر کے بڑے

ہسپتال میں لے جائیں چنانچہ اگلے روز دادا جان مجھے اپنے ساتھ شہر لے جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر لے آئے۔ ریلوے اسٹیشن ہمارے گاؤں عنایت پور سے پانچ کلومیٹر دور تھا۔ دادا جان نے شہر کے ووکلٹ لیے اور ہم پلیٹ فارم پر گاڑی کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے کے بعد ٹرین آگئی تو ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔

ہمارے گاؤں سے شہر کافی دور تھا اور ٹرین پورے پانچ گھنٹے میں شہر پہنچتی تھی۔ گاڑی چل پڑی۔ یہ گاڑی ٹینجر ٹرین نہیں ایکسپریس ٹرین تھی۔ ہر اسٹیشن پر نہیں رکتی تھی کوئی بڑا اسٹیشن آتا تو دو یا تین منٹ کے لیے رکتی اور پھر چل پڑتی۔ مجھے کچھ بھوک لگ رہی تھی اور بوتل پینے کو بھی دل کر رہا تھا تو میں نے دادا جان سے فرمائش کر دی۔ انھوں نے کہا کہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکنے کی تو وہ میرے لیے بوتل اور کھانے کی کوئی چیز لا دیں گے۔

ٹرین کو ہمارے گاؤں عنایت پور سے چلے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ ابھی پورے دو گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ گاڑی اپنی رفتار سے منزل کی طرف گامزن تھی۔ بہار کا موسم تھا کھڑکی سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ جو بہت کھلی لگ رہی تھی۔ مجھے اونگھ آنے لگی تو میں اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ میں تقریباً آدھا گھنٹہ سوئی رہی۔ جب اچانک میری آنکھ کھلی تو دیکھا بہت سارے مسافر کمپارٹمنٹ میں نہیں تھے اور دادا جان بھی سیٹ پر موجود نہیں تھے۔ میں کبھی شاید واش روم گئے ہوں۔ ٹرین تیز رفتاری سے چل رہی تھی جب کافی دیر کے بعد دادا جان نہیں آئے تو میں نے جا کر واش روم دیکھا تو وہ خالی تھا پھر پورے ڈبے کا چکر لگایا مگر دادا جان کہیں نظر نہ آئے تو میں نے اپنی سیٹ کے قریب بیٹھے ایک مسافر سے دادا جان کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ پچھلے اسٹیشن پر جب ٹرین رکی تھی تو تمہارے دادا جان دوسرے مسافروں کے ساتھ نیچے پلیٹ فارم پر اترے تھے مگر وہاں نہیں آئے اس نے سمجھا تھا کہ انھوں نے یہیں اترنا تھا۔ میں نے جب یہ سنا تو میرے ہوش اُڑ گئے اور میں سخت پریشان ہو گئی۔ جب میں سو رہی تھی تو مجھے پتا ہی نہ چلا کب کوئی اسٹیشن آیا اور گاڑی رکی تو دادا جان نیچے



جان نے مجھے تسلی اور دلاسا دیا کہ پریشان نہیں ہونا تم انور صاحب کے ساتھ ان کے گھر چلی جاؤ۔ وہ بھی صبح آجائیں گے کیونکہ اب آنے کے لیے یہاں سے کوئی بس، ویگن یا ٹرین نہیں ملے گی تو وہ کل صبح پہلی ٹرین سے پہنچ جائیں گے۔

اس طرح انور صاحب مجھے اپنے گھر لے آئے کیونکہ پچھلے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب نے انور صاحب کو ٹرین پہنچنے سے پہلے فون کر دیا تھا کہ مسرت نامی جوان لڑکی ٹرین میں تمہارا گئی ہے۔ اس کے دادا ٹرین میں سوار نہیں ہو سکے تو وہ مسرت کو اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ اسی طرح دادا جان کو وہ اسٹیشن ماسٹر صاحب اپنے گھر لے گئے۔

شام ہو چکی تھی۔ انور صاحب اس ریلوے اسٹیشن پھول گھر کے اسٹیشن ماسٹر تھے۔ پھول گھر ایک قصبہ تھا۔ تھوڑے سے فاصلے پر انور صاحب کا گھر تھا۔ جب میں انور صاحب کے ساتھ ان کے گھر پہنچی تو ان کی بیوی اور تین بیٹیوں نے بڑی حیرانگی کے ساتھ دیکھا تو انور صاحب نے فوراً مختصر طور پر انہیں میرے بارے میں بتا دیا۔

اس پر ان کی بیوی آنٹی جمیلہ نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ان کی تینوں بیٹیوں نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور مجھے کمرے میں بٹھا کر چائے پانی پلا یا۔ انور انکل کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی تو وہ بھی یونیفارم تبدیل کر کے کمرے میں آ گئے۔ انکل انور کی صرف تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی شکیلہ میری ہم عمر تھی اس سے چھوٹی شگفتہ تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی کا نام انیلا تھا۔

باتیں شروع ہوئیں تو میں نے انہیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ دادا جان کے ساتھ علاج کے لیے شہر جارہی تھی۔ آنٹی جمیلہ میرے ساتھ ہی بیٹھی تھیں تو انہوں نے بڑے پیار سے مجھے اپنے ساتھ لگایا اور کہنے لگیں کہ مسرت بیٹی اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ بالکل بھی پریشان نہیں ہونا۔ جب انہوں نے مجھے چھو اتو میرا جسم بہت گرم تھا تو وہ کہنے لگی۔

ارے تمہیں تو بہت تیز بخار تھا۔ اوہ ہو چلو بیٹی لیٹ

اُترے۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کوئی چیز کھانے اور بوتل کی فرمائش کی تھی تو یقیناً دادا جان وہی لینے کے لیے نیچے اُترے ہوں گے۔ مگر اب پریشانی یہ تھی کہ وہ واپس کیوں نہیں آئے.....

میرا تو سخت دل گھبرانے لگا کہ اب کیا بنے گا میرے پاس تو ایک روپیہ بھی نہیں تھا اور نکٹ بھی دادا جان کے پاس تھے۔ اب میں کہاں جاؤں گی، کیا ہوگا اب؟

انہی سوچوں اور گھبراہٹ میں میرے آنسو نکل آئے۔ میں گم صم اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی اور آہستہ آہستہ ایک اسٹیشن پر رک گئی مجھے اچانک خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ دادا جان غلطی سے کسی دوسرے ڈبے میں نہ بیٹھ گئے ہوں۔ اب ٹرین رکی ہے تو شاید وہ آجائیں میں ان کا انتظار کرنے لگی۔ مگر دادا جان تو نہیں آئے البتہ اس ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب آ گئے اور ڈبے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے میرے پاس آ کر رک گئے اور مجھ سے پوچھا کہ بیٹی آپ کا نام مسرت ہے؟ پہلے تو میں چند لمحوں کے لیے ڈر گئی جب ان کی طرف دیکھا تو وہ ریلوے کے سرکاری یونیفارم میں تھے اور ان کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس چھپن لگایا تو میں نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ جی میرا نام مسرت ہے۔

اس پر انہوں نے پوچھا کہ بیٹی آپ کہاں سے آرہی ہو تو میں نے بتایا کہ عنایت پور سے آرہی ہوں۔ تو وہ کہنے لگے بیٹی تمہارے دادا جان پچھلے اسٹیشن پر رہ گئے ہیں اور ان کے سوار ہونے سے پہلے گاڑی چل پڑی تھی تو وہ بہت پریشان اور فکر مند ہیں اور پچھلے ریلوے اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب کے دفتر میں بیٹھے ہیں تو اسٹیشن ماسٹر صاحب نے مجھے فون کر کے بتایا ہے۔ میرا نام انور ہے اور میں یہاں کا اسٹیشن ماسٹر ہوں تو بیٹی گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تو آپ میرے ساتھ آ جاؤ۔

پھر انہوں نے میرا ہیک اٹھایا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنے دفتر میں لے آئے۔ جس ٹرین سے میں اُتری تھی اس کو انہوں نے روانہ کر دیا۔ اور ساتھ ہی پچھلے ریلوے اسٹیشن ماسٹر کو فون کیا اور بتایا کہ مسرت بیٹی کو میں نے ٹرین سے اتار لیا ہے اور وہ میرے پاس پہنچی ہے۔ اور میری بات دادا جان سے کروائی تو دادا

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

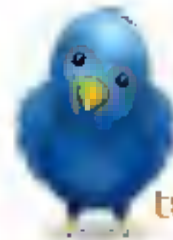
# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



جاؤ اور پوچھا کہ کوئی میڈیسن پاس ہے؟ تو میں نے کہا۔  
 آئی تقریباً ایک ماہ سے بخار جان نہیں چھوڑ رہا اسی  
 کے علاج کے لیے ہی تو شہر جا رہی تھی۔ لی الوقت میرے  
 پاس تو کوئی میڈیسن نہیں ہے۔

اس پر وہ بہت فکرمند ہوئیں اور انکل انور سے کہنے  
 لگیں کہ پتا کریں ڈاکٹر ابو ذر کا کلینک کھل گیا ہوگا۔ اس  
 سے ہنگی کی دوائے آئیں۔ تو انکل کہنے لگے کہ ابھی ٹیلی  
 فون کرتا ہوں۔ جب انھوں نے فون کر کے میری کیفیت  
 بتائی تو ڈاکٹر ابو ذر نے کہا کہ مریضہ کو کلینک پر لے  
 آئیں۔ چیک آپ کے بعد میڈیسن دوں گا۔

چنانچہ آئی جمیلہ اور انکل انور نے مجھے اپنے ساتھ  
 لیا ایک ٹانگے پر بٹھا کر کلینک لے گئے۔ ڈاکٹر ابو ذر نے  
 بغور تفصیلی چیک آپ کیا۔ بخار کی ہسٹری اور دیگر علامات  
 پوچھیں تو کہنے لگا کہ بخار پرانا ہے کچھ ٹیسٹ کروانے  
 پڑیں گے۔

ڈاکٹر صاحب نے پر جی پریسٹ لکھ کر دیے اور  
 لیبارٹری میں بھیج دیا جہاں سرنج کے ذریعے میرا خون کا  
 نمونہ لیا گیا اور کہا گیا کہ رپورٹ کل ملے گی۔ تو ڈاکٹر  
 ابو ذر نے وقتی آرام کے لیے ایک انجکشن لگایا اور کھانے  
 کے لیے میڈیسن دی اور اگلے دن رپورٹ لے کر آنے کا  
 کہا تو انکل اور آئی مجھے گھر لے آئے۔

میں نے ہلکا پھلکا کھانا کھا کر میڈیسن کھائی تو تھوڑی  
 دیر بعد مجھے نیند آئی۔

صبح جاگی تو طبیعت کچھ بہتر محسوس ہوئی۔ صبح دس بجے  
 دادا جان بھی پھول نگر پہنچ گئے تو انکل انور انھیں بھی گھر  
 لے آئے۔

میں دادا جان کے گلے لگ کر رونے لگی کہ آپ کدھر  
 رہ گئے تھے تو انھوں نے پہلے مجھے چپ کر دیا۔ اور بتایا  
 کہ تم ٹرین میں سو گئی تھیں۔ تو ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی  
 تمہیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور تمہارے لیے بوتل اور کچھ  
 کھانے کی کوئی چیز لینے کے لیے ٹرین سے اتر کر ریلوے  
 اسٹیشن سے باہر آیا۔ جب دکان پر پہنچا تو مجھے اچانک چکر  
 آئے تو میں گر گیا دکاندار نے مجھے فوراً پانی پلایا تو کچھ  
 طبیعت سنبھلی اس نے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ جب چکر آنے  
 بند ہوئے تو میں نے تمہارے لیے بوتل اور کچھ پھل لیے

اور آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر آیا تو دیکھا ٹرین جا چکی  
 تھی۔ یہ دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تو بہت  
 پریشان ہو گیا۔ پھر اس اسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر صاحب  
 سے ملا تو انھوں نے مجھے تسلی دی اور بتایا کہ اب وہ ٹرین  
 پھول نگر ریلوے اسٹیشن پر رکے گی تو میں اس کے اسٹیشن  
 ماسٹر انور صاحب کو فون کرویتا ہوں۔ پھر مجھ سے ٹرین کی  
 بوگی، سیٹ اور تمہارا حلیہ پوچھا تو اس طرح جب انور  
 صاحب نے تمہاری مجھ سے ٹیلی فون پر بات کروائی تو  
 مجھے حوصلہ ہوا تو اب پہلی ٹرین سے یہاں پہنچ گیا ہوں۔

آئی جمیلہ نے دادا جان کو چائے وغیرہ پلائی اسی  
 اثناء میں انکل انور لیبارٹری سے میرے بلڈ ٹیسٹ کی  
 رپورٹ بھی لے آئے تو میں، دادا جان اور انکل انور  
 ڈاکٹر ابو ذر کے کلینک پر پہنچے۔

ڈاکٹر نے رپورٹ دیکھ کر بتایا کہ مناسب علاج اور  
 تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے بخار بگڑ گیا ہے اور  
 ٹائیفیڈ ہو گیا ہے۔ جس کا کم از کم چودہ دن لگاتار علاج  
 ہوگا اور بلا ناغہ میڈیسن کھانی ہوگی۔ ہلکی غذا کھانی ہے اور  
 دو ہفتے مکمل ریست کرنا ہے اور ایک ہفتے کے بعد دوبارہ  
 چیک اپ کے لیے آنا ہے۔ ڈاکٹر نے دوا کا نسخہ لکھ دیا۔

اس کے بعد دادا جان نے اپنے سر چکرانے کا بتایا تو  
 ڈاکٹر نے ان کا بلڈ پریشر چیک کیا اور بتایا کہ آپ کا  
 بلڈ پریشر بہت ہائی ہے جس کی وجہ سے آپ کو چکر آتے  
 ہیں۔ دادا جان کو بھی دوا لکھ دی کہ روزانہ بلا ناغہ کھانی  
 ہے۔ انکل انور نے بتایا کہ ڈاکٹر ابو ذر بہت سیانا، ہمدرد  
 اور اچھا ڈاکٹر ہے اب اسی کا علاج شروع کر دیں آپ  
 کو شہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

انکل انور نے ہمیں دوپہر کا کھانا کھلایا دادا نے ان  
 کے پورے گھر کا شکر یہ ادا کیا سچ تو یہ ہے کہ مجھے ان کے  
 گھر سے بہت اپنائیت، پیار اور خلوص ملا۔ ان کی سب  
 سے بڑی بیٹی شکیلہ تو میری سہیلی بن گئی۔ ایک تو وہ میری  
 ہم عمر تھی دوسرا بہت سنبھلی ہوئی نرم و نازک سی بہت پیاری  
 تھی۔ پورا گھرانا بہت اچھا تھا ہم ان کے حسن سلوک  
 اور خلوص سے بہت متاثر ہوئے، کھانے کے بعد ان سے  
 واپسی کی اجازت چاہی تو انکل انور نے تاکید کی کہ ہفتے  
 بعد لازمی چیک آپ کروانا ہے۔ دادا جان نے وہیں سے

اپنی اور میری میڈیسن خرید لی۔

انگل انور نے ہمیں دو پہر والی ٹرین میں بٹھا دیا تو شام تک ہم گھر پہنچ گئے۔

☆☆☆

ہم دادا پوتی نے ڈاکٹر کے نسخے کے مطابق میڈیسن کھانی شروع کر دی۔ ایک ہفتے کے علاج سے مجھے بہت آفاقہ ہوا۔ میری صحت بحال ہو گئی۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق ہم دادا پوتی دوبارہ پھول نگر گئے۔ ڈاکٹر نے تسلی سے ہمارا چیک اپ کیا۔ آج میں نے ایک خاص بات نوٹ کی وہ یہ کہ ڈاکٹر ابوذر مجھ پر کچھ زیادہ ہی توجہ دے رہا تھا۔ اس کا پراسٹیا اور محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا اور ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ مجھے کچھ اچھا بھی لگ رہا تھا اور میں شرمنا بھی رہی تھی۔ ڈاکٹر ابوذر نے دادا جان کا بھی بغور حال پوچھا اور ان کا قصیلاً معائنہ کیا۔ انہیں دوا مستقل جاری رکھنے کی ہدایات دیں۔ اسی طرح مجھے بھی مزید ایک ہفتہ بلا ناغہ دوا کھانے کی تاکید کی اور اگلے ہفتے پھر آنے کو کہا۔ ہم انگل انور کے گھر آ گئے تو پورے گھرانے نے ہمیں رات رہنے کے لیے روک لیا۔ مجھے بار بار یہ احسان ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر ابوذر پیار بھری نظروں سے مجھے کیوں بار بار دیکھ رہے تھے۔ جب میں نے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھا تو مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ میرے والدین دونوں ہی بے انتہا خوب صورت تھے تو خوب صورتی اور حسن مجھے بھی وراثت میں ملا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک حسن کا مجسمہ تھی۔ مجھ پر جوانی ٹوٹ کر آئی تھی تو ڈاکٹر ابوذر کا پیار سے مجھے دیکھنا بجا تھا۔

رات گیارہ بجے تک ہم جاگتے رہے۔ آٹنی جیلہ، ٹکلیہ، ہنگفتہ اور انیلا سے خوب بائیں اور نسی مذاق ہوتا رہا جب میں سونے کے لیے لیٹی تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ڈاکٹر ابوذر کا سراپا میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ ڈاکٹر ابوذر کی عمر ستائیس سال تھی ٹھنڈے بال گورارنگ لمبا قد خوب صورت نین نقش بلاشبہ وہ ایک وجہ نہ ہو جو ان تھا۔ اور سے اس کا اچھا اخلاق، ٹھٹھے لہجے میں بات کرنا یہ سب کچھ میرے دل کو بھا گیا تھا۔ رات سوتے جاگتے گزری۔

صبح ہوئی سب نے مل کر ناشا کیا آج واپس گھر جانا تھا مگر میرا گھر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کہ آج پھر ڈاکٹر ابوذر کو دیکھوں۔

جب دادا جان نے واپسی کے لیے کہا کہ تیری کرو تو میں نے بہانہ بنایا کہ پیٹ میں درد شروع ہو گئی ہے اور جھوٹ موٹ درد کی اداکاری شروع کر دی تو دادا جان نگر مند ہو گئے۔ چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ شام کو ڈاکٹر ابوذر کے کلینک مسرت کو لے کر جائیں گے۔

ڈاکٹر ابوذر دن کو ساتھ والے شہر کے سرکاری ہسپتال میں بطور میڈیکل آفیسر ڈیوٹی کرتے تھے۔ اور شام کو پھول نگر میں اپنے پرائیویٹ کلینک میں مریضوں کا علاج کرتے تھے۔

الغرض شام کو دادا جان مجھے اس کے کلینک لے گئے تو مجھے دیکھ کر ڈاکٹر ابوذر کھل اٹھے۔ دادا جان نے اسے بتایا کہ مسرت کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا ہے۔ جب ڈاکٹر مجھے کاؤچ پر لٹا کر اسٹیتھو اسکوپ سے چیک اپ کیا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ مجھے درد نہیں ہے۔

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے مسکرا کر کہا۔ صبح تو تھا درد مگر اب پتا نہیں کیوں ٹھیک ہو گیا ہے۔

اس پر ڈاکٹر ابوذر نے بھی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اوکے کوئی بات نہیں میں سمجھ گیا ہوں۔ چنانچہ اس نے بتایا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے اصل میں بخاری جو دوا کھا رہی ہیں ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے درد ہو گیا ہو۔

اس نے نسخے میں ایک گولی کا نام لکھ کر دیا اور کہا کہ اگر دوبارہ درد ہو تو یہ گولی کھالیں۔ اگلے دن میں دادا جان کے ساتھ واپس اپنے گاؤں عنایت پور آ گئی۔

☆☆☆

پلک جھپکتے ہی ہفتہ گزر گیا۔ میں نے چودہ دن مسلسل میڈیسن کا کورس کیا اب میں مکمل طور پر صحت یاب تھی۔ دادا جان کو کچھ ضروری امور پٹانے تھے تو اس بار ان کی جگہ بھائی دلاور میرے ساتھ آیا۔ حسب معمول ہم ریلوے ٹرین کے ذریعے پھول نگر پہنچے۔ اسٹیشن پر



اُتر کر سیدھے انکل انور کے آفس گئے پھر وہ ہمیں ساتھ لے کر گھر آ گئے۔ دلاور بھائی کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور میں آٹی جیلہ کے پاس بیٹھ گئی۔

انکل انور، آٹی جیلہ اور ان کی تینوں بیٹیاں بہت اچھی تھیں۔ شکیلہ تو میری چکی سہیلی بن گئی تھی۔ باتوں باتوں میں پتا ہی نہ چلا شام ہو گئی تو دلاور بھائی کے ساتھ ڈاکٹر ابو ذر کے کلینک پہنچ گئی۔

ڈاکٹر ابو ذر نے بخار وغیرہ چیک کیا اور بتایا کہ مس سرت اب آپ کھل صحت یاب ہو گئی ہیں۔ لہذا میڈیسن کھانا بند کر دیں۔

میں نے ڈاکٹر ابو ذر کا شکریہ ادا کیا کہ میں آپ کے علاج سے ٹھیک ہوئی ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ ادا ہوا کہ آپ تو ٹھیک ہو گئی ہیں مگر مجھے بیمار کر کے جا رہی ہیں۔

میں نے حیرانگی سے پوچھا جی..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

تو اس پر ڈاکٹر نے کہا کہ بہت بڑی مرض میں مبتلا کر دیا ہے میں نے اسے۔

پھر اس نے ایک مٹی وٹامن کا شربت لکھ کر دیا اور کہا کہ دو یا تین دن روزانہ ایک گچ پیتا ہے اور مجھے فون کر کے بتانا ہے کہ شربت سے کیا اثر ہوا۔ ڈاکٹر کا بی بی سی ایل فون نمبر نئے پر موجود تھا۔

جب میں واپس آئے تو ڈاکٹر بہت اذاس لگ رہے تھے۔ جبکہ میں بھی اندر سے اذاس ہو رہی تھی۔ ہم انکل انور کے گھر آ گئے اور رات کا کھانا ہم سب نے مل کر کھایا۔

دلاور بھائی بڑے غور سے چوری چوری شکیلہ کو دیکھتے رہے۔

شکیلہ بھی اپنی بڑی بیماری نرم و نازک سی کول سی بہت خوب صورت۔

اگلے دن ہم دونوں بہن بھائی بذریعہ ٹرین واپس اپنے گاؤں آ گئے۔

تین دن کے بعد میں نے اپنے گاؤں کے نمبردار کے گھر سے شام کو ڈاکٹر ابو ذر کو فون کیا تو میری آواز سن کر بہت خوش ہوئے۔ میں نے پوچھا۔

جناب ڈاکٹر صاحب ذرا یہ تو بتائیں کہ میں نے آپ کو کون سے مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔

تو وہ بڑے رومانٹک موڈ میں بولا آپ کی محبت کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ میں آپ کا مریض محقق بن گیا ہوں۔ پھر انھوں نے فوراً ہی مجھ سے پوچھا کہ مس سرت آپ کو پیٹ درد نہیں تھا تو بہانہ کیوں بنایا تھا۔ اس پر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ آپ کی محبت کا درد تھا۔

یہ سن کر ڈاکٹر کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ اچھا! آگ ہے دونوں طرف برابر لگی ہوئی۔ چنانچہ ہمیں سے ہماری محبت کا آغاز ہو گیا۔

اب میں ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی بہانے نمبردار کے گھر جا کر ڈاکٹر ابو ذر سے بات کرتی۔ پھر میرے اصرار پر دادا جان نے بھاگ دوڑ کر کے گھر میں ٹیلی فون لگوا لیا تو ساری ساری رات ڈاکٹر ابو ذر سے خوب باتیں ہوتیں۔ اکٹھے مرنے جینے کی عہد کیے جاتے اور پھر اسی روٹین میں چھ ماہ گزر گئے۔

اسی دوران میں پانچ چھ بار دلاور بھائی کے ساتھ پھول نگر ڈاکٹر ابو ذر کو ملنے گئی۔ ظاہر ہے بیماری کا کوئی نہ کوئی بہانہ بنانا پڑتا تھا۔ اسی عرصے میں دو تین بار انکل انور اور ان کی پوری فیملی بھی ہمارے گھر آ چکی تھی۔

شکیلہ ڈاکٹر ابو ذر کے ساتھ میری محبت سے واقف تھی۔ وہ اکثر ڈاکٹر ابو ذر کا نام لے کر مجھے چھیڑتی رہتی تھی۔ ادھر دلاور بھائی بھی شکیلہ کی محبت میں پور پور ڈوب چکے تھے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے رہتے تھے کہ دادا جان کے ساتھ جا کر شکیلہ کا رشتہ مانگو اور اسے اپنی بہن بھی بنا لو تو میں کہتی دلاور بھائی شکیلہ تو بی اے پاس ہے اور آپ صرف آٹھ جماعت پاس ہو اور دوسرا کرتے بھی کچھ نہیں ہو۔ سارا دن آوارہ گردی کرتے ہو۔ کئی کئی دن گھر نہیں آتے تو ان حالات میں آپ کو کیسے رشتہ مل سکتا ہے شکیلہ کا.....؟ اگر آپ کو شکیلہ پسند ہے تو پہلے اپنی عادتیں درست کرو۔ اپنے آپ کو بدلو۔

پہلے تو بھائی کہتا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے پھر حیرت انگیز طور پر بھائی میں تبدیلی آئی شروع ہو گئی اب وہ روزانہ گھر آنے لگا۔ زمین کے تمام

معاملات دیکھنے لگا۔ آوارہ گردی چھوڑ دی اور کانی سلجھ گیا۔ یہ ساری تبدیلی صرف شکلیہ کو پانے کے لیے تھی۔  
 اوہر ڈاکٹر ابوذر بھی میرے لیے بہت بے چین رہنے لگے تھے۔ وہ بھی جلد از جلد مجھے اپنا لیٹا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اپنے ابوای کو بھیجو میرا رشتہ مانگنے کے لیے۔

چنانچہ ایک دن انکل انور کافون آیا کہ ڈاکٹر ابوذر کے والدین عنایت پور آنا چاہتے ہیں۔ تو دادا جان اور بھائی دلاور نے بخوشی انھیں آنے کی اجازت دے دی۔ انھوں نے اتوار کو آنا تھا۔ ان کے آنے سے ایک دن پہلے گھر کی خوب صفائی ستھرائی کی گئی۔ اتوار کو گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر ابوذر کے ای ابو اس کی دونوں بہنیں انکل انور اور آنٹی جمیلہ آگئیں۔ میں بے انتہا حسین و جمیل خوب صورت تو پہلے ہی تھی اوپر سے خاص تیاری، میک اپ وغیرہ نے میرے حسن کو چار چاند لگا دیے۔ مجھے پسند کر لیا گیا ڈاکٹر ابوذر کی ای اور دونوں بہنیں مجھ پر صدقے داری جارہی تھیں۔ مہمانوں کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ میں یہ بتانا بھول گئی کہ میرے نانا چوہدری نواز سن، نانی، ماموں ممانی بھی آئے تھے سب کو یہ رشتہ پسند آیا۔

اب دلاور بھائی بھی زور دینے لگے کہ جلدی سے شکلیہ کر رشتہ بھی مانگا جائے۔ دلاور بھائی کے اطوار کانی بدل گئے تھے۔ اب وہ بہت ذمہ داری سے سب کام کرتا، فصلوں کی کاشت کثانی وغیرہ کی خود نگرانی کرتا، شہر سے کھاد، بیج، اسپرے وغیرہ خود لے کر آتا تو دادا جان بہت خوش اور مطمئن تھے۔

اب شکلیہ کے رشتے کے لیے اس کا اصرار بڑھنے لگا۔ بال آخر دادا جان راضی ہو گئے۔

کچھ دن کے بعد دادا جان، نانا، نانی اور ماموں ممانی دلاور بھائی کے لیے شکلیہ کا رشتہ مانگنے انکل انور کے گھر گئے تو انھوں نے سوچ بچار اور صلاح مشورے کے لیے تھوڑا نام مانگ لیا۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ دلاور بھائی کا رشتہ انکل انور قبول کر لیں گے۔ اب پروگرام یہ تھا منگنی وغیرہ کرنے کے بجائے ہم دونوں بہن بھائیوں کی اکٹھی شادی کر دی جائے۔

میں تو خوشی سے نہال تھی اور ہواؤں میں اڑ رہی تھی کہ جسے چاہا تھا وہ ملنے والا تھا کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔

تقدیر ہم پر ہنس رہی تھی۔ ایک دم ہمارے سب خواب چکنا چور ہو گئے۔ ہوا کچھ یوں کہ دلاور بھائی کے کچھ دوست جو بہت لائق آوارہ گرد اور بد معاش تھے انھوں نے ایک بینک میں ڈاکہ ڈالا۔ بیس لاکھ کی ڈکیتی کی۔ اگلے دن ایک کوٹھی میں رات کو ڈاکہ ڈالا جہاں سے بہت سارا روپیہ اور زیورات لوٹے، خواتین کی بے حرمتی کی اور مزاحمت کرنے پر گھر کے سربراہ اور اس کی جوان بیٹے کو قتل کر دیا۔

اگلی رات وہ ڈاکو بازار حسن میں داؤ عیش دینے کے لیے چلے گئے اور ایک مشہور طوائف پر خوب فونوں کی برسات کی۔ اسے تحفے کے طور پر لوٹے ہوئے زیورات دیے وہاں سے وہ ڈاکو بھائی دلاور کے پاس آئے مگر اسے نہیں بتایا کہ انھوں نے ڈاکہ ڈالے ہیں۔ انھوں نے لوٹا ہوا زیورات اور پیسوں سے بھرا پیٹھی کیس بطور امانت بھائی کے پاس رکھوایا۔

دلاور بھائی ان سے دوستی ختم کر چکے تھے تو انھوں نے انکار کیا مگر ڈاکوؤں نے پرانی دوستی کا واسطہ دیا۔ منتیں کیں کہ چند دن کے لیے اپنے پاس رکھ لو۔ وہ ڈاکو خود بھی دو تین بھائی کے ڈیرے پر رہنا چاہتے تھے، انھوں نے جھٹ یہ بولا کہ ان کی دشمنی ہے تو وہ دشمنوں سے بچنے کے لیے چند دن رہنا چاہتے ہیں۔ تو بہت منت سماجت کے بعد دلاور بھائی نے بادل خواستہ انھیں اپنے پاس چند دن ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ اوہر پولیس بڑی مستعدی سے ان ڈکیتوں کا سراغ لگانے میں مصروف تھی۔ کیونکہ وہ دن کے اندر بہت بڑی ڈکیتیاں ہوئیں تھیں۔ تمام اخبارات میں ان ڈکیتوں کو اچھالا جا رہا تھا۔ وہ طوائف جس کو ڈاکوؤں نے زیورات دیے تھے وہ بہت گھاگ تھی اسے اندازہ تھا کہ یہ زیورات لوٹ کا مال ہے۔ ان زیورات کی وجہ سے وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے تو اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اسی وقت پولیس سے رابطہ کیا اور سارے زیورات ان کے حوالے کر دیے۔ پولیس نے وہ تمام زیورات ان گھر



دالوں کو دکھائے جہاں ڈاکوؤں نے ڈکیتی کی تھی تو انھوں نے فوراً پہچان لیے کہ یہ ان کے ہی زیور ہیں۔ اب پولیس کا کام آسان ہو گیا تھا۔

اس طوائف نے تمام ڈاکوؤں کے حلیے بھی بتا دیے ان میں سے ایک کو وہ ذاتی طور پر بھی جانتی تھی اس کے بارے میں پوری تفصیل بتادی۔ پولیس نے اپنے منجر چاروں طرف پھیلا دیے اور بالآخر چوبیس گھنٹے کے اندر پولیس نے ڈاکوؤں کا سراغ لگالیا اور بھاری نفری اسلحہ کے ساتھ دلاور بھائی کے ڈیرے پر چھاپہ مارا۔ سب ڈاکو گرفتار کر لیے گئے۔ زیورات اور پیسوں سے بھرا لٹیچی کیس بھی برآبد کر لیا۔ بد قسمتی سے اس وقت دلاور بھائی بھی وہاں موجود تھے تو ڈاکوؤں کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔

اگلے روز ننگ کے تمام بڑے اور قوی اخبارات میں ڈاکوؤں کی گرفتاری، ان کی تصاویر اور ناموں کے ساتھ شہ سرخی لگا دی گئی۔ پولیس کی کارکردگی کو بہت سراہا گیا تھا۔ ڈاکوؤں کی تصاویر کے ساتھ بھائی دلاور کی تصویر اور نام نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی۔ گوکہ دلاور بھائی سو فیصد بے گناہ تھے۔ ان ڈکیتوں سے ان کا کوئی واسطہ تعلق نہ تھا مگر بد قسمتی سے پیسہ اور زیور ان کے ڈیرے سے برآبد ہوا تھا۔ اور وہ خود بھی وہاں موجود تھے تو انھیں بھی ڈاکوؤں کا سامنا سنبھالنا پڑا۔

دلاور بھائی کی گرفتاری کی خبر اخبار میں ڈاکوؤں کے ساتھ ان کے نام اور تصویر چھپنے سے ہم پر قیامت ٹوٹ گئی۔

ہر طرف یہ خبر گردش کر رہی تھی کہ دلاور ڈاکوؤں کا ساتھی ہے۔ دادا جان پہلے ہی بہت کمزور نحیف لاغر تھے ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے، بہت بوڑھے ہو چکے تھے تو یہ خبر ان سے برداشت نہ ہوئی ان پر شدید فوج کا حملہ ہوا اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

تمام ڈاکوؤں کے ساتھ دلاور بھائی پر بھی ڈکیتی اور قتل کا الزام لگا کر ان کے خلاف پرجہ درج کر لیا گیا۔ پولیس نے ان پر بہت تشدد کیا کہ وہ اپنے جرم کا اعتراف نہ کریں مگر وہ بے گناہ اور بے قصور تھے تو جرم قبول نہ کیا مگر

انھیں مجرم قرار دیا جا رہا تھا۔ پولیس تعیش کر رہی تھی بالآخر انھیں جیل بھیج دیا گیا اور کیس عدالت میں۔

ان حالات میں ڈاکٹر ابوذر کے والدین نے میرا اور ڈاکٹر ابوذر کا رشتہ ختم کر دیا کہ وہ ایک ڈاکو کی بہن کو اپنی بہن نہیں بنا سکتے۔

میں نے ڈاکٹر ابوذر کو فون کر کے اپنے بھائی کی بے گناہی کا یقین دلایا بہت قسمیں کھائیں وہ خود بھی بہت پریشان اور دکھی تھے مگر اس کے والدین نے سختی سے انکار کر دیا کہ یہ شادی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ابوذر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ انھوں نے بڑی مشکل سے غریبی میں اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا تھا۔ وہ اپنی دو بہنوں اور والدین کا سہارا تھا۔ اپنے ماں باپ سے بغاوت نہیں کر سکتا تھا۔ میں دن رات روتی رہتی دکھوں نے میرے اندر ڈیرے ڈال لیے۔ اور میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔

نانا جان اور ماموں نے پیسہ پانی کی طرح بہانا مگر نہ ہی دلاور بھائی کی ضمانت ہو سکی اور نہ ہی ان کی بے گناہی ثابت ہو سکی۔ کیس عدالت میں چل پڑا۔ ہماری رہی سہی زمین اور گھر بھی بک گیا۔ مجھے نانا جان اپنے پاس مٹھ پنڈ لے گئے۔ مجھے دن رات ڈاکٹر ابوذر کی یادیں سنائیں۔ میں اس کی محبت، بھائی کے غم اور دکھ میں سوکھ کر کاٹا ہو گئی۔

ایک دن پولیس کی وین قیدیوں کو لے کر عدالت میں پیشی کے لیے لے جا رہی تھی اس وین میں ڈاکوؤں کے ساتھ دلاور بھائی بھی تھے تو راستے میں ڈاکوؤں کے ساتھیوں نے ان کو چھڑانے کے لیے حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا کچھ حملہ آور مارے گئے اور کچھ پولیس والے زخمی اور شہید ہو گئے۔ وین کا دروازہ توڑ دیا گیا اور سب قیدی فرار ہو گئے۔ بھائی کو بھی ان ڈاکوؤں نے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ کر اس گاڑی میں بٹھالیا جو ڈاکوؤں کو چھڑانے کے لیے آئی تھی وہ گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی پولیس نے وارنٹس کر کے قریبی علاقے کی پولیس کو بلا لیا اور پولیس کی بھری نفری اپنی گاڑیوں میں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

کافی لمبا سفر طے کرنے کے بعد بھی جب پولیس ان

تک پہنچ نہ پارہی تھی پولیس نے ڈاکوؤں کو چھڑانے والی گاڑی پر فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں گاڑی کے پیچھے دونوں ٹائر برسٹ ہو گئے اور گاڑی ہچکولے کھائی سڑک سے اتر کر کھڈوں میں اچھلنے لگی اور رک گئی۔ جیسے ہی گاڑی رکی جس کا جدھر رخ ہوا سب بھاگنے لگے۔ بھائی بھی ایک سمت بھاگنے لگا تھوڑا سا آگے جا کر ایک ریلوے لائن آگئی دلاور بھائی ریلوے لائن کے ساتھ دوڑنے لگے۔ پولیس ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد کوئی ریلوے اسٹیشن آ گیا تھا پولیس بھائی کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ وہ بار بار بھائی کو روک جانے اور گرفتاری کا بول رہے تھے مگر بھائی پلیٹ فارم پر بھاگے جا رہا تھا۔ اب پولیس والوں نے اسے روکنے اور ڈرانے کے لیے فائرنگ شروع کر دی تھی کہ اسٹیشن پر کافی رش نظر آ رہا تھا اور بھائی اس رش میں غائب بھی ہو سکتا تھا۔ پولیس کی فائرنگ سے بھائی کو کمر اور ٹانگوں پر گولیاں لگ گئیں وہ پلیٹ فارم پر گر گیا۔ چند لمحوں کے بعد پولیس اس کے سر پر تھی۔ بھائی نے وہیں ریلوے اسٹیشن پر ٹپ کر جان دے دی۔

اگلے دن اخبار میں پہلے صفحے پر خبر شائع ہوئی کہ قیدیوں کی پولیس دین پر حملہ کے نتیجے میں قیدیوں کو چھڑانے والے تین حملہ آور ہلاک چار پولیس اہلکار شہید ددشہید زخمی اور فرار ہونے والے تمام ڈاکو گرفتار کر لیے گئے۔ ایک دلاور نای ڈاکو پھول نگر کے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھاگے ہوئے پولیس مقابلہ میں فائرنگ سے ہلاک۔

دو دن کے بعد دلاور بھائی کی نعش پوسٹ مارٹم کے بعد نانا جان نے وصول کر لی اور اسی دن بھائی کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

وہ پھول نگر جو مجھے دنیا کے سب شہروں اور علاقوں سے خوب صورت اور پیارا لگتا تھا۔ جہاں میری محبت پروان چڑھی تھی۔ اسی پھول نگر کے پلیٹ فارم پر میرا سگا بھائی جو کہ بے گناہ تھا۔ پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

پے در پے صدیوں نے مجھے توڑ دیا۔ میں بیمار رہنے لگی اور دن رات کھانسی کا دورہ پڑتا رہتا اور بلغم کے ساتھ خون بھی آتا۔ میرا سارا حسن کھلا گیا رنگ

کالا ہو گیا۔ اور میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ ماموں مجھے علاج کے لیے شہر لے گئے تو وہاں انکشاف ہوا کہ مجھے لی بی کا مرض لاحق ہو چکا ہے۔ جس کا بہت لمبا علاج ہے۔ نانا جان اور نانی جان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ماموں نے گاؤں کی ساری زمین بیچ کر شہر میں گھر بنا لیا ہے اور وہ دن رات اپنے بزنس میں مصروف رہتے ہیں۔

ڈاکٹر ابوذر کے متعلق پتا چلا کہ انھوں نے کسی اور لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اسپتال ٹریژن کرنے کے لئے ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔ مجھے گورنمنٹ کے لی بی اسپتال میں داخل کروا دیا گیا ہے جہاں میرا علاج ہو رہا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ مکمل صحت یاب ہونے کے لیے چھ ماہ سے ایک سال کا عرصہ لگے گا۔

حسرتِ ناتمام کے ساتھ ایک موہوم سی امید ہے کہ شاید ڈاکٹر ابوذر واپس آ کر مجھے اپنائیں کیونکہ مقدمے کی سماعت کے دوران ثابت ہو گیا تھا کہ بھائی ڈکیتی میں ملوث نہیں تھا۔ جس گھر میں ڈاکہ ڈالا گیا تھا تو ان لوگوں نے باقی تمام ڈاکوؤں کو شناخت کر لیا تھا اسی طرح بینک کے عملے نے بھی گواہی دی تھی کہ دلاور بھائی ڈاکوؤں کے ساتھ نہیں تھا۔ ڈاکوؤں نے بھی اپنے بیان میں کہا تھا کہ دلاور بھائی ڈاکے ڈالتے وقت ان کے ساتھ نہیں تھے۔ ذہ تو زبردستی بنا لینے کے لیے ان کے پاس گئے تھے تو پولیس نے ڈاکوؤں کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کر لیا تھا۔ مگر اب اس گواہی کا کیا فائدہ میرا ماں جابا بھائی تو ڈاکو کی حیثیت سے پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔

مجھے اب بھی ڈاکٹر ابوذر کا شدت سے انتظار ہے۔ میں نے وہ سب اخبارات سنبھال کر رکھے ہیں جس میں مقدمے کی ساری رواداد لکھی ہے، جس کے مطابق ثابت ہو گیا تھا کہ بھائی بے گناہ تھا۔ باقی تمام ڈاکوؤں کو سزائے موت ہو گئی تھی۔ مجھے امید ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر میرا ڈاکٹر ابوذر سے سامنا ضرور ہوگا اور میں اسے اپنے بھائی کی بے گناہی کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جاؤں گی کیونکہ میری محبت سچی ہے۔ دعا کریں مجھے میری محبت مل جائے۔

☆☆☆



# بادبان

نیرمان احسان

خواہشوں کے سمندر میں سفر کرتا، ایک حاصل مطالعہ ناول،

جس میں زندگی کا بادبان ایک نئے جذبے کا سفر کرائے گا۔

(تیسرا حصہ)

زندہ جاتی تھی۔  
”اسفر میرے بیٹے“ زوار نے پکارا تھا۔ زبان سے نہیں دل سے۔ پردل کی آواز بھلا انسان کہاں سن سکتا ہے۔ اسفر دور جاتا دکھائی دیتا رہا اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہ دیکھا۔

زوار شکست سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ کتنے عرصے بعد ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

”بچے تو باغ کے پھول ہیں۔“ اسفر کے آنے سے چند منٹ پہلے پڑھی حدیث ان کے دماغ میں ابھری تھی۔

”میرے باغ کا پھول جانے کون چرائے گیا۔ میرے باغ کا پھول“ سوچوں کی نگرار ہونے لگی۔ دو آنسو آنکھوں سے ٹپکے اور میٹھس کے دامن میں جذب ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

پورے تین دن اور تین راتیں گزر گئیں۔ سونی گھر نہ آئی۔ یہ معمول کی بات تو نہ تھی لیکن سب نے اسے معمول کی طرح ہی لیا۔ پہلے ایسے بھی ہوا نہ تھا کہ کوئی بنا بتائے اتنے دن غائب ہو جائے۔ یہاں تک کہ جب چینی گوجرانوالہ گئی تھی۔ سبھی کو پتا تھا اور اب یہ

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ وہ اتنا ہی کہہ پائے۔  
”ٹھیک کہہ رہا ہوں ابو۔ آپ کی زندگی تو قرآن اور حدیث کی کتابوں تک ہی محدود رہی ہے۔ میں کیا ہوں؟ کیسا ہوں، کن مسائل کا شکار ہوں بھی جاننے کی کوشش کی آپ نے۔“ اسفر کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ پر آواز یہ غم کے ساتھ غصے کی بھی اجارہ داری تھی۔ زوار کچھ نہ کہہ پائے۔

”ساری زندگی کن مسائل میں گھرا رہا کبھی آپ آگے نہ بڑھے مجھے سہارا دینے کے لیے۔ آپ کے ہوتے ہوئے میں نے تیبوں جیسی زندگی گزار لی ہے۔“ لفظوں کا چابک زوار کی گردن پر پڑا تھا۔

”ایسے مت کہو اسفر میں تم سے غافل نہیں رہا۔“  
”آپ غافل رہے ابو، آپ رہے۔ جب سہارا نہیں دے سکتے تھے تو پیدا ہی کیوں کیا“ کہاں کی بات کہاں آرکی تھی۔ کہاں کا غصہ کہاں آنکلا تھا۔ اسفر کی آنکھوں سے دو بے رنگ آنسو ٹپکے۔ اسفر نے آنکھیں صاف کیں۔

”آپ اپنی دکان پر آرام سے بیٹھ کر یہ حدیثوں کی کتاب پڑھیے۔ میں جا رہا ہوں۔“ اسفر نے اترے اور بڑک پر سیدھی ست چلنے لگا۔ یہ ست گھر کی طرف

چہرہ۔ اجنبی لوگوں کے لیے تو پہچاننا مشکل تھا لیکن اس گھر کے باشندوں کا تو سالوں کا ساتھ تھا۔

اخبار اور الیکٹرونک میڈیا پر اعلان تو کیا گیا تھا کہ ورتاء آکر لاش لے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے اس سچ پر بات نہ کی۔ لاش لینے جاتے تو مر جانے والے سے اپنا کیا تعلق بتاتے؟ لاش لے بھی آتے تو تدفین کے انتظامات کون دیکھتا وہ پانچ لڑکیاں یا پھر وہ بیچرا؟

آخر خبروں میں یہ خبر آنے لگ گئی کہ ایک خیراتی ادارے کی سرپرستی میں اس جوان لڑکی کی لاش کو سپردِ خاک کر دیا گیا پر اس گھر کی سگوری میں کمی نہ آئی۔ ایک لڑکی جوان میں سے تھی۔ بچپن، لڑکپن کے ادوار اٹکھٹے گزارے تھے۔ سالوں سے مشترکہ چھت تلے رہ رہی تھی۔ جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھی یوں اچانک ---

سونی کا بغیر مطلع کیے غائب ہونا۔

پھر چوتھا دن پانچواں دن۔ ایک ہفتہ، دس دن، تشویش پریشانی میں بدل گئی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ سونی خود ہی کہیں چلی گئی ہو اور انھیں مطلع نہ کرنا چاہتی ہو۔ لیکن لڑکیوں کو انہونی کا احساس ہونے لگا۔

اور پھر ایک دن خبر ملی ایک لڑکی کی لاش راوی کے کنارے ملی ہے۔ برہنہ لاش جسے داغا گیا تھا اور پھولی ہوئی تھی۔ غالباً کئی دنوں سے راوی کے پانی کے رحم و کرم پر رکھی اسی لیے پھول گئی تھی۔

بات معمولی تھی کہ نہیں پر میڈیا نے خوب کورتاج دی۔ صبح شام کی خبروں میں اس خبر کو شامل کیا جاتا۔ بے فائدہ ٹاک شوز کیے جاتے۔

آئینے سامنے کمرے والے گھر میں سوگ نے ڈیرہ ڈال دیا۔ لڑکی کا چہرہ اخباروں کی زینت بھی بنا تھا اور الیکٹرونک میڈیا پر بھی دکھایا گیا تھا۔ پھولا ہوا

Downloaded From  
Paksociety.com

READING  
Section



سونی کا دکھ بھی تھا اور یہ خوف بھی کہ ان کی آئندہ کی زندگی کیسے ہوگی۔

سونی جو ان میں سے سب سے سادہ لڑکی تھی۔ جسے بناؤ سکھار سے دلچسپی نہ تھی۔ جو سادہ کپڑے پہنتی تھی۔ جسے زبان کا چسکا بھی نہ تھا۔ جو ملتا چپ کر کے کھا لیتی۔ جس کا کبھی کسی سے جھگڑا بھی نہ ہوا تھا۔

”اس سے تو بہتر تھا نوید ازمدہ ہی رہتا کم از کم تسل تو ہوتی۔“ ایک دن چندہ نے جلے دل کے ساتھ کہا تھا۔ چینی بنا کوئی جواب دیے یونہی آنکھیں موندے لینی رہی۔

”میرا خوف بے جا نہ ہوتا تھا۔ اب چینی یہ سب تیرے یا میرے ساتھ ہو گیا تو۔۔۔۔۔۔“ چندہ اٹھ کر چینی کی چار پائی پر آ بیٹھی تھی۔ چینی بھی لیٹے سے اٹھ بیٹھی۔

”تو کیا ہوگا۔ تیرا یا میرا جسم بھی راوی کنارے ملے گا یا پھر کسی گندے تانے سے“ چینی نے سفاکی سے کہا تھا۔ چندہ دہل کر رہی گئی۔

”چینی یوں تو ماں کہہ۔“  
”تو کیا کہوں! یہ سچ ہے چندہ ہم اس معاشرے کا فضلہ ہیں۔ جو اگر مر گئے جائیں تو بھی کوئی پروا نہ کرے گا۔“ دکھی دل کے ساتھ چینی کہہ رہی گئی اور چندہ بے یقینی سے ٹی میں سر ہلا رہی تھی۔

اسی لمحے سیفی کمرے میں آیا اور لڑکیوں سے مخاطب ہوا۔

”باہر چار ماہوں کچھ منگوانا ہے تو بتا دو“ سیفی کی بھی شادی نہ ہو سکی تھی۔ وہ خواجہ سرفرازا دیا نکلا تھا۔ شادی سے دو دن پہلے سیفی سے ادھار پیسے مانگے۔ سیفی نے بھی بلا تامل پیسے دے دیئے کہ جب ساری زندگی اسی کے ساتھ گزارنی ہے تو پیسوں کا کیا کین دین۔ اور وہ خواجہ سرفرازی دن سے غائب تھا۔ ٹھکانہ بھی چھوڑ دیا تھا اور فون بھی بند کر دیا۔ حالانکہ سیفی نے کوئی ایسا قارون کا خزانہ بھی نہ تمھایا تھا۔ پر شاید وہ اسی قابل تھا۔ سیفی نے بھی اس بات کا زیادہ سوگ نہ کیا تھا۔

”نہیں کچھ نہیں منگوانا“ سیفی جواب سن کر چلا

کیا۔ چینی انھی اور بوسیدہ ٹرنک سے ساڑھی نکال کر دیکھنے لگی۔ سرخ بلاؤز والی اس کی اکلوتی ساڑھی جس کے بلاؤز پر رنو کا تھوڑا سا نشان بھی تھا۔

ساڑھی نکال کر چینی نے استری لگائی اور ساڑھی استری کرنے لگی۔

”یہ ساڑھی کیوں استری کر رہی ہے؟“ چندہ نے اچنبھے سے پوچھا تھا۔ ایسے شوخ لباس تو وہ پین کر راتوں کو گھر سے باہر گا ہک کی تلاش میں نکلتی تھیں۔

”آج رات کام پر جاؤں گی۔“ استری کرتے ہوئے چینی کا انداز مصروف سا تھا۔

”لیکن کیوں؟“ اس وقت سب لڑکیوں نے طے تو کیا تھا کہ سونی کے چالیسویں تک ہم یہ کام نہیں کریں گے۔“ چندہ کو لگا شاید چینی بھول گئی ہے۔

”چالیسویں تک کام کو نہ گئی تو بھونکی مر جاؤں گی۔“ کل سے مے ختم ہو گئے ہیں۔“ بلاؤز آگے سے استری ہو گیا تو چینی نے اسے پلٹا اب وہ پچھلے حصے کو استری کر رہی تھی۔

”اور ہاں چندہ زندگی رو دو دھو کر گزارو یا ہنس بول کر نصیب تو ہمارا یہی ہے۔ اسی لیے جو جیسا ہے اسے قبول کر کے جینا سیکھ لے۔“ چینی کا لہجہ عام سا تھا۔ چندہ گنگ سی بیٹھی چینی کو دیکھتی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

رات کچھ تاریک سی تھی۔ سرخ بلاؤز، سنہری پلو والی ساڑھی باندھے چینی جیسے آتش سماں ہی تھی۔ یہاں سے وہاں ٹہلتے ہوئے وہ کسی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ آج وہ اکیلی تھی۔ ساتھ والی لڑکیوں نے سوگ مناتے ہوئے ابھی نہ آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ بلکہ انھوں نے تو کوشش کی تھی کہ چینی بھی نہ جائے لیکن چینی نے کسی کی نہ سنی اور اکیلی آ گئی۔

شہر کا یہ علاقہ جہاں چینی ٹہل رہی تھی یوں تو ایک پوش علاقہ تھا۔ ساتھ ہی اشیائے خورد و نوش کی بڑی مارکیٹ بھی تھی۔ لیکن یہ جگہ اور یہ فٹ پاتھ دہائیوں سے ایسی لڑکیوں کے لیے مخصوص تھا۔ کبھی کبھار نونس لے لیا تو لے لیا۔ ورنہ سب چل چلا چل تھا اور جب

سے چنبیلی باقاعدہ طور پر یہاں کھڑی ہونا شروع ہوئی تھی تب سے ملک کے خارجی اور داخلی حالات ہی اس قدر خراب تھے کہ دست راست کے لوگوں نے اس مسئلے کو مستقبل کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ کتنے سالوں سے چنبیلی یہاں آ کر کھڑی ہوتی اور طرح طرح کے مردوں کے ساتھ چلی جاتی بھی مسئلہ نہ ہوا۔ سوائے ایک مرتبہ جب بدرنے اسے تھپڑ مارا تھا۔

چنبیلی ٹہل رہی تھی جب ایک گاڑی آ کر رکی۔ مخالف سمت میں رکنے والی گاڑی کو دیکھنے کے لیے چنبیلی مڑی اور گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر اپنی ہی ہم عمر لڑکی کو بیٹھے دیکھ کر رک سی گئی۔ لڑکی گاڑی سے اتری اور چنبیلی کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم“ لڑکی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ایک جائزہ لیتی نظروں سے چنبیلی کو دیکھا تھا۔

”چنبیلی نے ہاتھ ملا یا اور سوالیہ نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگی۔ خیر سگالی کی سگر اہٹ چہرے کی زینت بناتے ہوئے لڑکی بولنے لگی۔

”میرا نام روا ہے۔ میں ایک جرنلسٹ ہوں۔ صبح ایک چینل پر شو ہو سکتی ہوں۔“

لڑکی کا لہجہ متاثر کن اور شستہ تھا۔ لڑکی نے تعارف کروایا تو چنبیلی کے ذہن میں خاکے ابھرنے لگے وہ بھی ایک آدھ بار اس لڑکی کوئی وی پروڈیو کی تھی۔

”اصل میں ہمارا وی چینل کو توجہ دینا چاہتا ہے۔ آپ کون ہیں؟ کیسے اس پروڈیشن سے وابستہ ہوئیں؟ مستقبل کیا ہے؟ یہ پروگرام دراصل اس لیے کرنا چاہ رہے ہیں تاکہ ہمیں پتا چلے کہ اس نسل میں یہ سب کہاں سے آرہا ہے اور ہماری نیت اچھی ہے۔۔۔۔۔“ روا قائل کرنے والے انداز میں کہے جا رہی تھی۔ چنبیلی خاموش نگاہوں سے اس ماڈرن لڑکی کو دیکھتی رہی۔

”اب دیکھیں کچھ دن پہلے ایک لڑکی کی برہنہ لاش راوی کے کنارے سے ملی اور لاش کی جو حالت تھی صاف بتاتی تھی کہ اسے پامال کیا گیا ہے۔ ہم ان باتوں

کو بھی ہائی لائٹ کرنا چاہتے ہیں۔“ روا کو اندازہ نہ ہو پارہا تھا کہ سامنے کھڑی Prostitute کیا سوچ رہی ہے۔ ”میری باتوں کا مانڈ مت کیجئے گا۔ میں نے پچھلے کچھ عرصے سے آپ پر نظر بھی رکھی تھی۔ آپ روزانہ یہاں آ کر کھڑی ہوئیں پھر درمیان میں آپ نے ناغے بھی کیے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم معاوضہ بھی دیں گے اور اگر آپ کو پرسنل ایشوز ہیں تو آپ نقاب کر کے بھی ہمارے شو میں آ سکتی ہیں۔“ اپنے پیشے سے مخلص روا بطور خاص چاہتی تھی کہ چنبیلی اس کے شو میں آئے۔ وہ معاشرے کے اس طبقے کو سامنے لانا چاہتی تھی۔

چنبیلی خاموش تھی اور چنبیلی کی خاموشی روا کو مایوس کر رہی تھی۔

”اس شو سے لوگوں میں آگاہی ہوگی اور۔۔۔۔۔“ روا لوگوں کی آگاہی سے متعلق مزید کچھ کہتی لیکن چنبیلی نے اس کی بات کاٹی۔

”وہ لاش جو راوی کے کنارے ملی تھی۔ وہ میری سہیلی کی تھی اور میں آپ کے شو میں ضرور آؤں گی۔“

☆.....☆.....☆

اس خاندان میں لڑکیاں پیدا نہیں ہوتی تھیں۔ آخری لڑکی جو پیدا ہوئی تھی اس وقت متحدہ ہندوستان میں غدر کا عروج تھا اور یہ چار نسلیں پہلے کی بات تھی۔ اس کے بعد یہ خاندان خدا کی رحمت سے محروم ہی رہا۔ یہاں تک ایک صدی سے بھی کئی سال اوپر ہو گئے۔

یہ بیسویں صدی کی اسی کی دہائی تھی جب زوار یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت تلاش کر رہے تھے۔ اوپر ملازم ہوئے اور والدین نے لڑکیاں دیکھنی شروع کر دیں اور جس لڑکی کی قسمت چھکی اس کا نام رخسار تھا۔

نہ حسب نسب دیکھا گیا، نہ مال دولت کو تولا گیا اور نہ ہی شکل و صورت کو اہمیت دی گئی۔ پانچ بہنوں میں رخسار کا نمبر تیسرا تھا۔ اس کی ماں چھ بہنیں اور ان کا ایک بھائی تھا۔ بس اسی بات کو اہمیت دی گئی کہ ان کے ہاں بیٹیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ والد نے پر زور اصرار کیا تھا اور وہ رشتے کے حق میں تھے۔ والدہ صاحبہ مجازی خدا کی بات کہاں جھٹلانے والی تھی۔



چنانچہ رخسار زواری دلہن بن کر آگئی۔

شکر گزار زوار اور قناعت پسند رخسار کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ اہم سے اہم تر ہوتا گیا اور یہ دنیا ہی ان کے لیے جنت بن گئی۔ حسین جنت۔

زوار اگر رخسار کے سلیقے کے قائل تھے تو رخسار ان کے طریقے کو سراہتی۔ محبت کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور جب ان کے اس رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے خدا نے ایک نئی جان رخسار کے پیٹ میں ڈالی تو گھر میں خوشی و انبساط کے ساتھ اضطراب نے ڈیرے ڈال لیے۔ والدہ صاحبہ تو چلوغیر خاندان سے تھیں۔ بہنوں، بھانجیوں اور بھیموں دانی لیکن والد صاحب محاورے کا نہیں بلکہ حقیقتاً نسلوں سے گھر میں بیٹی کی قلتار یاں سننے کے کو بے تاب تھے۔ جب ان کا اپنا زمانہ تھا تب بھی انھوں نے ہر مرتبہ بیٹی کا انتظار کیا تھا لیکن خدا نے ان کی خواہش کو تشنہ رکھا۔ اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ زوار کے دقت اپنے دوست کی بیٹی کو زوار کی دودھ شریک بہن اور اپنی رضاعی بیٹی بنایا۔ لیکن کسی اس طرح سے پوری نہ ہوئی جس طرح سے حقیقی بیٹی پوری کرتی۔

یوں تو والد صاحب فارغ وقت میں افقی بھی چار پائی پر بیٹھے سلیقے سے پگڑی سر پر جمائے، حقے کی منہ میں دہانے لگاڑتے ہوئے دھواں ہوا کے سپر کرتے رہتے لیکن اضطراب ان کی ہر حرکت سے داغ ہوتا۔

بیوی سے اصرار کر کے انھوں نے دور محلے کی دانی بھی بلوائی جو دوران حمل زچہ کی چال سے بتا دیتی کہ لڑکا ہوگا کہ لڑکی۔ دانی کا تجربہ دہائیوں پر محیط تھا۔

”لے سردار علی فیصلے خدا کی ذات کے۔ ہم کون ہوتے ہیں نخل ہونے والے پر میرا تجربہ بتاتا ہے کہ لڑکی ہوگی باقی خدا کی مرضی۔“ دانی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے تھے۔ سردار علی اتنے مسرور ہوئے کہ ایک سبز کڑاٹا نوٹ دانی کی جھولی میں ڈالا۔ سبز نوٹ کی اس زمانے میں بے تحاشا وقعت تھی۔ مگر دانی نے جو خبر سردار علی کو سنائی تھی وہ خبر کہیں زیادہ بڑی تھی۔

زمانے کی رفتار ان دنوں ایسی تیز نہ ہوتی تھی۔

الٹراساؤنڈ اتنا عام نہ تھا اور یوں بھی لوگ الٹراساؤنڈ لگوا کر بچے کی جنس معلوم کروانا گناہ کبیرہ خیال کرتے تھے اور پھر وہ دقت آگیا۔ جس کا انتظار کیا تھا۔

تجربہ کار دانی کو ہی بلایا گیا تھا۔ زوار کو بھی بیٹی کی تمنا تھی لیکن سردار علی کے انداز ہی نرالے تھے۔ لحد جاں گسل پگھل پگھل کر سرکتا رہا۔ یہاں تک کہ تھمتا تے چہرے کے ساتھ دانی اور زوار کی والدہ صاحبہ باہر آئیں۔ والدہ صاحب کے ہاتھ میں گرم کپڑوں میں لپٹا وجود تھا۔

”صد مبارک سردار علی۔ یوں تو میں نئی زندگی کی مبارک باد سب سے پہلے باپ کو دیتی ہوں لیکن تیری خوشی دیکھ کر مجھے آج تو مبارک کا زیادہ حق دار لگ رہا ہے“ سردار علی تو جیسے خوشی سے دیوانے ہو گئے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ پوتی کو ہاتھوں میں تھامتا تھا۔

”یہ میری بیٹی ہے“ سردار علی کی آنکھوں میں جھلمل آنسو چمکے۔

”بیٹی کے باپ کو بھی صد مبارک“ دانی نے کہا۔ باپ اور دادا نے دانی کو مٹھائی کے پیسے دینے اور توجیح سے بڑھ کر دیئے۔ دانی دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئی۔

”سردار علی بچی جھوٹی ہے کہیں۔ درد ہی نہ اتار دو۔“ والدہ صاحبہ نے ٹوکا تھا تو بمشکل تمام سردار علی نے بچی بیوی کے حوالے کی۔

بیٹے کو ساتھ لگایا تو کتنی دیر ساتھ بھینچے کھڑے رہے۔

”تھے یقین آئے یا نہ آئے زوار پر یہ سچ ہے اتنا خوش میں کبھی نہ ہوا“ سردار علی کے لہجے میں مسرت تھی۔

بچی کے نام رکھنے کا وقت آیا تو کسی نام پر اتفاق ہی نہ ہوتا تھا۔ یونہی ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا اور پھر ڈیڑھ ہفتے بعد سردار علی کی رائے کو مقدم جان کر بچی کا نام سونیا رکھا گیا۔

”سونیا سردار“ باپ کی خوشی کے لیے زوار نے بیٹی کے نام کے ساتھ اپنے نام کی بجائے باپ کا نام جوڑا تھا۔ سونیا گھر بھر کے آنکھ کا تارا تھی۔ ایک دن

رخسار نے یونہی پیار میں سونی بلایا تو سونی پیار کا نام  
 ٹھہرا۔  
 گھر بھر میں آسودگی تھی۔ سونی کی قاتقاریاں گھر  
 میں گونجتیں تو سارا گھر جھوم اٹھتا اور کبھی جو سونیا پیار ہوتی  
 تو سارا گھر پریشان ہو جاتا۔ یونہی وقت گزرتا گیا۔  
 سونی دو سال کی ہوئی تو سردار علی پر فوج آن  
 گزرا۔ فوج کا پہلا حملہ ہی جان لیوا ثابت ہوا تھا۔  
 والد صاحب کے گزرنے کے چند ماہ بعد والدہ صاحبہ  
 بھی خالق حقیقی سے جا ملیں۔

زوار نے کروٹ بدلی۔ گھڑی پر ٹائم دیکھا۔ صبح  
 کے پانچ بج رہے تھے۔ جولائی کے گرم دن تھے۔  
 پانچ بجے کافی دن نکل آتا تھا۔ کچھ دیر یونہی کسلندی  
 سے لیٹے رہے۔ پھر اٹھے۔ داش روم کا رخ کیا۔ منہ  
 پر چھینٹے مار کر آئے اور چار پائی پر بیٹھ گئے۔  
 اس وقت صحن میں دو چار پائیاں بچھی تھیں گرمیوں  
 کے دنوں میں میاں بیوی صحن میں سوتے تھے۔  
 رخسار برآمدے میں چوکی پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی  
 تھی۔

زوار نے یہ دکھ صبر سے ہے کہ یہ لمحہ تو ہر کسی نے  
 صبر سے سہنا ہی ہوتا ہے۔ زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔  
 چلتی رہی کہ ایک دن -----

”اٹھ گئے آپ، ضرور سونی کے شور کی وجہ سے  
 اٹھے ہوں گے۔ کل دوپہر کو سونی تو شام کو کتنی کوشش کی  
 مگر یہ محترمہ نہیں اٹھیں اور صبح ہمیں تنگ کرنے کے لیے  
 چار بجے ہی جاگ گئی“ رخسار نے آنے کو مکیاں  
 مارتے ہوئے کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

تنتلی ہوں میں تلی ہوں  
 پھولوں سے میں نکلی ہوں  
 ٹھنڈا پانی پیتی ہوں  
 اوپر پٹکھا چلتا ہے  
 نیچے مناسوتا ہے  
 منے کی ماں موٹی  
 کھائے ڈبل روٹی  
 ڈبل روٹی خراب  
 منے کی ماں ناراض

منے کی ماں موٹی  
 کھائے ڈبل روٹی  
 ڈبل روٹی خراب  
 منے کی ماں ناراض  
 سونی سائیکل کھشتی جاتی اور کہتی جاتی۔ زوار نے  
 گردن موڑ کر دلا ری کو دیکھا۔ بے ساختہ بے تحاشا پیار  
 اٹھ آیا۔

سونی کہتی جاتی اور کہتی جاتی۔ ستون سے گلے لگ  
 لگ کر وہ کتنی دیر یہ نظم گاتی رہی اور پھر دھیان سامنے  
 پڑے اپنے تین پہیوں والے سائیکل کی طرف گیا تو  
 دوڑ کر سائیکل کی طرف گئی اور سائیکل پر بیٹھ گئی۔

”سونی ادھر آؤ“ زوار نے پکارا۔ سونی سنی ان  
 سنی کرتی سائیکل کھشتی رہی اور کنگلانی رہی۔  
 ”کیسا صاف بولتی ہے ماشاء اللہ۔ سکول داخل  
 کروا دینا چاہیے۔ زوار رخسار سے مخاطب ہوئے۔  
 ”نہ جی اگلے سال داخل کروائیں گے۔ ابھی تو  
 صرف تین سال کی ہے۔ ابھی تو کھیلنے دیں۔“ آٹا گندھ  
 چکا تو رخسار پر ات لے کر باورچی خانے کی طرف چلی  
 گئی۔

تنتلی ہوں میں تلی ہوں  
 پھولوں سے میں نکلی ہوں

اب آواز پہلے سے بھی اونچی ہو گئی تھی۔ پورا زور  
 لگا کر گارہی تھی۔ تین پہیوں والا سائیکل ابھی پیڈل  
 کے ساتھ چلانا نہیں آتا تھا۔ پاؤں دھکیل دھکیل کر  
 سائیکل کھشتی۔

”تنتلی ہوں میں تلی ہوں“ ایسے لگتا تھا کہ سونی یہ  
 گاتے کبھی بیزار ہوگی اور نہ کبھی تھکے گی۔  
 ”ادت تلی ذرا ادھر تو آ۔۔۔۔۔“ زوار نے ایک  
 بار پھر بیٹی کو پکارا تھا۔ سونی سائیکل چھوڑتی دوڑ کر باپ  
 کے پاس آئی اور باپ کی گود میں چڑھ گئی۔  
 ”آرام سے آرام سے۔۔۔۔۔“ سونی کی رفتار

ٹھنڈا پانی پیتی ہوں  
 اوپر پٹکھا چلتا ہے  
 نیچے مناسوتا ہے



اپنے لیے بھی ناشتا لائی تھی۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔  
دونوں میاں بیوی میں خوب محبت تھی۔ شادی کے  
چار سال بعد بھی ایک ہی برتن سے کھاتے۔

”بعد تو بہت دور ہے۔ ہم آج ہی چلیں گے۔“  
زوار نے کہا تو رخسار نے دوبارہ سے تردید نہ کی۔ جانتی  
تھی شوہر نامہ اہل کہاں رکھنے والے ہیں۔ ان دنوں جمعے کو  
چھٹی ہوا کرتی تھی۔ اسی لیے گھر کے کام اور تفریح کے  
ارادے جمعے کے روز کے لیے اٹھا رکھے جاتے۔

”آؤ سونی ناشتا کر لو“ رخسار نے سونی کو بلایا تھا۔  
”مجھے نہیں کھانا“ سونی کھیلتی رہی۔ صبح وہ  
دودھ بھی پی چکی تھی اور آم بھی کھا چکی تھی۔ اب کہاں  
کچھ کھانا تھا۔

”اللہ کا لاکھ لاکھ چکر ہے کہ وہ اپنی رحمت کی چادر  
مسلل ہمارے اوپر تانے ہوئے ہے۔“ ناشتا ختم ہوا تو  
زوار ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔ ”جی بالکل“ رخسار  
نے ناشتے کے برتن سیٹے اور کچن کی طرف چل دی۔  
”بتلی ہوں میں بتلی ہوں۔“ سونی کاراگ جاری تھا۔

☆.....☆.....☆

دوپہر کا وقت تھا۔ گرم لو کے جھکڑ چل رہے تھے۔  
انسان حیوان، چرند پرند سبھی اپنے ٹھکانوں میں دبکے  
تھے۔ دھوپ میں جھلسا دینے والی تمازت تھی۔

نویدا دور سے چل کر آرہا تھا۔ سینے میں شرابور  
قمیض بدن سے چسکی ہوئی۔ حلق خشک، ایسے لگتا جیسے  
کانٹے اگے ہوئے ہوں۔ زمین کی گرمی تیلیپر سے  
پتروں کو خشک ہو رہی تھی۔ گھروں کی دیواروں کے  
سائے اتنے لمبے نہ تھے کہ بندہ ان میں سستا سکے۔ منہ  
ہی منہ میں بڑبڑاتا، گرمی کو کوستا وہ سا پہ وارجلہ کے لیے  
دیکھتا جا رہا تھا کہ سامنے مسجد کے مینار نظر آئے اور جان  
میں جان آئی۔

مسجد میں جا کر سب سے پہلے وہ رفع حاجت سے  
فارغ ہوا۔ وضو گاہ میں بیٹھ کر کئی دیر منہ پر چھینٹے مارتا  
رہا۔ سر بھی گیلا کیا۔ پاؤں بھی دھوئے اور سیر ہو کر پانی  
پیا۔ مسجد کا پانی کا ذائقہ تھوڑا ٹھیکین تو تھا پر پینے لائق  
تھا۔ اس سب سے جسم کو لگی آگ تھوڑی ٹھنڈی ہوئی تو  
اس نے اندرونی حصے کا رخ کیا۔

دیکھ کر زوار کو ڈر سا لگا کہیں گرمی نہ جائے۔  
”ابو آپ میرے لیے وہ آئس کریم نہیں لائے  
نا جو گائے کھاتی ہے۔“ آج کل ٹی وی میں ایک  
آئس کریم کی کمپین آ رہی تھی جس میں کارٹونک گائے  
آئس کریم کھاتی تھی۔ سونی کے حواسوں پر آج کل وہ  
آئس کریم طاری تھی۔ سوتے جاگتے۔ کھیلتے کودتے بس  
آئس کریم کو سوچے جاتی۔  
زوار مسکرا دیئے۔

”بیٹا وہ یہاں سے ملتی نہیں نا اور آج کل گرمی  
بہت ہے۔ میں دور سے لاؤں تو پگھل جائے گی۔“  
زوار نے کہا تو سونی نے منہ بسورا۔

”میں پگھلی ہوئی کھالوں گی۔“ تین سالہ بچی پگھلی  
کڑوا لگھی کہہ رہی تھی۔ زوار نے مسکراتے ہوئے بیٹی  
کے گال پر بوسہ دیا۔ سونی منہ بسورے بیٹھی رہی۔

”چلو ایسے کرتے ہیں، شام کو میں جب دفتر سے  
آؤں گا تو پھر آئس کریم کھانے چلیں گے۔ میں تم اور  
امی“ سونی نے ہونٹ دباتے ہوئے سرٹھی میں ہلایا۔  
”نہیں امی“ سونی سے کہاں صبر ہوتا تھا۔

زوار ایک بار پھر بس بڑے۔  
”سونی ابو کو تنگ مت کرو۔ انھوں نے کام پر جانا  
ہے۔ شام کو آئس کریم کھلانے لے جائیں گے نا۔“

رخسار کچن کے دروازے پر کھڑی کہہ رہی تھی۔ سونی  
نے تیوری چڑھا کر ماں کو دیکھ اور کچھ کہے بنا باپ کی  
گود سے اتر گئی اور پھر سے سائیکل پر آن بیٹھی۔  
”بتلی ہوں میں بتلی ہوں“ راگ ایک بار پھر  
جاگ اٹھا تھا۔

”تیار رہنا تم بھی شام کو پھر گائے والی آئس کریم  
کھانے چلیں گے۔“ رخسار ناشتے کر آئی تو زوار نے  
شرارت سے کہا تھا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ سارا دن دفتر میں گزار کر  
آپ اتنے تھکے ہوئے آتے ہیں۔ گرمی بھی تو بہت  
ہوتی ہے۔ دوبارہ سے کہیں نہیں جائیں گے۔ آپ  
آرام کیجئے گا۔ جو کو آپ کو چھٹی ہوگی چاہے اس دن  
چلے جائیں گے۔ سونی تو بچی ہے۔ ایسی چھوٹی موٹی  
چیزوں کے لیناس کا دل تو ہمکتا ہی رہے گا۔“ رخسار

اتنی لمبی دوپہر تھی سو چا تھوڑا دیر سستالے۔ ظہر کی جماعت کو ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تھا۔ اس مسجد میں نماز ظہر اول وقت میں ادا کر لی جاتی۔ اس وقت مسجد میں مولوی صاحب کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

”مسافر لگتے ہو؟“ مولوی صاحب نے نوید سے پوچھا تھا۔

”جی“ نوید ابولا تو بیان کی تیز خوشبو مولوی صاحب کے نکتوں سے ٹکرائی تھی۔ مولوی صاحب نظر انداز کر گئے۔ یوں بھی وہ ظاہری شخصیت پر دھیان دینے والے نہ تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ ظاہر باطن کے اظہار کا ذریعہ نہیں ہوتا تھا۔

”نماز ظہر ادا کر لی؟“

”جی“ نوید نے جھوٹ بولنے میں عار محسوس نہ کیا۔

”ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تھی۔ ادھر کام کے سلسلے میں جا رہا تھا۔ گری برداشت نہ ہو رہی تھی سو چا کہ تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں۔“ نوید نے کالج باز اڑی تھا۔ اگلے بندے کی سماعت پر گراں گزرنے والا تھا لیکن یہاں سامع مولوی صاحب تھے۔

”اچھا، اچھا“ مولوی صاحب دوبارہ سے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ وہ مسجد کے قرآن مجید ترتیب سے رکھ رہے تھے۔ قرآن مجید کے کئی نسخے تھے۔ محلے کی آبادی کے تناسب سے زیادہ۔ مولوی صاحب ترتیب دیتے رہے اور نوید آلتی پالتی مارے بیٹھا مسجد کے درو دیوار دیکھتا رہا۔ تھوڑا سا نیم دراز ہوا تب تک مولوی صاحب قرآن مجید ترتیب سے رکھ چکے تھے۔

”مسافر تو مسجد میں قیام کر سکتا ہے۔ پنا میں گھر جا رہا ہوں۔ مسجد کا دھیان رکھنا۔“ مولوی صاحب جوتوں کے ایک ڈبے سے اپنے کھسے نکالے اور چلے گئے۔

مولوی صاحب کے جانے کے بعد نوید یونہی چھت گھورنے لگا۔ چھت کالی نیچے تھی۔ پرانی وقتوں کی بنی مسجد تھی۔ دیکھتے دیکھتے نوید کی نظر گول گھومتے چھت والے پچھلے پر پڑی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی تو کھڑکی کے کواڑ کے پاس چھری بھی پڑی نظر آئی۔ لیٹے سے اٹھ بیٹھا اور تھوڑی دیر سوچتا رہا۔

اس گرمی میں بھلا کس نے مسجد میں آنا تھا۔ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک کھینٹی مسکراہٹ آن ٹھہری۔ ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ کس چیز پر کھڑے ہو کر پچھلا اتارا جاسکتا ہے۔ مسجد میں سٹول، میز، کرسی طرز کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ اس نے تین چار بار نگاہیں ادھر سے ادھر دوڑائیں۔ مسجد میں صفوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تھوڑا ماپوس ہونے لگا تو عقبی دیوار میں بنے اوپر نیچے کے طاقوں میں قرآن مجید نظر آئے۔ قرآن مجید کے کئی نسخے تھے۔ اتنے کہ چاروں طاق ترتیب میں لگے قرآن مجید سے پر تھے۔ ملعون ذہن میں ملعون سوچ آئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

جا کر مسجد کا داخلی دروازہ بند کر آیا۔ اول تو کوئی آتا نہ اور اگر کوئی آ بھی جاتا تو اس نے زیادہ سے زیادہ مارنا ہی تھا۔ نوید امار سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ اس گرمی میں لوگوں کو بھی توجیح نہیں کیا جاسکتا تھا اور نوید ابھانے میں یوں بھی تو ماہر تھا۔ داخلی دروازے کی کھنڈی لگانے کے بعد اس نے قرآن مجید کے نسخے نکالے۔ پچھلے کے نیچے ان کی ڈھیری لگائی۔ ترتیب سے اوپر نیچے رکھنے سے وہ کم از کم دو فٹ اونچائی میں آ گئے۔

نوید ان کے اوپر کھڑا ہو گیا۔ کلام اللہ پیروں کے نیچے تھا اور وہ چھت سے پچھلا اتار رہا تھا۔ آسانی سے پچھلا اتر گیا۔ جب نیچے اترنے لگا تو قرآن مجید کے نسخے ادھر ادھر کو لڑھک گئے۔

”کس نے کہا تھا یوں ڈھیر لگا کر مسجد بھرویں۔“ نوید نے ساتھ ہی ناقابل اشاعت گالی کی تھی۔ پچھلے کے پر اس نے چھری سے کھولے یہ تمام واردات سات منٹ میں ہو گئی۔ پچھلا اور پر بنگلوں میں دبا تا وہ مسجد سے نکل گیا۔

پچھلے کو قریب ترین کہاڑیے کی دکان پر اونے پونے بیچا۔ جو پیسے ہاتھ پہنچے گئے اس میں سے سب سے پہلے ایک گلاس ٹھنڈی بنجبین لی۔ ”گرمیوں میں ٹھنڈے مشروب کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔“ جب وہ گلاس منہ سے لگاتا تھا تو بنجبین کا مشروب اس کی موچھوں کو گیلا کرتا تھا۔



دوبچے کے قریب رخسار نے سونی کو تھپک تھپک کر سلا یا اور تین بجے وہ دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سوتے میں بھی اس کے خواب وہ آنسکریم آتی رہی جو گائے کھاتی تھی۔ رخسار کی ابھی بمشکل آنکھ لگی تھی کہ چار پائی ملی اور کھٹکا ہوا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو سونی چار پائی سے اتر رہی تھی۔

”تو بے کس قدر شرارتی ہے“ رخسار سوچ کر رہ گئی۔  
 ”باہر مت جانا سونی“ رخسار نے مندی مندی آواز میں کہا تھا۔ گرمیوں میں وہ صبح نماز کے وقت اٹھتی تو دوبارہ نہ سوتی اس لیے دوپہر کو طبیعت پر کافی کسلندی سی چھا جاتی۔ دوپہر کو سونا اس کے معمول کا حصہ تھا۔

سونی کمرے سے باہر آئی اور برآمدے میں پڑے اپنے کھلونوں کے ساتھ کھینے لگی۔ کھلونوں سے باتیں بھی کرتی اور انھیں الٹ پلٹ بھی کرتی۔ لیکن جلد ہی بیزار ہو گئی۔ کھلونوں کو پرے دھکیلا اور دوبارہ کمرے میں آ گئی۔ اس وقت تک وہ ننگے پاؤں تھی۔ کمرے سے اپنا میجک سٹریپ والا جوتا اٹھالائی اور پہن لیا۔ چار پائی پر چڑھی اور چہرہ کہنی پر ٹکائے زوار کا انتظار کرنے لگی۔

زوار کی نو سے پانچ والی ڈیوٹی تھی گھر پہنچے پہنچے عمو نا انھیں ساڑھے پانچ پونے چھ ہو جاتے تھے اور ابھی تو ساڑھے تین بجے تھے۔

سونی نے ایک نظر پاؤں میں پہنے جوتوں کو دیکھا۔ اسے ابھی دائیں اور بائیں پاؤں کے جوتے کا نہیں پتا چلتا تھا۔ غور سے جوتوں کو دیکھا تو لگا غلط پہنے ہوئے ہیں اتار کر دایاں جوتا بائیں پاؤں میں اور بایاں جوتا دائیں پاؤں میں پہن لیا۔ صحیح انداز میں پہنے ہوئے کو اتار کر غلط انداز میں پہننے کے بعد وہ مطمئن ہوئی کہ اب صحیح پہنے ہیں۔

نگلی ہوں میں نگلی ہوں

پھولوں سے میں نگلی ہوں۔

ٹھنڈا پانی پیتی ہوں

اوپر پٹکھا چلتا ہے

نیچے مناسوتا ہے

منے کی ماں موٹی

کھائے ڈبل روٹی

ڈبل روٹی خراب

منے کی ماں ناراض

گاتے گاتے اس نے نظر برآمدے میں لگی دیوار گیر گھڑی پر ڈالی۔ بس یہ پتا تھا کہ گھڑی سے وقت کا پتا چلتا ہے اور کچھ نہیں پتا تھا۔ گھڑی سے نظر بس ہٹا کر پھر سے گاتے لگی۔

”ٹھنڈا پانی پیتی ہوں“

”ٹھنڈا پانی پیتی ہوں“

”ٹھنڈا پانی پیتی ہوں“ انیسے جیسے ٹیپ ریکارڈ کی کیسٹ پھنس گئی ہو۔ ایک ہی فقرے کو بار بار آواز میں اتار چڑھا ڈالائے بغیر گاتی رہی۔

”ٹھنڈا پانی پیتی ہوں“ چار پائی سے اٹھی اور صحن پار کرتی گھر کے دروازے تک آئی کٹڑی پیچی تھی۔ سونی ایڑیاں اٹھا کر پنجوں کے بل کھڑی ہوئی تو با آسانی کٹڑی کھول لی۔

دروازے میں کھڑے ہو کر نگلی میں دیکھا ابو آ تو نہیں رہے۔ نگلی سنسان پڑی تھی۔ لو کے جھونکے مٹی کے ذرات اڑا رہے تھے۔ بالوں ہو کر دروازے میں کھڑی رہی۔

”ابو آ جائیں“ دیوار پر ہاتھ جمائے نگاہیں نگلی کے کٹڑ پر جمادیں۔ نگلی نوید نگلی کی کٹڑ پر نمودار ہوا۔

”بچی کیا کر رہی ہو۔“ نویدے نے دروازے پر رک کر سونی کو نظروں میں تولتا تھا۔

”میرے ابو نے آنا ہے۔ ہم نے آنسکریم کھانے جانا ہے۔ وہ جونی دی میں گائے کھاتی ہے۔“ سونی کی نگاہیں نگلی کی کٹڑ سے ہٹتی نہ تھیں۔ جیسے بس چند سیکنڈ ز میں زوار نے آ جانا ہے۔

بچی سرخ انار جیسی تھی۔ دیکھتے ہی چھوٹے کا دل کرتا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ نویدے نے پان زدہ دانتوں کی نمائش کی تھی۔

”سونی“

”تمہارے ابو کا کیا نام ہے؟“

”ابو کا نام۔۔۔۔۔“ سونی نے لمحے بھر کو نگاہ کٹڑ سے ہٹائی اور سامنے کھڑے انکل کو دیکھا کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر بولی۔

”ابو کا نام ابو ہے“ نوید نے کہا ہونٹ پھیل گئے۔ اس نے نگلی میں نظر ڈوڑائی بالکل سنسان تھی۔

”سونی مجھے تمہارے ابو نے بھیجا ہے۔ کہا ہے سونی کو لے آؤ۔ وہ آنسکریم والی دکان پر ہیں۔“

کونٹ سے نگاہیں کٹڑ پر جمائے سونی کی آنکھیں لمحے بھر میں چمک اٹھیں۔

”ای نے بھی جانا ہے ان کو لے آؤں“ سونی جلدی سے اندر کو مڑنے لگی تو نوید نے اس کی کلائی پکڑی اور گود میں اٹھالیا۔

”نہیں ای کے لیے ابو ساتھ لے آئیں گے۔“

نوید نے ہچکارا تھا۔

”ساتھ لے آئیں گے تو آنسکریم پلگھ جائے گی۔“ اتنا تو سونی کو پتا تھا۔

”نہیں کچھ ہوتا آؤ ہم چلیں۔ تم بتاؤ کتنی آنسکریم کھاؤ گی؟“

”اتنی“ سونی نے ہاتھ پھیلا کر اشارہ کیا۔ نوید نے تیز قدم اٹھا اٹھلی پار کرتا گیا۔

جیب میں پتلے کو بچنے سے نلی ہوئی رقم موجود تھی۔

قریب ترین جو بھی آنسکریم کی دکان آئی وہاں سے سونی کو آنسکریم لے کر دی تاکہ وہ بے چین ہو کر روٹا اور چیخنا نہ شروع کر دے۔ آنسکریم کھاتے ہوئے سونی بے انتہا خوش تھی۔ اتنی خوشی کہ حساب ہی نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

نوید کا اصل نام نوید نہیں تھا۔ وہ نوید ابھی تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے آپ کو اس محلے کے ایک گھر کی ڈیوڑھی پر پایا تھا۔ جس کے بارے میں شریف لوگ سوچنے سے بھی کتراتے تھے۔

کسی کو اس کی پروا نہ تھی۔ پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملتا۔ جہاں کچھ کھانے کو دیکھا وہاں جھپٹ پڑا۔ جانوروں کی طرح بغیر پرورش و تربیت کے وہ بڑھتا رہا۔ بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ کڑیل جوان ہو گیا۔

اب نوید کے کو اہمیت ملنا شروع ہوئی تھی؟ کئی کام وہ اپنے زور بازو پر کرتا تھا۔ اونچے اونچے گھروں والے پیسوں کا ڈھیر لگا دینے والے مرد ڈھونڈ لاتا۔

اسی ملک کی پیداوار ہونے کے باوجود ملک کے کسی ادارے یہاں تک کہ شناختی کارڈ دفتر میں بھی اس کا اندراج نہ تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اس محلے کے اکثر لوگ (جن میں اکا دکا مرد اور بے تماشا عورتیں تھیں) یونہی بے نشان تھے۔

ایسے ہی ایک دن ایک خوب پیسوں والے صاحب نے فرمائش کی۔ Pedophilia کا رواج نہ تھا پر گلی کے کتے بلیوں کی طرح خود بخود جوان ہونے والا نوید اتنا ہی خود غرض اور خود پرست تھا جتنا ایک گلی کا کتا ہوتا ہے۔ چھوٹی ہنگی چرا لایا۔

انھی دنوں اس کے ذہن میں خیال آیا کیوں نہ وہ خود کاروبار شروع کرے۔ چھوٹی پچیاں لے آئے گا تو چند سالوں بعد وہ اس کے لیے سونے کا انڈہ دینے والی مرغیاں بنی ثابت ہوں گی۔

چنانچہ اس نے دور کے گلی محلوں سے پچیاں چرائیں۔ پانچویں ہنگی پر اکتفا کر لیا۔ آخر انسان تھا کوئی کتا تو نہیں کہ بس بھرتا جاتا بھرتا جاتا۔ تھوڑا اور اچھے کا فرق تو انسان کو بتا ہوتا ہے اسی لیے وہ ہمیشہ تھوڑے اچھے کو زیادہ برے پر فوقیت دیتا ہے۔

☆.....☆.....☆

جہلم سے افسر بھائی، اسلام آباد سے ملازم بھائی اور گاؤں سے راشدہ آپا دوڑے چلے آئے۔ خبر ہی کچھ ایسی تھی۔

کہاں گئی سونی؟

گھر پر ایک سکوت بھری خاموشی نے ڈیرہ ڈال دیا۔

اخبارات میں اشتہارات دیئے گئے۔ ٹی وی اور ریڈیوں پر اعلانات کیے گئے۔ زوار نے خود گلی گلی جا کر سونی کو ڈھونڈا پر تمام کوششیں لاکھ حاصل نہیں۔

سونی لاپتا ہوئی۔ وہ رحمت جو چار نسلوں بعد خدا نے اتاری تھی۔ پتا بھی نہ چلا کھوئی۔

”صبر کرو زوار“ صفدر بھائی نے خوب دلا سے



دیئے۔ جہلم میں ان کے پاس افسری کا عہدہ تھا۔  
تعلقات بھی کچھ نہ کچھ تھے لیکن تمام تعلقات استعمال  
کرنے کے باوجود سونی کا پتہ نہ چل سکا تھا۔

”صبر۔۔۔۔۔“ زدار نے درد سے سوچا تھا۔  
”میری بیٹی کھو گئی اور آپ کہتے ہیں صبر کروں“  
زدار چیخ پڑے۔

صفر بھائی نے زدار کا ہاتھ پکڑا اور ہولے ہولے  
دبانے لگے ان کے لمس میں پیار بھری تسلی شامل تھی۔  
زدار نے لمحے بھر میں ہاتھ جھٹک دیا۔

”مجھے آپ کی ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔ کیسے  
افسر ہیں آپ ایک بچی کو نہیں ڈھونڈ سکتے۔“ زوار  
ہذیبانی انداز میں چیخنے لگے۔ نم آنکھوں والی راشدہ  
رضاعی بھائی کو درد بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

”زدار تم خود کو پریشان نہ کرو، سونی مل جائے  
گی۔ انشاء اللہ“ اسلام آباد سے آئے اسلم بھائی تسلی  
دیتے تھے۔

”کیسے ملی گئے دو ہفتے ہونے کو آئے ہیں اور کوئی  
سراغ ہی نہیں مل رہا۔ میں کیا کروں۔ خودکشی ہی نہ  
کر لوں۔“ زوار رونے لگے اور روتے ہی چلے گئے۔

کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ انھیں چپ کر دائے۔  
زوار کے بالتقابل بیٹھی رخسار خانی نظروں سے  
زدار کو دیکھتی رہ گئی۔ پچھلے دو ہفتے میں اس نے اتنے

آنسو بہائے تھے کہ اب لگتا تھا جیسے آنکھیں ہی خشک  
ہو گئی ہیں۔

”صدیوں بعد ہمارے خاندان میں بیٹی  
پیدا ہوئی تھی سب کتنے خوش تھے۔“ زوار روتے  
ہوئے کہہ رہے تھے۔ سب سر جھکائے بیٹھے رہ گئے۔

”ابو کی خوشی کا تو ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ میری سونی کا نام  
سونیا بھی انھوں نے ہی رکھا تھا اور مجھے یاد ہے کہ سونی  
کی پیدائش پر ابو نے مجھ سے کہا تھا کہ اتنا خوش وہ بھی  
نہیں ہوئے تھے۔“ الفاظ ٹوٹنے لگے تھے۔

”سونی کہاں ہو؟ یا اللہ یہ کیسی آزمائش ہے؟“  
زوار چیختے رہے، روتے رہے، روتے رہے، روتے رہے، روتے رہے،  
کیا سکتے تھے؟

☆.....☆.....☆

READING  
Section

2021 سچی کہانیاں

اور پھر سونی کو نہ ملتا تھا نہ ملی۔  
دور سے آئے بہن بھائی تسلیاں دیتے اور صبر کی  
تلقین کرتے رخصت ہو گئے۔ وہ بھائی جنھوں نے اپنے  
ہر پٹے کی پیدائش پر بیٹی کی تمنا کی تھی اور زوار کے ہاں  
سونی کی پیدائش پر اتنے ہی خوش تھے جیسے خود ان کے  
ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے جاتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

”شکر خدا کا کہ اس نے ہمیں بیٹی نہ دی۔ اگر وہ ہم  
ہو جاتی تو۔۔۔۔۔“ اس سے آگے وہ سوچ بھی نہ  
سکتے تھے۔

گھر میں چھائی خاموشی گھٹا ٹوپ ہونے لگی تھی۔  
زوار بولائے بولائے سے ایک کمرے سے  
دوسرے کمرے میں جاتے اور پھر سے پہلے کمرے  
میں آ جاتے۔

رخسار الٹ پلٹ کر سونی کے کھلونوں کو دیکھتی اور  
سینے سے لگا کر رونے لگ جاتی۔ بھوک کا احساس ہوتا  
تو بھی دونوں میاں بیوی ڈھیٹ بنے بھوک کے درد کو  
برداشت کرتے رہتے۔ کئی کئی پہر حلق سے ایک نوالہ نہ  
اتارتے۔ گھر ایسا میلا ہو گیا جیسے صدیوں سے صفائی نہ  
کی گئی ہو۔ خود رخسار اور زوار کس قدر تلکھے چلے  
رہنے لگے تھے۔

غم ایسا تھا کہ لگتا تھا کہ کلیجہ درد سے ہی پھٹ  
جائے گا اور وہ مرجائیں گے لیکن عجب بات تھی نہ کلیجہ  
پھٹتا تھا اور نہ ہی وہ مرتے تھے۔ دن کے دن گزر  
جاتے دنوں میاں بیوی بات نہ کرتے۔ کرنے کو جیسے  
کوئی بات ہی نہ تھی۔

ایسے ہی دن گزرتے جا رہے تھے۔ دفتر سے  
ایک خط آیا، دوسرا خط آیا اور پھر تیسرا اور آخری خط  
آیا۔ تیسرے خط میں مطلع کیا گیا تھا کہ زوار کو نوکری  
سے برخاست کر دیا گیا ہے۔

جب تیسرا خط موصول ہوا تھا اور زوار بیٹھے پڑھ  
رہے تھے تب رخسار بھی ساتھ دالی چار پائی پر بیٹھی  
تھی۔ نگاہیں زدار پر جمائے زدار کو دیکھتے ہوئے بھی  
انھیں نہ دیکھ رہی تھی۔

”دفتر سے خط آیا ہے۔ مجھے برخاست کر دیا گیا  
ہے“ خط پڑھنے کے بعد زدار نے خود ہی کہا تھا۔ خط

ساتھ تپائی پر پھینکنے کے انداز میں رکھا تھا۔ رخسار نگاہوں کا زاویہ تبدیل کیے بغیر زوار کو یونہی دیکھتی رہی۔ جیسے اس خبر کا ہونا نہ ہونا ایک ساتھ۔

کئی لمحے یونہی خاموشی میں گزر گئے۔ دونوں میاں بیوی خاموش بیٹھے رہے۔ بالآخر رخسار بولی۔

جیسے مدت بعد میاں بیوی مخاطب ہوئے ہیں۔

”سونی کب ملے گی زوار؟“

زوار جواب نہ دے پائے۔ خواب دینے کے لیے ان کے پاس الفاظ نہیں تھے اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ ایسی خاموشی جو زندگی کو ننگے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد زوار بولے۔ ان کی آواز میں کرب تھا۔

”سوچتا ہوں کہ ہم شہر کی بجائے کسی چھوٹے سے گاؤں میں رہتے۔ یوں میری بیٹی تو نہ کم ہوتی۔“

رخسار کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ رخسار کو روتے دیکھا تو زوار کی آنکھیں بھی خود بخود بھر آئیں۔

”خدا نے مجھے بیٹی دی تو خدا کا شکر ادا نہ کرتے ٹھکتا تھا۔ اب سوچتا ہوں کہ کاش بیٹی کی جگہ بیٹا ہوتا۔ پتا نہیں اس ظالم زمانے نے میری بیٹی کے ساتھ کیا حال کیا ہوگا۔“ رخسار تڑپ اٹھی۔ شوہر کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

”ایسی باتیں مت کرو زوار۔ میری سونی بہت چھوٹی ہے۔“ رخسار کے رونے میں روانی آگئی تھی۔

”ہاں ہماری سونی تو بہت چھوٹی ہے۔ ابھی تو اسے وائیں اور بائیں جوتے کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ آنسوؤں نے زوار کا پورا چہرہ بھگو دیا تھا۔ لاڈلی کی ہر بات یاد آتی تھی۔

”ہاں زوار۔ وہ خود سے صحیح جوتا بھی نہیں پہن سکتی تھی۔ اور کولر سے پانی بھی نہیں بھر سکتی تھی۔ اسے کولر کی ٹوٹی دیا تا نہیں آتا تھا اور اسے پیاس بھی ہر آدھے گھنٹے بعد لگتی تھی۔ سارا دن میرا سر کھاتی رہتی کہ پانی بھر دو اور جب پانی پیتی تو سارے کپڑے بھی گیلے کر دیتی۔ گلاس کا منہ بڑا ہوتا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے پانی بہتا۔ دونوں میاں

بیوی کا ایک ہی غم تھا۔

”اور وہ نظم جو وہ صبح شام گاتی تھی پھلی ہوں میں پھلی ہوں۔۔۔۔۔“ آنکھیں آنسوؤں سے اتنی بھر گئیں کہ سامنے بیٹھی رخسار وحند لی دکھائی دینے لگی تھی۔

”پھلی نہیں تلی، تلی ہوں میں تلی ہوں۔“ کہتے ہوئے رخسار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”تھوڑی تھوڑی“

”تھوڑی تھوڑی“

”سناؤ پھر۔۔۔۔۔“ زوار نے بوجھل آواز میں فرمائش کی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ آنسو صاف کرتے رخسار نفی میں سر ہلانے لگی۔

”پلیز۔۔۔۔۔“ زوار کے لہجے میں التجا در آئی۔

”سناؤ رخسار پلیز۔۔۔۔۔“ زوار نے آنکھیں رگڑی تھیں۔ ہچکیاں لیتی رخسار شوہر کو دیکھے گئی۔ پھلے چند دنوں نے کیسے تو مند سرخ چہرے والے زوار کو کمزور اور لاغر کر دیا تھا۔

چند لمحے خاموشی نے سمیٹ لیے اور پھر کمرے میں رخسار کی آواز گونجنے لگی۔

تلی ہوں میں تلی ہوں

پھولوں سے میں لگی ہوں

آنسوؤں کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔

”ٹھنڈا پانی پیتی ہوں

اوپر پٹکھا چلتا ہے

نیچے مناسوتا ہے

ہچکیاں الفاظ بھی صحیح طرح سے ادا کرنے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔

سننے کی ماں سونٹی

کھائے ڈبل روٹی

ڈبل روٹی خراب

سننے کی مہم ماں ناراض ص۔۔۔۔۔“

خاموشی سے روتے زوار نظم کے ختم ہونے تک بلند آواز میں رورہے تھے۔

☆.....☆.....☆

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆



مردوں کے لیے سے جہاں کو طیش میں نہ رہے وہاں کی عبرت ملاد  
 اس قدر کہ جہاں کو طیش میں نہ رہے وہاں کی عبرت ملاد

## گھر و دل!



جاوید راہی

جاوید راہی کے شرر بار قلم کا شاہ کار، طویل کہانی نمبر کی سوغات

ایک ایسی ڈکیتی کی واردات، جو آپ کو کبھی نہ بھولے گی

خدمت گاران تینوں ماں بیٹوں کے ناز نخرے پورے  
 کرنے کیلئے ہمہ وقت موجود رہتے۔ شام کو عثمان کے  
 کچھ دوست آجاتے تو اوپر والے حصے میں اکثر تاش  
 کی بازی جتا کرتی۔

پھر عادل کا ایم بی بی ایس کا فائنل نتیجہ آ گیا  
 جس میں وہ بہت اچھے نمبروں سے کامیاب قرار  
 پایا تھا۔ بس اس کے بعد تو بیگم احمد شاہ کے پاس  
 اپنے دونوں بیٹوں کیلئے لڑکیاں دیکھنے کے سوا کوئی  
 اور مشغلہ نہ تھا۔ عادل نے تو یہ کام اپنے ماں کی  
 مرضی اور منشاء پر چھوڑ دیا تھا مگر عثمان کی خواہش  
 تھی کہ وہ شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ لے، چنانچہ  
 اس کے دوستوں کی بیویاں اور بیگم احمد شاہ رات  
 دن اسی کام میں لگی ہوئی تھیں۔

مگر اس وقت عثمان ہر بات کو بھول گیا جب  
 اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی گلی میں  
 کار موڑی اس وقت اسٹیرنگ اس کے ہاتھ سے  
 چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا۔ گلی میں خلاف معمول  
 لوگ کھڑے تھے اور اس کے گھر کے سامنے  
 پولیس کی ایک دین بھی موجود تھی اس کا چھوٹا بھائی  
 کسی پولیس والے سے گفتگو کر رہا تھا۔ عثمان نے

بیگم احمد شاہ ایک معصوم صفت خاتون تھیں دو  
 بیٹیاں اور ایک بیٹی کی ماں تھیں شوہر کی موت کے بعد  
 کافی بیمار رہنے لگی تھیں لیکن دونوں بیٹے عثمان شاہ اور  
 عادل شاہ ماں کے بڑے فرماں بردار تھے۔ عثمان شاہ  
 بہترین ملازمت کرتا تھا جبکہ چھوٹا بیٹا عادل پڑھ رہا  
 تھا۔ بیٹی ندیمہ کی شادی کر دی اور وہ امریکہ چلی گئی  
 تھی۔ عادل شاہ عثمان سے ایک سال چھوٹا تھا۔ بیگم  
 احمد شاہ کی خواہش تھی کہ جلد از جلد عثمان کی شادی کر  
 دیں مگر عثمان کا اصرار تھا کہ عادل کے ایم بی بی ایس  
 مکمل کر لینے کے بعد دونوں بھائی ایک ساتھ شادی  
 کریں گے۔

بیگم احمد شاہ نے اپنے شوہر کی زندگی میں اتنے  
 راج نہ کیے ہوں گے جتنے عثمان نے انہیں کرا دیے  
 تھے۔ عثمان ایک ایسے سرکاری محکمے میں ملازم تھا جہاں  
 اوپر کی آمدنی اصل آمدنی ہوتی ہے۔ پہلی تاریخ والی  
 آمدنی تو اس کے گھر کی دو کاروں کا پٹرول بھی پورا  
 نہیں کر سکتی تھی اور اب تو عثمان نے شہر کے فیشن ایبل  
 علاقے میں جدید طرز کی ایک کوٹھی بھی خرید لی تھی  
 جہاں وہ اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتا  
 تھا۔ ایک خانساں ایک ڈرائیور ایک ملازمہ اور دو

اپنے گھر کے دروازے پر نگاہ ڈالی تو وہاں اسے اپنی والدہ حیران پریشان کھڑی دکھائی دیں۔ عثمان نے والدہ اور بھائی کو دیکھ کر اطمینان کا سانس ضرور لیا مگر پولیس کی موجودگی حالات کی کسی بڑی خرابی کا سراغ دے رہی تھی اور اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے گھر یقیناً ڈاکہ پڑا ہے مگر اسی لمحے اس کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا تھا۔ تھانے کا انچارج خود بھی جائے واردات پر چار پانچ سپاہیوں کے ساتھ موجود تھا۔ عثمان نے کار ایک طرف کھڑی کی اور باہر نکلا تو عادل تیزی سے اس کی طرف آیا۔ عادل اس کے سامنے پہنچ کر رونی صورت بنا کر بولا۔

اوٹ میں ہو گئی تھیں۔ اپنی ماں کو اندر جانے کی ہدایت کر کے اور چھوٹے بھائی کی پیٹھ پر تسلی کی غرض سے ہاتھ تھپتھپاتا ہوا عثمان اس طرف بڑھا جہاں تھانہ انچارج کھڑا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پر تکلف انداز میں ہاتھ ملایا اور پھر عثمان نے اپنا تعارف کروانے کے بعد تھانہ انچارج کو گھر کے اندر چلنے کیلئے کہا۔

”ہم گھر کا معائنہ تو کر چکے ہیں جناب ڈاکے کی پوری تفصیلات بھی معلوم ہو گئی ہیں ڈاکوؤں نے آپ کے کمرے کی الماری بھی تو زور دی ہے۔“ تھانہ انچارج نے کہا۔

”میرے کمرے کی الماری..... کیا مطلب؟“ عثمان کی آنکھوں میں ایک لمحے کیلئے تشویش کی جھلک نظر آئی تھی۔

”ہمیں پورے ڈاکے کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے؟“ انسپکٹر نے عثمان سے کہا۔ ”آپ کے بھائی اور والدہ نے بتایا کہ شاید کچھ نقدی وغیرہ آپ کی الماری میں تھی مگر یہ بات انہیں نہیں معلوم کہ اس نقدی کی مالیت کیا ہے۔ یہ بات آپ ہمیں بتادیں تاکہ ہم

”بیہیا! ڈاکو سب کچھ لے گئے سب کچھ“

”اللہ مالک ہے یار“ عثمان نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا اپنے آپ کو سنبھالنے کے سوا اس کے پاس چارہ بھی کیا تھا پھر وہ اپنی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے بولا۔

”آپ اندر جائیے ای۔“ اور اس کی والدہ اس کے کہنے پر آنکھوں میں آنسو بھر لیے دروازے کی

Downloaded From  
Paksociety.com



دیگر کاروائی کر سکیں۔“

”آپ اپنی طبیعت ٹھیک رکھیں ای ہر برے کام میں کوئی نہ کوئی اچھائی بھی ہوتی ہے اگر وہ ڈاکو خدا خواستہ آپ کو یا عادل کو نقصان پہنچا دیتے تو۔“

عثمان نے انسپکٹر کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے عادل سے پوچھا ”کیا کیا چیز گئی ہے؟“

عثمان نے کمال ضبط سے اپنی ماں کو تسلی دی۔  
”ٹو اپنا کمرادیکھ لے بیٹا تیری الماری بھی ان کمپنیوں نے توڑ ڈالی ہے۔“ بیگم احمد شاہ نے بمشکل کہا۔

”اسی کے سارے زیورات پرائز بانڈ اور دس لاکھ روپے نقد جوای کی الماری میں رکھے تھے“ عادل نے رو ہاتسے لہجے میں کہا۔

”سارے پرائز بانڈز“ عثمان نے پوچھا۔

عثمان کو خود بھی اپنے کمرے میں جانے کی جلدی تھی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی نظر سب سے پہلے الماری پر گئی۔ جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے اس نے سب سے پہلے الماری کے دونوں لاکر دیکھے جو ٹوٹے ہوئے تھے پھر اس نے جلدی سے اوپر والے خانے میں پوشیدہ لاکر کو دیکھا تو اس کا چھوٹا سا پٹ بھی کھلا ہوا تھا عثمان نے جلدی سے اس میں ہاتھ ڈال کر ٹیلا تو اندر کچھ بھی نہیں تھا ایک لخت اس کا پورا جسم پسینے میں بھج گیا اس نے محسوس کیا کہ اس کی ہاتھوں کا دم کسی نے نکال لیا ہے اگر وہ عقب میں کھڑی ہوئی اپنی ماں کو نہ دیکھ لیتا تو شاید اپنی لڑکھڑاہٹ پر زبردستی قابو نہ پاسکتا جس نے اس کے جسم کو لڑا کر رکھ دیا تھا اس کی ماں حیرت اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”جی ہاں تقریباً دو لاکھ روپے کے تھے وہ سب۔“ عادل نے جواب دیا۔

”آپ کی والدہ کا خیال ہے کہ زیورات کی مالیت چندرہ لاکھ روپے تھی۔“ انسپکٹر نے دونوں بھائیوں کی گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”آپ تو ماشاء اللہ پڑھے لکھے آدمی ہیں اتنی بھاری مالیت کے زیورات اور پرائز بانڈز آپ نے بینک کے لاکر میں کیوں نہیں رکھ دیئے۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ حالات ان دنوں بہت خراب ہیں۔“

عثمان نے ایک بار پھر انسپکٹر کی بات کا جواب دینے کی بجائے اس سے کہا وہ ذرا گھر کے اندر کا ایک چکر لگا آئے اور اپنے کمرے کو بھی چیک کر لے تاکہ ڈاکو میں جانے والی اشیاء اور نقدی کا خود بھی اندازہ لگا سکے۔ وہ گھر کے اندر چلا گیا اور انسپکٹر قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا جو ملازم نے تھوڑی دیر پہلے لاکر دی تھی۔

”کیا تیرے بھی کچھ پیسے یہاں رکھے تھے؟“ بیگم احمد نے ہولے سے سرگوشی کی۔

”نہیں تھوڑے سے پیسے ہی تھے اور پروالے خفیہ لاکر میں۔“ عثمان نے اپنی ماں کو جواب دیا اور قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے تولیے سے عثمان نے اپنے چہرے اور پیشانی کا پسینہ پونچھا اس کے دماغ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ لوٹ مار کرنے والے اس کی الماری کے خفیہ خانے سے ستر لاکھ روپے بھی لے گئے تھے۔ ان ستر لاکھ روپوں کے بارے میں عثمان نے اپنی ماں اور بھائی کو بھی نہیں بتایا تھا اسے ویسے ہی اپنی آمدنی چھپانا مشکل تھی۔ لہذا ان ستر لاکھ روپوں کے بارے میں کیا بتاتا۔ اس کے چھوٹے بھائی کو تو کسی حد تک اندازہ تھا کہ عثمان

عثمان جیسے ہی پورچ سے ہو کر بند گھر میں داخل ہوا تو بیگم احمد شاہ اس کے گلے لگ کر رونے لگیں ان کی آنکھوں سے برسات ہو رہی تھی وہ روتے ہوئے بولیں۔

”میرے بیٹے کی محنت لوٹ کر لے گئے کبخت مارے خدا غارت کرے ان تینوں کو برباد کر دیا میرا پورا گھر عالموں نے۔“ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگیں۔

”آپ کیوں فکر کرتی ہیں میرے ہاتھ کی لکیریں تو کاٹ کر نہیں لے گئے۔“ عثمان نے اپنی ماں کی آنسو بھری آنکھوں کے سامنے دائیں ہاتھ کی پھیلی کر دیتے ہوئے کہا۔

رشوت لیتا ہے مگر ماں نے جب بھی زیادہ آمدنی کے بارے میں سوال کیا تو عثمان نے اسے محض اللہ کا فضل ہے کہہ کر بات ٹال دی۔ بیگم احمد کا تعلق جس زمانے کی عورت سے تھا وہ واقعی اتنی ہی سیدھی سادھی ہوا کرتی تھیں کہ اولاد کی کوئی برائی اسے برائی ہی نہیں محسوس ہوتی تھیں۔

”وہ پرائز بانڈز دراصل میرے ایک دوست کے تھے لیکن اس میں سے بہت سے میں نے اپنے دوست کو واپس کر دیئے تھے یہ بات میری والدہ کے علم میں نہیں تھی میرا خیال ہے کہ ڈاکو تمام بانڈز لے گئے۔“

”اور زیورات کی مالکیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔

”ان زیورات کی مالیت اگر میری والدہ پندرہ لاکھ کی بجائے پچاس لاکھ روپے بھی بتائیں تو کم تھی۔“ عثمان نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا ذرا صاف صاف بات کریں؟“ انسپکٹر نے رکھائی سے کہا۔

”یہ دراصل جذبات کا معاملہ ہے۔“ عثمان نے آہستگی سے کہنا شروع کیا۔ ”وہ زیورات میری والدہ کے پاس میرے والد کی نشانی تھے میرا مطلب ہے کہ وہ ان کی شادی کے وقت سے ان کے پاس تھے اور وہ انہیں سنبھال کر رکھتی تھیں۔“ عثمان نے ذرا سا توقف کیا اور پھر بولا۔

”آپ تو جانتے ہیں کہ انسانی جذبات اور احساسات کی کوئی قیمت نہیں ہوتی مگر میرا خیال ہے کہ زیورات کی مالیت قیمتوں کے حوالے سے دو تین لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔“

انسپکٹر نے حیرت سے عثمان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا ”میں آپ کی حقیقت پسندی اور سچائی سے بہت متاثر ہوا جناب ورنہ آج کل تو لوگ چوری یا ڈاکے کے بعد اپنے سامان اور نقدی کو اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے حالانکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکے یا چوری کا سامان شاز و نادر ہی واپس ملتا ہے“ انسپکٹر نے عثمان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ویسے آپ فکر نہ کریں میں کوشش کروں گا کہ ڈاکو بیچ کر نکلنے نہ پائیں۔ آپ کے آنے سے پہلے ہی میں نے علاقے کی ناکہ بندی کا حکم دے دیا تھا۔“

”جی تھینک یو۔“ عثمان نے جواب دیا۔

عثمان کو ملازمت کرتے ہوئے چار پانچ سال ہو گئے تھے مگر اس کی پوسٹنگ ایک ایسی سیٹ پر بھی جہاں دھن برستا تھا۔ ان چند برسوں میں اس نے اپنے آباد اجداد کی تمام کسریں پوری کر لی تھیں۔ بہت ہی دولت اس نے اپنی بہن کے توسط سے امریکا منتقل کر دی تھی۔ اپنے گھر کے علاوہ اس کے چھ سات پلاٹ مختلف علاقوں میں تھے۔ اس کے علاوہ ایک انڈسٹریل پلاٹ بھی اس کی ملکیت تھا مگر اس تمام جائیداد میں سے کچھ بھی اس کے نام نہیں تھا یا تو اس کے چھوٹے بھائی یا ماں کے نام تھا۔ دو پلاٹ تو اس نے اپنے گہرے دوستوں کے نام پر خریدے تھے۔ دوستوں میں عثمان کی مقبولیت کا سبب اس کا کشادہ دست ہونا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو صرف اور صرف پیسے کو جمع کرنے کیلئے حاصل کرتے ہیں بلکہ اس کے مزاج کی رنگینی نے اسے کسی حد تک شاہ خرچ بھی کر دیا تھا لہذا اس کا حلقہ یاراں بڑھتا ہی چلا گیا مگر آج اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہے۔ کہنے کو تو اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ اس کی الماری سے کچھ ہزار روپے غائب ہیں مگر اس کا دل ہی جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلا اور صحن سے ہوتا ہوا باہر گلی میں آ گیا جہاں اس کا چھوٹا بھائی اور پولیس والے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”میری الماری سے بھی کچھ ہزار روپے غائب ہیں انسپکٹر صاحب۔“ عثمان نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔ انسپکٹر نے کاغذ پر کچھ نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کی والدہ نے پرائز بانڈز اور زیورات کی جو مالیت بتائی تھی کیا وہ درست ہے؟“



انسپیکٹر جمشید نے ذرا سے فاصلے پر کھڑے ہوئے ایک شخص کو اشارہ سے اپنی طرف بلا لیا تو عثمان نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا پتلون اور شرٹ پہنے ہوئے یہ شخص معمولی حیثیت کا حامل دکھائی دیتا تھا۔ انسپیکٹر کے بلانے پر وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا قریب آیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اس نے ہنسنے انداز میں کہا۔

”جی سر۔“

”اب تم جا سکتے ہو اگر تمہاری ضرورت پڑی تو تمہیں بلا لیا جائے گا۔“ انسپیکٹر کا لہجہ تھکسا نہ تھا۔ ”یاد رکھو پولیس کو اطلاع دیئے بغیر شہر سے کہیں باہر مت جانا۔“

”ٹھیک ہے سر۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ عثمان نے استعجابیہ انداز میں عادل سے پوچھا ”کون ہے یہ؟“

”یہ لائن مین ہے بھائی، فرید خان ہے اس کا نام جس وقت ڈاکو ہمارے گھر میں گھسے ہوئے تھے یہ ہمارا فون ٹھیک کرنے کیلئے آیا تھا جب اس نے بیرونی گھنٹی بجائی تو ڈاکو چونک پڑے ان میں سے ایک باہر آیا اور اس کو محکمہ ٹیلی فون کا بندہ جانتے ہوئے اندر لے گیا یہ غریب سمجھا کہ گھر میں بلانے والا اہل خانہ کا کوئی فرد ہو گا چنانچہ یہ اندر چلا گیا۔ اندر جاتے ہی ان لوگوں نے اس کے بھی ہاتھ پیر باندھے اور آپ کے کمرے میں ڈال دیا۔ انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا جب وہ لوگ ڈاکو ڈال کر فرار ہو گئے تو ہم نے اسے کھولا۔ یہ شدید دہشت اور خوف کا شکار ہے۔ پولیس والوں نے اسے بھی پوچھ گچھ کیلئے روک لیا تھا۔“

”تم نے کیا کیا دیکھا ہے؟“ انسپیکٹر کی موجودگی میں عثمان نے فرید خان سے پوچھا۔

”دیکھنا کیا تھا صاحب جی۔۔۔ گھر میں گھستے ہی انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔“ فرید خان نے مسکینی سے کہا ”میری جیب سے بھی پانچ سو روپے نکال کر لے گئے۔“

”کیا تم ان میں سے کسی کو پہچانتے ہو؟“ عثمان نے

فرید خان سے سوال کیا لیکن جواب انسپیکٹر نے دیا تھا۔ ”میں اس سے پوچھ گچھ کر چکا ہوں جو ڈاکو سے اندر لے گیا تھا اس نے بس ذرا دیر کیلئے نقاب اتاری تھی باقی دونوں ڈاکو تو نقاب پہنے ہوئے تھے لیکن آپ یہ بتائیے کہ کیا آپ کو کسی پر شک ہے کیونکہ آپ کی والدہ اور بھائی نے تو کسی پر شبہ کا اظہار نہیں کیا ہے؟“ انسپیکٹر نے عثمان کی طرف رخ کرتے کہا۔

”نہیں انسپیکٹر صاحب! ہم لوگوں کی تو کسی سے دشمنی نہیں ہے لہذا ہم کسی پر شبہ کیسے کر سکتے ہیں؟“

انسپیکٹر جمشید نے اس پر اصرار کرتے ہوئے کہا ”آپ کا خیال درست ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ یہ کوئی روٹین کی ڈکیتی ہو مگر پھر بھی ڈاکو ہمیشہ ڈاکو ڈالنے سے پہلے حالات ضرور معلوم کر لیتے ہیں۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ آپ اپنے ملنے جلنے والوں پر توجہ دیں۔ ہو سکتا ہے اس واردات میں کسی کا ہاتھ ہو؟“

”ٹھیک ہے، ہم لوگ غور کریں گے۔“ عثمان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ انسپیکٹر نے عثمان اور عادل سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھے فوری مطلع کریں۔“ انسپیکٹر دیگر سپاہیوں کے ساتھ دین میں سوار ہو کر چلا گیا تو محلے کے دیگر لوگ اظہار ہمدردی کی غرض سے عثمان کی طرف بڑھے۔

کچھ دیر بعد عثمان ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا تو اہل محلہ میں سے کچھ لوگ بیٹھ کر ڈاکو کے بارے میں تبصرہ کرنے لگے۔ عثمان کو ان لوگوں سے ابھن ہو رہی تھی وہ چاہتا تھا کہ اٹھ کر اندر چلا جائے مگر کچھ تو عروت اور کچھ یہ کہ اندر گھر میں محلے کی عورتیں بھی اس کی ماں کے پاس موجود تھیں مجبوراً ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ملازم نے اس کا موبائل لا کر دے دیا جس کی بیل مسلسل بج رہی تھی۔ موبائل پر نمبر دیکھ کر عثمان نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے لوگوں سے معذرت کی اور اٹھ کر باہر آ گیا باہر آ کر اس نے فوراً فون اٹھا لیا۔

”میں نے تمہیں منع کیا ہے کہ دفتری ادقات میں مجھے فون نہ کیا کرو۔“ عثمان نے ہنسنے والا ہنسا اور ہیزاری

سے سرگوشی کی اس نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا کہ اس کی آواز کوئی دوسرا فرو نہ سننے پائے۔

”تمہارے دفتر ہی فون کیا تھا تو پتا چلا کہ تم اچانک گھر چلے گئے ہو گھر کا فون بھی نہیں مل رہا تھا۔ موبائل بھی اٹینڈ نہیں ہو رہا تھا اب جا کر تم نے فون ریسیو کیا ہے۔“ دوسری طرف سے زارا نے جواب دیا۔

”میں ابھی تم سے بات نہیں کر سکتا شام تک وقت ملے گا تو خود فون کروں گا۔“ عثمان نے رکھائی سے کہا۔

”کیا آج شام کو آؤ گے نہیں؟“ زارا نے نرمی اور لگاؤ سے پوچھا۔

”شاید نہیں بلکہ بالکل نہیں۔“

”کیا بات ہے؟ تم پریشان لگ رہے ہو طبیعت تو ٹھیک ہے دفتر سے اچانک اٹھ کر گھر کیوں آ گئے؟“ زارا نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوال کر ڈالے۔

”میں کہہ رہا ہوں تا کہ شام کو بات کروں گا۔“ عثمان نے ترشی سے کہا اور سیل فون بند کر دیا۔

اگر عثمان اپنے گھر میں ہونی والی ڈکیتی سے خستہ حال نہ ہوتا تو بھی وہ زارا سے اسی طرح بات کرتا۔ زارا اب اس کیلئے جی کا جہال ہوتی جا رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ اس سے تعلقات کی اسے زندگی بھر قیمت ادا کرنی ہوگی۔ شروع شروع میں تو عثمان کو اس نے اپنے ایسے دکھڑے سنائے کہ وہ نرم پڑ گیا۔ اپنی اوڑوں سے کچھ دنوں تک تو اس نے عثمان کو دائمی لبھا یا بھی اور اس کے جسم و جان کی نگہبانی کو دور بھی کیا یہی وجہ تھی کہ عثمان نے اسے ایک فلیٹ کرائے پر لے کر دیا اور اسے بیس ہزار روپے مہینہ بھی لگا دیا۔

وہ اس فلیٹ میں اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی عثمان ہفتے میں ایک آدھ رات زارا کے فلیٹ میں بسر کرتا۔ جس رات وہ زارا کے گھر میں ہوتا زارا کا ماموں کسی کام سے کہیں اور چلا جاتا شب ب سری کے جواب میں عثمان جو تحفے تحائف زارا کو دیتا وہ معمول کی رقم کے علاوہ ہوتے تھے یہی وجہ

تھی کہ زارا اس کی راہ میں آنکھیں بچھائے رکھتی۔

زارا نے عثمان کو بتا رکھا تھا کہ شادی کے چھ مہینے بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی بچی اپنی نانی کے پاس دوسرے شہر میں رہتی تھی۔ عثمان غیر معمولی ذہانت رکھنے والا نوجوان تھا اسے زارا کے باضی سے کوئی غرض نہیں تھی وقت گزری کیلئے زارا اسے میسر تھی لہذا وہ محض اسے اپنی رنگین مزاج طبیعت کو بہلانے کا ایک کھلونا سمجھتا اس کے کچھ قریبی دوستوں کو بھی معلوم تھا کہ اس نے ایک وابستہ بھی رکھی ہوئی ہے۔

ان دنوں عثمان کا دل زارا کی طرف سے اس لیے ادبھ گیا تھا کہ اب وہ شادی پر اصرار کرنے لگی تھی اور یہ مطالبہ ماننا عثمان کیلئے تقریباً ناممکن تھا۔ عثمان کی پریشانی اور ابھمن کا سبب یہ بھی تھا کہ زارا کے پاس عثمان کی کچھ تصویریں بھی تھیں اور جس فلیٹ میں وہ رہتی تھی اس کے کرائے دار کی حیثیت سے اسے کاغذات پر عثمان کے دستخط تھے۔ ویسے ابھی تک زارا نے عثمان کو نہ تو کوئی دھمکی دی تھی اور نہ اس کی باتوں میں کسی طرح کی بلیک میلنگ کا شائبہ ہوتا تھا مگر عثمان کے اصرار کے باوجود اس نے وہ تصویریں واپس نہیں کی تھیں۔ تصویریں ان دونوں کی ایک ساتھ تھیں اور یہ تصویریں زارا کے ماموں نے بنائی تھیں۔

اس کے علاوہ ایک بار عثمان نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس سے بڑا اور خوبصورت فلیٹ اپنے نام سے کرائے پر لے لے تو زارا نے یہ بات نہیں مانی تھی۔ اس طرح کے کچھ اور ایسے معاملات تھے جن سے عثمان کو زارا کی نیت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ دوسری طرف زارا اس سے شادی کیلئے اصرار کرتی رہتی تھی۔ ایک بار تو اس نے زارا سے صاف کہہ دیا تھا۔

”زارا میں شادی کے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔“

”کیا مطلب۔۔۔ کنوارے رہو گے؟“

”ہاں مجھے یہی زندگی پسند ہے۔“

”مگر مجھے پسند نہیں ہے۔“ زارا نے کہا۔



”تو پھر۔۔۔؟“

”اس کا فیصلہ تم خود کرو گے۔“ زارا نے بھی سخت لہجے میں کہا اور عثمان کو غصہ آ گیا۔

”ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

اس نے کہا۔

”غلط تم مجھ سے جھوٹ بولتے رہے ہو۔“

”کیسا جھوٹ؟“

”میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم جانتے ہو کہ

میری زندگی میں تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے جبکہ

مجھے پتا چلا ہے کہ تمہاری ای تمہارے لیے رشتے

دیکھتی پھر رہی ہیں۔“

”کون کیا کر رہا ہے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں

ہے۔“

”مگر مجھے ہے۔“

اس دن کے واقعے کے بعد عثمان کے دل میں

زارا کی طرف سے بال آ گیا تھا۔ زارا کی عمر بے شک

زیادہ نہیں تھی لیکن وہ اندازے سے بہت گہری تھی اور اسے

اپنے تجربے کا داموں کی پوری سپورٹ حاصل تھی اور

ماموں اسے مشورے دینا رہتا تھا۔ اب وہ مسلسل

عثمان کے پیچھے لگی رہتی تھی کہ وہ اس سے شادی کرے

لیکن عثمان اسے ناگوار سمجھتا تھا لیکن ان باتوں سے اسے

شدید اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

وہ زارا کے نہ صرف سارے اخراجات اٹھاتا تھا

بلکہ اس نے زارا کو اور بھی بہت کچھ دیا تھا۔ سونے کے

خوبصورت زیورات، ہیرے کی انگوٹھیاں، لباسوں

کے انبار البتہ اب زارا سے اس کی خاصی اُن بن

رہنے لگی تھی اس نے کہا بھی تھا کہ زارا تم مجھے پسند ہو

میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن شادی نہیں کر سکتا۔

”اس کے لیے تم نے کسی اور کا انتخاب کر لیا ہے

؟“ زارا نے طنز سے کہا۔

”یہ بات بھی نہیں ہے۔“ عثمان نے بیزار لہجے

میں کہا اور زارا نے ایک دم نری اختیار کر لی غالباً اس

نے مصلحتاً ایسا کیا تھا۔

ایک رات عثمان دوستوں کی محفل سے رنگ

ریاں منا کر نشے میں مغموم زارا کے فلیٹ پر گیا تو

ماموں وہاں موجود تھا۔ زارا اور ماموں کسی بات پر

ہنس رہے تھے۔ عثمان کو ان کی یہ ہنسی ناگوار گزری تھی

تاہم اس نے کچھ نہ کہا لیکن ماموں طنز یہ انداز میں

بولے۔

”لو بھئی زارا۔ تمہارے ان داتا آگئے اب ہم

چلتے ہیں۔“

ماموں یہ کہہ کر چلا گیا لیکن عثمان کو اس کے الفاظ

اور انداز بہت برا لگا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا تو اس

کی نگاہ سائڈ ٹیبل پر رکھی فریم میں لگی اپنی اور زارا کی

ایک تصویر پر پڑی۔ اس کے دماغ میں آگ لگ گئی

اس تصویر کو فریم میں لگوانا بھی ماموں اور زارا کی ایک

سازش تھی تاکہ دیکھنے والے ان دونوں کی قربت کا

اندازہ لگا سکیں۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے تصویر کا

فریم اٹھا کر زمین پر پھینک دیا۔ شیشے کی کرسیاں

کمرے میں بکھر گئیں۔

زارا نے یہ دیکھا لیکن اس نے بڑے ضبط کا

مظاہرہ کیا اور اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر

عثمان کا غصہ اسی پر ٹھنڈا نہیں ہوا۔ اس نے نوٹے فریم

سے تصویر نکال کر پرزے پرزے کر دی اور خرابی

ہوئی آواز میں بولا۔

”تصویروں کے ٹکڑے کہاں ہیں؟“

”وہ میرے پاس سے خالی ہو گئے ہیں۔“

”یکو اس کرتی ہو“ وہ بولا اور زارا نے کسی رد عمل

کا اظہار نہیں کیا اور باہر چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے

ہاتھوں میں بیئر کی بوتل اور گلاس وغیرہ تھے۔

دوسری صبح عثمان پر سکون تھا۔ آنکھ کھلی تو زارا

کھری کھری خوبصورت گھریلو لباس میں بہت دلکش

نظر آ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھی اس کے بالوں

میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی لیکن اس کے چہرے

پر اداسی کے سائے تھے۔

”ناشنا بنا لوں۔“ اس کے لہجے میں بلا کی

اپنائیت تھی۔

”اس ہاں بنا لو۔“ وہ اٹھ گیا زارا نے اسے

بڑی اپنائیت سے ناشیا کر دیا اس کی ہر چیز جوتے

ناٹائی وغیرہ اس طرح رکھی جیسے رکھتی تھی۔ ناشتے کے

بعد جب وہ چلا تو وہ اس طرح پیار بھرے لہجے میں یونی۔

”کب آؤ گے؟“

”کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔“ وہ سرو لہجے میں بولا اور وہاں سے چلا گیا۔

اسے فریم میں لگی تصویر پر بھی غصہ آیا تھا کہ زارا نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان دونوں کے درمیان کوئی قانونی رشتہ نہیں ہے اس طرح ویدہ و لیری سے تصویر فریم کر کے کمرے میں سجا دی تھی۔ عثمان کو زارا کے اس رویے سے کسی خطرناک ارادے کی بو آئی تھی اور وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس لمحے عثمان یہ بھی بھول گیا تھا کہ زارا کسی بھی قسم کے رد عمل کا اظہار کر سکتی ہے اس واقعے کے بعد عثمان زارا کے فلیٹ پر نہیں گیا اور اس بات کو اب تقریباً دس گیارہ روز ہو گئے تھے۔

گزشتہ ایک اینڈ پر بھی وہ عثمان کا انتظار کرتی رہی مگر عثمان نے یہ بہانہ کر دیا کہ وہ والدہ کے بیمار ہونے کے باعث نہیں آسکتا اور اب زارا روز فون کر کے اسے بلا رہی تھی مگر وہ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا۔ اب وہ زارا سے ملاقات کو خود پر یوجہ تصور کرنے لگا تھا۔ اس کے خیال میں زارا اب حد سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

زارا سے بات کرنے کے بعد عثمان ڈرائیونگ روم میں جانے کی بجائے اوپر والے کمرے میں آ گیا۔ یہاں تنہائی تھی اور وہ تنہا ہو کر سوچنا چاہتا تھا اس وقت اس کا دماغ ہر طے جتنے والے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ گھر کے ملازمین سے لے کر دفتر کے ساگی تک پر اس کی نگاہ شک بھرے انداز میں پڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے عادل کو بلا کر ہدایت کی کہ اس ڈیکٹی کی خبر اس کے قریبی دوستوں کو دے۔ اچانک اس نقصان سے عثمان کو شدید ذہنی صدمے کا سامنا تھا اور مسترا وہ یہ کہ وہ اتنے بڑے نقصان کا دعوے دار بھی نہیں تھا۔ اگر پولیس رپورٹ میں وہ اتنی ڈھیر ساری رقم درج کروا دیتا تو مختلف حساب دیتا پھرتا۔ ظاہر ہے کہ کالے وھن کی قانونی حیثیت ثابت کرنا بہت دشوار بات تھی حالانکہ تین چار

مرتبہ تو اس نے کافی بڑی مالیت کے بانڈز خریدے تھے تاکہ کالا دھن ٹھکانے لگے اور اس کی مالی حیثیت کا سرکاری طور پر جواز نکل آئے۔

عثمان کمرے میں اکیلا بیٹھا ادھیڑ بن میں لگا رہا اس کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اتنے زیادہ نقصانات نے اس کے صبر کا پیمانہ چھلکا دیا تھا اس نے اپنے بھائی اور ماں پر تو یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اسے کتنا بڑا خسارہ ہوا ہے مگر اندر ہی اندر جتنے پیچ و تاب کھار ہا تھا یہ اس کا دل ہی جانتا تھا اس کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا مگر ان میں سے ایک آدھ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اپنا اثر و رسوخ رکھتا ہو اور اس وقت اسے کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو سرکاری حلقوں تک رسائی رکھتا ہو۔ اچانک عثمان کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ فوری طور پر سیزھیان اترتا ہوا نیچے ڈرائنگ روم تک آیا اس نے دیکھا کہ اظہار اندر وی کرنے والے لوگ جا چکے تھے مگر کچھ عورتیں اب بھی لابی میں بیٹھی اس کی والدہ کو تسلیاں دے رہی تھیں۔ اس نے عادل کو اپنے گھر سے باہر جانے کی اطلاع دی اور جلد ہی واپس آنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی اشارت کر کے وہ تیزی سے چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

انسپکٹر جمشید نے کسی سے بات کر کے ریسیور کریڈل پر رکھا اور گھنٹی بج کر اپنے دونوں سب انسپکٹروں کو طلب کیا۔ اس نے پر فکر انداز میں میز پر پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھا اور غیر محسوس انداز میں پیپر ویٹ کو اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے گھمانے لگا۔ پیپر ویٹ کی گردش کے ساتھ اس کا دماغ بھی بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا وہ آپ ہی آپ کسی بات پر معنی خیز انداز میں مسکراتا چاہتا تھا کہ اس کے دونوں معاون مستعد انداز میں اندر داخل ہوئے اور اس کے اشارے پر میز کی دوسری طرف والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

انسپکٹر جمشید کو اس تھانے میں تعینات ہونے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا مگر اس کا معاون عملہ اس کے



انسپیکٹر گل زمان نے دامن بچاتے ہوئے کہا۔  
انسپیکٹر جمشید نے غصے بھرے لہجے میں اسے  
گھورتے ہوئے زور سے کہا، ”کوئی ڈکیتی بھی معمولی  
نوعیت کی نہیں ہوتی ڈکیتی صرف ڈکیتی ہوتی ہے اور  
پولیس والوں کو اس کا جواب دینا ہوتا ہے اگر ہم اس  
بار بھی ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے میں ناکام رہے تو یہ  
ہمارے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔“ انسپیکٹر جمشید نے ذرا  
سے وقفے کے بعد میز پر جھکتے ہوئے جیسے سرگوشیانہ  
انداز میں اپنے معاونین سے کہا، ”اور میرا خیال ہے  
کہ یہ ڈکیتی معمولی نوعیت کی ہے بھی نہیں۔“

”کیا مطلب سر؟“ دونوں بیک وقت تعجب  
بھرے انداز میں بولے۔

”مجھے شبہ ہے کہ پولیس والوں کو صحیح رپورٹ  
نہیں دی جا رہی اس ڈاکے میں جتنا مال گیا ہے اس  
کے مقابلے میں پولیس کو بہت کم بتایا گیا ہے۔“  
”وہ کیوں سر؟“ انسپیکٹر گل زمان نے مؤدبانہ  
انداز میں پوچھا۔

”میں نہیں سے تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا گمان ہے  
کہ جس گھر میں ڈکیتی ہوئی ہے اس کے گھر والوں نے  
مختلف بیانات کسی خاص سبب سے دیئے ہیں۔ ماں  
اور چھوٹے بیٹے نے کچھ کہا اور بڑے بیٹے نے آکر  
اس کی تردید کر دی۔ مجھے ضرور دال میں کچھ کالا نظر آتا  
ہے۔“

”یہ تو بڑا عجیب کیس ہے سر؟“ سب انسپیکٹر گل  
زمان نے کہا۔

”ہاں عجیب تو ہے۔“ انسپیکٹر جمشید نے کہا، ”مگر  
ہمیں اس کو حل ضرور کرنا ہے ڈاکو ہمارے شہر سے  
بھاگنے نہیں چاہے ہیں۔“  
”میں نے کنٹرول ٹاور کو بتا دیا ہے۔“ ابراہیم  
خاں نے کہا۔

”یہ تو خیر اچھا کیا اب تم یہ کرو کہ لائن مین فریڈ  
خان کو یہاں بلواؤ۔“  
”یہ وی لائن مین فریڈ خان ہے جسے ڈکیتی کے  
دوران ڈاکوؤں نے باندھ کر ڈال دیا تھا۔“ گل  
زمان نے پوچھا۔

رعب و دبدبے سے بہت الٹ ہو چکا تھا۔ اس وقت  
بھی اس کے سامنے بیٹھے ہوئے سب انسپیکٹر ابراہیم  
خاں اور گل زمان خود سے کوئی گفتگو کرنے کی پوزیشن  
میں نہیں تھے۔ انسپیکٹر جمشید ان دونوں کو دیکھ رہا تھا اور  
وہ دونوں اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ادھر  
ادھر دیکھ رہے تھے۔ اس کی خاموشی دونوں کو اُجھن  
اور تذبذب میں ڈال رہی تھی۔ ان دونوں نے ایک  
دوسرے سے نظریں ملائیں اور سب انسپیکٹر گل زمان  
نے اپنے اندر بہت پیدا کرتے ہوئے انسپیکٹر جمشید  
سے کہا۔

”جی سر کیا حکم ہے؟“

”آج پٹرولنگ پر کون گیا تھا؟“ انسپیکٹر جمشید  
نے دیوار گیر گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔  
”ہم دونوں ہی تھے جناب، میری گاڑی مشرقی  
علاقے میں تھی اور مغربی علاقے میں ابراہیم اپنے  
سپاہیوں کے ساتھ تھا۔“

”کیا آپ دونوں نے اپنے اپنے علاقے  
مخصوص کر رکھے ہیں؟“

”نہیں سر۔“ گل زمان نے کہا۔ ”جب اور  
جہاں ضرورت ہوتی ہے ہم لوگ پٹرولنگ کے لیے  
چلے جاتے ہیں یہ سیم تو اپنی آسانی کیلئے بیان کی گئی  
ہے، کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم دونوں قریب قریب  
ہی ہوتے ہیں۔ ویسے چونکہ یہ علاقہ بہت بڑا ہے لہذا  
ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر طرف نظر رکھی جائے۔“  
”آج کی ڈکیتی کے بارے میں کیا خیال ہے تم

لوگوں کا؟“

”پتا لگ جائے گا سر، ہماری گاڑیاں اب بھی  
چیکنگ پر گئی ہوئی ہیں اور مشتبہ لوگوں کی ہم نگرانی کر  
رہے ہیں۔“ سب انسپیکٹر گل زمان نے مستعدی سے  
جواب دیا۔

”تمہیں خبر ہے کہ کل بڑے صاحب ہم سب  
لوگوں کو لائن حاضر کر دیں گے یہ ایک ہفتے میں چوٹی  
ڈکیتی ہے ہمارے علاقے میں۔“ انسپیکٹر جمشید نے سرد  
لہجے میں کہا۔

”مگر یہ تو معمولی نوعیت کی ڈکیتی ہے سر۔“ سب

”ہاں۔۔۔ ممکن ہے اس سے کچھ سراغ مل سکے۔“ انسپکٹر جمشید کے ماتھے پر شکنیں پڑ رہی تھیں۔  
 ”تم اس کام کیلئے ابھی نکل جاؤ، یہ اس لائن مین کے گھر کا پتا ہے۔“ انسپکٹر نے گل زمان کو ایک کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ گل زمان نے کاغذ تھامنے کے بعد انسپکٹر جمشید سے اجازت طلب کی اور کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ سب انسپکٹر ابراہیم بھی اس کے ساتھ ہی کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا لیکن جمشید نے اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس کے ساتھ مصروف گفتگو ہو گیا جبکہ گل زمان سیلوٹ کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

عثمان کو اس بڑے اور پرانے طرز تعمیر والے بلائزہ میں مرزا شاہد کالینٹ ڈھونڈنے میں دشواری نہیں ہوئی تھی۔ مرزا شاہد سے عثمان کی گہری دوستی تو نہیں تھی مگر ایشیا میل جول ضرور تھا کہ عثمان کو اس کے پاس جانے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ وہ دونوں ایک ساتھ کالج میں پڑھتے تھے، تعلیم سے فارغ ہو کر عثمان سرکاری ملازمت میں چلا گیا اور شاہد نے صحافت اختیار کر لی۔ شاہد کے پاس صحافت کی کوئی ڈگری تو نہیں تھی مگر وہ محنت کر کے ایک مقامی اخبار میں کرائم رپورٹر ہو گیا تھا اور صحافتی حلقوں میں اس لیے اہمیت رکھتا تھا کہ اس نے پیشہ ورانہ طور پر بہت سے ایسے پردے اٹھائے تھے کہ پولیس افسران بھی اس کی صلاحیتوں کا لوہا ماننے لگے۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت کے باعث مرزا شاہد کی رسائی حکام بالا تک بھی لہذا عثمان کو اس وقت اس سے بہتر کوئی اور مناسب آدمی نظر نہ آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد عثمان، مرزا شاہد کے گھر کے ڈرائیونگ روم میں بیٹھا اور پوری روداد سنا رہا تھا۔ مرزا شاہد اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا مطالعہ کرتا رہا اور جب عثمان نے تفصیل سے پوری بات بیان کر دی تو شاہد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔  
 ”کوشش کرتے ہیں یار دیکھا جائے گا تم فکر نہ کرو مجھ سے جو بن پڑے گا میں کروں گا۔“

پولیس یار میں تمہارے پاس اسی لیے آیا ہوں

کہ یہ سب باتیں میں کسی اور سے نہیں کر سکتا تھا۔“ عثمان کے لہجے میں قدرے ممنونیت تھی۔  
 ”میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔“ شاہد نے عثمان سے کہا، ”ویسے تم نے اچھا ہی کیا کہ پولیس رپورٹ میں تمام رقم درج نہیں کرائی۔“  
 ”یہ تو میری مجبوری تھی۔“ عثمان نے مٹھیاں سمجھتے ہوئے کہا، ”میرا بس نہیں چلتا کہ میں ان ڈاکوؤں کو ختم کر دوں۔“

”جذبائی ہونے کی ضرورت نہیں ہے عثمان، اس معاملے میں ٹھنڈے مزاج سے کام کرنا پڑے گا میں ابھی اپنے اخبار کے دفتر جانے کیلئے نکلنے ہی والا تھا تم نے بروقت مجھے اطلاع دے کر بہت اچھا کیا ہے۔“ پھر وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا، ”آؤ۔۔۔ میرے ساتھ چلو میں تمہارے علاقے کے تھانے میں چلتا ہوں دیکھیں ایس ایچ او کیا کہتا ہے؟“  
 عثمان کے کہنے پر مرزا شاہد نے اپنا اسکوٹر گھر پر ہی چھوڑا اور اس کی کار میں آ بیٹھا۔ عثمان نے اس سے کہا، ”دیا تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی جائے گا اس کو وہاں پہنچا دے گا۔“

☆☆☆

عثمان جب شاہد کے ساتھ تھانے کی عمارت میں داخل ہوا تو اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ شاہد کے تعلقات تھانے میں کیسے ہیں۔ انسپکٹر جمشید کے کمرے میں وہ بغیر کسی اجازت کے اندر داخل ہو گیا۔ عثمان بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔ انسپکٹر جمشید فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے گفتگو کے دوران نظرس اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا پھر فون بند کر کے کرسی سے ذرا سا اٹھا اور مرزا شاہد سے ہاتھ ملایا پھر عثمان کی سمت دیکھ کر بولا۔

”یہ آپ کے دوست ہیں غالباً۔“ یہ کہہ کر اس نے عثمان کی طرف بھی مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھا دیا۔  
 ”بالکل اور ہمارے دوست آپ کے بھی دوست ہوئے انسپکٹر صاحب۔“ شاہد مرزا نے بے تکلفی سے کہا۔

”اس میں کیا شک ہے۔“ جمشید نے خوش



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اخلاقی سے کہا۔

”لیکن دوستوں کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہو تو افسوس ہوتا ہے۔“

”کیوں نہیں مجھے واقعی ان کے گھر ڈکیتی کا افسوس ہے، بیٹھے آپ لوگ۔“ انسپٹر جمشید نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور وہ دونوں بیٹھ گئے۔

”میں نے اپنے دوست کو بڑی امید دلانی ہے۔“ شاہد نے کہا۔

”کس بات کی۔“

”یہی کہ انسپٹر جمشید مختلف انسان ہیں وہ ان کا مال ضرور برآمد کر لیں گے۔“

”یقیناً لیکن۔۔۔“ انسپٹر جمشید معنی خیز انداز میں خاموش ہو گیا۔

”لیکن کیا؟“

”یہ خود بھی تو ہمیں اپنا دوست سمجھیں۔ تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بچتی۔“

”براہ کرم وضاحت کریں۔“ شاہد بولا۔

”یہ ہم سے بھی بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔ انسپٹر جمشید نے گہری نظروں سے عثمان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ عثمان نے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن شاہد نے کہا۔

”آپ کا خیال درست ہے انسپٹر جمشید۔ ایک شریف آدمی بہت سی مشکلات کا شکار ہوتا ہے۔ عثمان بھی ایک شریف آدمی ہیں اور سرکاری ملازم ہیں۔

آپ تو جانتے ہیں کہ سرکاری ملازم۔۔۔“ شاہد نے اتنا ہی کہا تھا کہ انسپٹر جمشید نے درمیان سے جملہ کاٹ دیا اور کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔

”مگر انہیں مجھ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“

”میں نے عثمان سے یہی کہا کہ انسپٹر جمشید ہمارے دوست ہیں اور اب یہ آپ کے سامنے کچھ سچ کہنا چاہتے ہیں۔“ شاہد بولا۔

”بس بات یہ ہے کہ میں سرکاری ملازم ہوں۔“

”اس بات کو بار بار نہ دہرائیں مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ شاہد صاحب آپ انہیں میرے بارے میں بتا کر نہیں لائے۔“ انسپٹر کاموڈ پھر خراب ہونے لگا۔

READING

214

Corion

”تمہیں سب کچھ سچ بتانا ہو گا عثمان ورنہ میرا

یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ عثمان آہستہ سے بولا۔

”اس وقت ہم ذاتی حیثیت سے بات کر رہے ہیں اور میں ذاتی طور پر کوشش کروں گا کہ ڈاکو میرے ہاتھ سے نکل کر نہ جانے پائیں لیکن آپ کو میرے سامنے ایک ایک لفظ سچ بتانا ہو گا۔“ انسپٹر کا لہجہ پھر نرم ہو گیا۔

”تم پورا بھروسہ کر سکتے ہو عثمان۔“ شاہد بولا۔

آخر کار عثمان نے زبان کھول دی اور ساری روداد انسپٹر جمشید کو بتانے لگا۔ اس نے رقم اور زیورات کی تفصیلات سے بھی انسپٹر کو آگاہ کیا۔ انسپٹر جمشید کو بھی اس تفصیل پر حیرت ہوئی تھی۔ بات اس کی توقع سے کہیں آگے کی تھی۔ اگر یہ پوری تفصیل میڈیا اور اخبارات کو حاصل ہو جاتی تو زبردست حاشیہ آرائی ہوتی۔ اس نے سوچا کہ واقعی اس کا اندازہ ٹھیک تھا اس کے سامنے حقیقت نہیں آئی تھی اور ڈکیتی کی اس واردات کا اصل پہلو کچھ اور تھا۔

آخر کار پوری کہانی اس کے علم میں آگئی اور اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”ٹھیک ہے مسٹر عثمان صورت حال ایک نئی منزل میں داخل ہو گئی ہے میں پوری کوشش کروں گا کہ ڈاکو میرے ہاتھ لگ جائیں اور آپ کا سب کچھ واپس مل جائے۔“

”بہت شکریہ انسپٹر۔“ عثمان نے کہا، کچھ دیر کے بعد دونوں وہاں سے نکل گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

عثمان کئی رات تک جاگتا رہا تھا۔ رات کے تین بجے کے قریب اسے سونے کا موقع ملا تھا لیکن اس کے باوجود وہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا تھا کیونکہ اس واردات کے صدمے نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ دوست بھی اسے گھیرے رہے تھے جتنے منہ اتنی باتیں سب اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کر رہے تھے۔

غرض یہ کہ دن اسی میں گزر گیا تھا۔ ناور اور عامر

WWW.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY

RSPK.PAKSOCIETY.COM

FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1

f PAKSOCIETY



میں کیا تعلق ہے۔ ایک لمحے کیلئے اسے سخت رنج ہوا اسے معلوم تھا کہ بے چارے فرید خان کو محض موقع و ارواح کا گواہ ہونے کی سزا ملی ہے۔ اس نے یقیناً کسی ڈاکو کو پہچان لیا تھا اور پھر وہ اس و ارواح کا یعنی گواہ تھا اور ڈاکو ڈال کیلئے اس کا زندہ رہنا خطرناک تھا بس یہی بات اس کی موت کا سبب بنی۔

عثمان کو فرید خان کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا لیکن اس کے علاوہ اسے اس بات کا بھی شدید ملال تھا کہ ڈاکو کی و ارواح کا واحد چشم دید گواہ ختم کر دیا گیا ہے۔

کُل رات ناور اور عامر نے خاص طور سے کہا تھا کہ فرید خان اس کیلئے ضروری مہرہ ہے اسے ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے۔ عثمان الگ سے فرید خان سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے اس سے کچھ اہم باتیں کرنی تھیں لیکن انسپکٹر جمشید سے ملنے کے بعد اس نے فوری طور پر فرید خان سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ ممکن ہے یہ بات انسپکٹر کی مرضی کے خلاف ہو لیکن اب اسے فرید خان سے نہ ملنے کا افسوس تھا۔

”اسے صرف ہماری وجہ سے قتل کیا گیا ہے بھیا۔“ عادل نے کسی قدر خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”سو فیصدی۔“ عثمان بے خیالی کے عالم میں بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمیں بھی مار سکتے ہیں۔“

”ایں کیوں ہم نے تو انہیں نہیں دیکھا۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”فرید خان نے انہیں پہچان لیا تھا اسی وجہ سے اسے مار دیا گیا۔“

”ہاں ہاں ہاں۔“ عثمان نے کسی قدر غصے سے کہا پھر سنبھل کر بولا ”ہم سے تو انہیں یہ خطرہ نہیں ہے کہ ہم نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ڈاکو جو فرید خان کے گھنٹی بجانے پر باہر گیا تھا اپنی نقاب اتار کر گیا تھا اور فرید خان نے اسے دیکھ لیا تھا۔“

”مگر فرید خان نے تو بیان دیا تھا کہ وہ اسے نہیں

بھی اس سے اظہار ہمدردی کرنے آئے تھے لیکن اس وقت عثمان موجود نہیں تھا۔ رات کو وہ طرح طرح کے خواب دیکھتا رہا۔

دوسری صبح دروازہ زور سے بجاتا تو اس کی آنکھ کھل گئی اس نے چونک کر دیکھا تو ابھی صرف صبح کے سات بجے تھے۔

اتنی جلدی۔۔۔ کون ہو سکتا ہے۔ ذہن بری طرح تھکا ہوا تھا سر میں ورد کا بھی احساس ہوا۔

”کون آ گیا؟“ وہ عام طور سے صبح ساڑھے آٹھ بجے تک سونے کا عادی تھا۔ ویسے بھی اتنی بڑی و ارواح ہوئی تھی آج تو آفس بھی نہیں جانا تھا۔

دروازہ دوبارہ بجاتا تو وہ جھنجھلا گیا ”کون ہے؟“

”وہ زور سے چیخا۔“

”میں ہوں بھیا۔ دروازہ کھول لے۔“ یہ آواز اس کے بھائی عادل کی تھی۔

”خیریت ہے عادل؟“ وہ کسی قدر پریشان ہو گیا اور فوراً بستر سے نیچے اتر آیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور دوبارہ بولا ”خیریت؟“

عادل کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے اور اس کے ہاتھ میں کھلا اخبار نظر آ رہا تھا۔ اس نے اخبار عثمان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”یہ خبر پڑھیے“ اس نے کہا اور عثمان خبر پڑھنے لگا۔ ان کے گھر میں پڑنے والے ڈاکے کی خبر تھی لیکن اس کے علاوہ ایک اور خبر بھی تھی جس کے گرد عادل نے خاشیہ بنا دیا تھا۔ اس خبر نے عثمان کو بڑی طرح چونکا دیا۔

یہ خبر لائن میں فرید خان کے قتل کی خبر تھی۔ کسی نے اسے کل رات نوبت کے قریب گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ قاتل اسے قتل کر کے فرار ہو گیا تھا۔

”لائن میں فرید خان۔“ عثمان کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

”ہاں یہ وہی ہے نا جو ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔“ ڈاکٹر عادل نے کہا۔

”ہیں۔۔۔ لیکن۔“ اسے کیوں قتل کیا گیا؟“

عادل شاہ نے کہا اور عثمان چونک کر عادل کو دیکھنے لگا۔ یہ بات صرف وہ جانتا تھا کہ ان دونوں خبروں کا آپس

آہستہ سے نکلا۔

”ہاں یہ وہی ہے نا جو ہمارے گھر آتا رہتا تھا۔“ ڈاکٹر عادل نے کہا۔

”ہیں۔۔۔ لیکن۔“ اسے کیوں قتل کیا گیا؟“

عادل شاہ نے کہا اور عثمان چونک کر عادل کو دیکھنے لگا۔ یہ بات صرف وہ جانتا تھا کہ ان دونوں خبروں کا آپس

میں اسے کھول کر دیکھتی رہتی تھیں اور آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آج میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے وہ لاکٹ آپ کے گلے سے اتروا کر تجوری میں رکھ دیا۔ صرف اس لیے ای کہ آپ نہ رویا کریں۔ آہ کاش ڈاکو سب کچھ رکھ لیں وہ لاکٹ مجھے واپس کرویں۔“

ای پھر آبدیدہ ہو گئیں پھر بولیں۔

”وہ مجھے تمہارے ابو نے رونمائی میں دیا تھا۔ اس وقت وہ بہت غریب تھے اور انہوں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر وہ ہلکا سا لاکٹ بنوایا تھا۔ اس وقت جب سونا بھی کوڑیوں کے مول بکتا تھا۔ آج کی طرح نہیں کہ کوڑیاں بھی سونے کے مول بکتی ہیں۔“

انہی وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ بیل پر اشارہ موصول ہوا۔ عثمان نے موبائل دیکھا انسپکٹر جمشید کی کال تھی۔ ”عثمان شاہ صاحب!“

”جی بول رہا ہوں۔“

”ذرا تھانے آجائیے۔“

”کوئی خاص بات سر۔“

”ہاں آجائیے۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

سب انسپکٹر ابراہیم خاں نے انسپکٹر جمشید کو اطلاع دی تھی کہ فرید خان گھر پر نہیں ملا۔ ایک چچی آبادی میں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بیوی نے حیرانی سے پوچھا تھا کہ فرید خان سے اسے کیا کام ہے۔ ابراہیم خاں اسے ٹال کر چلا گیا تھا۔ اس نے انسپکٹر جمشید کو اس بارے میں اطلاع دیدی تھی کہ فرید خان اسے نہیں ملا کل صبح وہ اس سے مل کر اسے تھانے لے آئے گا لیکن دوسری صبح کے اخبارات میں فرید خان کے قتل کی خبر ملی تو جمشید بھی حیران رہ گیا۔ اسے بھی فرید خان کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ بے چارہ مال بچوں والا آدمی تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اسی کیس کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ وہ اس کیس کی گہرائیوں پر غور کر رہا تھا کہ ابراہیم خاں نے اندر آ کر سیلوٹ کیا۔

پہچان سکتا کیونکہ وہ گھر میں فون کی لائن چیک کرنے داخل ہوا تھا اور اس نے یہ غور بھی نہیں کیا تھا کہ دروازہ کس نے کھولا۔“

”ڈاکو یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔“

”مگر انہوں نے اسے اس وقت کیوں نہیں مار دیا۔“

”یہ وہی بتا سکتے ہیں۔“ عثمان عادل شاہ کی

بچکانہ باتوں سے اکتا کر بولا۔ ویسے بھی اس پر نیند کا شمار جاری تھا۔ پھر وہ بولا ”جاؤ آرام کرو۔ میں کچھ ویر اور سونا چاہتا ہوں۔“ وہ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا لیکن اسے دوبارہ نیند نہیں آئی۔ کچھ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اسے رہ رہ کر فرید خان کی موت کا خیال آ رہا تھا۔ جب کوشش کے باوجود نیند نہ آئی تو وہ اٹھ کر غسل خانے میں داخل ہو گیا اور ٹھنڈے پانی کے غسل سے کافی حد تک طبیعت کو بحال کیا۔

ناشتے کی میز پر وہ اپنی والدہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ عادل نے ہوشیاری سے کام لیا اور والدہ کو فرید خان کے قتل کی خبر نہیں سنائی ورنہ اس وقت ان کی حالت کافی خراب ہوتی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد انہوں نے اسے

مخاطب کیا ”عثمان!“

”جی ای۔۔۔۔۔“

”آفس نہیں جاؤ گے؟“

”آج نہیں جاؤں گا ای۔“

”کیوں؟“

”بس طبیعت میں سستی ہے رات کو ٹھیک سے سو

بھی نہیں سکا۔“

”میں بھی غمزہ ہوں۔ میرے بیٹے کی محنت کی

کمانی اس طرح برباد ہو گئی۔“

”مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں ہے ای لیکن میں

آپ کے دکھ کو جانتا ہوں مجھے پتا ہے کہ آپ کس چیز

کیلئے غمزہ ہیں۔“

”میں۔۔۔۔۔؟“ ای نے کہا۔

”ہاں۔ ابو کی نشانی وہ لاکٹ جس میں ابو کی

تصویر تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ کس طرح تنہائی



پڑتا کیونکہ اب تو اس کے گرگے اس کے بغیر بھی وارداتیں کر لیتے ہیں۔ ”گل زمان یہ کہہ کر چپ بو گیا۔“

”یہ میری بات کا جواب تو نہیں گل زمان مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں جلیل کے گینگ پر شبہ کیوں ہے؟“

”شبہ نہیں مجھے یقین ہے سر یہ لوگ ہر واردات کے بعد اپنی جگہ بدل لیتے ہیں۔ کل رات ان میں سے کسی کا بھی فلیٹ میں نہ آنا یہ ثابت کرتا ہے کہ اب انہوں نے وہ ٹھکانہ بھی چھوڑ دیا ہے۔ آج دن میں اور پتا چل جائے گا۔“

”وہ فلیٹ کس کی ملکیت ہے؟“

”پلازہ کے چوکیدار نے بتایا کہ فلیٹ کا مالک سعودی عرب میں مقیم ہے اور چند روز پہلے ہی ایک بوڑھی عورت اور اس کے دو جوان بیٹوں نے وہ فلیٹ ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے ذریعے کرائے پر حاصل کیا تھا۔“

”اسٹیٹ ایجنٹس والے اتنی تحقیق کہاں کرتے ہیں انہیں تو اپنے کاروبار سے غرض ہے۔“

”وہ بوڑھی عورت کون ہو سکتی ہے؟“

”وہ تو کسی کی بھی ماں یا خالہ ہو سکتی ہے سراسر ایسے لوگ مکان وغیرہ حاصل کرنے کیلئے اور پھر محلے والوں کو دکھانے کیلئے کسی عورت کو ضرور سامنے رکھتے ہیں یہ انتظام تو ہو ہی جاتا ہے اصل بات یہ ہے کہ اب وہ لوگ شہر کے کس حصے میں چھپے ہیں؟“

”جب وہ لوگ پچھلی واردات کے بعد اپنی پرانی کہیں گاہ سے اس فلیٹ میں منتقل ہوئے تھے تو اس وقت بھی ان کی تلاش میں چار پانچ روز لگ گئے تھے مگر ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث ہم ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکے تھے۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس بازوہ شہر ہی چھوڑ گئے ہوں۔“

”وہ پیشہ ور لوگ ہیں سر ان کا کام یہی ہے اور یہ کام اس بڑے شہر میں کرتے ہوئے انہیں بہت سی سہولتیں رہتی ہیں۔ اس منخان شہر میں خود کو چھپانا ان کیلئے بہت آسان ہے۔“ گل زمان نے اپنی رائے کا

”کیا خبریں ہیں ابراہیم خاں؟“

”سب خیریت ہے سرجی۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

”صبح کو اٹھ کر اخبار نہیں پڑھتے؟“

”نہیں سرجی گھر والی سے جھگڑا کرتا ہوں۔ ناشتا کرتا ہوں بیچوں کو اسکول چھوڑتا ہوں پھر تھانے آجاتا ہوں۔“ ابراہیم خاں کے انداز پر جمشید کو ہنسی آگئی۔ پھر اس نے کہا۔

”بیوی سے روز جھگڑا کرتے ہو؟“

”ضروری ہے سرجی۔“

”کیوں؟“

”میں شام کو واپس جاتا ہوں تو خوشامدیں کرتی ہے اچھا لگتا ہے۔“

”ایک بڑی خبر ہے۔“ جمشید نے کہا۔

”کیا سرجی؟“

”بے چارے فرید خان کو قتل کر دیا گیا۔“ جمشید نے کہا اور ابراہیم خاں بھی حیران رہ گیا۔ اس نے اخبار میں پوری خبر پڑھی پھر افسوس سے بولا۔

”یہ تو واقعی بڑی خبر ہے۔ سرجی بے چارے کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”یہ گل زمان کہاں رہ گیا؟ اسے ایک کام سنا تھا ابھی تک اس کا پتا نہیں ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے اتنا ہی کہا تھا کہ گل زمان نے آفس آکر سیٹ کیا۔ جمشید نے گردن ہٹائی اور پھر بولا ”تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ بیٹھو تم بھی بیٹھو ابراہیم خاں۔“

”شکر یہ سرا“ دونوں بیٹھ گئے۔

”ہاں گل زمان کیا خبر ہے؟“

”آپ کا اندازہ ٹھیک تھا سر۔ یہ وہی گینگ ہے سر ہم نے رات بھر اس جگہ کی نگرانی کی ہے دو سپاہی میرے ساتھ تھے مگر رات کو کوئی اس طرف نہیں آیا۔“

”یہ جلیل خان والا گروہ ہے۔“

”نکاسر!“ گل زمان نے جواب دیا۔

”لیکن میری اطلاعات کے مطابق جلیل تو ملک سے باہر ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”جلیل خان اگر باہر ہے تب بھی کوئی فرق نہیں

اظہار کیا۔

”ہمارے مجرموں کا کیا حال ہے؟“

آپ اپنے طور پر ہی تحقیقات کریں اس سلسلے میں مجھے معاف ہی رکھیں تو بہتر ہے۔“ عثمان نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

”وہ بھی لگے ہوئے ہیں سزا البتہ گینگ کے ایک آدمی کو گزشتہ ایک ماہ کے دوران تین چار مرتبہ بی ٹاؤن کے ایک پلازہ میں آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔“

”میرے علاقے میں کل اتنا بڑا ڈاکہ پڑا ہے عثمان صاحب اور پھر ایک بے مقصد سا آدمی اس سلسلے میں مارا بھی جا چکا ہے میں مزید کسی غفلت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا بہت ممکن ہے کہ مجرموں کے آئندہ اقدام اور بھی خطرناک ہوں۔ لہذا پلیز آپ مجھے۔۔۔“ انسپکٹر کا لہجہ سپاٹ ہو گیا تھا۔

گفتگو ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ اردلی نے انسپکٹر کو عثمان کے آنے کی اطلاع دی۔ انسپکٹر جمشید نے عثمان کو اندر بلوایا اور گل زمان کو اشارہ کیا، گل زمان باہر نکل گیا تھا۔ عثمان اندر داخل ہو گیا تھا، جمشید کے اشارے پر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا، انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”آپ کو چاہیے تھا کہ کل ہی اس لائن میں کو اپنی حفاظت میں لے لیتے۔“

”میں آپ سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اب اس ڈپٹی میں ایک قتل کا اضافہ ہو گیا ہے آپ نے آج کا اخبار تو پڑھ ہی لیا ہوگا۔“

”ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں یہ آپ ہم پر چھوڑ دیں اور ہمیں مشورے نہ دیں۔“ انسپکٹر نے کس قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”جی ہاں مجھے فرید خان کے قتل کی اطلاع مل چکی ہے بہت افسوس ہوا۔“ عثمان نے آہستگی سے کہا۔

”سوری سر میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ عثمان نے جلدی سے معذرت کی۔

”اب صرف افسوس کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ انسانی جان، مال و دولت سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ اس معاملے کو جلد از جلد حل کیا جائے۔“

”ہمارے آدمی نے کل رات آٹھ بجے تک اس کا انتظار کیا تھا۔“ انسپکٹر جمشید نے اپنا موڈ ٹھیک کر لیا۔

”میں تو آپ سے ہر تعاون کیلئے تیار ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے آپ کو ساری بات بتا دی ہے۔“ عثمان کے لہجے میں کل والی جھجک ختم ہو گئی تھی۔

”اس کی موت کی خبر کب ملی؟“

”میں تو آپ سے ہر تعاون کیلئے تیار ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ میں نے آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے آپ کو ساری بات بتا دی ہے۔“ عثمان کے لہجے میں کل والی جھجک ختم ہو گئی تھی۔

”آج صبح اس علاقے کے ایس ایچ او نے بتایا ساتھ ہی کچھ اور تفصیل بھی۔“

”پہلی بات تو یہ ہے عثمان صاحب کہ یہ کیس آپ کے بھرپور تعاون کے بغیر حل نہیں ہو سکتا لہذا میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس سلسلے میں جس کسی پر بھی شک ہو اس کا نام اور پتا مجھے بتادیں۔“

”پوچھ سکتا ہوں کیا؟“ عثمان نے کہا۔

”یہ تو بڑی مشکل بات ہے انسپکٹر صاحب، حالانکہ مجھے تو کل سے اپنے سائے تک پر شبہ ہو رہا ہے مگر شبہ کو یقین میں تبدیل کیے بغیر کسی کا نام بتانا تو زیادتی کی بات ہے وہ بیچارہ خواخواہ پولیس کی زد میں آجائے گا اور شبہ بے مقصد ثابت ہوئے تو میرے

”ہاں رات کو نو بجے کے قریب فرید خان واپس آ گیا تھا۔ پھر وہ کھانے سے فارغ ہوا تھا کہ کوئی اسے بلانے آیا۔ وہ باہر نکلا پھر واپس نہیں آیا اسے گلی سے دور ایک میدان میں لے جا کر گولی مار دی گئی۔ اس کی لاش کے بارے میں محلے کے لوگوں نے بتایا۔ اس کی بیوی نے آپ کے گھر پڑنے والے ڈاکے کے بارے میں بھی بتایا جس میں پولیس نے اسے بھی شامل تفتیش کر لیا تھا۔ اس علاقے کے تھانہ انچارج کا بھی یہی خیال ہے کہ ڈاکے اور فرید خان کے قتل کا واقعہ ایک دوسرے سے ملتا ہے۔“

”بہت افسوس کی بات ہے۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”بہت افسوس کی بات ہے۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”بہت افسوس کی بات ہے۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”بہت افسوس کی بات ہے۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”بہت افسوس کی بات ہے۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”بہت افسوس کی بات ہے۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”بہت افسوس کی بات ہے۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

”بہت افسوس کی بات ہے۔ میرے لیے اب کیا حکم ہے؟“

READING Section



”وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔“ جمشید نے کہا۔

”کیا۔۔۔؟“

”یہی کہ آپ ہم سے تعاون نہیں کر رہے اور یہ آپ کے حق میں بھی برائیت ثابت ہو سکتا ہے۔“ انسپکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔

عثمان کو اندازہ ہو گیا کہ واقعی صورت حال اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔ انسپکٹر کو ناراض کرنا کسی طور مناسب نہیں ہے اور پھر اب تو وہ اس کا راز دان بھی بن چکا ہے لیکن سمجھ میں آتا تھا کہ وہ کس پر شبہ کا اظہار کرے آخر کار اس نے کہا۔

”میں جانتا ہوں انسپکٹر صاحب کہ آپ میرے لیے مخلصانہ کام کر رہے ہیں لیکن۔۔۔۔۔“

”غلط خیال ہے آپ کا۔“ جمشید نے بات درمیان سے کاٹ دی۔

”جی۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”میں کوئی کام آپ کیلئے نہیں کر رہا۔ میں صرف اپنے فرض سے مخلص ہوں۔“

”پشک، پشک۔“ عثمان جلدی سے بولا اور پھر کہنے لگا ”میں آپ کو اپنے عزیز واقارب اور دوستوں کے پتے لکھوادیتا ہوں۔“ ابھی عثمان نے اتنا ہی کہا تھا کہ جمشید نے پھر اس کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

”تمہیں مسٹر عثمان اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں ان سب کے بارے میں جھان بین کرتا پھروں آپ کچھ خاص نام مجھے بتادیں لیکن وہ لوگ جن پر آپ کو واقعی شبہ ہو۔“

عثمان اُبھمن میں پڑ گیا، پھر بولا ”یہ ایک مشکل کام ہے۔“

”لیکن یہ آپ کو کرنا ہوگا۔ آپ ایک دولت مند انسان ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ آپ نے یہ دولت ناجائز ذرائع سے کمائی ہے مگر یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ کون کون شخص آپ کی اس ناجائز کمائی کے بارے میں جانتا ہے اتنا بڑا ڈاکہ جبری کے بغیر نہیں پڑ سکتا۔“

عثمان گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ انسپکٹر بے حد چالاک آدمی ہے اور بہت

گہرائیوں میں اتر گیا ہے۔ وہ بات اس کے ذہن میں بھی کچھ کے ڈال رہی تھی کہ معاملہ جبری کا ہی ہے۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچنے لگا جو اس کی اس زندگی کے بارے میں جانتے تھے۔

”آپ اب بھی سوچ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔“

”وہ۔۔۔۔۔ دراصل انسپکٹر صاحب۔“

”دراصل کچھ نہیں ہوتا صرف اصل ہوتا ہے۔“

”میں وہ نام آپ کو بتا رہا ہوں۔“

”جی ا“ انسپکٹر نے رائٹنگ پیڈ سامنے سرکا لیا اور عثمان نے پانچ ایسے نام بتا دیئے جو اس کی نظروں میں مشکوک تھے لیکن اس کا دل لرز رہا تھا یہ نام لیتے ہوئے۔ یہ بہت خوفناک انکشاف تھا اگر وہ مرزا شاہد کے کہنے پر اپنی دولت کے بارے میں اعتراف نہ کرتا تو یہ تو بہت نہ آتی لیکن اب وہ خود بھی مجرموں کی فہرست میں شامل تھا۔

”وہ انسپکٹر صاحب اس نے لرزتی آواز میں کہا۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا نام کہیں بھی سامنے نہیں آئے گا۔“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے جمشید پھر بول پڑا۔

”لیکن یہ لوگ آخر سمجھ ہی جائیں گے۔“

”وہ مجبوری ہے جس کیلئے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اب یہ صرف ڈاکے کا کیس نہیں رہا بلکہ مل کا کیس بن چکا ہے۔“

”ہاں مجھے اندازہ ہے۔“ عثمان نے کمزور لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے آپ چاہیں تو جاسکتے ہیں۔“ جمشید نے کہا اور عثمان اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ گردن تک دلدل میں پھنس گیا ہے۔ دولت چلی گئی تھی یہ بذات خود بہت بڑا المیہ تھا۔ جس کا اسے بے حد رنج تھا لیکن فرید خان کے قتل کے بعد تو یہ کیس انتہائی سنگین نوعیت اختیار کر گیا تھا اور اب وہ خود بھی خطرے میں پڑ گیا تھا جس کا اسے پوری طرح احساس تھا۔

☆.....☆.....☆

ان میں سے صرف دو کل رات گھر سے نکلے تھے۔ ان کے علاوہ ان تینوں نے اپنے آپ کو اس مکان میں بند رکھا تھا۔ خوف کے احساس نے انہیں اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ لونی ہوئی رقم اور اشیاء انہوں نے گھر کے مختلف حصوں میں چھپا دی تھیں۔ گھر میں انہوں نے کھانے پینے کی اشیاء کا کافی ذخیرہ کر رکھا تھا اس لیے انہیں اس کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ان تینوں میں سے کسی کی بھی عمر بیس یا بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

رات گہری ہو گئی تو وہ تینوں گھر کے ایک کمرے میں جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا ”تم نے اپنے ماموں سے اس گھر کی چابی لے کر بہت اچھا کیا ہے ناصر۔“

”ہاں یہاں ہمیں بہت آرام ہے فرہاد۔“  
”میں نے کرائے کے گھر کی اس لیے مخالفت کی تھی۔“ تیسرے نے کہا۔

”پولیس سارے ہتھکنڈے جانتی ہے کرائے کے گھر کا وہ آسانی سے سرانغ لگا سکتی تھی۔“  
”ماموں سے تم نے کیا کہا تھا؟“

”اتفاق سے وہ کچھ عرصے کیلئے ملک سے باہر جا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں پریشکون رہ کر اسٹڈی کرنا چاہتا ہوں اس لیے گھر کی چابی مجھے دے دیں۔“

”ویری گڈ۔۔۔ اور تم خوب اسٹڈی کر رہے ہو۔“ فرہاد نے ہنس کر کہا۔

”ہاں گھر کے لوگ یہی سمجھ رہے ہیں۔“  
”ہم تینوں ہی بڑے ہونہار بچے ہیں“ ناصر نے کہا اور تینوں ہنسنے لگے۔

”جلیل خان کو ہمارے اس کارنامے کی خبر ہے؟“ تیسرے نوجوان کمال نے کہا۔

”یقیناً ہوگی وہ ہماری پوری خبر گیری رکھتے ہیں اور پھر ڈاکے کی خبر اخبار میں بھی چھپ چکی ہے۔“ فرہاد نے کہا۔

”اخبار نے اس بارے میں زیادہ کچھ نہیں لکھا تھا۔“

”تو پھر؟ اس سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“  
”میرا مطلب ہے جلیل خان صاحب نے اس معمولی ڈاکے پر غور بھی نہیں کیا ہوگا حالانکہ ہم دس لاکھ کا حصہ دے چکے ہیں۔“  
”خان صاحب خوش نہیں تھے۔“

”وہ خوش کہاں ہوتے ہیں۔ سب کچھ خود ہی ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔“  
”یار وہ بڑا باخبر آدمی ہے اسے اصل رقم کا اندازہ ہے“ کمال نے کہا۔

”معلوم ہے تو معلوم رہے۔ سب اسے ہی تو نہیں دے سکتے ابھی تو دوسرا حصہ وار بھی آنے والا ہے۔“  
”یار یہ ہے بڑے تکلیف کی بات۔“  
”کیا؟“

”ہم کب تک جسے بانٹتے رہیں گے۔ محنت ہم کریں زندگی کی بازی ہم لگائیں اور آدمی سے زیادہ رقم یہ جسے دار لے جائیں ہمیں کیا ملتا ہے؟“

”نہیں ایسے مت سوچو ہماری حفاظت بھی تو کی جاتی ہے۔ اتنی رقم ہم ساری عمر نوکریاں کر کے بھی نہیں جمع کر سکتے تھے۔ بس تھوڑا وقت اور اس کے بعد ملک سے باہر نکل جائیں گے اور اس کے بعد عیش ہی عیش۔“

”واقعی یہ خیال سب سے خوبصورت ہے۔“  
”اور سب سے بھیا تک بھی۔“  
”بھیا تک کیوں؟“

”ڈیڑھ دو سال میں ہم ایک رات بھی سکون کی نیند نہیں سوئے ہیں۔“

”کچھ کرنے سے کچھ ملتا ہے دوست دنیا کو غور سے دیکھو اور خود کو دیکھو اپنی ہی بات لے لو پیشک ڈیڑھ دو سالوں سے تم سکون کی نیند نہیں سوئے لیکن ان ڈیڑھ دو سالوں میں تم نے پوری شان و شوکت سے اپنی بہن کی شادی کی اپنے والد کی بائی پاس سرجری کرائی جس پر لاکھوں خرچ ہوئے اپنی ماں اور بھالی کو فلیٹ خرید کر دیا۔ یہ سب کچھ ان بے سکون راتوں کا ہی صلہ ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“



”ویسے ایک کام بہت خطرناک ہوا ہے۔“  
”کیا؟“

”ایک خون بھی ہمارے سر آ گیا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔“

”یہ بھی تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ تمہارا پڑوسی تھا، بس ذرا سی دیر کیلئے میرا چہرہ کھل گیا تھا اور اس نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن اس حد تک جانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ضروری تھا یار! اور نہ خطرہ ہی خطرہ تھا۔“  
”یار چھوڑو ان باتوں کو۔ آگے کی سوچو اب کیا کرتا ہے؟“

”مال یہاں سے منتقل کرنا ہے ویسے نی الحال یہ جگہ محفوظ ہے۔“

”اور وہ دوسرا حصہ دار؟“  
”ہاں! دوسرے نے گہری سانس لی پھر بولا: آج کی رات تو یہاں گزارنی ہوگی۔ فرید خان کے قتل کے بعد تو پولیس بری طرح ہماری تلاش میں لگ جائے گی۔“

”کوئی ثبوت تو نہیں چھوڑا ہم نے پولیس ہم پر شبہ کیوں کرے گی؟“  
”اویار بچوں کی سی بات نہ کرو پولیس کوئی معمولی نہیں ہوتی۔“

اس وقت دروازے کی تیل بج اٹھی اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر شدید خوف کے آثار ابھر آئے۔ تینوں نے پھر نی سے ریو اور نکال لیے تھے۔ اس گھر کا کوئی پچھلا دروازہ بھی نہیں تھا جہاں سے فرار ہوا جاسکتا تھا اور پھر کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔

ناصر نے کمال کو اشارہ کیا اور کمال بلی کی سی چال چلا ہوا پورچ میں آ گیا جہاں تار کی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح آگے بڑھ کر ایک دیوار کے پاس پہنچ گیا۔

”تم اوسر“ ناصر نے سرگوشی کی اور اس کے اشارے پر فرہاد چھت پر چلا گیا۔

گھنٹی دوبارہ بجی تو کمال نے ہولے ہولے سر اٹھا کر بڑی احتیاط سے باہر جھانکا تب اس کی جان میں

”تم اوسر“ ناصر نے سرگوشی کی اور اس کے اشارے پر فرہاد چھت پر چلا گیا۔

گھنٹی دوبارہ بجی تو کمال نے ہولے ہولے سر اٹھا کر بڑی احتیاط سے باہر جھانکا تب اس کی جان میں

”تم اوسر“ ناصر نے سرگوشی کی اور اس کے اشارے پر فرہاد چھت پر چلا گیا۔

گھنٹی دوبارہ بجی تو کمال نے ہولے ہولے سر اٹھا کر بڑی احتیاط سے باہر جھانکا تب اس کی جان میں

”تم اوسر“ ناصر نے سرگوشی کی اور اس کے اشارے پر فرہاد چھت پر چلا گیا۔

جان آئی۔ اس نے گھنٹی بجانے والے کو پہچان لیا۔  
یہ پچاس پچپن سال کی عمر کا ایک مجھول سا آدمی تھا، اس کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ نشے میں دھت ہے۔

”خدا تمہیں غارت کرے آؤ۔ مرو“ کمال نے گیسٹ کھول کر اسے اندر کھینچ لیا۔ وہ نشے میں لڑکھڑاتا اندر آ گیا۔ ناصر اور فرہاد نے بھی اسے پہچان لیا تھا وہ سب پھر اکٹھے ہو گئے۔

”تم اس وقت کیوں آئے پچا سکندر؟“ کمال نے تخی سے کہا۔

”ضرورت کا کوئی وقت نہیں ہوتا یارے پچو مگر تم نے یہ اسلحہ کیوں نکال رکھا ہے۔ کیا چاند ماری کر رہے تھے؟“ نشے میں ڈوبے شخص نے کہا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ ناصر فرمایا۔  
”کیوں۔۔۔ میرا حصہ نہیں دو گے؟“

”ہم نے کہا تھا تمہارا حصہ تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔“

”اور میں نے کہا تھا کہ میں خود لینے آ جاؤں گا۔“  
”تمہیں معلوم ہے کہ پولیس ہمیں تلاش کرتی پھر رہی ہے۔“

”وہ پولیس کا کام ہے۔ تم اپنا کام کرو، کتنا مال نکلا؟“ سکندر نشے میں ضرور تھا لیکن اپنے کام میں جو کس نظر آ رہا تھا۔

”چھوڑو پچھا نام ہے سکندر اور تقدیر کے بندر۔“ ناصر نے کہا۔

”کیوں۔ کیا ہوا؟“ سکندر نے پوچھا۔  
”تمہاری اطلاع غلط تھی۔“ ناصر بولا۔

”وہ کیسے؟“ بوڑھے نے پوچھا۔  
”آٹھ دس ہزار روپے اور چند زیورات۔ بس یہ نکلا“ کہہ کر ناصر نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور سکندر کی طرف بڑھا دیا۔

”کتنے روپے ہیں اس میں“ سکندر نے پوچھا۔  
”بانیج ہزار بجی تمہارا حصہ بنتا ہے۔“

”تمکن ہی نہیں ہے۔ غلط کہہ رہے ہو“ سکندر نے بگڑتے ہوئے لہجے میں کہا۔

پانچوں کا تصور ذہن میں آتے ہی عثمان کے اندر ایک احساس جرم بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ ان میں سے ایک نام ایسا تھا جو عثمان کے شیخے کی بنیاد پر کم اور انتقام کے باعث زیادہ شدت رکھتا تھا۔ بانی چار نام وہ بتانے پر اس لیے مجبور تھا کہ ان کے سوا اس کی دولت کا حقیقی اندازہ کسی اور نہ نہیں تھا۔ مادر اور عامر پر تو رہ رہ کر کف افسوس مل رہا تھا مگر وہ کیا کرتا انسپکٹر جمشید نے اسے مجبور ہی اتنا کر دیا تھا۔

اب اسے یہ خیال آرہا تھا کہ مادر اور عامر اگر بدنیت ہوتے تو انہیں اس ڈاکے کی پشت پناہی کی ضرورت کیا تھی۔ ان کے نام عثمان نے لاکھوں روپے مالیت کے پلاٹ خرید رکھے تھے اور اگر وہ دونوں چاہتے تو اس پلاٹ سے مگر جاتے کہ وہ جائیداد عثمان کی نہیں بلکہ ان کی ہے باقی دو نام دفتر کے ساتھیوں کے تھے جن سے عثمان کی دفتری رقبابت تھی اور وہ لوگ جانتے تھے کہ عثمان کے پاس بے پناہ دولت ہے۔

جس بات بے عثمان کو سب سے زیادہ پریشان کر رکھا تھا وہ یہ تھی کہ دو دن گزر جانے کے باوجود انسپکٹر جمشید کی طرف سے کسی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا مادر اور عامر بدستور اس کے گھر آرہے تھے اور آج اس دفتر میں آکر علم ہوا کہ اس کے دفتری رقیب بھی حسب معمول اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے کام میں مشغول ہیں۔ کل شام زارا سے بھی بات ہوئی تھی اور وہ اس سے ملنے کیلئے اسی طرح بتاب بھی جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انسپکٹر جمشید بھی اس کیلئے کچھ نہیں کر رہا تھا۔

عثمان دن میں دو مرتبہ انسپکٹر جمشید کو ضرور فون کرتا مگر وہ تھانے میں موجود نہ ہوتا البتہ کل رات وہ فون پر مل گیا اس نے بتایا کہ وہ بہت جلد عثمان کو خوشخبری سنانے والا ہے۔ یہ بات معمول کے لہجے میں کہی گئی تھی لہذا عثمان اسے مطلق تسلیوں سے زیادہ گردانتا تو اس کی بیوقوفی ہوتی۔ مرزا شاہد بھی اس دن کے بعد سے غائب تھا۔ آج صبح دفتر جانے سے پہلے عثمان اس کے گھر گیا تو وہ کسی ضروری کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ عثمان اس کے گھر پر اپنا دزنگ کارڈ چھوڑ کر آ گیا۔

”یہی سچ ہے چچا سکندر تم نے بلا وجہ ہم سے اتنی محنت کرائی۔ اتنا خطرہ مول لیا ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ لیکن نہ آئے تو اخبار میں ڈاکے کی تفصیل پڑھ لینا۔ چلو شاباش پیسے رکھو اور پھوٹو یہاں سے۔“ ناصر نے ہاتھ میں دے کر یو لور کو انگلیوں میں چماتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ سکندر نے لفافہ جیب میں رکھا اور بولا ”چلتا ہوں“

”احتیاط سے جانا چچا اور کوئی اچھی سی ٹپ لادو تاکہ تمہارا بھی کام بنے اور ہمارا بھی۔“ بوڑھا خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

عثمان تین دن کے بعد دفتر آیا تھا۔ اس کے گھر پڑنے والے ڈاکے کی خبر سب کو تھی۔ دفتر کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے افسوس کرنے لگے۔ بڑے افسران نے بھی اسے آفس بلوا کر اظہار افسوس کیا۔ ظاہر ہے اس نے یہاں بھی لوٹی جانے والی رقم کی تفصیل نہیں بتائی لیکن جانتے والے جانتے تھے کہ بات چھوٹی سی نہیں جس سیٹ پر عثمان ہے وہاں دولت کی بارش ہوتی ہے۔ انہوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیئے تھے۔

”سنا تم نے۔۔۔“ انور علی نے نوید شان سے کہا۔

”کیا؟“

”چند ہزار اور تھوڑے سے زور۔“

”ڈاکوؤں کو خود کشی کر لینی چاہیے۔“

”ابے نہیں یا سب ایک دوسرے کو ٹریٹ دے رہے ہوں گے یہ چند ہزار یعنی چند انہیں بچھیس بچھاس لاکھ سے ضرب دے لو۔“

”چھوڑو یا رہیں کیا۔“

”بس اس جھوٹ پر ہنسی آرہی ہے۔“

”بری بات“ الیا س بیگ نے کہا ”آج کل جھوٹ پر ہنستے نہیں۔“ یہ سن کر سب ہنس پڑے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عثمان ذہنی طور پر بہت پر اگندہ ہو چکا تھا اتنا بڑا مالی نقصان اور اس پر مستزاد یہ کہ اس نے اپنے قریبی حلقے میں سے پانچ افراد کے نام بھی انسپکٹر جمشید کو بتا دیئے تھے۔ ان



عثمان اسی ادھیڑ میں مبتلا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف شاہد تھا، ہیلو عثمان، تم جلدی سے سی آئی اے سینٹر پہنچ جاؤ۔

”کوئی خاص بات ہے شاہد؟“

”وقت برباد مت کرو یا زجو کہہ رہا ہوں وہ کروڑوں تمہیں گیٹ پر مل جاؤں گا۔“ یہ کہتے ہوئے شاہد نے فون بند کر دیا۔ عثمان نے اپنے سینٹر کو بتایا کہ وہ ضروری کام سے باہر جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ واپسی میں دیر ہو جائے یا پھر وہ آج لوٹ کر نہ آئے۔

تھوڑی دیر بعد عثمان کی گاڑی سی آئی اے سینٹر کی طرف برق رفتاری سے جا رہی تھی۔ اس کے دماغ میں شاہد کے الفاظ گونج رہے تھے اس کا مطلب ہے کہ معاملہ سی آئی اے تک پہنچ گیا ہے یہ بات عثمان کی سمجھ سے بالاتر تھی جب اس کی گاڑی سی آئی اے سینٹر کے قریب پہنچی تو خوف کی ایک لہر اس کے دل میں موجزن ہو کر رہ گئی شاہد حسب وعدہ گیٹ کے قریب کھڑا تھا۔

”سبارک ہو عثمان۔“ مرزا شاہد نے اس کی طرف لپکتے ہوئے کہا، ”مگر یا تم نے تین دن سے میرا سونا جاگنا حرام کر رکھا ہے۔“

”کیا ڈاکو پکڑے گئے؟“ عثمان نے جتانی سے پوچھا۔

”باقی تفصیلات تھوڑی دیر بعد شاہد نے کہا اور اسے لیے ہوئے ایک بڑے افسر کے کمرے میں پہنچ گیا یہاں انسپکٹر جمشید بھی موجود تھا۔ انسپکٹر جمشید نے انسپکٹر مجید کا تعارف عثمان سے کرایا۔ تھوڑی دیر بعد عثمان کو اندازہ ہو گیا کہ کمرے کا ماحول نسبتاً بے تکلف ہے اور دونوں انسپکٹروں کی آپس میں خاصی انڈر سٹینڈنگ ہے۔ انسپکٹر جمشید نے شاہد کو مخاطب کر کے کہا۔

”عثمان صاحب کو سبارکبادی ہے یا نہیں؟“

”سبارکباد کے مستحق تو آپ لوگ ہیں“ شاہد کے لہجے میں خوشی اور طمانیت تھی۔ عثمان بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے بولا۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ انسپکٹر صاحب۔“

”اگر انسپکٹر مجید تعاون نہ کرتے تو شاید یہ معاملہ اتنی آسانی سے قابو میں نہ آتا۔“

”ہاں جی اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“ شاہد نے توصیفی نظروں سے انسپکٹر مجید کو دیکھتے ہوئے کہا جو منکسر انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر انسپکٹر مجید نے اپنے دائیں جانب رکھے شلف میں سے ایک تھیلی اور ایک بریف کیس نکال کر عثمان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ کی امانت ہے عثمان صاحب اگر اس میں کوئی کمی بیشی ہے تو اس کی ذمہ داری پولیس پر عائد نہیں ہوتی۔“

عثمان نے بے تابی سے بریف کیس کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھوں کی چمک میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اور پھر تھیلی میں زیورات کے ساتھ ساتھ وہ یادگار لاکٹ بھی تھا جو اس کی والدہ کی زندگی بھر کا حاصل تھا۔ خوشی سے عثمان کا پورا وجود لرز رہا تھا۔ اس نے ممنون نگاہوں سے باری باری کمرے میں موجود تینوں لوگوں کو دیکھا اور بولا، ”میں آپ لوگوں کا کس طرح شکریہ ادا کروں؟“

”میں بھی زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔“ شاہد نے سی دونوں انسپکٹروں سے کہا، ”آپ لوگوں نے واقعی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔“

عثمان نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے انسپکٹر جمشید سے پوچھا، ”کیا میرے بتائے ہوئے کسی نام کا بھی اس ڈکیتی میں ہاتھ تھا؟“

”اگر ہم آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے تو شاید کبھی بھی مجرموں کو نہ پکڑ سکتے۔“ انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”یہ تو محض اتفاق ہے کہ۔۔۔“ انسپکٹر جمشید ابھی اپنا جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا کہ دو سپاہی ہتھکڑی لگے ہوئے ایک شخص کو اندر کمرے میں لائے، اسے خاص طور پر آپ کیلئے بلوایا ہے۔“ انسپکٹر مجید نے عثمان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”اس کا نام سکندر ہے اور یہی اس ڈاکے کا اصل محرک ہے۔“

عثمان کو جیسے کرنٹ لگ گیا ہو وہ اچھل کر اپنی

بھی سب سے زیادہ توجہ زارا پر ہی دی تھی پھر تمہارے فلیٹ کی نگرانی کے دوران آدمی رات کے وقت سکندر کو کہیں جاتے ہوئے دیکھا گیا اور اس کا چہچہا کیا گیا۔ سکندر اس رات ان ڈاکوؤں سے ملنے ان کے فلیٹ پر آ گیا تھا۔ پولیس نے اس کی سخت نگرانی کی اور جب سکندر واپس فلیٹ سے نکلا تو کچھ دور جا کر پولیس نے اسے پکڑ لیا۔ یہ اس وقت نشتے میں تھا اور اس کی جیب میں پانچ ہزار روپے کی رقم کا ایک لفافہ تھا پولیس نے اپنے مشہور طریقہ کار سے ایک گھنٹے کے اندر اندر اس سے سارا راز اگلوا لیا۔ بس اس کے بعد ان ڈاکوؤں کے فلیٹ پر راتوں رات ریڈ کی گئی جب پولیس نے ڈاکوؤں کی کمین گاہ پر ریڈ کی تو ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پولیس ان تک پہنچ جائے گی۔ وہ تینوں ایک ہی کمرے میں تھے چنانچہ ان سے ہتھیار ڈالوانا مشکل ثابت نہ ہوا۔

”کون لوگ تھے وہ؟“  
 ”وہ دراصل جلیل خان والے گینگ کے آدمی ہیں بہر حال یہ پولیس کی بڑی کامیابی ہے کہ انہوں نے اس گینگ کے اہم ترین افراد کو پکڑ لیا ہے۔“  
 ”لیکن ان کا سرغنہ جلیل۔“

”اس کے بارے میں تحقیق ہو چکی ہے وہ ابھی تک ملک سے باہر ہے اور اس خبر کے بعد وہ ملک میں شاید ہی داخل ہو۔“  
 ”کب شائع ہوگی یہ خبر؟“

”کل صبح کے اخباروں میں ابھی تک اس خبر کو دانستہ چھپایا گیا ہے اس میں میرا مشورہ بھی شامل تھا کیونکہ اس کیس کا ایک مجرم آج صبح پکڑا گیا ہے۔“  
 ”کیا مطلب؟“ عثمان نے تعجب سے پوچھا ”وہ کونسا بڑا مجرم تھا؟“

”یہ اس پورے واقعے کا افسوس ناک کردار تھا مگر وعدہ کرو کہ اس مجرم کا نام بھی زبان پر نہیں لاؤ گے میں تم پر اعتماد کر کے اس کا نام بتائے دیتا ہوں۔“  
 ”میں وعدہ کرتا ہوں۔“ عثمان نے کہا۔

”وہ مجرم سب انسپکٹر ابراہیم ہے جو گزشتہ کئی مہینوں سے اس گروہ سے تعاون کر رہا تھا اور اس کے

کری سے کھڑا ہو گیا اس کے لیے زارا کے ماموں کو پہنچانا مشکل نہ ہوا۔ اس نے لڑتے ہوئے کہا۔  
 ”تو کیا کیا زارا بھی اس ڈکیتی میں ملوث ہے انسپکٹر۔“  
 ”جی نہیں اس میں زارا بالکل بے قصور ہے۔“  
 شاہد بیچ میں بول پڑا ”اور تم سے یہ بات پوری تحقیق کے بعد کی جا رہی ہے اس سلسلے میں انسپکٹر جمشید کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے میرا گزشتہ تین روز سے ان کے ساتھ مسلسل رابطہ رہا ہے۔ آپ کا اصل مجرم یہ ہے جس نے آپ کے سامان کی مخبری کی اور ڈاکوؤں نے اپنا کام دکھایا۔“

”مگر یا شاہد“ عثمان نے اچھتے ہوئے کہا۔  
 ”بہتر یہ ہے شاہد کہ آپ انہیں پوری تفصیل خود بتادیں ہمیں مزید کام سے جانا ہے۔“

عثمان ان کا مدعا سمجھ گیا وہ لوگ زیادہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتے تھے اور اب جبکہ اس ساری کارروائی کا علم شاہد کو تھا اور اس کا تمام مال بھی برآمد ہو گیا تھا۔ سکندر کو واپس لے جایا گیا اور عثمان اور شاہد ان دونوں سے رخصت ہو کر باہر آ گئے لیکن اس کے ذہن میں بہت سے سوالات کلبار ہے تھے۔ عثمان نے شاہد سے پوچھا۔

”کیا سکندر ڈاکوؤں کے گینگ کا آدمی ہے؟“  
 ”براہ راست نہیں ہاں البتہ اگر پکڑا نہ جاتا تو ہمیشہ کیلئے ڈاکوؤں کا آلہ کار بن جاتا۔“ شاہد نے جواب دیا۔ ”یہ دراصل کسی بدنام اڈے پر ان ڈاکوؤں سے ملا تھا پھر ان میں راہ ورسم ہو گئی۔ سکندر نے تمہارے زارا سے تعلقات کے دوران تم پر پوری ورکنگ کی تھی اور تمہارے گھر کا تمہاری سرکاری حیثیت کا پتہ لگا پتا تھا اور اسے پوری طرح اندازہ تھا کہ تم اس قدر موٹی آسای ہو۔ اس نے ان ڈاکوؤں کو تمہارے بارے میں مخبری اس بنیاد پر کی تھی کہ ڈکیتی کی رقم میں سے جو تھائی حصہ سکندر کا ہوگا۔“

”لیکن پھر پولیس ان ڈاکوؤں تک کس طرح پہنچی اور مال کیسے برآمد کیا جبکہ چوری تو سکندر نے نہیں کی تھی۔“

”انسپکٹر جمشید نے تمہارے بتائے ہوئے پانچ ناموں کے بارے میں نگرانی شروع کر دی مگر اس نے



”یہ تمہاری غلط فہمی ہے عثمان۔“ شاہد نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت تک تو وہ شہر سے چلی بھی گئی ہوگی۔ وہ مجھے واپس آنے کا کہہ کر سی آئی اے سینٹر سے سیدھی اپنے فلیٹ گئی وہاں سے سامان سمیٹا واپس یہاں آئی اور مجھے فلیٹ کی چابی دیتے ہوئے کہا کہ یہ اس فلیٹ کی چابی ہے جو تم نے اسے کرائے پر لے کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ چابی میں تمہارے حوالے کروں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ مارے ندامت کے تمہارا سامنا نہیں کر سکتی وہ اپنے آپ کو تمہاری مجرم سمجھ رہی ہے۔“ شاہد نے جیب سے ایک چابی نکال کر عثمان کی طرف بڑھادی جو اس نے شاہد سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لی۔

پھر اس نے شاہد کو اس کے فلیٹ کے نیچے ڈراپ کیا گاڑی سے اتر کر وہ شاہد کے گلے ملا تھا اور اسے بہت شکر بے کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ پھر وہ اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ گھر کے اندر پہنچ کر اس نے زیورات کی تھیلی گاڑی میں سے نکالی بریف کیس اس نے وہیں رہنے دیا تھا۔ لابی میں اس کی ماں اور چھوٹا بھائی عادل گم گم بیٹھے تھے۔

عثمان نے ساتھ لائی ہوئی زیورات کی تھیلی اپنی والدہ کی گود میں الٹ دی اس کی والدہ اور عادل حیرت بھری نظروں سے اس تھیلی کو دیکھ رہے تھے عادل بولا۔

”بھائی کیا کیا۔۔۔؟“

”ہاں عادل تمام رقم اور یہ زیورات کی تھیلی برآمد ہو گئی ہے۔ ڈاکو بھی پکڑے گئے ہیں لیکن سنو محلے میں ابھی خبر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بات جب سامنے آئی ہوگی خود ہی منظر عام پر آ جائے گی۔“

اس کی والدہ تھیلی میں سے نکلے ہوئے زیورات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی انہوں نے زیورات میں سے اپنا یادگار لاکٹ اٹھایا پھر عثمان کو اپنے پاس بلایا اور اس کے گلے سے لگ کر رونے لگی تھیں۔

☆☆.....☆☆

بدلے اسے خاصی رقم موصول ہو جاتی تھی۔“  
”اوہ۔۔۔۔“ عثمان کا منہ حیرت سے کھل گیا  
”مگر اس کے بارے میں خبر کیسے ہوئی؟“  
”ان ڈاکوؤں نے اگاہ ہے۔“  
”اب ابراہیم کا کیا بنے گا؟“

”اس لیے میں تم سے رازداری برتتے کیلئے کہہ رہا ہوں انسپکٹر جمشید نے فی الوقت اسے دو ماہ کی جبری رخصت پر بھیج دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ابراہیم خاں کو ہرگز معاف نہیں کرے گا مگر اس کیس پر ہاتھ ڈالنے کا مقصد یہ ہوتا کہ تم پر آنچ آتی اور میں اس کیلئے ہرگز تیار نہ تھا۔“

”ٹھیک ہے مگر یار یہ انسپکٹر جمشید بے خوب آدمی۔“  
”مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ فرید خان کے قاتل بھی پکڑے گئے۔“

”ارے یہ تو میں بھول ہی گیا۔ کیا انہی لوگوں نے اس غریب کو جان سے مارا ہے؟“  
شاہد نے فرید خان کے قتل کی وجوہات اور واقعے سے آگاہ کرنے کے بعد کہا ”یہ زارا کا کیا چکر لگا رکھا ہے تم نے اپنے ساتھ مجھے اس کا بھی دکھ ہے۔“

”اس میں دکھ کی کیا بات ہے یار وہ بڑی کمین عورت ہے۔“ عثمان کے لہجے سے نفرت جھلک رہی تھی ”اس نے تو مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔“

”نہیں یار آج بڑی تفصیل سے میری اس سے بات ہوئی۔ انسپکٹر جمشید نے اسے سی آئی اے سینٹر بلوایا تھا تاکہ اس کے ماموں کے کارنامے سے اسے آگاہ کروایا جائے اور اگہ قانونی طور پر وہ اپنے ماموں کے لیے کچھ کر سکتی ہے تو کر لے۔“

”پھر کیا کہا اس نے؟“ عثمان نے پوچھا۔  
”اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے ماموں کو گولی مار دیتی وہ تو فرط غم سے دو بار بیہوش بھی ہو گئی اس نے تم سے اپنی محبت کا اعتراف بھی کیا اور اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔“

”چاہتی تھی کیا مطلب اگر میں آج راضی ہو

”جاؤں تو وہ ابھی۔۔۔۔“

زہرا عشق

خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور عشق کی ایک ایسی ناقابل یقین داستان، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

قسط نمبر: 14

صنوبر اپنی ماما کے اس رویے پر ایک دم ہی پریشان ہو گئی مگر کوئی اس کے دل و دماغ میں گھس کر اس سے مسلسل یہ کہہ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو حماد کو اس گھر میں رکھنا ہے۔ کیوں؟ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

”ماما یہ چور نہیں ہے۔ یہ تو حماد ہے۔“ صنوبر نے سنبھل کر کہا۔

”میں جانتی ہوں یہ حماد ہے مگر یہ جس طرح یہاں سے گیا تھا۔ بنا کسی کو کچھ بھی بتائے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اس نے ضرور چوری کی تھی ورنہ اس طرح جانے کی کیا ضرورت تھی؟“ در شہوار نے حماد کی طرف بڑھتے ہوئے اور غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ حماد کو ایک ہی دھکے میں بیڑھیوں سے دھکینے والی ہے۔

یکا یک صنوبر نے بیڑھیوں کا ایک اسٹیپ عبور کیا اور اب وہ عین حماد کے سامنے کھڑی ہوئی تھی حماد اس کی پشت پر تھا۔ وہ بولی۔

”یہ مجھے بتا کر گیا تھا ماما۔۔۔ آئیں میں آپ کو سمجھاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر صنوبر واپسی کے لیے اس طرح مڑی کہ اس کے ہاتھوں میں اپنی ماں کا ہاتھ تھا۔ حماد بھی نیچے اترنے لگا اور پھر تینوں نیچے والے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

صنوبر اور در شہوار و بیڑھیوں پر براجمان ہو گئیں اور حماد چپکے سے وہاں سے کھسک کر چکن میں چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی۔ جس میں سلیقے سے دو گپ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے چائے میز پر رکھی اور کپوں میں چائے انڈیلنے لگا۔ در شہوار اس کی طرف دیکھنے لگی حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ابھی تو اسے رکھنے کا فیصلہ بھی نہیں ہوا اور اس نے کام شروع بھی کر دیا مگر وہ کہہ نہ سکی اور چپ رہی اسے چائے کا وہ ٹیسٹ یاد آ چکا تھا جو حماد کے ہاتھ کی چائے میں دنیا میں سب سے جدا تھا اور اس ٹیسٹ کو محسوس کر کے اسے جیسے حماد کی چائے اور اس کا کیا ہوا ہر کام یاد آنے لگا۔ اسے لگا کہ اس جادوگر لڑکے کو نہ رکھنے کی غلطی اسے نہیں کرنی چاہیے ورنہ یہ کہیں اور چلا گیا تو وہ ان سب چیزوں سے محروم ہو جائے گی جن کی وجہ سے اسے زندگی میں ایک نئے لطف اور روانی کا مزا آنے لگا تھا۔

چائے کا ایک سب لیتے ہی وہ جیسے ایسے مسرور ہوئی کہ اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ جلدی جلدی وہ ساری چائے پی گئی اور حماد کی طرف دوسرے کپ کی چاہت سے دیکھنے لگی۔ حماد کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی اس لیے اس نے پہلے سے ہی کافی چائے بنائی تھی۔ صنوبر ابھی چائے پی رہی تھی اور دل ہی دل میں یہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی کہ جو کام اتنی دیر سے اس





Downloaded From  
Paksociety.com



READING  
Section





کے سارے دلائل اور اس کی تاویلیں نہیں کر پائیں وہ حماد کی ایک کپ چائے نہ کر دیا تھا۔ وہ حماد کی اس ہوشیاری پر اس کی صلاحیت کی قائل ہو چکی تھی کہ وہ جانتا تھا اس کی چائے میں کیا جادو چھپا ہوا ہے۔ اسے خود بھی حماد کی چائے میں بہت لطف و سرور ملتا تھا لیکن یہ شاید اس سرور سے کچھ کم تھا جو اس کی ماما کو مل رہا تھا۔ چائے کا دوسرا کپ ختم کرنے کے بعد در شہوار کا رویہ کافی مصنوعی کا ہو گیا وہ یونہی بولی۔

”تم کیا سمجھتے ہو چائے پلا کر مجھے راضی کر لو گے اور میں قبول جاؤں گی کہ تم کیسے چوروں کی طرح میاں سے گئے تھے۔“

صنوبر نے ماں کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مجھے معلوم ہے آپ اسے معاف کر چکی ہیں اب کیوں بے چارے کو پریشان کر رہی ہیں۔“ یہ دیکھتے ہی حماد نے فوراً ہی اپنی حرکت کی معافی مانگنا شروع کر دی اور در شہوار کو یقین دلایا کہ اب وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔ یوں حماد کی نوکری پھر سے اس گھر میں پکی ہو گئی۔

حماد نے صنوبر کے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے اور اپنی اس پریشانی میں بھی اس نے اس کی مجبوری کو سمجھا اور اسے اپنے گھر میں پھر سے ملازمت دلوانے میں دل و جان سے کوشش کی۔ صنوبر پریشان ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ کیوں؟ اب وہ سوچ رہا تھا کہ صنوبر کی پریشانی کو کیسے معلوم کرے۔۔۔ اسی سوچ و بچار میں دن ختم ہو گیا اور شام ہو گئی۔ کوئی بہانہ نہیں مل رہا تھا کہ وہ صنوبر کے پاس جائے اور اس سے اس کی پریشانی کی بابت پتا کرے۔ سوچ کے دائرے بنتے اور ابھرتے چلے جاتے۔

صنوبر اسی اور فکروں میں گھری ہوئی تھی جاتے ہوئے وہ شرجیل سے یہ بھی نہیں پوچھ سکی کہ اس سے سلمان نے کیا کہا تھا جس سے اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اسی پریشانی میں اس نے شرجیل کو فون کیا۔ شرجیل جو خود صنوبر کو فون کرنے کا سوچ رہا تھا۔ صنوبر کا نام اپنے موبائل پر دیکھ کر فوراً ہی فون ریسپونڈ کر کے بولا۔

”ہاں صنوبر کسی ہوتی؟“

”تم اسکول کیوں نہیں آئے؟ مجھے تم سے ملنا تھا۔“ صنوبر نے جواب دیا۔

”ملنا تو مجھے بھی تھا تم سے۔ لیکن کچھ ایسی پریشانی رہی کہ مجھ میں نہیں آیا کیا کروں؟“

”کوئی نئی بات ہوئی ہے کیا؟ میں تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی سلمان نے تم سے کہا کیا تھا؟“

صنوبر نے ایک ہی سوال میں دو سوال کر لیے۔ دونوں سوالوں کا جواب ایک ہی تھا۔

”سلمان نے کیا کہا ہے؟ وہ نئی پریشانی اس لیے میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے اس وقت کیا کرنا چاہیے۔“

شرجیل نے سوچ کی اتھاڑ سے ایسے کہا جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ اس سے پہلے کہ صنوبر کوئی اور سوال گرتی وہ پھر بولا۔

”سلمان نے مجھ سے کہا اچھا تو وہ تم ہو جو صنوبر کی زندگی کو مشکل بنا رہے ہو۔ جانتے ہو فانس تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے۔ اسے اگر تم کہیں بھی مل گئے تو تمہیں شاید اندازہ بھی نہیں ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔۔۔ بندہ غائب کرنا تو اس کے لیے چٹکیوں کا کام ہے۔“

”کیا۔۔۔۔۔ سلمان نے یہ کہا تم سے؟“ صنوبر کی پریشانی جیسے چھت سے لگ گئی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ایک ہارے ہوئے آدمی کی سی آواز تھی جو اس وقت شرجیل کے منہ سے نکلی۔

”اسی لیے تم آج اسکول نہیں آئے؟“ صنوبر اس سوال کا جواب ہاں میں دینے کا مطلب تھا کہ وہ فارس سے ڈر گیا ہے۔ کچھ دیر وہ چپ رہا کچھ بولا نہیں تو صنوبر خود ہی بولی۔

”پھر تو تم نے بہت اچھا کیا شرجیل۔ ہمیں کسی سے بھی لڑنا نہیں ہے۔“

”ایسا نہیں ہے صنوبر کہ میں فارس کے ڈر سے اسکول نہیں آیا۔ میں یہ سوچتا رہا ہوں کہ اگر تمہارا اور میرا شتا ہونے سے پہلے اگر میرا فارس سے سامنا ہو گیا اور بات بڑھ گئی تو میرے لیے وہ ایک راستا بھی مشکل ہو جائے گا کورٹ میرج والا۔ اس لیے میں احتیاطاً نہیں آیا۔ اس سے جھگڑا ہونے کی صورت میں یہ بات میرے اور اس کے پیرنس کو پتا چل



جائے گی اور فارس کے والد یہ جاننے کے بعد میرے والد سے شکایت کریں گے۔ اس سب کے بعد اگر میں نے تم سے کورٹ میرج کی تو وہ سمجھیں گے میں نے تمہارے بعد بھی ایسا کیا ہے تو وہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیں گے اور اس طرح میرا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ میں تمہاری خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں مگر میرے خاندان کا تو اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ انہیں کیوں سزا ملے۔ اس لیے میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ شرجیل نے تفصیل سے اپنی پریشانی اور اپنے اسکول نڈانے کے بارے میں بتایا۔

یہ سب سن کر صنوبر گہری سوچ میں چلی گئی اسے شرجیل کی باتوں میں سچائی اور احتیاط دونوں نظر آئے اور اسے لگنے لگا کہ ایسی صورت حال میں تو کورٹ میرج کے علاوہ اور کوئی سورت باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ تو کیا اس کی محبت کے لیے بس یہی ایک رستا باقی بچا ہے؟“

وہ سوچتی رہی اور الجھتی رہی۔ ایک مڈل کلاس لڑکی کے لیے کورٹ میرج کرنا جتنا مشکل ہوتا ہے اس سے زیادہ مشکل اس وقت صنوبر کے لیے تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنے ماں باپ کو اس بات پر راضی نہیں کر سکے گی کہ وہ اس کی کورٹ میرج کو سپورٹ کریں اور اوپن رشتا یا شادی ہونے کی صورت میں فارس اور اس کے خاندان کو پتا چلنا لازمی تھا۔ دونوں طرف کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر صنوبر نے کہا۔

”مجھے تم سے ملنا ہے شرجیل“

”میں بھی تم سے ملنا چاہتا ہوں صنوبر“ شرجیل کی گہری اور بھاری سی آواز میں جو بے بسی بھری ہوئی تھی اسے صنوبر نے محسوس کر لیا۔ ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس سے کیسے اور کہاں مل سکتی ہے۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم نندا کے گھر ملیں؟“ صنوبر نے اپنی دوست کا نام لیا تو شرجیل فوراً ہی سمجھ گیا کہ صنوبر کس نندا کی بات کر رہی ہے۔

”اچھا ایک بات بتاؤ کیا میرا بھائی سلمان تم سے ملنے کے بعد یہ جان چکا ہے کہ تمہارے والد کون ہیں اور تم کس خاندان سے ہو؟“ صنوبر کے ذہن میں اچانک ایک اور پریشانی نے سزا ٹھایا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟“ شرجیل نے سمجھتے ہوئے بولا۔

”اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ اگر وہ یہ بات جانتا ہے تو وہ یہ بات اب تک فارس کیسے کو بتا چکا ہوگا۔“

”اوہ ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ شرجیل ایک دم ہی جیسے اچھل سا گیا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سلمان میرے بارے میں کتنا جانتا ہے۔“ شرجیل کی آواز میں جو تشویش تھی اسے محسوس کر کے صنوبر کو لگا کہ پھر تو شرجیل کا کہیں بھی نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ سوچنے لگی کہ اب کیا کرے۔ اس طرح تو وہ شرجیل سے مل ہی نہیں سکتی۔ اور یہ بات اس کی روح تک اترنے والے دکھ کی طرح تکلیف دہ تھی۔ وہ ابھی سوچوں کی کھائیوں میں اتری ہوئی تھی کہ شرجیل بولا۔

”پتا نہیں تمہارا بھائی کس سوچ کا مالک ہے جو تمہیں ایک غنڈے کے ہاتھوں سوخنے پر راضی ہے۔ کیا بھائی بھی ایسے ہوتے ہیں۔ میری کوئی بہن ہوتی تو چاہے مجھے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑتی میں ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہونے دیتا۔ یہ بات میں نے سلمان سے بھی کہی تھی۔“

”تو اس نے کیا کہا؟“ صنوبر نے اپنے بے حس بھائی سلمان نے بارے میں سوچتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”کچھ نہیں وہ یہ سن کر بس چپ رہا۔“ شرجیل نے کہا تو صنوبر کا دل زور سے دھڑکا اور وہ بولی۔

”میں تمہیں کچھ دیر بعد پھر سے فون کرنی ہوں“ اس سے پہلے کہ شرجیل یہ پوچھتا کہ کیا ہو اوہ کیوں بات کو درمیان سے منقطع کر رہی ہے صنوبر نے فون بند کر دیا۔

☆☆☆

فون بند کرتے ہی صنوبر کے دل میں جس خیال نے پلچل مچائی تھی وہ اس کے تصدیق کے لیے سلمان کے کمرے کی

READING  
Section

سچی کہانیاں 229

طرف چل پڑی۔ سلمان ابھی ابھی اپنے کمرے میں گھسا تھا۔ جانے سارا دن کہاں مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔ اس نے صنوبر کو اپنے کمرے میں آتے دیکھا تو حیران ہوا کیونکہ اس دن کے جھگڑے کے بعد سے صنوبر تو اس سے بات تک نہیں کر رہی تھی اس کے کمرے میں تو وہ ویسے بھی نہیں آتی تھی۔ کوئی بہت ضروری کام ہوتا تو ہی آتی تھی۔ سلمان نے اسے مشکوک سی نظروں سے دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

”تمہیں یاد ہے سلمان بچپن میں جب ماما اور پاپا کی لڑائی ہوتی تو ہم دونوں ایک ہی کمرے میں سہم کر دیک کر ایک دوسرے کو پکڑ کے اس طرح چھپ چایا کرتے تھے جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو ان کے غضب سے بچانا چاہتے ہوں۔ ہمیں ایسا لگتا تھا جیسے ان دونوں کا جھگڑا ہمیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور وہ ان دونوں میں سے کوئی ایک تو ضرور باوجود اپنا غصہ ہم پر نکالے گا اور ہمیں مار پڑ سکتی ہے۔ تب مجھے یاد ہے تم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا تم بالکل مت ڈرو۔ تمہیں شاید یہ بات نہیں معلوم ہوگی میں تمہیں آج بتاتی ہوں جب تم مجھے سلی دیا کرتے تھے تو مجھے تمہاری بات پر اتنا یقین ہوتا تھا جیسے تم واقعی مجھے دنیا میں کسی سے بھی بچا لو گے اور مجھے کچھ نہیں ہونے دو گے۔“

صنوبر اس کے ہیڈ پر ہنسی ہوئی اپنی بات ایسے کہے چلی جا رہی تھی جیسے وہ کسی اسٹیج پر کسی کردار کے یاد کیے ہوئے مکالمے بول رہی ہو۔ سلمان اس کی طرف دیکھ کر شدید حیرت میں غوطے کھانے لگا۔

”اس وقت تو واقعی ایسا تھا میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ میری بہن تو بے قصور ہے وہ معصوم اور چھوٹی ہے اسے اگر ماما یا پاپا نے کچھ کہا تو میں انہیں ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ ان کے ہاتھ پہ کاٹ لوں گا یا پھر تمہیں لے کر کہیں دور بھاگ جاؤں گا۔ کہاں؟؟ یہ تو میں نے اس وقت بھی نہیں سوچا تھا۔“ سلمان کو بھی جیسے اپنا بچپن اور اس کے مناظر یاد آنے لگے۔

”بچپن واقعی بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ رشتے اور سب چیزیں بہت واضح اور صاف دکھائی دیتی ہیں۔ دوست اور دشمن بھی کون ہیں سب کچھ بالکل سامنے ہوتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس وقت ہمیں اپنے ماں باپ ہمارے دشمن معلوم ہوتے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے جیسے سب سے اچھے دوست تھے۔ پتا ہے ایسا کیوں تھا؟“ صنوبر نے سلمان کی طرف دیکھا جو نہایت دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ایسا لیے تھا کہ بچے بھی جانوروں اور پرندوں کی طرح ہوتے ہیں جو اپنے جیسے اور اپنی طرح کے پرندوں سے نہ ہی ڈرتے ہیں اور نہ ہی انہیں اتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں کہ وہ ان سے خوف زدہ ہو جائیں۔ بچے بھی ایسا ہی سمجھتے اور سوچتے ہیں۔ اسی لیے بچوں میں ہمیشہ دوستی ہوجاتی ہے بچے بڑوں کے مجمع سے نکل کر اپنے جیسے بچوں کو تلاش کرتے ہیں اور ان کے ساتھ پہلے سے شائستگی نہ ہونے کے باوجود بھی ایک ہی پل میں ایک دوسرے کے ساتھ اپنے کھیلنے لگتے ہیں جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔“ وہ جیسے سانس لینے لگی۔ ”بچپن واقعی زندگی کا سب سے خوبصورت عہد ہوتا ہے“

”ٹھیک کہا تم نے۔“ سلمان نے یہ کہا اور پھر جیسے کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔ دونوں خیالوں کی دنیا میں جانے کہاں سے کہاں چلے گئے۔ تاہم سلمان جلد ہی حال اور حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا اور اس نے خرد کی زمین پر قدم رکھتے ہی پوچھا۔

”یہ آج تمہیں اس قسم کی پرانی باتوں کا خیال کیوں آیا ہے صنوبر؟“

”میں سوچ رہی تھی کہ کیا تم میرے وہ ہی بچپن والے بھائی ہو؟“ صنوبر نے آنکھیں پھیلا کر چہرے کو اور بھی وسیع کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں میں وہ ہی ہوں۔۔۔ اس میں تمہیں کوئی شک ہے؟“ سلمان ڈھٹائی سے بولا۔

”نہیں۔۔۔ تم وہ نہیں ہو۔۔۔ اگر تم وہ ہوتے تو مجھے ایک غنڈے، ایک بد معاش سے شادی کرنے کا مشورہ کبھی نہیں دیتے۔“ صنوبر نے جذبات کا سہارا لیا۔

”تم غلط سوچتی ہو۔ یہاں اس دنیا میں سب کسی نہ کسی شکل کے غنڈے ہیں۔ سب اپنے مفاد کے بارے میں سوچتے ہیں۔“

”اور اسی کی پروا کرتے ہیں۔ فارس میں کچھ بری عادتیں ہیں لیکن اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ یہ سب عادتیں شادی کے بعد



چھوڑ دے گا۔ اور تمہیں اس کی ان عادتوں سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ویسے بھی اس کلاس کی عورتوں کو مردوں کی شرافت کی نہیں ان کے بینک بیلنس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو فارس کے خاندان اور خود فارس کے پاس بہت زیادہ ہے۔

”لیکن سلمان میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔ محبت کرتی ہوں اس سے“ صنوبر کی آواز ایک دم ہی اونچی ہو گئی۔

”محبت کا تو تم نام نہ لو۔ اس کلاس میں محبت تو بہت ہی ناپائدار ہوتی ہے۔ یہاں سب کچھ پیسا ہے۔ اور شاید بانی دنیا میں بھی پیسے سے زیادہ مضبوط سہارا اور کوئی نہیں ہوتا۔ رہی تمہاری پسند کی بات تو پسند بھی حیثیت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔“ سلمان اپنے حساب سے کافی سمجھداری کی باتیں کر رہا تھا۔

”لیکن میں شرجیل سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے ایسے کہا جیسے وہ التجا کر رہی ہو۔

”ہاں میں ملا ہوں اس لڑکے سے۔ لڑکا تو اچھا تھا وہ بھی مگر اس کی حیثیت فارس کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے ان فیکٹ اس کا خاندان تو فارس کے خاندان کا کافی محتاج ہے۔ فارس کے والد کے جتنے شیئرز شرجیل کے والد کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں اگر فارس کے والد چاہیں تو اس کمپنی پر جب چاہیں قبضہ کر لیں وہ تو ان کی مہربانی ہے جو انہوں نے شرجیل کے والد کو فری پنڈ دیا ہوا ہے۔ اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کچھ تمہیں فارس سے شادی کر کے مل سکتا ہے وہ شرجیل سے شادی کر کے کبھی نہیں مل سکتا۔“

سلمان کی بے تکلی تقریر نے صنوبر پر کوئی اثر نہیں کیا اور وہ جو بات جاننے آئی تھی اس کے بارے میں پوچھنے کا اس سے اچھا موقع نہیں تھا۔

”اسی لیے تم نے شرجیل کے بارے میں سب کچھ اس کہنے فارس کو بتا دیا ہوگا ہے نا؟“

سلمان اس کی بات سن کر جیسے لمحے بھر کو چپ سا ہو گیا۔ وہ سوچتے لگا کہ اس نے اب تک یہ سب فارس کو کیوں نہیں بتایا کہ شرجیل اس کے گھر اپنی ماں کے ساتھ رشتا لے کر آیا تھا۔ اور یہ شرجیل سرفراز ملک کا بیٹا ہے جو فارس کے والد کے پارٹنر ہیں۔

”میرے سوال کا جواب دو سلمان۔۔۔ کیا تم میرے دشمن بن چکے ہو۔ تمہیں میری خواہشات کا کوئی خیال نہیں ہے۔ کیا ایک بار پھر سے تم میرے لیے میرے وہ ہی بھائی نہیں بن سکتے جو بچپن میں مجھے سب لوگوں سے بچانے اور محفوظ رکھنے کا یقین دلایا کرتا تھا۔“ صنوبر کے دل میں امنڈنے والے جذبات اور احساسات مصنوعی نہیں تھے وہ حقیقت میں اپنے احساسات کی عکاسی کر رہی تھی جو اس وقت اس کے دل اور روح میں موجزن تھے لیکن جس مزاج اور جن خیالات کی مالک صنوبر کی ایسی سب ہی باتیں اس طبقے میں مذاق سے زیادہ کچھ نہیں ہوتیں۔

لحظے بھر کو سلمان کا دل چلا لیکن یہ وقت اتنا مختصر تھا کہ کسی اور کو تو کیا پتا چلتا خود سلمان کو بھی پتا نہیں چلا کہ اس کے اندر کچھ ہوا تھا۔ اس نے صنوبر کو ایک اجنبی مسخرے پن سے دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔

”تم آجکل انڈین فلمیں زیادہ دیکھ رہی ہو۔ اس قسم کی جذباتی باتیں ان فلموں میں چھوٹے اور معمولی لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کی جاتی ہیں۔ ان کا زندگی کی اصل حقیقت سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔“

”میں جانتی تھی تم سے کوئی اچھی توقع رکھنا ہی فضول ہے۔ تم اسی قسم کی باتیں کر کے میرا دل دکھایاؤ گے۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ سلمان اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ ابھی دروازے سے باہر نہیں نکلی تھی کہ وہ بولا۔

”تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے شرجیل کے بارے میں سب کچھ فارس کو بتا دیا ہوگا۔ تو میں خود حیران ہوں کہ یہ اتنی بڑی اور اہم بات میں نے اب تک فارس کو کیوں نہیں بتائی۔“

”کیا۔۔۔ تم نے فارس کو نہیں بتایا شرجیل کے بارے میں“ صنوبر سے اس کی بے چینی اور خوشی چھپی نہیں رہ سکی اور سلمان سمجھ گیا کہ وہ اس سے یہی پوچھنے کے لیے آئی تھی۔

”اگر تمہیں اس بات سے کوئی فائدہ ہوتا ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں فارس کو شرجیل کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

سلمان نے پتا نہیں کس جذبے کے تحت یہ بات کہہ دی اسے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ اسے لگا اس وقت اسے یہ کہہ دینا چاہیے۔ صنوبر اس کی بات سن کر جیسے نہال ہی ہو گئی وہ دار فطرتی سے پلٹی اور آ کے سلمان کے سینے سے چٹ گئی۔ ایک خبیث اور شیطان صفت انسان کو سلمان کو اس وقت صنوبر کا اس کے گلے لگنا اتنا اچھا لگا کہ اسے لگنے لگا جسے اسے پتا نہیں کیا مل گیا ہے۔ کتنے عرصے سے وہ ایسی ہی کسی چھٹی پاپیاری کو جیسے ترنا ہوا تھا۔ لیکن پیار وہ احساس ہے جو کسی سے شراب کے گلاس کی طرح نہ تو خرید جا سکتا ہے اور نہ ہی مانگا جا سکتا ہے۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے۔ اور یہ چیز قدرت نے صنوبر کو دی ہوئی ہے وہ شاید سچ کہتی ہے اسے دولت اور بینک بینکس سے زیادہ محبت کی پروا ہے اور محبت کے لیے وہ کتنی بھی دولت اور حیثیت کو ٹھوکر مار سکتی ہے۔

صنوبر کب کی جا چکی تھی اور وہ مسلسل اس نئے رونما ہونے والے واقعے کے حصار سے اب تک نکل نہیں سکا تھا۔ لیکن کب تک سلمان جیسے انسانوں کو ایسے احساسات اور جذبات ہمیشہ کے لیے اپنا نہیں بناتے۔ دیکھتے ہی جس قسم کی سرگرمیوں میں سلمان پڑا ہوا تھا ان میں اتنی طاقت تو ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی انسان کی روح کی تازگی کو بچھڑ کے پی جائیں۔ بالکل ایسے جیسے جسم کی راحت کا وزن ہمیشہ روح کی راحت اور خمار سے زیادہ ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں برے انسان زیادہ اور اچھے انسان اتنے کم نہ ہوتے۔

فارس سلمان کو وہ کچھ دے سکتا تھا جو شرجیل اسے نہ تو دے سکتا تھا اور نہ ہی سلمان اس کے بارے میں ایسا سوچ سکتا تھا۔ بکنے والے عورتوں میں سے کوئی ایک تو ہر ایک اینڈ پر فارس اور اس کے دوستوں کا دل بہلا رہی ہوئی اور اب تو فارس کے لیے سلمان کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ تھی سو صنوبر کی پیار کی چھٹی کتنی دیر تک اپنا اثر قائم رکھ سکتی تھی!!! حماد نے جتنی مرتبہ بھی صنوبر کے کمرے میں جانے کی کوشش کی اسے وہ کسی سے فون پر بات کرتی ہوئی ملی اور بات چیت روک کر وہ اسے اشارے سے کہتی کہ بعد میں آنا۔ حماد سمجھ چکا تھا کہ کوئی ایسی پریشانی والی بات ہے جو صنوبر اتنی دیر سے فون پر بات کر رہی ہے۔ ورنہ عموماً اتنی زیادہ دیر تک فون پر بات نہیں کرتی تھی۔

”اس کا مطلب ہے سلمان نے اب تک فارس کو کچھ نہیں بتایا؟“ شرجیل نے کہا۔

”ہاں مجھے یقین ہے سلمان سچ بول رہا ہے۔“ صنوبر نے تین سے کہا۔

”تب تو ہمیں جلد سے جلد کوئی فیصلہ کرنا ہو گا صنوبر کیونکہ اس بات کی ضمانت نہ تمہارے پاس ہے اور نہ میرے پاس کہ سلمان اور کتنی دیر تک فارس کو یہ بات نہیں بتائے گا۔“ شرجیل نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”میں اپنے بھائی کو جانتی ہوں شرجیل۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ یہ بات فارس کو بھی نہیں بتائے گا۔ اس لیے تم اس کی طرف سے مطمئن رہو وہ نہیں بتائے گا۔“ صنوبر نے اس کی تسلی کے لیے کہا۔ حالانکہ اندر ہی اندر وہ بھی اس دوسو سے میں جتنا تو کہتی کہ پتا نہیں سلمان کو اپنا وعدہ یاد بھی رہے گا یا نہیں۔

☆☆☆

یہ اندیشہ غلط نہیں ثابت ہوا۔ اگلے ہی دن سٹریڈے ٹاؤن تھی اور فارس نے دوستوں کے لیے دلچسپی اور مروج مستی کا وسیع پروگرام بنایا ہوا تھا۔ باہر سے اچانک آنے والی شراب نے یہ سب ہنگامہ کرنے پر اکسایا جو فارس کا ایک دوست دو دن پہلے ہی کافی مقدار میں لایا تھا۔ بڑے لوگوں کے لیے ایسے ملک کا قانون توڑنا کبھی بھی مشکل نہیں ہوتا جہاں قانون ہوتا ہی صرف چھوٹے اور کمزور لوگوں کے لیے ہے۔ اس لیے یہ سوچنا فضول ہے کہ شراب نے ممنوعہ سرحدیں کیسے عبور کیں۔ یہ اعلیٰ درجے کی شراب سلمان اور اس جیسے شریک سب ہی ٹوکوں کے کمزور ایمانوں کو پلک جھپکتے ہو اسیں اڑالے گئی اور سلمان نے بھی فارس سے وہ سب کچھ کہہ دیا جس کے نہ کہنے کا اس نے وعدہ کیا تھا اپنی بہن صنوبر سے۔

کہتے ہیں شرابی کو ہر قسم کے وعدے اور قسموں کو توڑنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور شراب کے نشے میں بولا گیا کوئی بھی سچ نہ تو سچ ہوتا ہے اور نہ جھوٹ ہوتا ہے۔ لیکن جو یہ بات جانتا ہے وہ چاہے اس پر یقین نہ کرے لیکن مفاو ایک ایسی پہلجڑی ہے جو جل کر خاک بھی ہو جائے تب بھی انسان اس سے اپنے حصے کی روشنی حاصل کر ہی لیتا ہے۔ جن معلومات



کے لیے فارس کتنے ہی دن سے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا وہ اسے اس طرح مل جائیں گی یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی اسے سلمان پر غصہ تھا جس نے کئی دنوں سے اپنے پاس یہ قیمتی معلومات دبا کر اور چھپا کر رکھی ہوئی تھیں اور اسے دانستہ نہیں بتا رہا تھا یہ تو شراب کا کمال تھا جس نے سلمان جیسے کمزور کھلاڑی کے سارے کس بل ڈھیلے کر دیے اور اس کی رگوں سے سارے راز ایک ایک کر کے بہہ کر باہر نکلتے چلے گئے۔

”سالاکینہ۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے یہ مجھے اپنی بہن سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ اور سامنے کہتا ہے کہ میں تو صنوبر کو سمجھا رہا ہوں کہ اسے مجھ سے اچھا کوئی اور رشائیں ملے گا۔“ فارس کو ایک دم ہی غنڈوں والا جلال آ گیا۔ اگر سلمان صنوبر کا بھائی نہ ہوتا تو وہ اسے اس وقت اس حرکت کے جواب میں ایسا سبق سکھاتا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتا۔ لیکن ساری دنیا ایک طرف اور جو رو کا بھائی ایک طرف والی مثال کبھی کبھی واقعی درست ثابت ہوتی ہے ویسے بھی شادی سے پہلے ہونے والی بیوی کا ہر رشتے دار قابل عزت ہوتا ہے اور شادی کے بعد۔۔۔۔۔“ جہانی نے پوچھا۔

”شادی کے بعد تو بیوی قابل عزت نہیں ہوتی تو اس کا کوئی رشتے دار کیسے ہو سکتا ہے۔“ فارس یہ کہہ کر خباثت سے بچنے لگا اور جہانی بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے بلاوجہ ہنسنے لگا۔

”لیکن دیکھنا یہ بات سلمان سے مت کہنا۔۔۔ سمجھے۔“ فارس کو احتیاط کی ضرورت محسوس ہوئی۔

”کیوں فکر کرتے ہو، میں کسی سے نہیں کہوں گا۔“

لڑکیوں کی طرح نرم و نازک اور خوبصورت جہانی کا دل اور ہمت کسی توانا اور تو مند مرد سے بھی زیادہ وسیع اور مرنے مارنے جیسی تھی اسے کبھی یہ پروا نہیں ہوتی تھی کہ اس کے سامنے کون ہے حتیٰ کہ وہ فارس سے بھی جب کئی دفعہ بھڑکتا تھا اور فارس کو ہی اسے بعد میں ایکسکسپوز ہول کے منانا یا راضی کرنا پڑتا تھا۔ یوں کہنا چاہیے کہ جہانی وہ تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جنگوں میں تو انا جسم نہیں بلکہ حوصلے اور جذبات لڑا کرتے ہیں۔ جہانی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہ سکتا تھا کہ وہ اس قدر گھنیا محفلوں کا شریک و شیدائی ہے۔ شکل و صورت اور اپنے رکھ رکھاؤ سے وہ ایک اچھے خاندان کا ایسا نوجوان دکھائی پڑتا تھا جیسے کہ خاندانی شریف لوگ ہوا کرتے ہیں۔ وہ کیسے فارس جیسے بگڑے ہوئے امیر زادوں کی صحبت کا شکار ہوا یہ ایک الگ داستان ہے۔ اور اب تو وہ بھی گھنٹوں گھنٹوں اس ولد دل میں دھنس چکا تھا اس حد تک کہ اس نے ہی سلمان کو بھی اس آتش جہنم میں جھونک دیا تھا۔ محرومیوں کا شکار نوجوانوں کو ایسے کاموں میں کھینچتا جتنا آسان ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ ان نوجوانوں کا شکار کرنا ہوتا ہے جو دولت کی گز میں نہا رہے ہوتے ہیں اور انہیں کوئی اور بھی چاہیے ہوتا ہے ساتھ نبھانے کو۔ عموماً اس قسم کے طبقوں کے لڑکے غریب اور مڈل کلاس لڑکوں کو اپنا دوست نہیں بناتے کیونکہ مڈل کلاس لڑکوں کے پاس شرم، بھجک اتنی ہوتی ہے کہ اتنی ویر میں شیطانیت ایک جہان کو مسخر کر سکتی ہے۔ اصل مین مڈل کلاسیوں کے پاس شرم اور عزت ہی سب کچھ ہوتا ہے اور جس کے پاس جو کچھ متاع حیات کی طرح ہوتا ہے وہ اسے آسانی سے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ دولت والوں کے پاس دولت ہی سب کچھ ہوتی ہے اور وہ اس پر جان دیتے ہیں۔ ان کا دین ایمان سب کچھ روپیا اور پیسا ہوتا ہے یا اقتدار اور اقتدار کے لیے تو تاریخ بھری پڑی ہے۔ لوگ اپنے گئے باپ بھائیوں تک کا گلا کاٹتے آئے ہیں تو دوست اور محفل کے شریک کار کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔ سلمان بھی دراصل فارس کے لیے ایک اقتدار پر چڑھنے والی سیزمی کا طرح ہی تھا۔ شاید یہ بات کم لوگ جانتے ہوں کہ عورت بھی مرد کے لیے ایک قسم کا اقتدار ہی ہوتی ہے جسے پانے کے لیے وہ کسی کا بھی خون کر سکتا ہے اور کسی کے بھی پاؤں میں گر سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو عورت جاہ و ہشم والے اقتدار سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے اور یہ بات اس وقت فارس پر صادق آ رہی تھی۔ وہ صنوبر کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا مشکل یہ تھی کہ صنوبر خود اس کے ہاتھ آنے پر آمادہ نہیں تھی اس لیے اسے ہاتھ ذرا احتیاط سے رکھنا پڑ رہا تھا۔

☆☆☆

سلمان کو ہوش آنے پر بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ اس نے کیا حرکت کر دی ہے۔ صنوبر اسی دھوکے میں رہی کہ اس کا

READING  
Section

بھائی کم سے کم یہ ایک وعدہ تو نبھانی دے گا۔ اسی لیے اس نے شرجیل کو ندا کے گھر ملنے کے لیے بلا لیا۔ جب وہ گھر سے نکلنے لگی تو حماد نے ہمت کر کے اس سے کہا۔

”صنوبر بی بی آپ بہتر سمجھیں تو مجھے بھی ساتھ لیتی جائیں“

صنوبر اس کی اس بات پر کوئی اور موقع ہوتا تو زور زور سے ہنستی کہ یہ اتنا سا لڑکا اس کی کیا مدد کر سکتا ہے مگر اس وقت تو اسے یہ سوچنے کی فرصت بھی نہیں تھی کہ حماد نے اتنی اچانک یہ بات کیوں اور کس لیے کہی۔ اسے کیا معلوم ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر عجلت سے بولی۔

”اچھا تم یوں کرو جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ“ حماد اس وقت گھر میں کام کرنے والے ملازموں کے حلیے میں تھا۔ حماد سرعت سے گیا اور دوسرے ہی لمحے واپس آ گیا صنوبر چونکی تو ضرور کہ اتنی جلدی وہ کیسے گیا اور پہنچ کر کے واپس آ گیا لیکن بولی کچھ نہیں۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ راستے میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے حماد نے اس خاموشی کو توڑنے کی خاطر کہا جو کتنی ہی دیر سے گاڑی میں موجود تھی۔ اس کی بات سن کر ایک صنوبر چونکی اور اس نے بنا پیچھے دیکھے ہوئے کہا۔

”اپنی ایک دوست کے گھر جا رہی ہوں“ حماد جانتا تھا کہ وہ ندا کے پاس جا رہی ہے اور وہاں شرجیل آنے والا ہے۔ اس نے صنوبر کی ساری باتیں سن لی تھیں یہ تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ سلمان تھا اور سلمان میں یہ شکتی موجود تھی کہ وہ موٹی اور ساؤنڈ پروف دیواروں کے پیچھے ہونے والی گفتگو بھی با آسانی سن سکتا تھا۔

”آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔ کیا آپ مجھے اپنی پریشانی نہیں بتائیں گی؟“ صنوبر کو اس کی یہ بات بہت عجیب سی لگی۔

”چپ چاپ مٹھو میں تمہیں پتا نہیں کیوں ساتھ لے آئی۔“

صنوبر کی بات حماد کے لیے توقع کے عین مطابق تھی وہ جانتا تھا کہ وہ حماد نہیں سلمان ہے۔ وہ سلمان جو صنوبر پر عاشق ہے لیکن صنوبر یا کوئی اور یہ بات نہیں جانتے تھے کہ وہ کون ہے۔ اور ایک گھریلو ملازم کو وہ بھی سولہ سترہ سال کے کمسن لڑکے کو کوئی بھی صنوبر جیسی حیثیت کی مالک لڑکی کیوں اپنی پریشانی یا باتیں بتانا چاہے گی۔

”ٹھیک ہے مت بتائے۔۔۔ مگر میں آپ کے کام آ سکتا ہوں۔“ ایک دم ہی صنوبر کے پاؤں بریک پر پڑے اور گاڑی دوڑتک گھسٹ کر رک گئی۔ شکر ہے کہ آگے پیچھے کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی اور ویسے بھی یہ ایک سنسان سڑک تھی جو میں شاہراہ کی زلی سڑک میں شمار ہوتی تھی ندا کا گھر بس آنے ہی والا تھا۔

”تم یہ کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ کیا جانتے ہو تم۔ میری کیا مدد کر سکتے ہو؟“ گاڑی روک کر وہ مڑی اور غصے سے پیچھے مڑ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے حماد پر برسے لگی۔

”میں نے کہا تھا نا بچپن میں میں نے کچھ علم سیکھا تھا اسی علم کی وجہ سے میں یہ جانتا ہوں کہ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں اور اس وقت آپ ایک قسم کی مشکل میں ہیں۔“

حماد نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھ کر نظریں نیچے کرتے ہوئے کہا۔

”کیا۔۔۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو میں سمجھ نہیں پا رہی۔ صاف صاف کہو تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا کہ کیا..... مگر مدد ضرور سکتا ہوں۔ میں یہ بات جانتا تھا اسی لیے میں نے آپ کے ساتھ آنے کی درخواست کی اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ ضرور لے کر جائیں گی، چاہے گھر بھی انکار نہیں کر سکیں گی۔“ حماد کی باتوں نے صنوبر کو الجھن میں ڈال دیا۔

”پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں تو تمہیں ساتھ لاکر چھتاری ہوں“ صنوبر نے دوبارہ سے گاڑی اسٹارٹ کی۔ حماد نے سوچا اس وقت کوئی بھی بات کہنا فضول ہے اس لیے وہ چپ ہو گیا۔

گاڑی ندا کے گھر کے پاس رکی اور صنوبر جلدی سے نیچے اتری حماد بھی اترنے لگا تو وہ بولی۔



”نہیں تم ہمیں بیٹھے رہو سمجھو۔“ وہ اترتے اترتے دک گیا۔ اور اس عالی شان گھر میں جو صنوبر کے گھر کی طرح اس کی کلاس کا آئینہ دار تھا۔ وہ اپنی ہی طرح ایک امیر کبیر لڑکی سے ہی ملنے آئی ہے۔ صنوبر گھر کے گیٹ کے باہر لگی ڈور بیل بجا کر کچھ ہی دیر میں اندر چلی گئی۔ نزدیکی غلام گردش میں ہی اسے ندائے گئی جو اس کی آواز سن کر اسے لینے کے لیے ہی آ رہی تھی۔

”کیا وہ شرجیل آ گیا؟“ صنوبر نے بے صبری سے پوچھا۔

”نہیں وہ تو ابھی نہیں آیا۔“ ندانے جواب دیا تو صنوبر نے جلدی سے گھڑی دیکھی۔

”کیا وقت ہوا ہے۔“ گھڑی دیکھنے کے بعد وہ آپ ہی آپ بولی۔

”ارے ابھی تو آدھا گھنٹا باقی ہے میں ہی کچھ جلدی آگئی۔“ یہ کہہ کر دونوں سہیلیاں ندا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔۔۔ آج ندا کے والدین اس کے بھائی کے ساتھ اس کی پسند کی لڑکی دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ اس کا بھائی عاظم بھی ساتھ گیا تھا۔ اس لیے گھر میں کوئی نہیں تھا۔

”مجھے پتا ہے تمہیں بھی اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ جانا تھا اور تم میری وجہ سے نہیں گئیں۔ میں تمہارا کس زبان سے شکر یہ ادا کروں ندا“ صنوبر نے اس کی گرم نوازی کے احساس میں ڈوب کر کہا۔

”ارے کیوں اس قدر فارل ہو رہی ہو وہ میری دوست ہے میں اس سے اکثر ملتی رہی ہوں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ تم تو خواجواہ اتنی فارل ہو رہی ہو۔ میں نے شرمین کو فون کر دیا تھا وہ برا نہیں مانے گی۔ ہم دونوں میں کافی انڈر سٹینڈنگ ہے۔ اچھا تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔“ ملازموں کو میں نے خود ہی چھٹی دے دی تھی۔“

صنوبر اس کی مزید ممنون احسان ہو گئی۔ جس کا اظہار اس نے اپنی آنکھوں اور چہرے سے کیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ چائے والے تکلف سے ندا کو روک دیتی لیکن اس وقت اسے شرجیل کا انتظار کرنا تھا اور وہ جانتی تھی انتظار کرنا کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے۔ وقت گزرتا گیا اور انتظار طویل ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ رات کے دن بج گئے اور ندا کے گھر والوں کے آنے کا وقت ہو گیا۔ صنوبر نے کئی بار فون لگانے کی کوشش بھی کی لیکن شرجیل کا فون مسلسل بند آتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر شرجیل وعدہ کر کے بھی آیا کیوں نہیں اور اب وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہا۔ اسے تو آج اس سے کورٹ میرج کے بارے میں بات کرنا تھی۔ اور یہ آئیڈیا تو خود شرجیل کا ہی تھا پھر وہ اس بات سے کیسے پیچھے ہٹ سکتا ہے۔

پریشانی دھیرے دھیرے غصے میں بدل گئی اور وہ ندا کے سامنے بار بار شرمندگی سے یہ کہتی رہی کہ شرجیل نے ایسا کیوں کیا؟ وہ ایسا کرتا تو نہیں سے ایسا کیا کام آن پڑا کہ اس نے اپنا فون بھی بند کیا ہوا ہے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے جب وہ پوری طرح تھک کر باپوں ہو گئی تو اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا اس کے علاوہ اور جارہ بھی کیا تھا۔ اسے اپنی ماں کی یہ بات یاد آنے لگی کہ یہ لڑکا پہلے بھی بزدلی کا مظاہرہ کر چکا ہے اور اب بھی پتا نہیں کب تمہیں راستے میں چھوڑ کے چلتا ہے۔“

اسی قسم کے خیالات کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے چلنے لگی اسے تو یہ تک یاد نہیں تھا کہ اس کی گاڑی میں اس کا ملازم حماد بیٹھا ہوا ہے جسے وہ انتظار کرنے کا کہہ کر گئی تھی اور اب اس بات کو مین گھنٹے سے بھی زیادہ ہو چکے تھے۔

”وہ نہیں آئے؟“ حماد کی آواز پر وہ بری طرح چونکی اور ایک بار پھر اس کی گاڑی ایک تناور درخت سے ٹکراتے ٹکراتے بنی۔

”تم۔۔۔ اوہ میں تو تمہیں چھوڑ کر بھول ہی گئی تھی۔“ پھر وہ سنبھلی اور بولی۔

”تم کس کے بارے میں بات کر رہے تھے؟“

”وہ بی جن سے آپ ملنے آئی تھیں۔“ حیرت کا ایک اور جھٹکا صنوبر کو محسوس ہوا۔

”میں کس سے ملنے آئی تھی۔ حماد تم کیا جانتے ہو؟ میں تو اپنی دوست کے گھر اسی سے ملنے آئی تھیں۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ آپ اپنی دوست کے گھر آئی تھیں مگر آپ اپنی دوست سے نہیں کسی اور سے ملنے آئی تھیں۔ اور جس

سے آپ ملنے آئی تھیں وہ آئے نہیں۔“

”یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟“ صنوبر کو حیرت اور غصہ ساتھ ساتھ آنے لگا۔

”ان باتوں میں دقت ضائع کرنے کے بجائے آپ جلدی سے یہاں سے چلیں۔ صنوبر بی بی۔“

”کیوں کیا ہوا ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟“ صنوبر کو اس کی باتوں کی پراسراریت سے الجھن ہونے لگی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں جن سے آپ ملنے آئی تھیں اس دقت ان کو آپ کی ضرورت ہے!“ حماد نے کہا تو صنوبر کے

اوسان خطا ہو گئے۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو حماد پلیز مجھے صاف صاف بتاؤ۔“ وہ جیسے بے بسی سے بولی۔

”آپ نی الحال گاڑی چلائیں نہیں تو بہت دیر ہو جائے گی۔ پلیز“

اور اس بار صنوبر نے اس کی بات مانتے ہوئے گاڑی چلانا شروع کر دی۔ پھر حماد کے کہنے پر ہی وہ گاڑی کی اسپید ہی

بڑھاتی نہیں رہی بلکہ جن راستوں سے وہ کہتا رہا وہ ان ہی راستوں کی طرف چلتی رہی کوئی ایک گھنٹے سے بھی زیادہ کی

ڈرائیو کے بعد حماد نے گاڑی کو ایک سنسان ٹوٹی پھوٹی سڑک پر روکنے کو کہا تو صنوبر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دور

دور تک کوئی آبادی تھی نہ کوئی انسان بق ووق ویرانہ اور کہیں گھسی جھاڑیاں ایسا وہ تھیں۔

حماد ایک راستے کی طرف چلنے لگا۔ صنوبر کو ڈر محسوس ہوا اور اسے لگا یہ لڑکا اسے بہکا کر جانے کہاں لے آیا ہے اور اب

شاید یہ کسی کو تلاش کر رہا ہے پتا نہیں اس کے دل میں کیا ہے۔ میں کیوں اس کی باتوں میں آگئی۔ پتا نہیں ان کا کیا ارادہ

ہے۔

بڑے گھروں کے نوکروں کی ملی بھگت سے ہونے والے کتنے ہی واقعات اسے یاد آنے لگے جن میں نوکروں نے

گھر لوٹے یا انجو ابرائے تاوان کے لیے اپنی ایمانداری کا سودا کیا تھا۔ تو کیا وہ ایسے کسی جال میں پھنسنے والی ہے۔ یہ سوچ

کر مارے خوف کے اس کی گھٹی سی بندھ گئی دور دور تک پھیلا اندھیرا اس وقت اس کے خوف اور ڈر میں مسلسل اضافہ کر رہا

تھا۔ اور جیسے ہی صنوبر نے خود اس طرف کو دیکھنا چاہا جہاں حماد گیا تھا تو اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ ڈر سے اس کی ٹانگیں

کانپنے لگیں یا خدا یہ میں کہاں آگئی ہوں۔ اور حماد..... وہ خود کہاں چلا گیا۔ کہیں وہ کسی کو لینے تو نہیں گیا۔ اس کا کوئی ساتھی

جس کے ساتھ مل کر وہ اس قسم کی وارداتیں کرتا رہا ہو۔ اس قسم کی باتوں کے درمیان ہی اسے اچانک خیال آیا کہ اس

دقت وہ گاڑی کے پاس اکیلی ہے اور چاہے تو یہاں سے بھاگ بھی سکتی ہے۔

حماد کو یوں اس طرح اس دیرانے میں اکیلا چھوڑ کر پہلے تو اس کا دل نہیں مانا مگر جب اس کا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ وہ

ضرور کسی جرائم پیشہ گروہ سے ملا ہوا ہے تو اسے یہاں سے نی الفور بھاگ جانے میں ہی عافیت نظر آئی۔ وہ جلدی سے

گاڑی میں بیٹھی اور جیسے ہی اس نے گاڑی چلانا چاہی تو گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس میں اسے کوئی اپنی گاڑی کے سامنے کھڑا

دکھائی دیا۔ صنوبر نے ڈرتے ڈرتے توجہ سے دیکھا تو اس آدمی نما ہیولے کے کاندھے پر کوئی سامان لدا ہوا تھا۔ وہ اس کی

گاڑی کے عین سامنے آ کے کھڑا ہو چکا تھا اور اس کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ وہ گاڑی اس پر سے گزارتی ہوئی چلی

جائے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اس نے زور زور سے ہارن بجانا شروع کر دیے تاکہ گاڑی کے سامنے

آنے والا سامنے سے ہٹ جائے۔ لیکن وہ تو چلتا ہوا خراشاں خراشاں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یا اللہ مدد! جتنی بھی دعائیں وہ مانگ سکتی تھی اس نے مانگنا شروع کر دیں لیکن کچھ بھی کام نہیں آیا اور وہ ہیولا اس کے

عین نزدیک پہنچ گیا۔ ڈر خوف کے مارے صنوبر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تب ہی گاڑی کا گیٹ کھول کر کسی نے کچھ اندر

رکھا اور بجلت سے بولا۔

”جلدی سے چلیے صنوبر بی بی انھیں ہوسپتال پہنچانا ہوگا“

حماد کی آواز کو صنوبر پہچان گئی اور اس نے خوف کی عنفرتوں کے چنگل سے نکل کر جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”تم کس کی بات کر رہے ہو کون ہے یہ؟“

READING  
Section

236 سچی کہانیاں



یہ کہتے کے ساتھ ہی صنوبر نے گاڑی کے اندر کی لائٹ جلدی جلائی اور اور پھر مڑ کر پیچھے دیکھا تو اس کی چیخیں نکل گئیں جو اس ویرانے میں دور دور تک سنی گئیں۔

”یہ۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔“  
 ”اس وقت کوئی بھی سوال جواب چھوڑیں انہیں جلدی سے ہوسپٹل پہنچائیں نہیں تو بہت دیر ہو جائے گی صنوبر بی بی۔۔۔۔۔ پلیز ہوش کریں اور گاڑی چلائیں۔“  
 حماد کی بات نے اس کے ہوش و حواس کسی حد تک بحال کر دیے اور وہ گاڑی کو ہوا کی اسپید سے اونچے نیچے راستوں پر بھگائے چلی گئی۔

☆☆☆

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے اسے جان سے مارنے کو نہیں کہا تھا“ فارس نے غصہ اپنے اندر دو باتے ہوئے کہا۔  
 ”بھالی صاحب ایسا ہو جاتا ہے۔ اب ہم کوئی تاپ تول کے تو کسی کو نہیں مارتے۔ وہ بندہ تھا ہی اتنا نازک دو ہاتھ پڑے چکرا کے گرا اور اور پھر۔۔۔۔۔“

”تب تو وہ زندہ ہوگا۔ مر نہیں ہوگا۔“ فارس کے ذہن میں امید نے سر اٹھایا۔  
 ”ہو سکتا ہے زندہ ہو۔ مگر جہاں ہم نے اسے پھینکا تھا وہاں دور دور تک کسی انسانی آبادی یا انسان کے گزرنے کی امید نہیں ہے۔ اس لیے وہ وہاں پڑے پڑے مر بھی سکتا ہے۔“  
 اوباش قسم کے اس نوجوان نے جس کا نام صابو تھا، لا پرواہی سے کہا۔  
 ”اب آپ ہمارے پورے پیسے دو ہم نے تمہارا کام کروا لیا ہے۔“ صابو نے ایک تلی کوداؤں میں ادھر ادھر گھما کر بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

جہانی کو جو اس وقت بھی فارس کے ساتھ تھا یہ سب سن کر ایک حجز جھری سی آئی اور لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ فارس نے جیب سے چیک نکال کر خراب موڈ سے صابو کے حوالے کرنا چاہا تو وہ بولا۔  
 ”لگتا ہے تم نے پہلی بار کسی کئی سپاری دی ہے۔ ان کاموں میں یہ کاغذ کا ٹکڑا نہیں چلتا جناب۔۔۔۔۔ کیش پیسے دینے ہوتے ہیں۔ کیش۔۔۔۔۔“

”کیش۔۔۔۔۔ وہ تو اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔ اچھا تم کچھ دیر انتظار کر دو میں بینک سے خود جا کر کیش لاتا ہوں۔“ فارس کے ذہن میں اب بھی پریشانی کا سینہ کچھ کے نگارہا تھا اسے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ کہیں شرجیل مر نہ گیا ہو اگر ایسا ہوا تو کہیں کوئی مشکل نہ کھڑی ہو جائے۔ اس نے تو صرف اسے کچھ سبق سکھانے کے لیے صابو بد معاش کو سپاری دی تھی اسے کیا معلوم تھا کہ وہ اسے جان سے ہی مار دے گا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا جو ہونا تھا وہ تو ہوس چکا تھا۔  
 ”اچھا میں ابھی آتا ہوں“ فارس نے کہا۔ ”آؤ جہانی“ لیکن جیسے ہی فارس کے ساتھ جہانی چلنے کے لیے مڑا تو اسے لگا جیسے کسی نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ یہ صابو کا ساتھی تھا۔  
 ”یہ نہیں جاسکتا۔“ صابو نے کہا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں جاسکتا؟“ فارس کو ایک دم ہی غصہ آنے لگا۔  
 ”تمہارا کام پورا ہو گیا مگر ہماری ہیمنٹ ابھی باقی ہے۔ پیسے پورے کر دو پھر اسے لے جانا۔“ صابو کی یہ بات سن کر جہانی کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔

”یہ کیا کہہ رہا ہے فارس میں یہاں نہیں رکوں گا۔ ویسے بھی اس سب سے میرا کیا لینا دینا“ جہانی کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ صابو کے بندے نے اب تک اس کا ہاتھ اسی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اور جہانی جیسے امیر نرم و نازک لڑکے کے سفید سفید ہاتھوں میں خون جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔

فارس کو لگا کہ یہ لوگ کافی خطرناک ہیں اور اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ جہانی یہاں رکے یا وہ خود یہاں رکے

READING  
Section

سچی کہانیاں 237

اور جہانی پیسے لے کر آئے۔

”اگر تم نہیں رکنا چاہتے تو کوئی بات نہیں جہانی۔ میں رک جاتا ہوں۔ تم بینک سے جا کر پیسے لے آؤ“ فارس نے دوستانہ انداز میں کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ یہاں اسی کو رکنا ہوگا۔“ صابو کا ایک ساتھی جو بڑی دیر سے مسلسل جہانی کو دیکھ رہا تھا۔ بولا تو معلوم ہوا کہ وہ صرف دکھنے میں ہی خوفناک نہیں تھا اس کی آواز بھی ایسی تھی جیسے کوئی بھیڑیا بول رہا ہو۔ یہ سنتے ہی جہانی کے جسم کا سارا خون خوش ہونے لگا، حلق میں جیسے کانٹے سے پڑ گئے۔ صابو اس ساری صورت حال سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپنے ساتھی سے مسخرے پن سے بولا۔

”کیوں بے وحشی تھے اس لونڈے میں کیا دلچسپی ہے یہ دیکھ کے یا وہ دوسرا والا اس سے فرق کیا پڑتا ہے“

”فرق نہیں پڑتا تو استاد پھر اسی کو روک لوں گا۔“ بھی بھی تو ہماری بات بھی مان لیا کرو“ وحشی نے کچھ عجیب سے انداز سے کہا تو جہانی کو اپنی روح قبض ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ فارس میں یہاں نہیں رکوں گا۔ تم مجھے یہاں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔“ بڑی مشکل سے جہانی نے اپنی بات مکمل کی۔

”ڈرتا کیوں ہے ہم کوئی تھے کھا تو نہیں جائیں گے۔ بس کچھ ہی دیر کی تو بات ہے“ صابو نے اس کا ہاتھ اپنے ساتھی کے ہاتھ سے چھڑا کر خود جہانی کا ہاتھ آرام سے پکڑ کر اپنے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بٹھایا۔ جہانی سیکائسی انداز میں بیٹھ گیا مگر وہ مسلسل اس آدمی کو دیکھ رہا تھا جس کو صابو نے وحشی کہہ کر پکارا تھا۔ فارس کی آنکھوں میں جہانی نے بے بسی دیکھ لی تھی اور وہ جہانی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد فارس واپس لوٹا تو اسے وہاں جہانی پہلے کے مقابلے میں کافی مطمئن دکھائی دیا۔ فارس نے پیسے دیے اور جہانی کے ساتھ وہاں سے باہر نکل آیا۔

جہانی نے گاڑی میں بیٹھ کر ایک طویل پرسکون سانس لی اور فارس کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے تمہارے ان چکروں میں پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میری عقل کو پتا نہیں کیا ہو گیا تھا جو میں تمہارے ساتھ یہاں ان غنڈوں کے ٹھکانے پر چلا آیا۔“

”اتنا ناراض کیوں ہو رہے ہو یار مجھے کیا پتا تھا کہ وہ چیک ریسیون نہیں کرے گا۔“ فارس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔“ جو کچھ ہو وہ سب اتفاق تھا میں نے کچھ بھی جان بوجھ کے نہیں کیا۔ تمہیں کچھ کہا ان لوگوں نے؟“ فارس نے جہانی کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں جہانی چپ رہا۔

”بتاؤ نا کیا کہا ان لوگوں نے ضرور تم سے کچھ پوچھ رہے ہوں گے“ فارس نے پھر اصرار کیا۔ اور جہانی کو یاد آیا کہ اس ایک گھنٹے میں ان لوگوں نے اس کی ہر طرح سے خاطر مدارات کیں۔ بس وہ وحشی اسے مسلسل گھورتا رہا۔ لیکن اس کی خون آلود آنکھوں میں اس کے لیے نفرت نہیں کوئی اور ہی جذبہ تھا۔ جسے جہانی سمجھ نہیں سکا۔ البتہ اس کے باقی ساتھی اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ اور کہتے رہے کہ وحشی نے بھی زندگی میں اتنا حسین لڑکا نہیں دیکھا اس لیے لگتا ہی باندھ کر بس دیکھے ہی جا رہا ہے۔ تاہم اس نے پھر جہانی کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ کوئی اور بات کہی۔

”نہیں کچھ نہیں پوچھا۔ بس اتنا کہ میں تمہارا کون ہوں؟“ جہانی نے خیالات کے بھنور سے نکل کر جواب دیا۔

”تو تم نے کیا کہا؟“

”میں نے کیا کہا تھا وہی کہا جو ہم ہیں یعنی دوست“

جہانی کا لہجہ اب بھی اکھڑا ہوا تھا اسے اس بات پر غصہ تھا کہ فارس اسے ان کے پاس گروی رکھ کر کیوں چلا گیا تھا۔ اسے نہیں جانا چاہیے تھا۔

”تم شاید میرے تمہیں یہاں چھوڑ کے جانے پر ناراض ہو؟“ فارس نے پوچھا۔

”ہاں اور اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہارے ان لئے سیدھے کاموں میں کبھی ساتھ نہیں دوں گا۔“



”ایسے تو مت بولو یار۔۔۔ تمہیں پتا تو ہے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ ٹوبول کیا کرتا میں۔ میں نے تو آخر کی تھی کہ میں رک جاتا ہوں اور تم میسے لے کر آ جاؤ مگر وہ نہیں مانے تو اس میں میرا کیا قصور ہے تم خود ہی بتاؤ“ فارس کے رویے میں جہانی کو منانے اور مطمئن کرنے کی جو کوشش تھی وہ اس کے لہجے سے مترشح تھی۔

جہانی نے غور کیا تو اسے فارس کی بات غلط نہیں معلوم ہوئی۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ مجھے فارس کے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے فارس مسلسل اس کے جواب اور رد عمل کا منتظر رہا۔ وہ جہانی کا موڈ اچھا کرنا چاہتا تھا اس کے منہ سے سنا چاہتا تھا کہ اب سب ٹھیک ہے اور جہانی اس سے ناراض نہیں ہے۔

”بس کر دے نایار! اب ہم ہر کام میں تو ساتھ ہوتے ہیں ایک ذرا مختلف کام میں بھی ساتھ ہوئے تو کیا ہو گیا؟“ فارس نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”گاڑی سامنے دیکھ کر چلاؤ۔ میں ٹھیک ہوں اب۔“ جہانی نے بمشکل اپنے لہجے کو نرم اور روئین کا بنانے کی کوشش کی۔

”تو اب تم مجھ سے ناراض نہیں ہو؟“ فارس کو جیسے اب بھی اطمینان نہیں ہوا تھا۔

”کہا ناہاں اب ٹھیک ہے جہانی نے بڑی مشکل سے مسکرائے کی کوشش کی۔

”ویسے میں بہت ڈر گیا تھا۔ پوری زندگی میں پہلی بار مجھے اتنا ڈر محسوس ہوا۔ سارا وقت بس یہی سوچتا رہا کہ پتا نہیں وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہیں شکر ہے یار کہ سب خیریت رہی۔“ فارس کا اطمینان اب واپس آئے لگا۔

”اچھا یہ بتاؤ انھوں نے تم سے شرجیل کے بارے میں تو کچھ نہیں پوچھا؟“

”نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ مجھے ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں بلا وجہ کی کھوج میں نہیں پڑتے۔“ جہانی کا اعتماد بھی واپس آچکا تھا۔

”لیکن اب ذرا یہ سوچو اگر شرجیل سر گیا تو کیا ہو گا؟“

کتنی ہی دیر سے یہ بات کہیں اندر گم ہو گئی تھی اور جہانی کی ناراضگی میں وہ اس بات کو جیسے بھول گیا تھا اب جو جہانی

## اقبال بانو کے جادوگر قلم سے نکلا وہ

شاہکار جولازوال ٹھہرا۔

دو شیزہ ڈائجسٹ میں مسلسل 20 ماہ شائع

ہونے والا یہ اشمول ناول اقبال بانو کی پہچان بنا۔

”شیشہ گر“ وہ ناول، جس کا ہر ماہ انتظار

کیا جاتا تھا۔ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

کتاب ملنے کا پتا:

القریش پبلی کیشنز، سرکلر روڈ اردو بازار لاہور۔



READING  
Section

نے اسے یاد دلایا تو اس کے چہرے پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ کیا جواب دے۔ اس کی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔  
 ”تم تو جانتے ہو میں نے ایسا نہیں کہا تھا اور نہ ہی میں اسے جان سے مارنا چاہتا تھا مگر ان لوگوں نے پتا نہیں کیا سمجھا۔“  
 ”دعا کرو کہ وہ زندہ ہو۔“  
 جہانی نے ایسے کہا کہ اگر وہ زندہ نہیں ہو تو سمجھو تمہاری خیر نہیں ہے۔ فارس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

☆☆☆

ہوسپٹل کس طرح پہنچے یہ صنوبر کو سمجھ نہیں آیا۔ اسے لگا جیسے کوئی ان دیکھی طاقت تھی جو اسے ہوسپٹل تک لے کر آگئی تھی۔ ورنہ اس کے تو اوسان خطا ہو چکے تھے۔ حماد نے شرجیل کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا اور ایمر جنسی میں پہنچایا تو پہلی بار اسے خیال آیا کہ حماد نے ٹھیک ہی کیا جو اس کے ساتھ چلا آیا۔ ورنہ یہ سب کون کرتا؟ وہ تو کبھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لمحے اسے اس لڑکے کی پوشیدہ قوتوں کا بھی احساس ہوا۔ حماد کو کیسے پتا تھا کہ شرجیل کو کسی نے وہاں زخمی کر کے پھینک دیا ہے۔ وہ کس طرح سیدھا اسی مقام پر پہنچا اور شرجیل کی جان بچانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ وہ سوچتی رہی اور ادھر ادھر ہنسلتی رہی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ڈاکٹر شرجیل کو تو آپریشن تھیٹر میں لے گئے ہیں یہ حماد کہاں چلا گیا۔ کہیں کوئی دوا وغیرہ لینے نہ گیا ہو۔ پریشانی میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس کے پاس تو پیسے بھی نہیں ہوتے۔ وہ اسے پیسے ہی دے دیتی۔ نا ہی اسے یہ خیال آیا کہ شرجیل کے گھر والوں کو اس کے بارے میں اطلاع کر دیتی۔ اس نے ادھر حماد کو دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ شرجیل کے اور اپنے گھر والوں کو خبر کرنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے کسی ڈاکٹر یا نرس کے آپریشن تھیٹر سے باہر آنے کا انتظار کر رہی تھی تاکہ جو کوئی بھی اس سے شرجیل کی حالت کے بارے میں پوچھے تو وہ اسے نسلی بخش جواب دے سکے۔ کچھ دیر پریشانی سے وہ ادھر ادھر ہنسلتی رہی۔ دل ہی دل میں شرجیل کی زندگی کی دعائیں بھی مانگ رہی تھی۔ ”آپ شرجیل کے ساتھ یہ سب کس نے کیا؟ اگر یہ ایکسڈنٹ تھا تو شرجیل کی گاڑی کہاں چلی گئی۔ وہاں تو کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ جس کسی نے بھی شرجیل کے ساتھ یہ ظلم کیا تھا وہ یقیناً شرجیل کی گاڑی بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر کوئی شرجیل کے ساتھ اتنا سب کیوں کرے گا۔ وہ سوچتی رہی۔“

”فارس رحمن“ پیسا خیال اسے فارس کا ہی آیا۔ ہونہ ہو یہ اسی کام ہے ورنہ شرجیل اس ویرانے میں کیوں جانے لگا۔ ندا کے گھر کے راستے میں تو وہ سڑک آتی ہی نہیں تھی۔ کتنے ہی سوال تھے جو اس وقت جب وہ آپریشن ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی تو خود بخود اس کے دماغ میں گھمے چلے آ رہے تھے اور وہ خود ہی ان سوالوں کے جواب بھی سوچ رہی تھی۔  
 ”کیا فارس اس حد تک بھی گرسکتا ہے؟ اس نے شرجیل کو جان سے مارنے کی کوشش کی!“ اس کا دماغ سلگ اٹھا۔ اس کا تو مطلب تو یہ ہوا کہ فارس نے شرجیل کی نقل و حرکت پر نظر رکھی ہوئی تھی اور جب شرجیل گھر سے نکلا تو اس نے شرجیل کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔

انھی سوچوں کے گرداب میں ڈوبتی ابھرتی وہ اکیلی ہوسپٹل کے کوریڈور میں لگی ہوئی بیچ پر کبھی بیٹھ جاتی اور کبھی رونے لگتی۔ ہاتھوں کو مسل مسل کے دعائیں مانگتے لگتی۔ پھر اس نے شرجیل کے گھر والوں کو فون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس سے پہلے اس کے دل میں اس سوال نے سراٹھایا کہ وہ کہے کیا۔ جو بھی ہوا سے بتانا تو ہوگا۔ اس نے ہمت کر کے شرجیل کی ای کو فون ملا یا اور انھیں شرجیل کے ایکسڈنٹ کا بتایا ساتھ ہی اس ہوسپٹل کا نام و پتا بھی بتایا جہاں وہ تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی ماں کو فون کیا اور انھیں جلدی سے ہوسپٹل آنے کو کہا۔ در شہوار کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آپریشن جاری تھا اور اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ شرجیل کی حالت کیسی ہے۔ کچھ دیر بعد ایک نرس آئی اور اس نے جلدی سے اس کے ہاتھ میں دوا کا ایک پرچا تھماتے ہوئے کہا کہ یہ لادیں۔“

صنوبر نے اسی تیزی سے پرچا پکڑا اور بولی۔ ”وہ پیشنٹ کیسا ہے اب؟“

”اس بارے میں ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا ان کی حالت کافی نازک ہے آپ جلدی سے یہ دوا لے کر آئیں پلیز۔“ نرس

کی بات سن کر صنوبر کے پیروں میں پہلے سے طاری لرزش میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ اندر سے ٹوٹنے لگی۔ اسے اپنی دنیا



تاریک ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مشکل سے اس نے اپنی قوت کو مجتمع کیا اور دوا لینے فارمیسی تک پہنچی۔ دوا کا پرچامیڈیکل اسٹور والے کے ہاتھ میں تھا کہ اس نے سہا کے لیے ایک ستون کو تھام لیا اور نہ اسے ڈر تھا کہ وہ گر سکتی ہے۔ پتا نہیں تھا اس وقت کہاں ہے اس نے اتنی مدد کی تھی تو اب وہ اسے یوں تنہا چھوڑ کے کہاں جاسکتا ہے۔ دوا لے کر وہ واپس آئی اور نرس کے حوالے کر کے دیہن بیچ پر جیسے ڈھے ہی گئی۔ اسی وقت اس نے دیکھا کہ شرجیل کے پیرنٹس کوریڈر میں داخل ہوئے۔

”کہاں ہے میرا بیٹا؟ کیسا ہے وہ؟“ ایک ہی سانس میں شرجیل کی ماں نے دو سوال کیے۔

”جی آپریشن چل رہا ہے“ صنوبر نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

”اچھا میں دیکھتا ہوں“ یہ کہہ کر شرجیل کے والد آگے بڑھ گئے۔ اور شرجیل کی ماں وہیں بیٹھ کر لرزتے ہاتھوں سے دعا

مانگنے لگیں۔

”کسے ہوا یہ سب؟“ انھوں نے صنوبر سے پوچھا۔

”پتا نہیں آتی“ صنوبر نے مختصر جواب دیا۔

”کیا مطلب پتا نہیں بیٹا۔۔۔ کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں تھا؟“ وہ حیرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات میں بول

رہی تھیں۔

”نہیں وہ میرے ساتھ نہیں تھا“ صنوبر کوئی تفصیلی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس کی حالت دھیرے دھیرے خراب ہوتی جا رہی تھی۔ شرجیل کی ماں کو اندازہ ہو گیا کہ صنوبر زیادہ بات کرنے کی حالت میں نہیں ہے۔ مگر یہ چیخیدگی ان کے دماغ میں کھلانے لگی کہ اگر شرجیل صنوبر کے ساتھ نہیں تھا تو وہ یہاں کیسے پہنچی۔ اسے اس ایکسیڈنٹ کے بارے میں کیسے پتا چلا۔ سوچوں کی الجھاؤوں میں انھوں نے صنوبر کو پانی لا کر دیا۔ اور صنوبر کو لگا کہ پتا نہیں وہ کب سے پیاسی تھی اسے پانی پینے کا ہوش بھی نہیں تھا۔ جلدی جلدی ایک روگھونٹ لے کر اس نے شرجیل کی ماں کو احسان مندی سے دیکھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا بیٹے کہ تمہیں شرجیل کے ایکسیڈنٹ کا کیسے پتا چلا۔ تم تو کہہ رہی ہو تم اس کے ساتھ نہیں تھیں۔ کیا اس نے تمہیں فون کیا تھا؟“ صنوبر کو محسوس ہوا کہ ان سوالوں کے جواب اگر وہ دے بھی دے تو اس کی باتوں پر یقین کون کرے گا۔ یہ تو حاد کی ان دیکھی صلاحیتوں کا چنکار ہے لیکن یہ حاد کا بچہ پتا نہیں کہاں غائب ہو چکا ہے۔ صنوبر خالی خالی آنکھوں سے شرجیل کی ماں کی طرف دیکھتی رہی کیوں کہ اس کے پاس ان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے رہ رہ کر حاد پر ٹپس آ رہا تھا جو اس وقت اسے یوں اکیلا چھوڑ کر غائب ہو چکا تھا وہ تو کسی کو یہ یقین بھی نہیں دلا سکے گی کہ وہ شرجیل کو سڑک سے اٹھا کر اکیلی یہاں ہوسپتال تک لاتی ہے۔ اسی وقت در شہوار سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی اور صنوبر جیسے بے پناہ تکلیف سے اور ایک ایسی کیفیت میں جب مصیبت کی کسی گھڑی میں کوئی اپنا اچانک آ جائے تو اس کے ملنے سے جو کیفیت ہوتی ہے ایسے ہی دلہانہ جذبے سے وہ اپنی ماں کے سینے سے لگی اور کچھ ہی لمحوں کے بعد ز میں بوس ہونے لگی تو در شہوار کی چیخ نکل گئی۔ شرجیل کی ماں نے جلدی سے سہارا دیا اور دونوں نے مل کر اسے ہسپتال کے فریل پر گرنے سے بچاتے ہوئے بیچ پر لٹا دیا۔ صنوبر کمزوری اور سرد پڑتے احساسات کی شدت سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

”آپ ذرا اس کا خیال کریں میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں“ در شہوار اندر کی طرف بھاگی اور کچھ ہی دیر بعد صنوبر کو ہسپتال کے ایک کمرے میں بیڈ پر لٹا کر ڈرپ چڑھائی جانے لگی۔

شرجیل کی ای کمرے میں داخل ہوئیں تو در شہوار اپنی بیٹی کے ماتھے پر پیار کر رہی تھیں۔

”مسز کریم اب آپ کی بیٹی کیسی ہے؟“ انھوں نے پوچھا۔ شرجیل کی ماں کا نام رخسانہ سرفراز تھا۔

”جی اب کافی بہتر ہے“ در شہوار نے انھیں بیٹھنے کا کہا۔

”آپ کا بیٹا کیسا ہے آپریشن ختم ہو گیا؟“ در شہوار کو اپنی بیٹی کے یوں اچانک بے ہوش ہو جانے کی وجہ سے رخسانہ

ملک سے یہ پوچھنا یہ یاد ہی نہیں رہا تھا۔

”پتا نہیں۔۔۔ ابھی تو ڈاکٹر کچھ نہیں بتا رہے۔۔۔ شاید ابھی آپریشن ختم نہیں ہوا۔ میں وہیں جا رہی ہوں۔ آپ کی

READING  
Section

سچی کہانیاں 241

بیٹی کی خیریت پوچھنے آگئی تھی۔ چلتی ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ چلی گئی اخلا تاور شہوار نے ان سے کہا کہ جیسے ہی کچھ بتا چلے انہیں بھی ضرور بتادیں۔۔۔۔۔

”کیا کہا ڈاکٹرز نے؟“ جیسے ہی سرفراز ملک دکھائی دیے تو شرجیل کی ماں نے ان سے پوچھا۔  
 ”آپریشن تو ختم ہو گیا ہے لیکن ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ ابھی کچھ بھی کہنا مشکل ہے اگر شرجیل کو۔۔۔۔۔ چوبیس گھنٹوں میں ہوش آ گیا تو کچھ یقین سے کہا جاسکتا ہے۔ بس دعا کر دوہ جلدی سے ہوش میں آجائے۔“ سرفراز ملک نے بیوی کو جو کچھ انہیں معلوم تھا اس میں سے یہ ایک بات نہیں بتائی کہ ڈاکٹرز نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے ان کی حالت کافی سیرئیس ہے اس لیے چانسز بہت کم ہیں۔ ان کے چہرے سے ظاہر ہونے والی پریشانی کو بھی وہ بیوی پر ظاہر ہونے سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”میں ابھی آئی ہوں“ شرجیل کی ماں نے کہا۔  
 ”تم کہاں جا رہی ہو رخسانہ؟“ سرفراز ملک کو بھی جیسے اکیلے ہونے سے ڈر لگنے لگا۔  
 ”نماز پڑھنے۔۔۔۔۔ بیٹی کی زندگی کی دعا مانگنے“ انہوں نے ایسے کہا کہ آنسو روکنے کی کوشش کر رہی ہوں۔  
 ”میں بھی چلتا ہوں“ اور یوں وہ بیوی کے ساتھ نماز پڑھنے اور شرجیل کے لیے دعا مانگنے چلے گئے۔  
 ساتھ ہی کمرے میں لیٹی ہوئی صنوبر کو ہوش آ گیا۔ اور اس نے ماں کو اپنے قریب دیکھ کر کچھ اطمینان محسوس کیا۔  
 ”اب کیسی ہو؟“ در شہوار نے محبت سے پوچھا۔

”کافی بہتر ہوں۔ شرجیل کیسا ہے؟“  
 ”اس کی ماں آئی تھی تمہیں دیکھنے۔ تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ بتا رہی تھیں کہ ابھی شرجیل کی حالت کے بارے میں کچھ نہیں بتا چل رہا شاید آپریشن چل رہا ہے ابھی۔“ در شہوار نے چائے نکالی اور صنوبر سے پوچھا کہ وہ چائے پیے گی۔ صنوبر نے منع کر دیا۔

”کیا آپ کو حماہ کہیں نظر آیا؟“ صنوبر کو لگا کہ اب اگر وہ شرجیل کے بارے میں اپ ڈیٹ لینے کی کوشش میں جانا چاہے تو اس کی ماں اسے کسی قیمت پر جانے نہیں دے گی۔ اس لیے اس نے حماہ کے بارے میں پوچھا وہ ہی اسے ساری معلومات لا کر دے سکتا تھا۔

”نہیں کیوں؟ وہ تو آج پھر شام سے ہی غائب ہے اور اس وقت رات کے بارہ سے بھی زیادہ بج چکے ہیں پتا نہیں یہ لڑکا کن چکروں میں رہتا ہے۔ میں اب اسے نہیں رکھوں گی نکال دوں گی۔“ در شہوار کو دھیرے دھیرے غصہ آنے لگا۔  
 ”وہ میرے ساتھ تھا اسی نے مدد کی شرجیل کو یہاں تک لانے میں۔“  
 ”کیا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ در شہوار کو جیسے شاک لگا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں وہ نہ ہوتا تو شرجیل۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ صنوبر کچھ اور نہیں کہہ سکی۔  
 ”تو تم کہاں لے گئی تھیں اسے اپنے ساتھ؟“ در شہوار کا دماغ گھومنے لگا۔ وہ بھی شرجیل کی ماں کی طرح اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ صنوبر شرجیل کے ساتھ تھی۔

”میں اپنی دوست ندا کے گھر گئی تھی شرجیل بھی وہاں آنے والا تھا مجھ سے ملنے مگر وہ نہیں آیا۔ رات کو دس بجے تک جب وہ نہیں آیا تو ہم وہاں سے چل دیے اور راستے میں ہمیں شرجیل زخمی حالت میں ملا۔“  
 ”حماد تمہارے ساتھ تھا اور میں پتا نہیں کیا سوچتی رہی۔“ در شہوار کا غصہ فوراً ہی کا فور ہو گیا۔  
 ”تو اس وقت وہ کہاں ہے مجھے تو کہیں نظر نہیں آیا؟“ در شہوار نے بات پوری کی۔  
 ”یہ ہی تو میں بھی سوچ رہی ہوں کہ وہ مجھے ہسپتال میں چھوڑ کے پتا نہیں کہاں چلا گیا۔ شروع میں تو یہیں تھا۔“ صنوبر نے جواب دیا۔

صنوبر نے شکر ادا کیا دل ہی دل میں کہ اس کی ماں نے یہ نہیں پوچھا کہ حماد کو ندا کے گھر لے جانے کی کیا ضرورت



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

تھی۔ اس سوال کا خود اس کے پاس بھی جواب نہیں تھا۔ آج سب کچھ بہت عجیب عجیب ہو رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد صنوبر کو شرجیل کے بارے میں یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اس کی حالت بہت نازک ہے اگر شرجیل کو چوبیس گھنٹے میں ہوش نہیں آیا تو۔۔۔۔۔ اس کے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیرانی ڈیرا ڈال چکی تھی۔ آنسو پاتا نہیں کیسے خود بخود خشک ہو چکے تھے۔ اس وقت کوئی بھی اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا کہ شرجیل کے ساتھ یہ حادثہ کیسے ہوا۔ گویا تھا جو اسے اس طرح زخمی کر کے اس کی گاڑی بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ دوسروں کے مقابلے میں صنوبر تو مزید یہ بھی جانتی تھی کہ یہ ایکسڈنٹ نہیں تھا بلکہ شرجیل کو مارنے کی کوشش کی گئی تھی کیونکہ اس کا زخمی جسم جھاڑیوں میں چھپا دینا اور اس کی گاڑی بھی ساتھ لے جانا اسی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ جو کوئی بھی تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ شرجیل کو کوئی مدد نہ ملے اور وہ وہیں پڑے پڑے جان سے چلا جائے۔ لیکن اس وقت صنوبر یہ بات کسی کو نہیں بتانا چاہتی تھی۔ اسے اس وقت صرف شرجیل کی زندگی کی پروا تھی۔ شرجیل بچ جائے تو وہ باقی باتوں کے بارے میں اس کے بعد فیصلہ کرنا چاہتی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس اضافی بات کا ایک گواہ البتہ ہوا تھا اور اس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ کبھی جب صنوبر کو ہمدرد کا خیال آتا تو وہ سوچنے لگتی کہ اس بہت ہی عجیب لڑکے کو پتا نہیں کیا کیا معلوم ہے۔ وہ ایسی قرآنی آیات کے بارے میں بھی جانتا ہے جن کے اثر سے بہت سے کام لیے جاسکتے ہیں۔ اسے کسی واقعے کے بارے میں بھی شاید پہلے سے یا واقعہ رونما ہونے کے بعد پتا چل جاتا ہے۔ ایک ایسی صنوبر کو خیال آیا کہ ہمدرد کے ساتھ مذاکے ہاں اصرار کر کے گیا تھا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہو سکتا ہے آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔ تو کیا وہ پہلے سے جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے!!!

یہ خیال آتے ہی وہ بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور زور زور سے سانس لیتے لگی۔

☆☆☆

شرجیل کے آپریشن کے پورے وقت میں ہمدرد اصل مسلمان تھا آپریشن تھیمٹر میں موجود رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شرجیل کی جان کتنی خطرے میں ہے۔ وہ اسے بچانا چاہتا تھا لیکن یہ اس کے دائرہ اختیار سے باہر تھا البتہ وہ پل پل بدلتے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ جس وقت صنوبر نے شرجیل کے بارے میں سوچ کر ہلکے ہلکے کر رونا شروع کیا تو وہ چند لمحوں کے لیے صنوبر کو دیکھنے آیا تھا۔ ورنہ شہوار کو وہاں دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہوا کہ صنوبر اکیلے نہیں ہے۔ وہ دوبارہ آپریشن تھیمٹر میں چلا گیا۔ آپریشن طویل تھا اور کافی دیر میں ختم ہوا۔ ڈاکٹروں نے جو کچھ آپس میں کہا وہ سب مسلمان نے سن لیا اور اسے یقین ہو گیا کہ شرجیل کو کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ اس لیے وہ اس معجزے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے اس وقت بھی شرجیل کے پاس موجود تھا۔ کچھ کچھ دیر بعد ایک وارڈ بوائے اور ایک نرس شرجیل کی کنڈیشن دیکھنے آ رہے تھے۔ اور پھر آخر میں ڈاکٹر آیا۔ اس نے مشینوں کی طرف دیکھ کر شرجیل کا معائنہ کیا۔ اس کے چہرے پر بھیبتی مایوسی کو مسلمان نے دیکھ لیا اور اسے پتا چل گیا کہ شرجیل ایک آخری چمکی لے کر اس جہان فانی سے کوچ کر چکا ہے۔ ڈاکٹر نے اس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھانک دیا اور افسردگی سے باہر نکل گیا شرجیل کے ماں باپ کو یہ ولد و زخیر دینے کہ شرجیل اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ابھی ڈاکٹر منہ کھولنے ہی والا تھا سرفراز ملک اور شرجیل کی ماں کے سنے ہوئے چہروں پر وہ مزید دکھوں کی بارش کرنے والا تھا کہ ایک نرس بھاگتی ہوئی آئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔

”ڈاکٹر صاحب پیشینت کو ہوش آ گیا ہے!“

”کیا۔۔۔۔۔!“ ڈاکٹر جلدی سے آئی سی یو کی طرف چل دیا۔ شرجیل کو واقعی ہوش آ چکا تھا۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ جو زندہ ہے وہ شرجیل نہیں مسلمان ہے۔ شرجیل مر چکا تھا۔ مسلمان اس کے مردہ جسم میں حلول کر گیا تھا!!!  
(ایک جن اور آدم کی محبت لیے، اسرار بھری عشق کی دنیا میں لے جانے والے  
سطر سطر ہر عشق لہو میں دوڑاتے، اس ناول کی اگلی کڑی ماہ مئی میں پڑھیے)



# مسئلہ ہے

## خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ ہے“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ”تجلی کہانیاں“ کے اڈیلین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورت حال یہ ہو گئی کہ اگر ماہنامہ ”تجلی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد و بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپر وڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہ راست جوابات کے لیے میز معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی بچھتی کی دعا اور مسلمانین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپر وڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”تجلی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم ان افراد کی خواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات تو کن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم ان خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”تجلی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II - خیابان جامی - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

پریشان ہوں مجھے جلد از جلد جواب دے۔ میں آپ کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ آپ کو صحت اور سکون عطا فرمائے تاکہ آپ اسی طرح لوگوں کے مسئلے حل کرتے رہے۔

میرے بچوں اللہ تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ میں اپنے ان بچوں کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جو نہایت پابندی سے ضرورت مند خاندانوں کی کفالت کر رہے ہیں۔ کسی ایک انسان کا بھی بھلا ہو جائے تو اس سے بڑی کوئی نیکی نہیں۔ میرے پاس تم لوگوں کے لیے صرف وعائیں ہیں اور یقیناً اللہ کے پاس بہترین اجر۔ میں شاہدہ آسٹریلیا کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ جس نے میرے کہنے پر ضرورت مند خاندانوں کے لیے چھت کا بندوبست کیا۔ بیٹی اللہ تمہیں دین اور دنیا کے خزانے عطا فرمائے۔ آنے والا مہینہ رجب کا ہے۔ میں تمام پڑھنے والوں کو نصیحت کروں گا کہ اس ماہ میں خوب صدقہ خیرات کریں۔ روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کریں۔ اور چیزوں کو وانا پانی ضرور ڈالیں۔ اللہ ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو اس کے بندوں کے کام آتے ہیں۔

○ بیٹی شمیمہ! تعویذ لینے کا طریقہ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلوم کر لو۔

□ نظر علی برہانی۔ کراچی

○ محترم باباجی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کو سدا خوش رکھے۔ آپ کو اور زیادہ توفیق عطا فرمائے تاکہ آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ آمین۔ باباجی ہم ماشاء اللہ چھ بھائی ہیں۔ سب سے بڑے تین بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے۔ میرا تیسرا نمبر ہے اس لیے میری بھی ہو چکی ہے۔ چوتھے نمبر والا جو بھائی ہے میرے بعد والا اس کی ابھی نہیں ہوئی لیکن اس سے چھوٹا جو پانچویں نمبر پر ہے اس کی شادی کو اللہ کے فضل و کرم سے ایک سال ہو چکا ہے۔ باباجی اس کی بیوی کے ساتھ بتا نہیں کیا مسئلہ ہے کہ کتنی کھڑے کھڑے اور کبھی بیٹھے بیٹھے اس کو چکرا آ جاتے ہیں اور وہ گر جاتی ہے اور اس کے سر میں بہت چوٹ لگتی ہے اور کہیں نہیں صرف سر میں چوٹ آتی ہے اور اتنی زیادہ چوٹ آتی ہے کہ بہت خون نکلتا ہے۔ باباجی شادی سے پہلے بھی اس کو ایک دو بار چکر آ چکے تھے۔ ہمیں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کیا بیماری ہے اور یہ چکر کیوں آتے ہیں۔ بہت سے پیروں، فقیروں کو دکھایا ہے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا ہے۔ باباجی اگر کوئی زمین پر بیٹھے بیٹھے گر جائے تو اس کو زیادہ چوٹ تو نہیں آتی لیکن یہ بیٹھے بیٹھے گر جاتی ہے پھر بھی اس کو سر میں بہت چوٹ

□ شمیمہ قریشی۔ مقام نامعلوم

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میں ”سچی کہانیاں“ بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور آپ کا کالم مسئلہ یہ ہے بھی بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ خط لکھنے کی جرأت پہلی بار کر رہی ہوں۔ آپ سب کے مسئلے بڑی خوش اسلوبی سے حل کرتے ہیں۔ مجھے بھی ایک مسئلہ درپیش ہے۔ میری عمر 23 سال ہے۔ رشتے بہت آتے ہیں۔ لیکن کہیں پر بھی بات نہیں بنتی۔ آپ جو تعویذ رشتوں کے لیے دیتے ہیں۔ میں بھی وہ تعویذ لینا چاہتی ہوں۔ انجھے اور شریف گھر میں میرا رشتہ طے پا جائے۔ تعویذ کس طرح لیا جائے گا۔ طریقہ بتاویں میں بہت زیادہ

## اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتہ لوٹ فرمائیں اور آئندہ اپنا مسئلہ ویسے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتہ: II-C-88۔ فرسٹ فلور۔ خیابان جامی بکرشن۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔ 7، کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 021-35893121



گنتی ہے اور بے تحاشہ خون نکلتا ہے۔ باباجی ہم سب بہت پریشان ہیں کہ آخر یہ مسئلہ کیا ہے اور ہم اس کا علاج کہاں سے کرائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ باباجی برائے مہربانی آپ ہماری رہنمائی فرمائیں اور پلیز ہمیں بتائیں کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے اور اس کا کوئی حل بھی بتائیں۔

○ بیٹے نظر! جو صورتحال تم نے تحریر کی ہے وہ مجھے سمجھ آ رہی ہے مگر مکمل وضاحت سے میں تعویذ دینے کے بعد ہی بتا سکوں گا۔ تعویذ دینے کے بعد بچی کو حصار میں لے لوں گا۔ تم سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے تعویذ منگوانے کا طریقہ معلوم کر لو۔ انشاء اللہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

□ س۔ م۔ ا۔ حیدر آباد

○ محترم باباجی! السلام علیکم! باباجی امید کرتی ہوں آپ خیریت سے ہوں گے۔ باباجی آپ نے مجھے تعویذ دیا تھا دو مہینے پہلے اور سورۃ فاتحہ کا ورد بھی کہا تھا۔ باباجی میرے شوہر کے رویے میں تھوڑا بہت فرق آیا ہے۔ باباجی جس کے لیے اللہ کا بہت شکر ہے اور باباجی میں نے آپ کو اولاد نرینہ کے لیے بھی کہا تھا تو باباجی آپ نے کہا تھا خاموشی اختیار کرو سب اچھا ہوگا۔ باباجی میں اپنی ساس سسرکی بہت خدمت کرتی ہوں۔ باباجی اب جو ایک مسئلہ ہو گیا ہے وہ میری بڑی نند کو طلاق ہو گئی ہے۔ باباجی وہ ہمارے گھر آگئی ہے۔ باباجی شروع سے ہی ان کی مجھ سے نہیں بنی۔ باباجی اب میرے شوہر کا رویہ پھر مجھ سے خراب ہو رہا ہے۔ باباجی میں سارا دن مگن کا کام کروں۔ باباجی میری نند کا بیٹا جو کہ 5 سال کا ہے بہت گالیاں دیتا ہے۔ باباجی گھر کے اس ماحول کی وجہ سے میری بیٹی جو کہ 4 سال کی ہے اس پہ بہت بڑا اثر پڑ رہا ہے۔ باباجی میں بہت پریشان ہوں۔ باباجی سارا دن بچے آپس میں کھیلتے رہتے ہیں باباجی مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ باباجی ہے تو وہ پھر بھی لڑکا۔ مجھے کیا پتا کون سے کھیل کھیل رہے ہیں۔ باباجی یہ سوچ کے دن رات مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں۔ باباجی میری مدد کریں اللہ کوئی اسباب نکالے۔ آپ کو اپنا مسئلہ بتا رہی ہوں مجھے سچی کہانیاں میں جواب دیجیے گا۔ باباجی میرے لیے اولاد نرینہ کے لیے بھی دعا کریں۔ باباجی گھر کا ماحول بہت خراب ہے امید ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے۔

○ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ مثبت تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ ورجاری رکھو۔ معاملات میں خاموشی رکھنے میں ہی کامیابی ہے۔ اس وقت تمہاری نند اور اس کے والدین شدید مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔ طلاق بہت دکھ دینے والا فعل ہے۔ بہر حال تم سب کا خوش اسلوبی سے خیال رکھو۔ اپنی نند کا خاص طور سے بہت خیال رکھنا۔ 5 سال کا بچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے تم بلاوجہ کی فکر میں مت آؤ۔ اولاد نرینہ کے لئے تعویذ منگوا لینا خبر ہوتو۔

□ افضلہ ناز۔ منڈی وار برٹن

السلام علیکم باباجی! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش اور سلامت رکھے۔ باباجی میرا مسئلہ بڑا شدید ہے۔ میں جس لڑکے کو پسند کرتی ہوں وہ مجھ سے کسی بات سے ناراض ہو گیا ہے اور ناراض ہونے کی وجہ بھی نہیں بتاتا۔ پلیز باباجی! میری مدد کریں میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں یہ وہ مجھ سے بات ہی نہیں کرتا۔ مجھے کوئی ایسا جلالی وظیفہ بتائیں جس سے اس کی ناراضگی بھی دور ہو جائے اور اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر رشتے کے لیے بھی بھیج دیں۔ اور ہماری جلد شادی ہو جائے۔ پلیز باباجی میرا مسئلہ حل کر دیں میں زندگی بھر آپ کو دعا کریں دوں گی اور مارچ شمارے میں جواب دے دیں گے تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

○ بیٹی افضلہ! ناراضگی تو دور ہو جائے گی مگر شادی میں مسئلہ ہے تم مجھ سے تعویذ منگوا لو تاکہ رکاوٹیں دور ہوں۔ تفصیل سچی کہانیاں کے دفتر سے حاصل کر سکتی ہو۔

□ شاہانہ۔ جہلم

○ پیارے باباجی! السلام علیکم! میں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکی ہوں۔ مسئلہ وہی شادی کا ہے۔ آپ نے ایک وظیفہ ہم تینوں بہنوں کے لیے ارسال کیا تھا جس کو پڑھ کر میری ایک بہن اللہ تعالیٰ کے کرم سے اپنے گھر کی ہو گئی۔ اسی وظیفے کو پھر میں نے پڑھا۔ اسی دوران ایک رشتہ آیا لیکن ذات پات کے چکر کی وجہ سے ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا۔ ہم متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ شادی کے وقت قرضہ چڑھ جاتا ہے۔ اس کو

READING

246 سچی کہانیاں Section

لڑکی اس معاشرے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میری آپ سے التجا ہے کہ میرے لیے دعا کریں۔ بابا! میرا یہ خط شائع کیجیے گا۔ مجھے ایک ایسے انسان کے سہارے کی ضرورت ہے جو حساس ہو اور اس میں انسانیت ہو اور جو میرے ساتھ مل کر میرے اس کام میں شریک ہو سکے جو کہ میں کرنا چاہتی ہوں۔ اگر میری زندگی کا کچھ حصہ کسی اچھے کام میں گزر جائے تو میں سمجھوں گی کہ میرا دکھ کچھ نہیں ہے۔ شاید میں ان معصوم لوگوں کو خوشیاں دے سکوں جو 'خوشی' کے لفظ سے واقف نہیں ہیں۔

☆: بیٹی! تمہارا خط پڑھا۔ تم نے حالات کچھ مبہم سے تحریر کیے ہیں۔ لہذا اندازے کی بنیاد پر جواب دے رہا ہوں۔ بیٹی! کبھی کبھی انسان کو زندگی میں بہت دکھوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں ہمت نہیں باری چاہیے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو اور اس سے مدد مانگی رہو۔ دنیا میں جہاں بڑے لوگ ہیں، وہاں اللہ کے نیک بندے بھی ہیں مگر انسان کی نیت اچھی ہو تو وہ سب کچھ پالیتا ہے۔ جس کی خواہش رکھتا ہے۔ تم نماز فجر کے بعد ایک مرتبہ سورۃ الطلاق پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیا کرو۔ وظیفہ دو ماہ تک کرو۔

□ غوشیہ۔ میر پور خاص

☆: محترم بابا جان! السلام علیکم! آپ نے میرا خط شائع کیا۔ بہت مہربانی آپ کی۔ ایک بات اور پوچھنی ہے کہ وظیفہ کی زکوٰۃ کیسے نکالی جاتی ہے اور وظیفہ کا کفارہ کیسے ادا کیا جاتا ہے؟ کیوں کہ کچھ عرصے پہلے میں نے آپ سے اجازت لیے بغیر ایک وظیفہ شروع کیا تھا جو آدھا کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔ اس کا کفارہ کیسے ادا کروں؟ وظیفہ مکمل ہونے کے بعد زکوٰۃ کیسے نکالی جاتی ہے؟ میں موسیقی سے کس طرح پرہیز کروں کیوں کہ ہمارے گھر تو صبح شام گانے سنے جاتے ہیں۔ میں کسی کو منع تو نہیں کر سکتی۔ وہ وظیفہ جو آپ نے بتایا تھا میں نے شروع کر دیا ہے۔ مکمل ہونے کے بعد آپ کو اطلاع دوں یا نہیں؟

☆: بیٹی غوشیہ! زکوٰۃ حسب استطاعت رقم ہوتی ہے جو وظیفہ مکمل کرنے کے بعد کسی بھی جائز ضرورت مند کو دے دینی چاہیے۔ کفارہ بھی ایسے ہی نکال دینا

اتارنے میں دو سال لگ جاتے ہیں۔ اس دوران کوئی شادی کرنے کے قابل بھی نہیں ہوتا ہے۔ اگر رشتہ اچھا اور قابل قبول ہو تو ممکنہ وغیرہ تو ہو جائے۔ لوگوں کے اتنے اچھے رشتے طے ہو جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور حیرت کی کیا بات ہے، دینے والا اللہ ہے۔ خیر! اب آپ مجھے بتائیے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ابھی میری ایک اور بڑی بہن ہے اور میں ہوں۔ ہماری عمریں بھی زیادہ ہو رہی ہیں۔ آپ برائے مہربانی ہمارے لیے دعا کیجیے۔ ہم لوگ آپ کو بہت دعا کریں گے۔

☆: بیٹی! شاہانہ! اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر اور عشاء کے بعد ۴۱۔۴۱ بار الحمد للہ شریف پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو اور حاجت بیان کرو۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی! اپنی بہن سے کہو کہ نماز فجر کے بعد یازمین یا رحیم کی ۷ تہجیات پڑھ کر حاجت بیان کرے۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔ اور ہو سکے تو فوراً مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ کرم ہوگا۔

□ غمگین۔ چارسدہ

☆: باباجی! السلام علیکم! میں بہت لمبا چوڑا خط لکھنا نہیں چاہتی اس لیے مختصر انداز میں لکھ رہی ہوں۔ جو کچھ میں لکھوں گی، اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر لکھوں گی۔ اس سے زیادہ سچائی کا ثبوت میرے پاس نہیں ہے۔ بابا! مجھے ایک ایسا دکھ ملا جو کہ بظاہر کچھ نہیں مگر اس دکھ کی وجہ سے میں اذیت کا شکار رہی۔ میں بہت حساس ہوں۔ میں وہ دکھ کس طرح بیان کروں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میرے اپنے ہی میرے لیے اذیت کا سامان کرتے گئے۔ میرے وہ اپنے جن کو میں نے ٹوٹ کر چاہا، وہ رشتہ جو کہ ایک مقدس رشتہ تھا۔ بس یوں سمجھیں کہ اس کو شدت سے چاہا تھا۔ کبھی بچپن میں لیکن اب اس سے وہ محبت نہیں رہی۔ نہ صرف میں نے اپنے اس مقدس رشتے کے ہاتھوں تکلیف سہی بلکہ مجھے اس گناہ کا احساس ہوا۔ بابا جی! اب میری دنیا میں دیرانی ہی دیرانی ہے اور میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ انسانیت کی خدمت میں گزارنا چاہتی ہوں اور وہ بیرون کے دکھ درد کو شیر کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن ایک

READING  
Section



پابندی کے ساتھ دو ماہ کرو پھر مجھے مطلع کرو۔

□ امینہ۔ کراچی

☆: بیٹی امینہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔

(آمین)۔ نماز کی پابندی رکھو۔ وظیفہ تحریر کر رہا ہوں۔ ۱۴ دن کرنے کے بعد مجھے مطلع کرو۔ نماز عصر

اور مغرب کے بعد ۷۔ ۷ بار سورۃ فلق، سورۃ الناس اور آیت الکرسی پڑھ کر دم کرو اور گھر کے تمام افراد ایک ایک گھونٹ یہ پانی پی لیں۔ نماز عشاء کے بعد ایک مرتبہ سورۃ جن پڑھ کر حاجت بیان کرو۔ یہ عمل ۱۴ دن تک نہایت پابندی کے ساتھ کرو۔ جمعرات کے دن کچھ رقم ضرور خیرات کرو یا کرو۔ کرم ہوگا۔

□ انیلا۔ بستی ملوک

☆: بیٹی انیلا! تمہاری ہدایت پر مسئلہ شائع نہیں

کیا جا رہا۔ تمہارا خط پڑھا۔ بے انتہا دکھ ہوا۔ اللہ

تمہاری والدہ کو راہ راست پر لائے۔ (آمین) بیٹی!

تم معاملات اللہ کے سپرد کرو۔ نبی قابل علاج مرض

ہے۔ تم اپنے والد کا علاج کراؤ۔ وہ ٹھیک ہو جائیں

گے۔ بیٹی! تم نماز کے ساتھ ساتھ، قرآن بھی پڑھتی

ہو۔ بہت اچھی بات ہے۔ روزانہ رات کو اور صبح میں

آیت الکرسی پڑھ کر اپنے گرد حصار کر لیا کرو۔ نماز عصر

کے بعد ۷، ۷ بار سورۃ توبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کرو

اور حاجت بیان کرو۔ اللہ ضرور کرم کرے گا۔ مجھے

ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ بشیر احمد۔ ساہیوال

☆: بزرگوار باباجی! السلام علیکم! میں نے اپنے

بٹے کے علاج کے لیے آپ کو خط لکھا تھا اور آپ سے

کسی دوا کی درخواست کی تھی۔ اس کے جسم پر داؤد

ڈاکٹری علاج سے ختم ہوئی تھی نہ ہو میوٹیشن اور ویسی

علاج سے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے جو مرہم

بھیجا تھا، اس سے داؤد بالکل ختم ہوئی ہے۔ خدا آپ کو

عمر دراز عطا کرے تاکہ آپ اسی طرح مایوس

ضرورت مند لوگوں کے کام آتے رہیں۔ (آمین)

☆: بیٹی! شفا دینے والا تو رب العزت

ہے۔ اسی کا شکر ادا کرتے رہو جس کا سب سے بہترین

طریقہ شیخ وقت نماز کی ادائیگی ہے۔ اپنے بٹے کا صدقہ

چاہیے۔ کوشش کیا کرو کہ وظیفہ نامکمل نہ چھوڑو۔ اس طرح حاجت بھی نامکمل رہ جاتی ہے۔ وظیفہ مکمل کرنے کے بعد مجھے نتائج سے ضرور آگاہ کیا کرو۔

اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

□ امیر خان۔ واسٹنگٹن

☆: جناب باباجی! السلام علیکم! تقریباً دو ماہ پہلے

میں نے اپنی مشکلات کے سلسلے میں آپ سے براہ

راست رابطہ کیا تھا۔ آپ نے تعویذ ارسال فرمایا تھا۔

ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ میرے تینوں مسائل

بخیر و خوبی حل ہو گئے۔ مجھے پہلے سے بھی اچھی

ملازمت مل گئی ہے اور گھریلو مشکلات بھی ختم ہو گئی

ہیں۔ میں آپ کا بہت بہت مشکور ہوں۔ باباجی!

آپ جس طرح مشکلات میں پھنسے ہوئے لوگوں کے

کام آتے ہیں، خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔

☆: بیٹی امیر خان! مشکلوں سے نجات دلانے

اور مسائل حل کرنے والی ذات تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی

ہے اس لیے میرا شکر یہ نہیں بلکہ اس رحیم و کریم کا شکر

ادا کرو۔ اور اس کے نام پر خیرات بھی کرتے رہو۔

نماز کی پابندی کبھی نہ بھولنا۔

□ ثمر۔ مریدانہ

☆: محترم جناب باباجی! السلام علیکم! آپ مجھے

پہچان گئے ہوں گے۔ کیوں کہ میں آپ سے پہلے بھی

رابطے میں رہ چکی ہوں اور آپ کے بتائے ہوئے

وظیفے سے مستفید ہو چکی ہوں۔ وہی انسانیت کی جو

خدمت آپ کر رہے ہیں، خدا آپ کو اس کا اجر عطا

کرے۔ (آمین) میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں رات کو

سوتے وقت دانت بہت زیادہ چباتی ہوں۔ یعنی

دانت پیستی ہوں۔ میں پچھلے کئی سال سے اس طرح

کر رہی ہوں جس کی وجہ سے میرے دانتوں میں

بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ مجھے کوئی

وظیفہ بتائیں تاکہ میرا یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

☆: بیٹی ثمر! خوش رہو! (آمین) نماز کی پابندی

کے ساتھ کثرت سے یا تمیم کا ورد کرتی رہو۔ دانتوں

پر رات کو سوتے وقت سرسوں کا تیل اور نمک اچھی

طرح لگالیا کرو اور بشیر کلی کیے سو جاؤ۔ یہ عمل نہایت

READING

Section

24 سچی کہانیاں

## قارئین کے نام کھلا خط

محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اولین شمارے سے یہ سلسلہ شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے ناصرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔ ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون و زکا رہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا

قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔



دھولو۔ انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔ چہرے کے لیے دوا تیار ہے۔ آفس فون کر کے تفصیلات لے لو۔

□ عروبہ۔ لاڑکانہ

○: باباجی! السلام علیکم! آپ نے بہت سے لوگوں کے مسائل حل کیے ہیں۔ امید ہے آپ میرا مسئلہ بھی حل کر دیں گے۔ باباجی! میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر جنھوں نے دو حج کیے ہوئے ہیں، عمرے بھی کیے ہیں مگر وہ نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے شوہر نماز پڑھنا شروع کر دیں۔ میری دو بیٹیاں قرآن پاک حفظ کر رہی ہیں۔ میرا بیٹا بھی ماشاء اللہ نمازی ہے اور میں خود بھی نماز پڑھتی ہوں۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے دونوں چھوٹے بچے بیٹا اور بیٹی بہت تنگ کرتے ہیں۔ بیٹا سات سال کا ہے۔ وہ ذہن کا تیز ہے مگر پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا۔ بہت ضدی ہے اور بہت بدتمیز بھی ہے۔ کسی کا کہنا بھی نہیں مانتا اور بیٹی جو گیارہ سال کی ہے، ماشاء اللہ حفظ کر رہی ہے۔ وہ بھی بہت ضدی اور بدتمیز ہے۔ کسی کا کہنا نہیں مانتی۔ انھیں نماز بھی میں ڈانٹ کر پڑھواتی ہوں۔ باباجی! کوئی ایسا وظیفہ بھی دے دیں جس کی برکت سے میرے شوہر نماز پڑھنا شروع کر دیں اور بچے نیک سیرت ہو جائیں۔

○: بیٹی عروبہ! خوش رہو! نماز کی تلقین کرنا تمہارا فرض ہے۔ وہ کرتی رہو۔ بچوں پر چاروں گل پڑھ کر دم کرتی رہا کر دو۔ گھر کا ماحول خوش گو اور رکھو۔ نماز نہ پڑھنے پر کسی کو بھی برا بھلا مت کہو۔ تم خود باندی سے نماز پڑھو۔ بچے جب والدین کو عبادت کرتا دیکھتے ہیں تو خود بھی عمل کرتے ہیں۔ زبردستی سے بعض اوقات مقصد تو حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر وہ مستقل نہیں ہوتا ہے اور مذہب میں تو بہت نری اور محبت سے چلنا چاہیے۔ بچوں کو خود وقت دو اور نماز عصر کے بعد سورۃ کافرون 21 بار پڑھ کر حاجت بیان کرو۔ مدت 21 روز ہے۔ شوہر اور بچوں کے لیے مجھ سے تعویذ بھی منگوالو۔ اللہ کرم کرے گا۔

□ رخشندہ۔ ڈسکہ

○: باباجی! آداب و نیاز! میں نے جس کام کے لیے براہ راست آپ سے تعویذ منگوایا تھا، خدا کے

اور اللہ تعالیٰ کے نام کی خیرات ضرور دیتے رہنا مگر مستحق لوگوں کو۔

□ روشن۔ جلال پور پیر والا

○: السلام علیکم! محترم باباجی! میرا مسئلہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ہے۔ میری عمر برہمتی جا رہی ہے مگر ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا جس کی وجہ سے میں اور میرے گھر والے بہت پریشان ہیں۔ میں تقریباً مایوس ہو چکی ہوں۔ آپ مجھے کوئی ایسا تعویذ دیں اور وظیفہ بتادیں جس سے میرا رشتہ بھی آئے اور بات بھی طے ہو جائے۔

☆: بیٹی روشن! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ (آمین) مایوسی کا مطلب ہے، ناامیدی اور جو لوگ اللہ پر بھروسہ رکھتے رہیں، وہ کبھی ناامید نہیں ہوتے ہیں۔ تم فوری طور پر تعویذ منگوالو۔ تفصیلات آفس فون کر کے معلوم کر لو اور ہاں بیٹی تمہیں ایک نہایت سہل وظیفہ بھی دے رہا ہوں۔ ہر نماز کے بعد 100 مرتبہ یا حبیب کا ورد کرو اور حاجت بیان کرو۔ وظیفہ نہایت باندی کے ساتھ 14 دن تک کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔ خیال رہے، اس دوران نماز بالکل قضا نہ ہو۔ تعویذ کا اسی لیے کہتا ہوں چونکہ مجھے پتا ہے کہ اکثر وظیفہ پابندی سے نہیں ہوتا اور نافذ آ جاتا ہے۔

□ حمیدہ۔ صادق آباد

○: باباجی! السلام علیکم! آپ دکھی انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ میرے بھی کچھ مسائل ہیں۔ باباجی! میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال بہت تیزی سے گرتے ہیں۔ بالوں میں خشکی بھی ہے۔ بال اتنے اترتے ہیں کہ گھر والے بھی پریشان ہیں۔ بالوں میں زیادہ تیل بھی نہیں لگا سکتی۔ زیادہ تیل لگانے سے بال اور زیادہ اترنے لگے۔ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میرے بال گرنا بند ہو جائیں۔ ساری عمر آپ کو دعاؤں دوں گی۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر اتنی کشش نہیں ہے۔ میں چہرہ پر کشش کرنے کے لیے لیکیا کروں پلیز بتائیں! میں بہت پریشان ہوں۔

☆: بیٹی حمیدہ! بالوں کے لیے مجھ سے تیل منگوالو۔ تیل بالوں کی جڑوں میں لگاؤ۔ آملہ اور ریٹھا پیس کر گیلے بالوں میں لگاؤ اور آدھے گھنٹے کے بعد سر

ہوسکتا ہے۔ اپنی سوچ مثبت رکھو۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔

□ انعم۔ ڈپرہ غازی خان

☆: بیٹی انعم! میں صرف ایک وقت میں دو مسائل کے جواب دیتا ہوں۔ بے شمار سوالات کے جواب دینا میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ بہر حال وظیفے کے بارے میں جو تم نے پوچھا ہے تو اس کی مدت 41 دن ہے۔ ایک وقت میں ایک جامع وظیفہ کئی مسائل کے لیے ارسال کیا جاتا ہے۔ میں خط پڑھ کر جواب دیتا ہوں لہذا وظیفہ مکمل ہونے پر مجھے حالات سے آگاہ کیا کرو۔

□ پروین۔ کراچی

☆: محترم باباجی! السلام علیکم! بہت سے لوگ مسائل کے سلسلے میں آپ کے تحریر کردہ وظائف و عملیات سے مستفید ہو رہے ہیں اس لیے میں بھی آپ سے رجوع کر رہی ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرا بھائی بیرون ملک جانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس کا کام جلدی نہیں ہو رہا۔ کوئی ایسا تعویذ دین یا باجی کہ بیرون ملک جانے کا کام جلدی ہو جائے۔ باباجی! اس کے علاوہ ہمارے گھر میں برکت نہیں ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی وظیفہ بتائیں کہ گھر کے حالات اچھے ہو جائیں۔ ابو جتنے بھی پیسے کما کر لاتے ہیں۔ جلد خرچ ہو جاتے ہیں۔ آپ جلد از جلد میرا مسئلہ حل کر دیں۔ خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔ (آمین)

☆: بیٹی پروین! انسان کو اپنے ہاتھوں سے راہ خدا میں ضرور کچھ نہ کچھ نکالنا چاہیے۔ اس عمل سے برکت رہتی ہے۔ نماز فجر کے بعد ایک مرتبہ سورۃ رحمان پڑھ کر رزق میں کشاویگی اور برکت کی دعا کرو۔ نماز عصر اور نماز مغرب کے بعد 41-41 بار سورۃ النصر پڑھ کر اپنی حاجت بیان کرو۔ یہ عمل بھائی کرے تو بہتر ہے۔ مدت 41 دن ہے۔ اور ہو سکے تو فوری طور پر بھائی کے لیے تعویذ منگوا لو۔

□ ارم۔ کراچی

☆: بیٹی ارم! نماز کی مکمل پابندی کرو اور ان تمام افعال سے پرہیز کرو جنہیں اللہ جل شانہ، اور اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے۔ بعد نماز فجر سورۃ

فضل و کرم سے وہ پورا ہو گیا ہے۔ آپ نے اطلاع دینے کو کہا تھا لہذا اطلاع بھی دے رہی ہوں اور شکر یہ بھی ادا کر رہی ہوں۔ خداوند کریم آپ کو اجر دے کہ آپ نے دو گھروں کو برپا ہونے سے بچالیا ہے۔

☆: بیٹی رخشندہ! بگڑے کام تو وہی رحیم و کریم اور قادر مطلع ہی بناتا ہے۔ میں تو اس کا ناچیز بندہ ہوں اس لیے میرا شکر یہ ادا کرنے کی بجائے اسی کا شکر ادا کرو اور نماز کی پابندی کرتی رہنا۔

□ شہناز۔ چنڈی

☆: بیٹی شہناز! اللہ تمہاری دعائیں قبول فرمائے۔ (آمین) زندگی بے شک بہت مشکل ہے اور بعض اوقات تو بہت تلخ حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر کامیابی صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو ہمت اور صبر کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ تم بہنیں ہر نماز کے بعد 222 مرتبہ پڑھو۔ "اللہ اللطیف الرحیم"۔ مدت 41 دن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھ سے تعویذ بھی منگوا لو۔ حسب استطاعت خیرات کیا کرو۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔

□ جنید۔ خیر پور

☆: بیٹے جنید! تمہارا خط طوالت کے باعث شائع نہیں کیا جا رہا۔ انسان کے دل میں جو کچھ ہوتا ہے اس کو باہر آنا چاہیے اور اس کے لیے مخلص دوست بہت ضروری ہے۔ ضروری نہیں کہ دوست کوئی ہم عمر ہی ہو۔ تمہارے والد، بھائی، بہن یا والدہ کوئی بھی تمہارا اچھا دوست بن سکتا ہے۔ اصل دوستیاں وہی ہوتی ہیں جو بچپن سے چلی آ رہی ہوتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگ صرف ضرورت کے تحت دوستی کرتے ہیں۔ لوگوں سے خوش اخلاقی سے ملا کرو اور ایک فاصلہ رکھا کرو کہ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ تم ان پر مسلط ہو رہے ہو۔ ہنسا بولا کرو۔ اگر کوئی بات اچھی نہ لگے تو ضروری نہیں ہوتا کہ کھل کر مخالفت کی جائے۔ سب سے بہتر طریقہ خاموش ہو جانے کا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور صرف یا حمید کا کثرت سے ورد کرو۔ اچھی کتب کا فرصت میں مطالعہ ضرور کیا کرو۔ فارغ وقت کا اس سے اچھا مصرف اور کچھ نہیں



طلوع نیت سے اپنی حاجت اس مہربان آقا کے حضور پیش کرو۔ اس کے ساتھ ساتھ ”سورۃ طہ“ کی آیات نمبر 131-132 ہر نماز کے بعد بکثرت پڑھو۔ انشاء اللہ تعالیٰ تمہاری جائز دلی خواہش ضرور پوری ہوگی۔ اس عمل کی کوئی مدت نہیں۔ جب تک حالات میں بہتری کے آثار پیدا نہ ہوں، یہ عمل کرتی رہو۔ دو ماہ بعد مجھے نتائج سے مطلع کرنا۔ دوسرے مسئلے کے لیے تمہیں تعویذ منگوانے کا کہوں گا۔

□ سرور۔ انگ

○: باباجی! السلام علیکم! میں نے دو ماہ قبل آپ سے اپنے مسئلے کا حل دریافت کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ کی دعاؤں کے طفیل میرا مسئلہ حل ہو گیا ہے اور مجھے بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ باباجی! میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں۔ جن سے آپ کا شکر یہ ادا کر سکوں۔ آپ کی ہدایت کے مطابق خیرات بھی دے رہا ہوں۔

☆: بیٹے سرور! شکر یہ میرا نہیں بلکہ اس مالک حقیقی کا ادا کر دو جن نے مجھ عاصی و گناہ گار کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہر قسم اسی رب رحیم کا شکر ادا کرتے رہنا اور نماز سے غفلت بھی مت برتنا۔ اپنی جائز آمدنی میں سے حسب استطاعت خیرات ضرور کرتے رہنا اور اس بات کا دھیان رکھنا کہ خیرات مستحقین تک پہنچے۔

□ ارشد خان۔ KPK

○: محترم و مکرم باباجی! السلام علیکم! آپ نے اب تک لاکھوں افراد کے مسائل حل کیے ہیں۔ میں بھی اپنا مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود گزشتہ کئی سال سے بے روزگاری کا عذاب جھیل رہا ہوں۔ صرف ایک بین اسکول میں پڑھانی ہے، اسی سے گھر کا خرچ چلتا ہے۔ مکان بھی کرائے کا ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نفسا نفسی کے اس درد میں اپنا پراپا کوئی بھی ساتھ نہیں دیتا اور کوئی بھلا کب تک ساتھ دے سکتا ہے۔ باباجی! ابھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی اس فضول اور ناکارہ زندگی کا خاتمہ کر لوں مگر پھر ماں اور بہن بھائیوں کا خیال آجاتا ہے۔ میرے بعد تو وہ بالکل بے آسرا ہو جائیں گے۔ باباجی! اب آپ ہی میری آخری امید ہیں۔ اللہ

آل عمران کی آیت نمبر 14 سے 18 تک ایک مرتبہ ضرور تلاوت کر لیا کرو۔ اگر بعد نماز فجر موقع نہ ملے تو مجبوراً بعد نماز عشاء بھی ان آیات کی تلاوت کر سکتی ہو۔ ان آیات مبارکہ کو مستقل طور پر اپنا ورد بنا لو۔ جب دل زیادہ گھبرائے یا مایوسی کا غلبہ ہو تو ان آیات جلیلہ کو بلند آواز سے تین مرتبہ پڑھ لیا کرو کیونکہ دل میں مختلف قسم کے وسوسے اور مایوسی شیطان پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ورج ذیل عمل بھی کر لو۔

بعد نماز عشاء دو رکعت نماز نفل نماز حاجت کے طور پر ادا کرو۔ نماز حاجت کے بعد ایک مرتبہ ”سبح فاطمہ“ پڑھو پھر اسی جگہ قبلہ رخ بیٹھ کر۔ ”سورۃ آل عمران“ کی آیات نمبر 26-27 کا 40 مرتبہ ورد کرو۔ جب چالیس مرتبہ پڑھ چکو تو ایک سفید کاغذ پر خوش خط انداز میں لفظ ”مجوم“ لکھو اور اسے اس جگہ پر چسپا کر دوں جہاں تم نماز ادا کرتی ہو۔ ایک بات کا دھیان رکھنا کہ اس کمرے میں کسی بھی جاندار کی تصویر نہیں ہونا چاہیے۔ یوں تو گھر کے کسی بھی حصے میں تصویر کا ہونا جائز نہیں ہے لیکن اس کمرے میں خاص طور پر اس بات کا دھیان رکھنا۔ اب آئندہ سے اس لفظ ”مجوم“ کے حروف کو غور سے دیکھو اور سورۃ آل عمران کی مذکورہ آیات مبارکہ کا ایک مرتبہ ورد کرو۔ اسی طرح اس لفظ کے حروف کو 40 مرتبہ دیکھو اور ہر مرتبہ سورۃ آل عمران کی مذکورہ آیات مبارکہ کا ورد کرتی رہو۔ اس سربلج الاثر عمل کی مدت چالیس روز ہے۔ ناسخے کے دن شمار کر کے بعد میں پورے کر لیا۔ چالیس روز کے بعد تم خود اس رب رحیم کی رحمت کے نظارے دیکھو گی۔ وہ مہربان آقا ایسی رحمتیں نازل فرمائے گا کہ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔ بس اس رب رحیم کی ذات برکات پر پختہ یقین اور اعتماد شرط ہے۔ (وہ تمام احباب جو تنگ دستی میں مبتلا ہیں یہ عمل کر سکتے ہیں، میری طرف سے اجازت ہے، بس نماز کی مکمل پابندی اور دروغ گوئی، حسد، نفیث اور دوسروں کا دل دکھانے سے پرہیز کریں)

□ فاطمہ۔ لاہور

☆: بیٹی فاطمہ! ہر نماز کے بعد ایک ”سبح“ ایسا کہ بعد واپاک نستعین“ پڑھنے کے بعد انتہائی خضوع و خشوع اور

نہیں کرتا۔ میں تمہارے لیے انتہائی زود اثر اور آزمودہ وظیفہ تحریر کر رہا ہوں مگر نماز کی مکمل پابندی اور کمروہات سے پرہیز شرط اولین ہے۔

دور کعت نماز حاجت اس طرح پڑھو کہ چاروں سجدوں میں (سجدہ کے بعد) چالیس چالیس مرتبہ آیت مبارکہ۔ ”لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین۔“ پڑھو۔ یہ عمل کسی بھی فرض نماز کے بعد کر سکتے ہو مگر نماز عشاء کے بعد کرو تو بہتر ہے۔ چاند کی اولین جمعرات (نوپندی جمعرات) سے شروع کرنا۔ اس عمل کی مدت سات دن ہے۔ اس عرصے میں انشاء اللہ تمہارے حالات میں خوش گوار تبدیلیوں کی ابتدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ بعد نماز عشاء کے بعد ایک مرتبہ ”سورہ واقعہ“ کی تلاوت کر لیا کرو اور ہمیشہ کرتے رہو۔ باری تعالیٰ کے فضل و کرم سے کبھی رزق کی کمی نہ ہوگی۔ سات دن بعد مجھے نتائج سے آگاہ کرنا۔ ان سات دنوں میں کثرت سے ”یا حی یا قیوم برحمتک استغیث“ کا ورد کرتے رہنا اور کوشش کرنا کہ ہر نماز جماعت کے ساتھ ادا ہو۔

کے واسطے مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ مجھے بے روزگاری کے اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔

☆ بیٹے ارشد! زندگی میں اس قسم کے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے یہ گویا بندے کی آزمائش ہوتی ہے۔ انسان کو کسی بھی صورت میں مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ مایوسی کا شکار ہونا کفر کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ تم نے نماز بھی ترک کر دی ہے۔ اس غفور الرحیم سے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگو اور نماز کی پابندی کرو۔ یہ ایسی فرض عبادت ہے جو کسی بھی حال میں ترک نہیں کی جاسکتی۔ اسی کے ذریعے اللہ اور بندے میں تعلق قائم ہوتا ہے۔ تم اپنے دل میں یقین تو پیدا کرو کہ سب کچھ اسی کے ور سے اور اسی کے حکم سے ملتا ہے اور ہر مانگنے والے کو ملتا ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ تم مجھ سے مانگو، میں تمہیں دوں گا اور یہ بات ذہن میں اچھی طرح بٹھا لو کہ اللہ رب العزت اپنے وعدے کے خلاف

## علاج اور مکمل شفاء

میرے عزیزو!

اللہ تعالیٰ! سب کو اپنی امان میں رکھے۔

☆ اگر آپ اپنے جسم کے اندرونی اور بیرونی زخموں کا مکمل علاج چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ بالوں کی بیماریوں، سکری اور بال خورے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆ اگر آپ دانتوں کی گونا گوں تکالیف میں مبتلا ہیں۔

☆ اگر آپ بوٹا پنے جیسی موذی بیماری کا شکار ہیں۔

آپ سب کے لیے خوش خبری ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے ان تمام عوارض کا مکمل علاج اور دوائیں موجود

ہیں۔ ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ علاج معالجے اور دواؤں کی طلب کے لیے جوابی لفافے کے ساتھ اپنا مسئلہ تحریر کریں۔

88-C II فرسٹ فلور، خیابان جامی کراچی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی



# ماہنامہ پارک

ڈی خان

زندگی کے رنگوں سے آباد وہ گوشہ، جسے قارئین کے بھیجے گئے منتخب مراسلوں اور اقتباسات سے سجایا جاتا ہے۔

## اعتبار و خلوص

اعتبار و خلوص کا راستہ بھی بڑا عجیب ہے۔ اس میں انسان آنکھیں بند کیے دوسرے شخص پر اپنا اعتبار و خلوص لٹا رہا ہوتا ہے۔ پر یہ آنکھیں جب کھلتی ہے جب وہی شخص دور کھڑے آپ کے خلوص کا مذاق اڑاتے ہوئے آپ کے اعتبار کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے تو ایسے میں افسردہ نہ ہو وہ شخص تو اپنا نظریہ دکھا کر چلا گیا۔ آپ اپنے خلوص و اعتبار کو سنبھال کر رکھیے اور اس اعتبار و خلوص کو وہاں لٹائیں۔ جو اس کے قابل ہے۔  
ذو قلم: فریح انیس۔ کراچی

## حکمت کی باتیں

☆ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے ناراض ہوتا ہے تو اسے نیک لوگوں کی عیب جوئی میں مشغول کر دیتا ہے۔  
☆ اگر تمہارے اعمال اور کردار سے اللہ کی مخلوق خوش ہو تو سمجھ لو کہ تمہارا رب بھی تم سے راضی ہے۔  
☆ زندگی تب بہتر ہوتی ہے جب آپ خوش ہوتے ہیں لیکن زندگی تب بہترین ہوتی ہے جب آپ کی وجہ سے کوئی دوسرا خوش ہوتا ہے۔  
☆ اچھا انسان وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھلا دے پر کسی کی دی ہوئی محبت اور عزت کبھی نہ بھلائے۔  
☆ اپنا فائدہ سوچے بنا سب کے ساتھ اچھائی کرو کیونکہ جو لوگ پھول تقسیم کرتے ہیں ان کے ہاتھوں میں خوشبو ضرور رہ جاتی ہے۔

## نکری سونا ہو گئی

حضرت خالد بن عبدالعزیزؓ سے روایت سے کہ پرانے وقت میں ایک حافظ الحدیث بہت ہی منلوک الحال اور تنگ دست تھے۔ اور خوف خداوندی سے دن رات رویا کرتے تھے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ عالم تہائی میں انتہائی گریہ زاری کے ساتھ دعا مانگ رہے ہیں۔ مجھے ان کی غریبی پر بڑا ترس آیا۔ تو میں نے عرض کیا کہ کیوں نہیں آپ خداوند عالم سے دعا مانگتے کہ وہ آپ کو اتنی دولت عطا فرمائے کہ آپ کی تنگ دستی دور ہو جائے۔ یہ سنتے ہی حضرت نے دائیں بائیں مڑ کر دیکھا اور زمین سے کچھ سنگریاں اٹھائیں تو وہ سونا بن گئیں اور انھوں نے ان کو میری طرف پھینک دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مصالحتوں کو خوب جانتا ہے۔ پھر میں نے عرض کیا کہ میں ان سونے کے ٹکڑوں کو کیا کروں۔ تو فرمایا کہ تم ان کو اپنے اہل و عیال پر خرچ کر ڈالو۔ خالد بن عبدالعزیزؓ کا بیان ہے کہ میں اس حال اور ان کے جلال سے اس قدر خائف ہو گیا کہ مارے ڈر کے ان کے فرمان کو نال نہ سکا۔ اور میں ان سونے کے ٹکڑوں کو ساتھ لے کر گھر آ گیا۔ ان واقعات سے ان منکبیرین کو عبرت حاصل کرنی چاہیے کہ جو اولیاء اللہ کے خداداد کرامات کے انکار اور بزرگان دین کی توہین کرتے ہیں۔ ان کو کیا خبر کہ وہ لوگ جو اپنی ایک نظر ڈال کر مٹی کو سونا بنا دیتے ہیں۔  
مراسلہ: ملک علی رضا۔ اسلام آباد

☆ زندگی میں اچھے لوگوں کی تلاش مت کرو خود اچھے بن جاؤ شاید کسی کی تلاش پوری ہو جائے۔  
☆ خوبصورتی ایک نعمت ہے لیکن سب سے خوبصورت آپ کی زبان ہے چاہے تو دل جیت لے اور چاہے تو دل چیر دے۔

انتخاب: ممتاز احمد۔ سرگودھا

بکرے کے گوشت کی بخنی ضرور پیتا ہوں اور دوپہر کے کھانے کے ساتھ وہی ضرور ہو۔ بس آپ کوئی تکلف نہ کریں۔ مجھے ڈاکٹر نے سختی سے پرہیز کا کبہ رکھا ہے۔“  
(عنایت اللہ خان کے مضمون ”کلم کے سلسلے میں“)

### حجامت

سے جو ادنیٰ نور اسلام آباد کا انتخاب

فوجی کمانڈر ایک سارجنٹ کے ساتھ نئے بھرتی ہونے والوں کے سامنے پہنچا۔ اس نے تعارفی تقریر شروع کی۔ چند تعارفی کلمات کے بعد وہ بالوں کی حجامت کے موضوع پر آیا۔ ”بالوں کے معاملے میں آپ بالکل آزاد ہیں۔“ لے بال رکھنے والے فوجیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔  
کمانڈر نے کہا۔ ”آپ لوگ اپنی پسند کے بال رکھ سکتے ہیں مگر ان کی لمبائی میرے بالوں سے زیادہ نہ ہو۔“  
اس نے اپنے سر سے ٹوپی اٹھا کر اپنی سو لجر کٹ حجامت دکھائی۔ ”اور سارجنٹ کے بالوں سے کم نہ ہو۔“  
سارجنٹ نے بھی اپنی ٹوپی اٹھائی وہ گنجانا تھا۔

### ایک وعدہ

مرسلہ: شاہانہ احمد۔ کراچی  
کتنے وعدے کیے تھے ان نے  
یاد دلا یا تو چونک گیا  
اتنے وعدوں سے کیا نباہ کرتا  
جو ایک وعدے کی آس رکھ نہ سکا  
اپنے کہنے کا پاس رکھ نہ سکا

### دفاع

شاعرہ: نوشابہ صدیقی  
مقدمے کی سماعت آخری مراحل میں تھی ملزم نے مطالبہ کر دیا کہ وہ اپنے وکیل صنفائی کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہے۔ اس لیے اسے وکیل تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے۔  
جج صاحب بولے۔ ”پولیس نے تمہیں ڈاکا ڈالتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ دکان دار نے بھی تمہیں پہچان لیا ہے۔ زیورات بھی تمہارے قبضے سے برآمد

### یاد آتے ہو

ہمیں ایسا کیوں لگتا ہے  
بہت مصروف رہنا ہے  
تمہارے واسطے نعمت  
کہ یوں مصروف رہنے سے  
تھیں پچھلی کوئی باتیں  
کوئی قصہ کوئی یادیں  
افیت دے نہیں پاتیں  
بہت مصروف رہتے ہو  
صبح سے شام ہونے تک  
سچی ہم کہہ نہیں پاتے  
بہت تم یاد آتے ہو  
شاعر: عماد حسین انصاری۔ کراچی

### پرہیزی مہمان

مہمانوں کی جان لیوا قسم تو وہ ہوتی ہے۔ جو پرہیزی غذا کھاتی ہے اور یہ کہتی نظر آتی ہے کہ ناچی چائے تو میں نہیں پیتا۔ آدھا سیر دی کی لسی اور دو قلعے تو میرے لیے زہر ہیں۔ لقمہ اندر گیا اور انتڑیاں سوچی۔ کھجڑی اور دلے کے سوا کچھ کھا ہی نہیں سکتا۔ رات سونے سے پہلے دودھ تو میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ہر کھانے کے بعد دو سبب..... میرے لیے کوئی تکلف نہ کیجیے گا۔ میں کہاں یہ مرغن کھانے ہضم کر سکتا ہوں؟  
پھر یہ کہتے ہی نظر آتے ہیں کہ میں مہمان تھوڑا ہی ہوں۔ یہ تو میرا اپنا گھر ہے۔ آپ تکلف نہ کریں میں تو صرف دو وقت دودھ پیتا ہوں۔ ناشتے کے ساتھ ڈبل روٹی پکھن اور دو ہاف بوائل انڈے..... البتہ شام کو



ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ تم آٹھ مرتبہ کے سزا یافتہ ہو۔ تمہارے خیال میں اب کوئی دوسرا وسیلہ تمہارے دفاع میں کیا کہہ سکتا ہے۔“  
 ملام نے جواب دیا۔ ”یہی تو میں جانتا چاہتا ہوں۔“

### وقت

مرسلہ: اسامہ بلال اعوان۔ لاہور

ایک مسافر نے اسٹیشن پر کھڑے گاڑے سے پوچھا۔  
 ”گاڑے صاحب! کیا گاڑی چلنے میں اتنا وقت ہے کہ میں چائے پی کر آ جاؤں۔“ گاڑے نے مسافر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”گاڑی آنے میں ابھی وقت ہے اور اس بات کا یقین دلانے کے لیے میں خود آپ کے ساتھ چائے پینے کے لیے جا سکتا ہوں۔“

### غزل

مرسلہ: ممتاز اقبال اعوان۔ داروغہ والا لاہور

ابھی تو رات باقی ہے۔ دھل جائے تو سو جانا میرے ہدم دل نادان سنبھل جائے تو سو جانا سناؤں تم کو جی بھر کے میں اپنی داستانِ غم ہے ارمان اس دل کا نکل جائے تو سو جانا مسلسل ہچکیاں، جھینے کی حسرت، ٹوٹی سانسیں گھڑی یہ سخت ہے گتھی یہ نل جائے تو سو جانا ستارے مسکرائیں چاند کی سرگوشیاں سن کر میری جاں یہ حسین منظر بدل جائے تو سو جانا مرے دلبر مرے جانی ہمارے وصل کا لمحہ یہ تمہائی کی ناگن کو نکل جائے تو سو جانا بہت سہا ہوا رہتا ہے خالد یہ دل نادان یہ دل اک لمحہ بھر کو بھی بہل جائے تو سو جانا

### اولاد کی پرورش کرنے کے چند اصول

شاعر: خالد یوسفی۔ سرگودھا

بچپن میں جو عادت بھلی یا بری پختہ ہو جاتی ہے وہ عمر بھر نہیں جاتی۔ لہذا اس لیے چند باتوں کا خیال رکھیں۔  
 ☆ عورتوں کی عادت ہے کہ بچوں کو کہیں سیاہی سے ڈراتی ہیں کہیں ڈراؤنی چیزوں سے۔ سو یہ بڑی بات

ہے۔ اس سے بچے کا دل کمزور ہوتا ہے۔

☆ دودھ پلانے اور کھانا کھلانے کا وقت مقرر رکھیں۔ اس سے صحت پر اگراثر پڑتا ہے۔

☆ بچوں کے ہاتھوں سے غریبوں کو کھانا، پیسہ اور دیگر ایسی چیزیں دلایا کرو۔ نیز بہن بھائیوں کو آپس میں چیزیں تقسیم کر دیا کرو۔

☆ وقت نکال کر نیک لوگوں کی حکایتیں اور قصے سنایا کرو۔

☆ جب بچہ کوئی بات یا خوبی ظاہر کرے تو اس پر خوب شاباش دو بلکہ حتی الامکان انعام بھی دو۔ اس سے صلاحیت اجاگر ہوتی ہے۔

☆ ماں کو چاہیے کہ بچہ کو باپ سے ڈراتی رہے۔

### میل پچیل

حسن انتخاب: محمد نعیم عباس میوانی۔ پٹوکی  
 ظلیل جبران کا ایک دھوبی گھاٹ سے گزر ہوا۔ وہاں ایک دھوبی کپڑے دھونے میں مصروف نظر آیا۔ ظلیل جبران نے اس سے پوچھا کہ تم کیا کرتے ہو؟

دھوبی نے جواب دیا۔ ”میں کپڑوں سے میل پچیل نکالتا ہوں۔ دھوبی نے ظلیل جبران سے پوچھا آپ کیا کرتے ہو؟

ظلیل جبران نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم کپڑوں کا میل پچیل نکالتے ہو اور میں دلوں کا میل پچیل نکالتا ہوں۔“

### دیر آید

مرسلہ: ریاض حسین تبسم چوہان۔ فیصل آباد  
 میکسیکوٹی کا ایک رومانی جوڑا جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ ہر کام بہت غور و خوض کے بعد کرنا چاہیے۔ لہذا وہ دونوں مگنتی کے بعد 62 برس تک شادی کے سوال پر غور کرتے رہے اور آخر جب وہ ایک دوسرے سے مطمئن ہو گئے تو انھوں نے شادی کر لی۔ شادی کے وقت ان کی عمر 82 برس تھی۔

مرسلہ: کاشف عبید۔ بیٹ گرام



قارئین

اپنی سخن فہمی کو آزمائے، قارئین کے بھیجے گئے وہ اشعار جو یاد رہ جاتے ہیں اور اکثر ذہن میں گونجتے رہتے ہیں نوٹ، قارئین سے گزارش ہے کہ اشعار بھیجتے وقت معیار کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ شعر مسترد کر دیا جائے گا۔

اعلام یافتہ شعر پر قاری کو 3 ماہ تک سچی کہانیاں بطور انعام بھیجا جائے گا۔

بھی ہواؤں میں روشن چراغ کر دے گا  
شکستِ حیشہٴ صحبت سے دل لہو ہے مرا  
وہ کون ہے جو مرا ساتھ عمر بھر دے گا؟  
ارمِ اظہر..... کراچی

صبح ہوتے ہی چلے جاتے ہیں  
خوابِ تعبیر کو کھا جاتے ہیں  
احمد عبدالغنی..... کراچی

رایگان ہی تھی اس کا حوالہ تو ہے  
میں تو خوش ہوں کہ مرا شہر تمنا تو ہے  
کیوں نہ جھک جائے محبت سے مرے دل کی جبین  
یہ تیرا نقش کف پا بھی تو گویا تو ہے  
بمیل جاوید..... سرگودھا

ہم اہل عشق بہت بدگمان ہوتے ہیں  
اسی طرح کا کوئی وصف تیری ذات میں تھا  
ہوائے ہاتھ میں جیسے چراغِ جل انھیں  
یہی کمال تری جستجو کی رات میں تھا  
معاویہ عنبروٹو..... ہڑپ

بستر سے کروٹ کا رشتہ ٹوٹ گیا اک یاد کے ساتھ  
خواب سرمانے سے اٹھ بیٹھا کیلے کو سرکانے میں  
نگہت منیر..... اوکاڑہ

ترتیب الٹ کر جو دیکھے حروف کی  
بارش سے ربط کوئی تو ہوگا شراب کا  
ام حبیبہ..... اسلام آباد

اب دل کی دختوں سے مرا واسطہ نہیں  
اک نبض رازداں تھی سو وہ بھی خوش ہے

الفت جہاں..... کراچی  
دعا نہ مانگو تو غم سے رہائی دیتا نہیں  
سنائی دیتا ہے لیکن دکھائی دیتا نہیں  
فہدیم..... کویت سٹی

اگرچہ پیار کا قصہ ہے دو دلوں کا مگر  
ہے ایک تیسرا کردار بھی کہانی میں  
پھر اس کے بعد یہی دھیان بکھیریں گے  
ابھی جو لوگ لگے ہیں قصیدہ خوانی میں  
کسیم شفیق..... اسلام آباد

ہوا ہے کوئی تو کرتا ہے مخبری جا کر  
چراغِ جب بھی جلاتا ہوں روشنی کے لیے  
کہ دہشتی تو ہماری سرشت ہی میں نہیں  
ہمیں خدا نے بتایا ہے دوستی کے لیے  
ایم افضل آزاد..... ساہیوال

کہاں تک بے ارادہ خوش رہیں گے  
بچھڑ کر ہم زیادہ خوش رہیں گے  
یہ سوچا تھا کہ اگلے شہر میں جب  
مکان ہوگا کشادہ خوش رہیں گے  
رضوانہ کوثر..... لاہور

کھلا نہیں آنکھوں پر افلاک گردش سے  
سورج ہے کہ شعلہ ہے تارا ہے کہ چنگاری  
یہ بزمِ غزالاں ہے ہشیار ذرا رہنا  
اک چشمِ گرفتہ ہے مصروفِ طرحداری  
شامکہ اختر..... لاہور

کبھی چراغ بجھائے گا راستوں کے تمام



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

بس اک شاداب ہی گوشہ نشین ہے  
 نعمان الطاف.....کراچی

اتنی ساری ضرورتوں کے  
 کسے ہوتا ہے خود کفیل کوئی  
 کھینچ رہا ہے دل اس کی جانب کیوں  
 پاس اپنے نہیں دلیل کوئی

شاہدہ سعید.....پسرور

محدود کر نہ ذہن کی ہنگامہ خیزیاں  
 وہ آئینہ تراش کہ دنیا دکھائی دے  
 عابدہ بیگم.....کراچی

درد دل میں اٹھا تھا اچانک  
 کچھ نہ کچھ ہو رہے گا اچانک  
 میں ہوں راجہ عدم کا مسافر  
 ہار جائے گی دنیا اچانک

جیلہ کٹول.....لیاری انیکسپریس کراچی

بغیر ہار جیت کے اگر کوئی خرق بھی  
 گلست اپنی مان لے تو پھر فساد کیسے ہو؟  
 نصاب عشق کے سوا کچھ اور یاد کیسے ہو؟  
 ہمارے قول و فعل میں بھلا تضاد کیسے ہو؟

حاصم وقاص.....لاہور

ہم بے خبر تھے اور وہ زمانہ شاس تھا  
 ہر بار جیتنے کا ہنر اس کے پاس تھا  
 شازبہ رضوی.....کراچی

خواب ہی خواب پھیلی پہ لیے پھرتی ہوں  
 میرا یوسف کوئی تعبیر بتاتا ہی نہیں  
 خیمہ زن ہونے کو ہے پھر کسی سحر میں حسن  
 میرا دل میرے قبیلے میں ساتا ہی نہیں

کاشف نبی خان.....کراچی

جیسے دھاگہ ہو کوئی کھینچ کا  
 میری سانسوں کے درمیاں تو ہے  
 شعبان کھوسہ.....کوئٹہ

تو نے اے عشق! یہ سوچا کہ ترا کیا ہوگا  
 میں ترے سر سے اگر ہاتھ اٹھا لیتا ہوں؟  
 عادل گلزار.....فیصل آباد

بخت جب سازگار ہوتا ہے  
 زرد موسم بہار ہوتا ہے  
 کرن شہزادی.....راولپنڈی

میں ہوں اخبار محبت مری پیشانی پر  
 روز اک آس کے مرنے کی خبر لگتی ہے  
 زینب علی.....ملتان

اب تو بس تیرا خیال آتے ہی  
 صرف احساس زیاں ہوتا ہے  
 یوں تو چھوڑ آئے ہیں ماں کا آگن  
 دل مگر اب بھی وہاں ہوتا ہے  
 مقصود بیویج.....واہو

طوقاں کے باوجود سمندر ہے پرسکوں  
 کشتی سے باوہاں کا تعلق کچھ اور ہے  
 فائزہ ناز.....پہری

بے حسی کا علاج کون کرے  
 آوی بھی مشین جیسا ہے  
 سلمان عمرانی.....سجاول

جو زندہ لوگ ہیں وہ دھیان رکھیں  
 مگر آباد اک زیر زمیں ہے  
 زمانہ شہر کی رونق میں ہے گم

میرا یہ پسندیدہ شعر ”سچی کہانیاں“ کی نذر ہے

کوہن برائے

تیرنیم  
 کش

اپریل 2016ء

نام:

پتہ:

25 سچی کہانیاں